

سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

صفحات 290
قیمت 100 روپے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

فروری 2019

نگران: معراج رسول







بے مثال فنکار: ان فنکاروں کا ذکر جو قیامِ پاکستان سے قبل دلوں کی دھڑکن تھے

آخری حصار: اس شیر دل حکمران کا زندگی نامہ جس کی شکست نے برصغیر کی تقدیر بدل دی

زندگی کو دِ گراں: وہ کالی تھی اسی لیے اس کی زندگی دشت آلام بن گئی، ایک دکھی کر دینے والی سچ بیانی

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 28 ✧ شمارہ 12 ✧ فروری 2019ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرِ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◆◆◆

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

◆◆◆

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 100 روپے ✧ زرِ سالانہ 1200 روپے

پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول

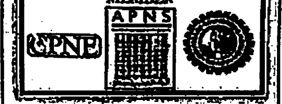
مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ○ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

ہم ٹی وی کے سامنے بیٹھتے ہیں تو دل بلّیوں اچھلنے لگتا ہے۔ وہ لوگ جن کا کہا حرفِ آخر کہا جاتا تھا، آج وہ کٹہرے میں کھڑے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جن پر کرپشن کے الزام لگے ہیں۔ سو ہمیں امید ہو چلی ہے کہ جلد ہمارا ملکِ کرپشن سے پاک کہلائے گا لیکن اگلے دن جب بلدیاتی دفاتر، سرکاری محکمے میں پہنچتے ہیں تو وہاں وہی معمول نظر آتا ہے۔ آخر یہ تضاد کب دور ہوگا؟ کب ہمارے خوابوں کو تعبیر ملے گی یا ہم اسی طرح ہر روز ایک نیا تماشا دیکھتے رہیں گے؟

کوئی کچھ بھی کہہ لے، تبدیلی تبھی آئے گی جب ہم خود کو بدلیں گے۔ ہماری سوچ بدلے گی.....تو کیوں نہ ہم یہ کوشش آج سے ہی شروع کرلیں۔ خود کو قائداعظم کے خواب کی تعبیر بنانا شروع کردیں۔ ہر غلط راہ کو مسترد کردیں۔

معراج رسول

شاعر انقلاب

آفریدی علی خیل قبیلے کے محمد بلند خان درہ خیبر عبور کر کے فرخ آباد آئے پھر وہاں سے بعد والی ریاست نواب محمد امیر خان راجستھان کی ریاست ٹونک پہنچے۔ وہاں کچھ عرصہ گزار کر اودھ آگئے۔ نواب فقیر محمد گویا نے ملیح آباد سے میل بھر دور ایک قصبہ خرید کر اس کا نام اپنے کارکن میرزا احتو بیگ کے نام پر میرزا گنج رکھا تھا، وہیں یہ خاندان آباد ہوا۔ اسی میرزا گنج میں 5 دسمبر 1898ء کو صبح چار بجے اسی خاندان کے نواب بشیر احمد خان بشیر کے گھر ایک بچے نے جنم لیا۔ محمد بلند خان نے قصبہ خریدا تھا اور ان کے بعد یہ قصبہ ان کے بیٹے حسان الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خان گویا نے انتظام سنبھالا تھا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے نواب محمد احمد خان احمد اور ان کے بعد نواب بشیر احمد خان بشیر کی نوابیت قائم ہوئی تھی۔ انہی نواب بشیر کے ہاں بچے نے جنم لیا تھا۔ بچے کی خوشی میں ایک ہفتے تک لنگر عام جاری رہا۔ بچے کی دادی (بیگم نواب احمد خان) میرزا غالب کے خاندان کی تھیں۔ انہی نے بچے کو اپنی نگرانی میں لے لیا جب کہ دوسرے بچوں (شفیع احمد خان ولی، رئیس احمد خان رئیس، افسر جہاں، انیس جہاں، حشمت آراء اور شوکت آراء) سے انہوں نے زیادہ رغبت نہیں دکھائی، بس اسی بچے کو ہاتھوں کا چھالا بنا لیا تھا، بچے نے ہوش سنبھالا تو عربی تعلیم کے لیے میرزا محمد ہادی رسوا (امراؤ جان ادا کے مصنف) فارسی و اردو کے لیے مولانا قدرت اللہ بیگ (جنہوں نے 5 ہزار اشعار کی مثنوی بے نقطہ کی کہی) انگریزی کے لیے گومتی پرشاد کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ابتدائی اسباق میں شُد بُد کے بعد سیتا پور اسکول میں داخل کرایا گیا، پھر جوبلی ہائی اسکول پھر چرچ مشن اسکول لکھنو میں داخل کرایا۔ اسی دوران 1907ء میں اشرف جہاں سے نکاح پڑھا دیا گیا۔ میٹرک کرتے ہی ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لے لیا پھر 1912ء میں سینئر کیمبرج کے لیے سینٹ پیٹرز کالج آگرہ چلے گئے۔ 1915ء میں والدین نے گھر بلایا اور رخصتی کی رسوم ادا کر کے اشرف جہاں کو گھر لے آئے۔ 1907ء میں جب وہ صرف 9 سال کا تھا زندگی کا پہلا شعر کہا۔ ”شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے۔ یہ میرا فن خاندانی ہے“ یہاں شاعری کا آغاز کر چکا تھا۔ اسکول اور کالج پہنچنے تک اچھی خاصی غزلیں اور نظمیں کہہ لی تھیں۔ 12,11 سال کی عمر تک غزلیں کہی تھیں لیکن 1914ء میں وحید الدین پانی پتی کے مشورے پر نظم کی جانب راغب ہو گئے۔ پہلی نظم ”ہلال محرم“ کہی تھی۔ 1918ء میں وہ رابندر ناتھ ٹیگور کی قائم کردہ درس گاہ شانتی نکیتن میں مزید تعلیم کے حصول کی خاطر جا پہنچے مگر بنگالی ماحول سے جلد اکتا گئے اور صرف چھ ماہ میں واپس آگئے۔ 1925ء میں ملازمت کا شوق ہوا تو حیدرآباد دکن جا کر ”دارالترجمہ“ میں ملازمت کرلی۔ 1934ء میں ناظر ادب کے عہدے سے علیحدگی حاصل کر کے حیدرآباد سے واپس دہلی آگئے اور ماہنامہ ”کلیم“ کے مدیر بن گئے۔ 1939ء تک اس پرچے سے وابستہ رہے پھر 1940ء میں لکھنو آکر ماہنامہ نیا ادب کی ادارت سنبھال لی۔ اب وہ کل ہندوستان کے شاعر مانے جانے لگے تھے، ان کی شاعری کے ہزاروں دیوانے تھے، خود پنڈت جواہر لعل نہرو کا یہ حال تھا کہ ان کا نام سنتے ہی اس شہر میں جا پہنچتے جہاں مشاعرہ ہوتا، انہیں حکومت ہند نے سب سے بڑے سول اعزاز ”پدم بھوشن“ (1954ء) سے نوازا لیکن بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک دیکھ کر وہ 1958ء میں پاکستان آگئے۔ کراچی میں سکونت اختیار کرلی۔ 22 فروری 1982ء کو 83 سال کی عمر میں اسلام آباد میں انتقال کیا۔ بعد از مرگ 2013ء میں انہیں ہلال امتیاز کے تمغے سے نوازا گیا۔ اس شاعر انقلاب کو جوش ملیح آبادی کہتے ہیں۔

☆☆☆

شہرِ خیال

مدیرِ اعلیٰ

☆ اویس شیخ کی خوشہ چینی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ ”اس مرتبہ آپ نے اداریے میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کا موازنہ بڑی عمدگی کے ساتھ کیا لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ سوشل میڈیا نے ان دونوں کی اہمیت کسی حد تک کم کر دی ہے اور ایک مربوط نیٹ ورک بن چکا ہے۔ ”شاعرِ تاجدارِ حرم“ ڈاکٹر یاور عباس کا تذکرہ پڑھا، کمال کی شخصیت کا انتخاب کیا۔ ”ناکردہ گناہ“ سحر انگیز داستان تھی۔ صرف پانچ برس کے کاموں کو ہندوستان کی تاریخ اگلی پانچ صدیوں تک بھی یاد رکھے گی۔ کسی مورخ نے اس کے بارے میں لکھا تھا کہ ”مغلوں کے ایک ہزار سال اور شیر شاہ سوری کے پانچ سال ترازو کے پلڑے میں رکھ دیے جائیں تو اس افغان زادے کا پلڑا فوراً زمین پر آ لگے گا۔“ اور جب نوجوان شادی نے سوال کیا۔ ”شیر خان یہ ہتھیار دیواروں ہی پر سجے رہتے ہیں یا انسانی جسموں پر بھی سجتے ہیں؟ شیر خان کا فلسفیانہ جواب بے مثال تھا، کہا۔ ”یہ ہتھیار کبھی میرے دشمنوں کے جسم پر سجے رہتے تھے لیکن جب میں نے انہیں زیر کر لیا تو ان کے جسموں پر سے اتار کر دیواروں پر سجا دیا اور کہا کہ اس دیوار کے خالی حصے کے لیے مجھے تمہارے ہتھیار درکار ہیں۔“ ”امیر البحر“ بہت معلوماتی اور دلچسپ مضمون تھا۔ ”شاخِ زیتون“ پڑھی۔ ”کاش میرے اختیار میں ہوتا تو میں سب کو چولہے میں جھونک دیتی۔“ یہ جملہ پڑھ کر یقین ہو گیا محبت کا کوئی مذہب، فرقہ اور وطن نہیں ہوتا ہے۔ پائل اور منصور کی محبت نے جن دنوں جنم لیا وہ جنگ کے کٹھن حالات تھے، منصور پڑھا لکھا ایک باشعور انسان تھا۔ اس لیے اس نے اپنے زخموں سے چور ہم وطنوں کی تیمارداری کی خاطر اپنی محبت کو رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ وہ دونوں جان چکے تھے کہ اس محبت کا کسی انجام تک پہنچنا ناممکن ہے۔ سچ بیانیوں میں ”وارث“ پڑھی قسمت کا کیسا دردناک کھیل تھا، جائیداد کا وارث بھی پیدا ہوا ایک نہیں بلکہ دو پیدا ہوئے لیکن محبت اور نفرت کی آگ نے سب کچھ ختم کر دیا۔ ”نشانِ عبرت“ پڑھ کر ابھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ ایک سگا باپ کتنی بے غیرتی اور سنگدلی کے ساتھ اپنی بیٹیوں کو معاشرے میں ٹریٹ کرواتا رہا۔ اس قبیح کھیل میں ماسی مصالحہ نے نائکہ کا کردار ادا کیا۔ ”انتظار“ پڑھی۔ سمجھ نہیں آتی سرداراں بی بی کو خوش نصیب کہا جائے یا پھر بدنصیب لکھا جائے؟ ”بھول“ پڑھی۔ نادیہ کو قسمت کی دیوی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ قدرت نے قدم قدم پر اس کی نادانیاں نہ صرف معاف کیا بلکہ اس کی رہنمائی بھی کی۔ آخری پیراگراف تک پڑھتے ہوئے بھی یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ نادیہ کا مقدر نوید ہوگا یا پھر قیصر؟ بے شک وہ ذات دلوں کو پھیرنے میں قادر ہے۔ ”حماقتی اقدام“ میں صدف نے عقل مندی اور مستقل مزاجی کے ساتھ ارسلان کے چھچھورپن کا سامنا کیا ہو داد دینی پڑے گی۔ ”قربانی“ ایسی کہانی تھی جس نے مجھے ایک عجیب سی ذہنی کوفت میں مبتلا کر دیا۔ اس پورے کھیل میں سارا ملبہ صرف سیٹھ ریحان جیسے بھیڑیے پر ڈال کر ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آپ منیر صاحب کی حماقت اور بیوقوفی کا اندازہ اس بات سے لگائیں جب انہیں اس بات کا علم تھا کہ ان کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے تو انہوں نے بیوی کے مرنے کے 14 سال تک دوسری شادی کیوں نہیں کی؟ پھر ایک بیٹا جسمانی طور پر مفلوج بھی تھا، جس گھر میں رہ رہے تھے وہ مکان بھی کرائے کا تھا۔ سیدھا سیدھا اولاد کو جہنم میں دھکیلنے والی بات تھی اور پھر اس کا خمیازہ ان کی بیٹی اور بیٹے کو بھگتنا پڑا اور مجھے یہ بات کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ سیٹھ ریحان کو قتل کر کے بہت غلط کیا گیا۔ ”شہرِ خیال“ میں نظر دوڑائی تو منشی عزیز صاحب کی سالانہ رپورٹ پر نظر پڑی۔ کافی دلچسپ تھی۔ سید امتیاز حسین بخاری کے بارے میں جان کر اچھا لگا اتنی معتبر شخصیت ہمارے درمیان موجود ہے۔ ڈاکٹر بشریٰ بہن کو موسٹ ویلکم اور نزاہت افشاں، رانا محمد شاہد صاحب آپ بھی اچھا لکھتے ہیں، اس کے علاوہ اعجاز سٹھار صاحب ایک نکتہ جو انہوں نے ”ایک خواب تھا“ سچ بیانی پر اٹھایا کہ ”اگر ہم ہوتے تو کیا کرتے؟ دوسروں پر تنقید کرنا بہت آسان ہے۔“ بالکل درست فرمایا لیکن آپ دیکھیں ڈاکٹر امجد نے اپنی بہن کا گھر بچانے کی خاطر اپنی بیوی سے تعلق توڑا۔ تعلقات توڑ کر کیا مسئلے کو ختم کیا جا سکتا ہے؟ اگر ڈاکٹر صاحب تھوڑی سی عقل لڑاتے تو معاملات سیدھے کر سکتے تھے، یہ ادھر توڑ لو، ادھر جوڑ لو، ایسے رشتے کبھی سکھ نہیں دیتے، پیچھے صرف احساس ندامت ہی رہ جاتا۔“

☆ اعجاز حسین سٹھار کا تبصرہ نور پور تھل سے۔ ”سالانہ رپورٹ پھیکی اور نامکمل لگی، وحید ریاست بھٹی، کیا دھماکا کی معلومات لاتے تھے۔ شاید وہ غمِ روزگار میں چاہنے والوں کو بھلا بیٹھے ہیں۔ یاد کرنے، سراہنے اور خطوط میں اعزاز دینے پر سب دوستوں کا شکر گزار ہوں۔ میں نے پورے بارہ خطوط لکھے اور بروقت پوسٹ کیے، گم ہو جانے والے خطوط کی بازیابی میرے لیے ناممکن ہے اس لیے اپنی پسند کے مضامین اور کہانیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ”جنونی قاتل“ جیسے کئی درندے اپنے ناپاک وجود کے ساتھ زمین کا بوجھ ہیں۔ جولی کے ایک سچ بولنے سے سفاک قاتل گرفت میں آ گیا۔ ایسی جرم و سزا پر مبنی ترجمہ یا طبع زاد کہانیاں شامل ہونی چاہئیں۔ دوسرے سلسلوں میں بڑے جرائم، دوسری نور جہاں، دیوداس کی پارو اور شاخِ زیتون اپنے موضوعات کے ساتھ معلومات اور دلچسپی کا خزانہ ہیں۔ ”ناسور“ میں ابو جبرال کے حملے کے ساتھ جو حشر فائل کا ہوا، دل صدموں سے بھر گیا پھر کیکڑا موٹر سائیکل سواروں کا حملہ بھی غیر متوقع ہے۔ سچ بیانیوں میں ”وارث“ کے واقعات میں کتنے جوڑ توڑ ہیں جیسے سیاسی بساط بچھائی جاتی ہے لیکن اس کا مقصد حریف کو وقتی طور پر شکست دینا ہوتا ہے یہاں تو پورا خاندان تباہ ہو گیا، جینے والے بھی کہاں ہوش مند ہوں گے بلکہ وسیب کے لیے نشانِ عبرت ہوں گے۔ اونچی حویلیوں میں رہنے والے جبر، ظلم، ناانصافی اور حقوق غصب کرنے کی کتنی کہانیاں رقم کرتے ہیں، خود غرضی میں سازشوں کے جال بن کر بے بس اور غریب لوگوں کا شکار کرتے ہیں۔ جب یہ کچلا ہوا طبقہ سکھ اور سکون کا سانس لے گا تب معاشرے میں حقیقی تبدیلی کا منظر ہوگا۔ ”نشانِ عبرت“ میں مرزا خالد کے لالچی ذہن اور غلیظ سوچ پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ باپ کے لیے جوان بیٹی جہاں بھاری بوجھ ہے وہاں زمانے کا چلن دیکھ کر راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے لیکن یہ کیسا باپ تھا جو بنا بنایا، ہنستا گھر اجاڑنے پر تل جاتا تھا۔ واقعی اس کا یہی انجام ہونا تھا۔ ”کٹی پتنگ“ میں سارا قصور عورت کا نہیں ہے، تنہائی کا شکار سمجھتے ہوئے عیاش اور خاص کر شکاری فطرت مرد ورغلا کر غلط فیصلے کراتے ہیں۔ غیر مطمئن اور خود کو حسینہ عالم کے روپ میں دیکھنے والی عورتیں جلد شکنجے میں آ جاتی ہیں، ماہی کی قریبی سہیلیوں نے اس کی تعریفیں کر کے ایک گھر میں ٹکنے نہ دیا، رہی سہی کسر وجدان کے پراسرار کردار نے نکال دی۔ وہ کشتیاں جلا کر آئی تھی۔ معمولی تنگی برداشت کر لیتی لیکن وہ کیسا جوان مرد تھا جسے جوان لڑکی کی پروا نہ تھی بلکہ شجرِ ممنوعہ جان لیا یوں اسے دوسری بار طلاق کا مطالبہ کرنا پڑا۔ وہ ضد، ہٹ دھرم اور انا پرست ہونے کے ساتھ مضبوط کردار رکھتی تھی اس لیے اللہ کی رحمت کے سائے میں رہی اور آج دیگر رشتوں کے ساتھ بیٹی اور داماد کے سامنے سر اٹھا کر، ذہن پر کوئی خلش، پچھتاوا لیے بغیر زندگی کے باقی دن گزار رہی ہے۔ ”انتظار“ کی سرداراں نے ماسی کی بیٹی ہونے کے باوجود دنیا کی ہر خوشی، سہولت اور نعمت حاصل کی جس میں نیک بختی کا زیادہ حصہ رہا لیکن اولاد کے معاملے میں بدقسمتی عروج پر رہی۔ شرجیل، راحیل اور سمیر طریقے سلیقے سے خرچ کرتے تو ماں کی خدمت اور دعاؤں سے کاروبار ترقی کرتا، آخرت سنور جاتی اور معاشرے میں عزت و بھرم قائم رہتا لیکن انہوں نے جیسے اللہ کی ناراضی مول لی ہے۔ انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ان کا انجام سب کے سامنے ہے۔ سیدہ شاہدہ شاہ سے ادبی ساتھ پرانا ہے وہ ایک باعزت مقام رکھتی ہیں، وہ اپنے تجربات، مشاہدات اور مصروفیات سے حاصل ہونے والے [illegible] پیش کرتی رہیں گی۔“

☆ سدرہ [illegible] گوری کا تجزیہ کراچی سے۔ ”اداریہ میں اس بار انکل نے کتب بینی کا ذکر کیا، کتب بینی کا شوق چونکہ مجھے بھی بے حد ہے سو یہ اداریہ دلچسپ [illegible] بلکہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اس شوق میں مبتلا بھی دیکھا، حال ہی میں ایکسپو سینٹر میں 5 روزہ عالمی کتب میلے کا انعقاد کیا گیا۔ [illegible] کا ایسا جمِ غفیر دیکھنے میں آیا کہ یوں لگا کہ جیسے سارا شہر وہاں امنڈ آیا ہو، ایک اندازے کے مطابق تقریباً 6 لاکھ لوگوں نے اس میلے میں شرکت کی۔ لوگوں کی اس قدر دلچسپی یہ ثابت کرتی ہے کہ بھلے ہی آج انٹرنیٹ، ٹی وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ عام ہو گئے ہوں مگر کتب بینی کا شوق آج بھی عروج پر ہے (مطالعہ کے شوقین کبھی کم نہ ہوں گے۔ جو لوگ الیکٹرونک میڈیا کے شوقین ہیں، ان کا شوق عارضی ہے) سال نو کے پہلے مہینے کے نئے شمارے کے ”شہرِ خیال“ میں میرا تبصرہ کہیں بھی نہیں تھا جس کا مجھے دلی دکھ ہوا۔ خط شائع نہ ہونے کی وجہ تو میں نہیں جانتی [illegible] دوستوں اور خالد کبیر نے مجھے خصوصی طور پر یاد رکھا اس کے لیے ان کا بے حد شکریہ۔ خالد کبیر آپ کا خلوص اور محبتیں اپنی جگہ مگر [illegible] کبھی خواہش ہی نہیں رہی کہ میں کبھی ادیبہ، شاعرہ یا مصنفہ بنوں، میں تو بس ایک عام سی زندگی میں ایک عام سی انسان بن کر رہنا چاہتی ہوں، [illegible] لوگوں کے دکھ بھی خاص ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ پروین شاکر، محسن نقوی اور بھی ادب کی نامی گرامی شخصیات کس اذیت اور کرب کا شکار ہوئیں۔ شہرت اور ذہانت بہت کچھ دیتی ہے تو بہت کچھ چھین بھی لیتی ہے، بس دعا کیا کریں میرا شمار رب تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں میں ہو جائے۔ نزاہت افشاں بھائی یاد انہیں کیا جاتا ہے جنہیں بھلا دیا جائے آپ تو شہرِ خیال کی رونق ہیں آپ کو بھلا کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔ ”ناکردہ گناہ“ تاریخ کے جھروکوں سے ایک خاص الخاص واقعہ بہت خوب صورتی اور سلیقے سے لکھا گیا۔ منظر امام ”بڑے بڑے جرائم“ لے کر آئے اور دہشت زدہ کر گئے۔ ”دوسری نور جہاں“ کے کام اور نام دونوں سے ہی ہمارا تعارف پہلی مرتبہ ہوا، ان کے گیت سنے بہت تھے مگر یہ علم نہیں تھا کہ گلوکارہ کون ہے، اب ان سے متعارف ہوئے تو اچھا لگا۔ ویسے ہم بچپن سے ہی صرف ملکہ ترنم نور جہاں کو ہی جانتے تھے۔ اب انکل فرہاد کی مہربانی سے دوسری نور جہاں سے بھی واقف ہو گئے۔ ”ناسور“ میں ڈاکٹر صاحب کا ہیرو بھرپور ایکشن میں نظر آیا۔ ”وارث“ میں سکھاں کی محبت کا دردناک انجام

بڑھ کر دل کانپ گیا۔ زمانہ بدل گیا نہ بدلے تو رسم و رواج نہ بدلے۔ زمین کے معمولی ٹکڑوں کی خاطر ہنستی مسکراتی معصوم کلیاں اپنے بھائیوں اور باپوں کے ہاتھوں اجڑ کر زندہ درگور کردی جاتی ہیں۔ ''کٹی پتنگ'' میں مجھے مصنفہ کے اس آخری جملے پر اعتراض ہے کہ ''میں نے اپنا وقت باعزت طریقے سے گزارا'' محترمہ اگر کسی اچھے خاصے محبت کرنے والے شوہر کو ٹھکرا کر خوب صورتی کے پیچھے بھاگنے کو آپ باعزت طریقہ کہتی ہیں تو بہت معذرت کہ مجھے آپ کی اس رائے سے سخت اختلاف ہے۔ ''پچھتاوا'' پچھتاوؤں کی نذر ہو گئی۔ ایک ہنستا بستا گھر شک کی وجہ سے اجڑ گیا۔ ''قربانی'' خوب تھی۔ آج کل اتنی اچھی بہنیں ملتی کہاں ہیں کہ جو اپنا آپ اپنے ماں جائے کے لیے قربان کردے، ایسی عظیم قربانی کو سلام۔ حفاظتی اقدام، بدلہ اور بھول بھی اچھی رہیں۔''

☆ رازق بخش ذکی اہیر کی آمد جلال پور پیروالاں ضلع ملتان سے۔ ''منشی محمد عزیز مئے نے سرگزشت کی سالانہ رپورٹ بہترین انداز و تفصیل میں تیار کی جو قابل داد ہے۔ محمد اشفاق سرائے عالمگیر نے تجویز دی ہے کہ ''خود ساز نمبر'' کے صفحات 375 اور قیمت 160 ہو۔ ان صفحات کی قیمت تو 130 روپے بنتی ہے۔ ''ناکردہ گناہ'' بہترین تاریخی واقعہ ہے۔ مجھے تاریخ سے دلچسپی اور مطالعے کا شوق ہے، چند ایجادات کی معلومات حاصل ہوئیں، یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ ''شاخ زیتون'' میں عشق کا انجام بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ ''جنونی قاتل'' اچھی کہانی ہے۔ سچ بیانی سے احمق جولی کی جان بچی ''ناسور'' کی اس قسط میں نعمان ریت کے دریا میں پھنس کر بڑی مشکل سے بچا۔ پہلی آپ بیتی ''وارث'' دکھ بھری کہانی ہے جو بہت یاد رہے گی۔ ''نشانِ عبرت'' سبق آموز ہے مرزا خالد برا انسان ہے۔ ''کٹی پتنگ'' کی ماہ نور صورت پسند تھی جب کہ سیرت والا بہتر ہوتا ہے۔ ''انتظار'' کی سرداراں جایداد بچوں کے نام نہ کرتی تو دارالامان کی بجائے گھر میں رہتی بچوں کے نے کے بعد تو جایداد اس کے بچوں کو وراثت میں مل جاتی۔ نادیہ سے دوبارہ ''بھول'' ہو گئی لیکن قسمت نے ساتھ دیا۔ ''پچھتاوا'' کی میمونہ حد سے زیادہ شکی تھی۔ ''بدلہ'' اور ''حفاظتی اقدام'' نے بہت متاثر کیا اور ''قربانی'' کے بدکردار سیٹھ ریحان پر صد افسوس ہے۔ خود ساز نمبر کا انتظار ہے۔''

☆ انجم فاروق ساحلی نے لاہور سے لکھا ہے۔ ''جس پرچے میں زویا اعجاز کی لکھی ''منٹو کی آپ بیتی'' شائع ہوئی اس کا تذکرہ سن کر پرویز انجم نے فوراً سرگزشت کا شمارہ منگوالیا۔ وہ میرے اچھے دوست ہیں اور منٹو پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''منٹو کا منٹو'' آچکی ہے۔ ایک معروف میگزین کی اسسٹنٹ غلام زہرا کو سرگزشت بے حد پسند ہے۔ آج کل نئی نئی چیزیں تخیل سے آرہی ہیں۔ تراجم کا سلسلہ روک دیا ہے۔ ''رومانیت کیا ہے'' ایک علمی و ادبی مضمون مرتب ہوا ہے۔ زیادہ ادبی مباحث علی عباس جلالپوری اور ڈاکٹر انور سدید کی ہے۔ تھوڑا سا حصہ میں نے بھی لیا ہے کیونکہ میں زمانہ طالب علمی میں ''رومانویت'' سے اچھی طرح آگاہ ہوا تھا (سرگزشت میں سچ بیانیاں، سچے واقعات چھپتے ہیں۔ رومانیت کیا ہے، یہ اخبار و نیوز میگزین کے لیے بہتر ہے) یہ دیکھ کر مسرت کا احساس ہوتا ہے کہ علمی و ادبی لوگوں کی توجہ کا مرکز سرگزشت ڈائجسٹ ہی ہوتا ہے۔ آپ کی محنت اور عرق ریزی کے بھی قائل ہیں۔ گزشتہ دنوں جو بات ہوگئی اسے چھوڑ دیا جائے۔ بعض اوقات لکھنے والا زیادہ توجہ اور سنجیدگی سے نہیں لکھ پاتا کیونکہ اس کے داخل اور خارج میں ربط قائم نہیں رہتا۔ نامساعد حالات اور پھر رکاوٹیں پیدا کرنے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی کی دوسری غلطیاں بھی بسا اوقات اسی لیے سرزد ہوتی ہیں۔''

☆ رانا محمد شاہد نے گلستان کالونی بورے والا سے لکھا ہے۔ ''جنوری کا شمارہ دسمبر کے آخری دنوں میں خریدا۔ شدید سردی نے نقل و حمل کو محدود کردیا ہے۔ جنوری کا سرورق دیدہ زیب تھا۔ یک صفحی سرگزشت میں ڈاکٹر یاور عباس کی مشکلات کے باوجود شاعری سے محبت پڑھ کر اچھا لگا۔ یہ پڑھ کر تھوڑی حیرانی بھی ہوئی کہ اس دور کے شرفاء اور تعلیم یافتہ گھرانوں کی پہچان شاعری تھی، ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو عزت آج کے کھلاڑی اور فنکار کو حاصل ہے، وہ کبھی شاعر کو تھی۔ اداریے میں معراج رسول صاحب نے نہایت اہم نکتے کی وضاحت کی۔ دسمبر کے آخری دنوں میں کراچی کے ایکسپو سینٹر میں کتابوں کا میلہ لگا۔ اس سے پہلے نومبر کے پہلے ہفتے میں اسی طرح کا میلہ لاہور کے ایکسپو سینٹر میں لگا تھا۔ آپ اگر ایک دفعہ یہاں کا وزٹ کریں تو معراج رسول صاحب نے جس اہم نقطے کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ بخوبی سمجھ میں آجائے گا۔ الیکٹرونک میڈیا جتنی بھی ترقی کرلے، کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کتاب سے بڑا رفیق کوئی نہیں، زندہ قومیں کتاب کی ترقی و ترویج کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتی ہیں۔ ترقی یافتہ اور مہذب ملکوں میں آج بھی ''کمپیوٹرائزیشن'' کے باوجود کتابیں چھاپنے، فروخت کرنے اور خریدنے کا تناسب روز بروز بڑھ رہا ہے۔ ''معبر خیال'' میں منشی محمد عزیز مئے نے نہایت ہی محنت سے سرگزشت کا سالانہ تجزیہ پیش کیا۔ یہ بھی سرگزشت سے محبت رکھنے والوں کا ایک انداز ہے کہ وہ ''معبر خیال'' میں آنے والوں کی حاضری اور لکھنے والوں کی ایک، ایک تحریر کا یوں ذکر کرتے ہیں۔ خالد کبیر کی بھی مختصر سی رپورٹ اس حوالے سے تھی۔ ناصر حسین رند نے سال بھر میں سرگزشت میں شائع ہونے والی اپنی پسندیدہ پراسرار تحریروں کا جائزہ لیا۔ اعجاز حسین سٹھار اور اویس شیخ کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ رحمت اللہ اعوان! سرگزشت کے لیے ضرور لکھیے کیونکہ تجربے کا کوئی نعم البدل نہیں۔ ڈاکٹر بشریٰ عادل کا لکھا بھی پسند آیا۔ ڈاکٹر صاحبہ آپ جیسی ادب دوست لوگوں کی آج پہلے سے زیادہ ضرورت

ہے۔ محمد اشفاق کی سرگزشت کے خاص نمبر والی تجویز اچھی ہے مگر میرے خیال میں کاغذ کی بڑھتی قیمتوں اور دوسرے کئی معاملات کی وجہ سے ادارے کی اپنی کوئی مجبوری ہوگی۔ اسی لیے خاص نمبر زیادہ صفحات کے ساتھ شائع نہیں ہو رہا۔ البتہ ان کی دوسری تجویز کے حوالے سے یہ کہیں گے کہ سرگزشت کے ماضی کے معروف رائٹرز کا تعارف ضرور ہونا چاہیے تاکہ قاری اور لکھاری کا تعلق بھی مضبوط ہو۔ سید امتیاز حسین بخاری آپ کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا کہ آپ کا کلام معروف گلوکاروں نے بھی گایا ہے۔ ہمارے ہاں یہی مسئلہ ہے۔ گانے والا تو دولت، شہرت، عزت پالیتا ہے جب کہ لکھنے والے کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ وہ گمنامی کے اندھیروں میں زندگی گزار دیتا ہے۔ نزاہت افشاں، عبدالحکیم ثمر اور پروفیسر کیوائے قاسمی کے تبصرے بھی پسند آئے۔ معروف لکھاری الیاس سیتاپوری نے تاریخ کے معروف جرنیل شیر شاہ سوری کی زندگی کے اہم گوشوں سے آگاہ کیا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ برصغیر پر صرف پانچ سال تک حکومت کرنے والے شیر شاہ سوری کے وہ پانچ سال برصغیر کی ترقی پر ہر طرح سے حاوی نظر آتے ہیں۔ تاریخ اس کے کاموں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ منظر امام صاحب کافی دیر بعد ایک دلچسپ و معلوماتی تحریر کے ساتھ نظر آئے۔ اپنے نفس کی تسکین اور مفادات کے لیے انسان بڑے سے بڑا جرم کرنے سے بھی نہیں گھبراتا اور گویا اپنی تباہی و بربادی کا سامان خود کرتا ہے۔ انور فرہاد نے فلم نگری میں ماضی کی ایک اہم گلوکارہ کے بارے میں خاصا تفصیل سے لکھا۔ ہم تصویر سے نسیم بیگم کو گلوکارہ مالا سمجھتے رہے، پڑھا تو حقیقت کھلی۔ سید احتشام کی دیوداس کی پارو بھی ایک اداکارہ کی کہانی تھی۔ ویسے اس دفعہ فلمی شخصیات پر دو، دو مضامین اور اردو ادب کو آپ نے جگہ ہی نہیں دی۔ گزارش یہ ہے کہ اردو ادب کی کسی بھی شخصیت پر ہر ماہ کوئی ایک تحریر ضرور دیا کریں۔ محمد یاسر اعوان کی ایجادات بھی ایک معلوماتی تحریر تھی۔ یاسر بھائی نے تحریر کے ساتھ کوئی حوالہ نہیں دیا کہ انہوں نے یہ معلومات کہاں سے لیں، کیونکہ میرے پاس یاسر جواد صاحب کی ایک کتاب ہے جس میں ان تمام ایجادات پر خاصی تفصیل سے معلومات موجود ہیں۔ سلمٰی اعوان کی تحریر ہمیشہ ہی خاص ہوتی ہے کیونکہ وہ سینئر لکھنے والی ہیں۔ اس دفعہ وہ پیار و محبت کی ایک منفرد داستان ''شاخ زیتون'' کے ساتھ حاضر تھیں۔ سید جاذب کی ''جنونی قاتل'' بھی دلچسپ رہی۔''

☆ کوثر اسلام نے صوابی سے لکھا ہے۔ ''معبر خیال کے تمام دوستوں کے لیے محبتیں اور نیک خواہشات۔ سب سے پہلے میں ادارے کا بہت بہت شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ میری تحریر شائع کر کے مجھ جیسے نو آموز کی حوصلہ افزائی کی۔ سرگزشت کی یہی خاصیت سب سے اچھی ہے کہ یہاں نئے لکھنے والوں کی پذیرائی ہوتی ہے۔ اداریہ مختصر اور ہمیشہ کی طرح جامع تھا۔ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کتب بینی میں اضافہ نہیں ہوا۔ مہنگائی اور کتابوں کی قیمتوں میں ہوشربا اضافے نے پرنٹ میڈیا کے مقابلے میں الیکٹرونک میڈیا کی تعداد بڑھائی لیکن ماضی کی بہ نسبت پرنٹ میڈیا کو ترجیح دینے والوں کی تعداد اب بھی زیادہ ہے۔ یک صفحی سرگزشت میں ''تاجدار حرم'' جیسی شہرۂ آفاق نعتیہ باعی کے خالق ڈاکٹر یاور عباس کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا۔ ''معبر خیال'' میں منشی محمد عزیز کرسی صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ پچھلے سال کی طرح انہوں نے اس سال بھی بہت کمال کا تجزیہ پیش کیا۔ خالد کبیر اور ناصر حسین رند کے تجزیے بھی بہت عمدہ تھے۔ بھائی اعجاز حسین راہی، محمد شاہد اور سید امتیاز حسین کے تبصرے ہمیشہ کی طرح جامع اور دلچسپ تھے۔ سرگزشت کے ابتدائی صفحات کی تحریر ہمیشہ بہت اعلیٰ ہوتی ہے۔ الیاس سیتاپوری کا نام دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ ''ناکردہ گناہ'' شروع کی تو پڑھتا ہی چلا گیا، یوں لگ رہا تھا جیسے فلم آنکھوں کے سامنے چل رہی ہو۔ جمیلہ اور کلثوم ایک ہوگئے۔ شیر شاہ کی موت نے رنجیدہ کردیا۔ ''امیر البحر'' بہت عمدہ اور معلوماتی تحریر تھی واسکوڈے گاما کے متعلق پہلے پڑھا تھا لیکن تفصیل کے ساتھ پہلی بار پڑھا۔ منظر امام صاحب نے اس صدی کے بڑے بڑے جرائم کا ذکر کیا۔ مونالیزا کی چوری، گریٹ ٹرین رابری، اسکول شوٹنگ اور سن آف سام ڈیوڈ کا واقعہ بہت عمدہ انداز میں تحریر کیا۔ ہمارا معاشرہ بھی ڈیوڈ جیسے وحشیوں سے بھرا پڑا ہے۔ یاسر اعوان نے ''ایجادات'' کے ذریعے معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ ''جنونی قاتل'' مغرب سے درآمد شدہ ایک عمدہ پر تجسس کہانی تھی۔ مجرم چاہے جتنا بھی شاطر ہو اور جرم چاہے جتنے پردوں میں چھپ کر کیا جائے ایک نہ ایک دن آشکارا ہو جاتا ہے۔ جولی نے سچ بولا اور سچائی ہی کی وجہ سے اسے نجات ملی۔ یہ کہانی ہر کسی کے لیے ایک سبق بھی ہے کہ وہ چند میٹھی باتوں کی وجہ سے کسی کے جھانسے میں نہ آئیں۔ سچ بیانیاں تمام بہت عمدہ تھیں اکثریت خواتین کی تھی جنہوں نے سلگتے موضوعات پر قلم اٹھایا تھا۔ ''وارث'' سوچنے پر مجبور کرنے والی سچ بیانی تھی۔ یہ رسم اور یہ طریقہ آج بھی زمینداروں میں رائج ہے۔ جائیداد کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ سکھاں جیسی لڑکیوں کی بغاوت بھی اس رواج کا کچھ نہ بگاڑ سکی ہاں اتنا ہوتا ہے کہ بغاوت کرنے والی کا مقدر ایک تاریک کوٹھڑی یا سفید لباس بن جاتا ہے۔ فرح انیس نے ''پچھتاوا'' کی صورت میں عورتوں کا بہت بڑا مسئلہ اٹھایا۔ شک کی وجہ سے بستے آباد گھر اجڑ گئے۔ میمونہ جیسی ہزار عورتیں ہیں جو اب بھی پچھتا رہی ہیں مگر پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئی کھیت۔ فضہ عادل نے ''قربانی'' کی صورت میں ایک عمدہ سچ بیانی تحریر کی۔ ہمارا معاشرہ سیٹھ ریحان جیسے لوگوں سے بھرا پڑا ہے جو کسی ضرورت مند کی مدد نہیں کرتے مگر بے سہارا لڑکی کو دیکھ کر وہ سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں اور بعد میں بڑی قیمت وصول کرتے ہیں۔ در نجف نے بھائی کے لیے بہت بڑی قربانی دی۔ بہنیں ہمیشہ بھائیوں پر قربان ہوتی آئی ہیں۔ سیٹھ کا انجام ایسا ہی ہونا تھا۔ عبداللہ کی زندگی کی طرف آنا اور صحت یاب ہونا اچھا لگا۔ دونوں انعامی سلسلے بہت عمدہ ہیں۔ مجموعی طور پر تاریخ معلومات تفریح اور سچ

بیانیوں سے سجا یہ شمارہ بہت زبردست تھا۔"

☆ سید امتیاز حسین بخاری نے چک نمبر 36 شمالی سرگودھا سے لکھا ہے۔ "ماہ جنوری 2019ء کا سرگزشت حسب روایت مقررہ وقت پر ملا۔ دیدہ زیب دلکش سرورق دیکھ کر دل فرطِ مسرت سے معمور و لبریز ہوگیا۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا۔ الیکٹرونک میڈیا پر اب بھی پرنٹ میڈیا غالب نظر آتا ہے جو لطف و انبساط پرنٹ میڈیا کے مطالعے میں ہے، وہ الیکٹرونک میڈیا پر اپ لوڈ مواد میں نہیں ہے۔ شاعر تاجدار حرم ڈاکٹر یاور عباس دبستان دہلی کی یکتائے نادر روزگار ادبی شخصیت ہیں، ڈاکٹر ناصر عباس لائق و فائق فرزندِ ارجمند ہیں۔ اپنے قبیلے کا نام روشن کردیا۔ 'معبرِ خیال' میں داخل ہوا تو منشی محمد عزیز مے کا تجزیہ غور و فکر عمیق نظر سے پڑھا تو جی مسرور ہوا۔ انہوں نے سال بھر کا کامیاب و جامع تجزیہ کر کے حیران کردیا مگر شہرۂ آفاق ٹی وی فلم کار افتخار مجاز لاہور کا نام لکھنا بھول گئے۔ ان کا ماہ ستمبر 2018ء کے سرگزشت میں خصوصی مضمون اشاعت پذیر ہوا تھا اور اقتباسات کو خارج کردیا گویا یہ سرگزشت کا حصہ نہیں تھے، سب احباب کے خطوط اور تبصرہ بھرپور ٹھوس تھے۔ "ناکردہ گناہ" الیاس سیتاپوری کی قابلِ تعریف تاریخی کہانی شیر شاہ سوریؒ پر طویل ترین عرصے کے بعد پڑھنے کو ملی۔ سوری قبیلہ افغان غوری قبائل میں بہت ہی کم افرادی قوت رکھنے والا ہے مگر ذہانت، [illegible] شجاعت امورِ حکمرانی میں سب سے آگے ہے۔ روہتاس جرنیلی سڑک ٹھوس ثبوت ہیں جو باغی گکھڑوں کی سرکوبی کے لیے بنایا گیا تھا۔ غوری [illegible] سوری خلجی قبائل نے ایک سو بیس سال تک ہندوستان پر حکمرانی کی۔ نیازی قبیلہ بادشاہ گر کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ موجودہ وزیراعظم پاکستان عمران خان کا تعلق نیازی شیر مانی قبیلہ سے ہے۔ غوری قبائل حضرت یوسف کے چھوٹے بھائی بن یامین کی نسل سے جلال الدین شاہ نسبت شاہ حسن غوری حاکم غور سے ایران اور ہندوستان کے حکمران رہے ہیں۔ امیر البحر طارق عزیز خان کی معلوماتی تحریر تھی، بڑے جرائم از منظر امام بھرپور رہی۔ فلم نگری میں اس بار محترم انور فرہاد صاحب "دوسری نور جہاں" بلبل پنجاب کوئل پاکستان نسیم بیگم کی یاد تازہ کر رہے تھے جسے فراموش کردیا تھا مگر میں اس سے اتفاق نہیں کرتا کہ وہ دوسری نور جہاں تھی، ملکہ ترنم نور جہاں کا ثانی پیدا ہوا اور نہ ہوگا کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر مرد و عورت کو الگ آواز اور چہرہ سے احسن طریقے سے پیدا کیا ہے، کوئی چہرہ کسی چہرے کا مثنیٰ نہیں ہوسکتا نہ ہی کوئی آواز کسی کی آواز سے [illegible] نسیم بیگم میری پسندیدہ گلوکارہ ہے میں ان کے گائے ہوئے گیت و نغمے گاتا رہتا ہوں۔ نام لے لے کے ہم تو جیے جائیں گے۔ لوگ یوں ہی [illegible] کیے جائیں گے۔ 1966ء میں جب میں جماعت ہشتم کا طالب علم تھا، برصغیر پاک و ہند کے گلوکاروں اور گلوکاراؤں کو تب سے سنتا آرہا ہوں۔ موسیقی و گلوکاری شاعری کا میں دلی شیدائی ہوں لیکن روح کی غذا نہیں سمجھتا، ذکر خدا ہی روح کی غذا ہے۔ سید احتشام کی دیوداس کی پارو کا تذکرہ قابل مطالعہ ہے۔ "شاخ زیتون" محترمہ سلمٰی اعوان کی بھرپور رومانی عاشقانہ تحریر ہے۔ سید جاذب کی "جنونی قاتل" واقعات کا احسن تذکرہ ہے۔ "ادب شناس" میں اشعار بہت ہی اچھے تھے لیکن نامعلوم شاعر لکھنے سے ادبی ذوق متاثر ہوتا ہے۔ شاعر کا نام لکھنا لازمی ہے۔ نفیسہ سعید کی کہانی وارث نے مجھے مغموم و غمگین کردیا۔ بیٹیاں اللہ کی رحمت و خوشی ہوتی ہیں۔ ان کو جائیداد سے محروم کرنا اور ان کی شادی قرآن سے کرنا کبیرہ گناہوں میں شامل ہے۔ کوثر اسلام کی "نشانِ عبرت" عبرت ناک کہانی تھی۔ نسرین اختر نینا کی "کٹی پتنگ" قابل مطالعہ کہانی ہے۔ ایک معمولی سی غلطی زندگی تباہ کردیتی ہے۔ "انتظار" سیدہ شاہدہ شاہ جہلم کی بھرپور ٹھوس کہانی ہے۔ "بھول" محمد فاروق انجم کی کہانی نے بہت متاثر کیا ہے۔ بروقت غلطی نے اشتباہ کردیا تھا۔ "بدلہ" ڈاکٹر ساجدہ کی سبق آموز کہانی ہے۔ محترمہ راحت وفا راجپوت کی رومان انگیز ہے۔ "حفاظتی اقدام" نے بہت ہی زیادہ لطف اندوز کیا ہے۔ "قربانی" محترمہ فضہ عادل ہری پور کی کہانی نے تو کمال کردیا ہے۔ قربانی دے کر کسی کی زندگی سنوارنا عبادت ہے۔ اللہ کے فضل سے ساری سچ بیانیاں پڑھ لی ہیں۔ اول دوم سوم کا فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں ہر کہانی ہر کہانی سے بڑھ کر ہے، عمدہ سے عمدہ تر ہے۔"

☆ قیصر خان کا تجزیہ بھکر سے۔ "پہلے پہل اداریہ پڑھنے کو ملا، بہترین کام کا حکم تھا جو ہم نے فوراً پورا کیا۔ اس کے بعد یک صفحہ شاہ جی کے بارے میں جاننے کو ملا۔ افسوسناک خبر کہ سفرنامہ کی آخری قسط ہے۔ خیر جو شروع ہو وہ ختم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ صدا اسلامت اور قلم سے رشتہ مضبوط رکھے، آمین۔ سب خطوط بھرپور تھے جس میں بے نام خط میرا تھا جلدی میں نام لکھنا بھول گیا تھا۔ نئے دوستوں میں محسن علی طاب، رازق بخش ذکی، طاہر کریم اور رابعہ امجد آپا کو خوش آمدید اور تمام دوستوں کے خطوط اچھے لگے۔ رسالے میں پہلے انکل کا سفرنامہ پڑھا۔ اس کے بعد زویا اعجاز صاحبہ کا مضمون "باغی" فلمکار پڑھا۔ جتنا وہ باغی تھا اس کے حالات بھی اس کے واسطے اسی طرح باغی تھے۔ مرتے دم تک مشکلات کا شکار رہا ہے۔ "رکشے والا" بہت اعلیٰ تحریر تھی۔ تمام آپ بیتیاں اچھی تھیں۔"

☆ فریدہ افتخار کا خلوص نامہ اسلام آباد سے۔ "نیا سال مبارک ہو دعا ہے کہ پروردگار نئے سال میں پاکستان اور اس کے باسیوں کے لیے امن، محبت بھائی چارے کی فضا عطا کرے، آمین۔ جنوری 2019ء کا شمارہ اپنے اندر بصیرت افروز معلومات، کہانیاں لیے ہوئے ہے۔ ناکردہ گناہ اور شیر خان سے شیر شاہ تک کا سفر ایک دلیر، دبنگ نوجوان کی کہانی ہے جس نے ناؤ نوش اور عیاشی میں پڑنے کی بجائے عوام الناس کے لیے رفاہی امور انجام دیے جن میں شاہراہیں، سرائے، مسافر خانے اور ڈاک کے نظام قابل ذکر ہیں۔ مغلوں کی طرح عیاشیوں میں نہیں پڑے جنہوں نے باغات محلات، عمارات تو بنوائیں مگر ان کی تن آسانیاں مغلیہ سلطنت کے زوال کا باعث بھی بنیں۔ "شاخ زیتون" کی خالق سلمٰی اعوان داد کی مستحق ہیں جن کا قلم فلسطین کے خوں چکاں حالات بیان کرتے ہوئے لگتا ہے کہ پورے کا پورا مسلمانوں کے بے گناہ

خون میں ڈوبا ہوا ہے اور ہم پڑھتے ہوئے اشکبار۔ "ناسور" لگتا ہے جیسے کسی فلم کے سائن بورڈ پر لکھا ہو مار دھاڑ سے بھرپور۔ کچھ زیادہ ہی لڑائی مار کٹائی کے مناظر قلم بند کیے جا رہے ہیں۔ انجام کیا ہوگا اللہ جانے یا مصنف۔ "انتظار" نے دل دکھا دیا۔ پروردگار ایسی اولاد سے بے اولاد ہی رکھے۔ "دوسری نور جہاں" معلومات کا خزانہ لگا۔ نسیم بیگم کی مشہور گائی غزل "سو بار چمن مہکا سو بار بہار آئی" میرا پسندیدہ رہا ہے۔ جب طالب علم تھے تو جغرافیہ میں واسکوڈی گاما کے بارے میں پڑھتے تھے مگر اب کی بار سیر حاصل مہم جوئی کی داستان پڑھ کر مزہ ہی آگیا۔ آپ بیتیاں نت نئی سچ بیانیاں لیے ہوئے تھا۔ سبق آموز تھیں۔ ادارے کی کاوشوں کے لیے مبارک باد پیش کرتی ہوں۔"

☆ اعجاز حسین لدھیانہ کی آمد کچا کھوہ سے۔ "حسبِ سابق اپنی پوری رعنائی اور چاشنی سمیت تھا۔ سب سے پہلے جناب معراج رسول کی خدمت میں حاضری دی اور آپ کی باتوں سے پتا چلا کہ انسانوں نے 3100 قبل مسیح میں لکھنا شروع کردیا تھا اور دوسری حوصلہ افزاء بلکہ خوشی کی بات یہ کہ کتب بینی کا شوق ماند نہیں پڑا بلکہ اس کا تناسب اب بھی کافی زیادہ ہے۔ شاعر تاجدار حرم یک حرفی ہونے کے باوجود اپنے آپ میں مکمل تھی۔ اب جو 'معبرِ خیال' میں پہنچے تو پہلے تو پوری 'معبرِ خیال' کی محفل کی تلاشی لی کہ شاید کسی کنارے یا نکڑ پر ہمارا خط بھی نظر آجائے مگر دل اداس ہوگیا کہ میرا نام تو تاخیر سے آنے والوں میں بھی نہ تھا۔ شاید محکمہ ڈاک کی نوازش سے اِدھر اُدھر ہوگیا ہے لیکن پھر سوچا کہ یار زندہ صحبت باقی۔ منشی محمد عزیز مے سرگزشت کے سالانہ تجزیے کے ساتھ موجود تھے۔ جتنی احتیاط اور محبت سے آپ یہ سالانہ رپورٹ مرتب کرتے ہیں یہ صرف آپ کا ہی خاصا ہے۔ خالد کبیر نے بے شک مختصر سی سالانہ رپورٹ جاری کی ہے لیکن آپ نے بھی کوزے میں دریا بند کردیا ہے۔ ناصر حسین رند بھی موجود ہیں نائس جناب۔ آہا ہمارے پیارے جناب اعجاز حسین ستار صاحب جناب ہمارا اسلام قبول کریں۔ عرض ہے آپ کا ہر خط اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔ 'معبرِ خیال' کی محفل میں باقی سب دوست ستاروں کی طرح ہیں تو آپ ہماری اس محفل کے سورج ہیں۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی عطا فرمائے، آمین۔ اویس شیخ! 'معبرِ خیال' میں ہر فرد ایک فیملی ممبر کی طرح ہے اس لیے شکریہ کی ضرورت نہیں ہے۔ 'معبرِ خیال' ہمارا گھر ہے۔ رحمت اللہ اعوان، ڈاکٹر بشریٰ عادل، محمد اشفاق مرشد آف امریکا سے، رازق بخش زکی اہیر آپ سب کے خطوط مختصر مگر اچھے تھے جب کہ رانا محمد شاہد، سید امتیاز حسین بخاری، آپ کے خطوط عمدہ اور فکر انگیز تھے۔ نزاہت افشاں جیسے آپ کا نام منفرد ہے اس طرح خط بھی انفرادیت لیے ہوئے ہے۔ عبدالحکیم ثمر اور جناب پروفیسر کیواے قابی آپ کے تبصرے بھی جاندار اور عمدہ تھے۔ "ناکردہ گناہ" واقعی تاریخی واقعات سے شغف رکھنے والوں کے لیے الیاس سیتاپوری صاحب کی عمدہ کاوش ہے لیکن مسلمانوں کا ایک المیہ بھی ہے کہ حکومت کے جنون میں ایک مسلم نے دوسرے مسلم کا گلا کاٹنے سے بھی دریغ نہیں کیا ہے۔ حمید نے جو گناہ کیا ہی نہیں تھا، وہ بھی اس کے نام لگا دیا گیا۔ امیر البحر عمدہ تحریر ہے۔ بے شک ان یورپی مہم جوؤں نے دنیا کو انجانے علاقوں سے روشناس کروایا لیکن یہ جہاں جہاں گئے انہوں نے وہاں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا بلکہ قتل و غارت سے بھی گریز نہیں کیا بلکہ جہاں بھی گئے زیادہ تر وہاں قبضہ جما کے بیٹھ گئے۔ بڑے جرائم بھی اچھی تحریر تھی۔ جرائم کہاں نہیں ہوتے بس کچھ جرائم اپنی انفرادیت کی وجہ سے تاریخ میں انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں جیسا کہ بڑے جرائم میں بتایا گیا ہے۔ "دوسری نور جہاں" انور فرہاد کی بہت شاندار تحریر تھی۔ واقعی میڈم نور جہاں کی موجودگی میں اپنا ایک نام اور مقام بنانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ "دیوداس کی پارو" بھی اچھوتی اور شاندار تحریر ہے۔ چترا سین کا صرف نام ہی سنا تھا مگر یہ تحریر پڑھ کے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی زبردست اداکارہ اور بردبار شخصیت کی مالک تھی۔ اس تحریر پر سید احتشام مبارک باد کے مستحق ہیں، ویلڈن۔ "ایجادات" [illegible] تحریر تھی۔ سلمٰی اعوان صاحبہ "شاخ زیتون" کے ساتھ موجود تھیں۔ بہت ہی عمدہ اور جاندار تحریر تھی۔ "جنونی قاتل" بھی ٹھیک ہی تھی۔ واقعی [illegible] اکثر اوقات بندہ چہرے سے دھوکا کھا جاتا ہے کہ اس چہرے کے پیچھے دوسرا چہرہ کتنا مکروہ اور گھناؤنا ہے۔ "وارث" بلاشبہ اس ماہ کی [illegible] تحریر ہے۔ زمین و جائیداد کی ہوس نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔ بیٹی چاہے گھر میں بیٹھی بیٹھی زندگی گزار دے مگر غیر برادری میں شادی نہیں کرنی کیونکہ زمین جائیداد کا بٹوارہ ہو جائے گا۔ "نشانِ عبرت" واقعی عبرت انگیز ہے۔ کیسے ایک باپ اپنی بیٹیوں کو دولت کے عوض بیچ سکتا ہے یعنی شادی کرا سکتا ہے مگر آخر کار اللہ کی پکڑ میں آگیا ہے۔ "کٹی پتنگ" بھی ہمارے ہی معاشرے میں بستے کرداروں کی کہانی ہے۔ اپنے نیک سیرت [illegible] صرف کم صورت ہونے کی وجہ سے دھتکارا مگر خود بھی ساری زندگی در بدر ہو کے گزاری۔ "انتظار" ہمارے معاشرے کے منہ پر طمانچے [illegible]۔ خاص کر ان نافرمان اولادوں کے لیے یہ تحریر عبرت انگیز ہے جو دولت کے لیے ماں باپ جیسی مقدس ہستیوں کو گھر سے نکال باہر کرتے [illegible] اور پھر ساری زندگی اس کیے کا تاوان دیتے رہتے ہیں۔ "بھول" بھی اچھی تحریر ہے۔ بعض اوقات ایک بھول ساری زندگی کے لیے پچھتاوا بن جاتا ہے۔ "پچھتاوا" شکی مزاج عورتوں کے لیے سبق رکھتی ہے۔ کیسے ایک شک ہنستی بستی زندگی کو قبرستان میں بدل دیتا ہے۔ "بدلہ" بھی اچھی تحریر ہے۔ حفاظتی اقدام بھی شاندار ہے۔ کوئی بھی لڑکی کمزور نہیں ہوتی۔ "قربانی" عمدہ تحریر ہے۔ کسی اپنے کے لیے یہ سب کچھ دنیا کی مصیبتیں برداشت کرنا واقعی بہت بڑی بات ہے۔ آخر میں ایک مشورہ ہے کہ دوستوں کے تعارف کا باتصویر سلسلہ شروع کریں اگر قابل قبول ہو تو شکریہ۔"

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کی آمد کورنگی کراچی سے۔ "کتب بینی کے تناسب کو بڑھانے میں پاکیزہ، جاسوسی، سرگزشت اور سسپنس کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ہم خود بھی ذرائع ابلاغ کے تمام ذرائع سے مستفید ہونے کے باوجود اخبارات ضرور پڑھتے ہیں۔ بساط بھر نئی اور پرانی کتب خرید کر اور صاحب ظرف دوستوں سے مانگ کر پڑھنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے اور اپنی کتابیں واپس نہ کرنے والے کم ظرفوں سے

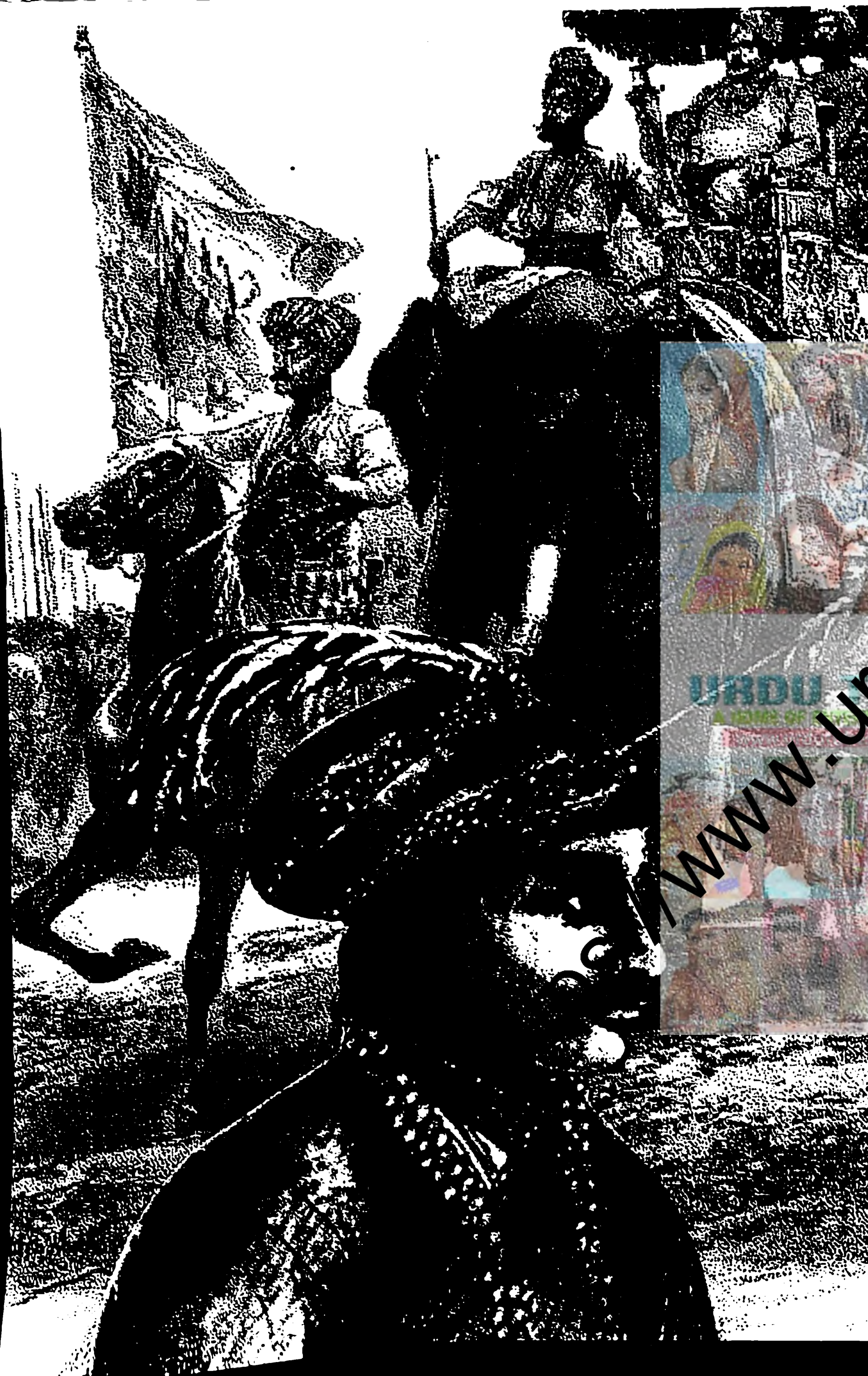
...لیے ظرف کا موازنہ بھی نہیں کرتے۔ سچ مچ کتب بینی کا ایک اپنا ہی مزہ ہے۔ ''تاجدار حرم'' میں یاور عباس کی یہ رباعی جنت بھی گوارہ ہے مگر میرے لیے لے کا جب تقدیر مدینہ لکھ دے، انسانی ذہن میں موجود آقائے نامدار کی حرمت کی صحیح عکاس ہے۔ نعتیہ شاعری میں عشق مدینہ کی ایسی مثال شاید ہی کوئی دوسری ہو۔ ''معبر خیال'' میں منشی محمد عزیز مے کی سالانہ تجزیاتی رپورٹ انتہائی عرق ریزی اور محنت سے تیار کی گئی تھی مگر ہمیں تجزیاتی کم اور شماریاتی زیادہ لگی۔ خالد کبیر کو بھی ساتھ دینے پر مبارک باد۔ دونوں حضرات کو سلام شوق۔ ناصر حسین رند خود ساز نمبر سے خوفناک کرم کی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ اعجاز حسین سٹھار، ندیم اقبال کی نسرین سے شادی نہ ہونے پر اپنی پیش گوئی پر نازاں تھے جب کہ رحمت اللہ اعوان کی نگارشات ضرور پڑھنا چاہیں گے۔ ڈاکٹر بشریٰ عادل ہمیں بھی سینما جا کر فلم دیکھنے کا مزہ یاد کروا رہی تھیں۔ اویس شیخ کا اپنے تایا کو خراج تحسین اچھا لگا۔ رانا محمد شاہد ہمیں دعاؤں میں یاد رکھنے کی یاددہانی کروا رہے تھے جس کی ضرورت نہ تھی۔ محمد اشفاق کی تجویز بہت اچھی ہے کہ خاص نمبر عام شمارے سے صفحات اور قیمت میں برتر ہونا چاہیے۔ ہم آپ کو دل کی بات منہ پر کردینے کی جسارت پر آپ کو مبارک باد دیتے ہیں۔ سید امتیاز حسین بخاری عبدالحکیم قمر کا ہیرا بننے پر خوش تھے جب کہ ہماری نظر میں ''معبر خیال'' کا ہر ممبر خوب صورت موتی ہے جن سے مل کر ہم خوب صورت مالا کا روپ دھارتے ہیں۔ نزاہت افشاں کو صاحب [illegible] گزشتہ سال دو مرتبہ مسند پر بیٹھنے کی مبارک باد دی، پورے سال ہم تین مرتبہ اس حرکت کے [illegible] ہوئے تھے۔ کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی۔ پڑھ کر اپنی ادبی کسمپرسی کا احساس جاگ اٹھا۔ اہر کیا ہر شد کو ہی آیا تو ان کا ''عذاب'' سچ مچ یاد آ گیا۔ عبدالحکیم قمر کی طرح ہم ندیم اقبال [illegible] انٹری کے خواہش مند ہیں (انشاء اللہ جلد وہ نئے سفرنامے کے ساتھ آ رہے ہیں) پروفیسر کیوا نے قاسمی سرورق دیکھ کر سرشار ہوئے [illegible] طرح خوب صورت شعر سے اظہار بھی کر دیتے۔ گزشتہ چند ماہ سے ''معبر خیال'' میں دوسری قسط وار کہانی کی بازگشت سنائی دے رہی ہے تو کیوں [illegible] نیک کام تاریخ کے پنوں سے لیا جائے، تاریخی کہانی دی جائے۔''

☆ عبدالجبار رومی انصاری کی بورے والا سے اختتامی لمحات میں آمد۔ ''کئی دن سے طبیعت ٹھیک نہیں [illegible] کی چھٹی تھی اس لیے سسپنس اور سرگزشت پڑھنے کے لیے خوب ٹائم ملا۔ آکسیجن کے لیے گھروں میں ایک یا کئی کئی گملے رکھے جا سکتے ہیں [illegible] آزادی طور پر ہر انسان کو شجرکاری اپنے اوپر لازم کرنی چاہیے تاکہ آلودگی کم سے کم ہو اور ہم صاف ستھرے سبز و شاداب ماحول میں سانس لے [illegible] انکل کا اداریہ بہت اچھا لگا۔ پلیز سبھی تبصرہ نگار اور قارئین ایک دفعہ شجرکاری کے لیے لازمی وقت نکالیں۔ ''معبر خیال'' میں ندیم اقبال کا اظہار [illegible] پڑھ کر تو دل باغ باغ ہو گیا۔ ''شمشال نے تو رنتو'' جیسے ایک اور سفرنامے کے لیے ڈھارس بندھ گئی کہ نسرین انہیں چھوڑ کر چلی گئی، بہت [illegible] ہوا نسرین کو واپسی کا عندیہ ضرور دینا چاہیے تھا بھلے ہی وہ بھائی کی موت پر وقتی طور پہ دکھی تھی چلیں کوئی بات نہیں۔ شاید کسی اگلے سفرنامے میں وہ اچانک لوٹ آئے۔ بہر حال انکل ندیم اقبال کے لیے ڈھیروں مبارک باد اور نیک تمنائیں۔ جب تک اگلی تحریر نہیں آ جاتی تب تک آپ ہمارے درمیان حاضری دیتے رہیے گا۔ رانا محمد شاہد سرگزشت کی طرح بھی حالات و واقعات اور تحریروں پر سیر حاصل تبصرے کے ساتھ بہت اچھے لگے۔ سدرہ بانو ناگوری نے بھی بہت عمدہ تجزیہ کیا اور سرگزشت اب جس حال میں ہے، بہت اچھا ہے۔ رازق بخش ذکی خوش آمدید۔ آفتاب احمد نصر اشرفی نے اچھا لکھا۔ اویس شیخ کا خلوص نامہ بھی زبردست تھا۔ رضا احمد اعوان کا اظہار خیال اچھا لگا۔ بے شک ننھے شہداء و اساتذہ ہمارا قیمتی اثاثہ تھے۔ ان کی یاد کی شمع ہمیشہ ہمارے دلوں میں روشن رہے گی۔ اعجاز حسین لدھیانہ و اعجاز حسین سٹھار کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ نزاہت افشاں کی بھرپور کوشش بھی بہت اچھی لگی۔''

☆ نزاہت افشاں کی اختتامی وقت میں گاؤں مہورہ ڈاکخانہ گگن تحصیل فتح جنگ سے آمد۔ ''سال نو کا پہلا شمارہ 25 دسمبر کو مل گیا۔ اداریے میں معراج صاحب نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ اگرچہ کہا جاتا ہے کہ یہ صدی کتاب سے محبت کی آخری صدی ہے مگر آج بھی کتاب کو اہمیت دینے والے لوگ موجود ہیں۔ میں خود آج بھی کپڑے لنڈا بازار سے لیتا ہوں مگر ہر ماہ پانچ چھ ہزار کی کتابیں خریدتا ہوں۔ ابھی پچھلے دنوں ہی میں نے اقبال کے خطوط پر مشتمل ایک کتاب انڈیا سے منگوائی ہے جو کہ چار جلدوں میں ہے اور 7200 میں ملی ہے۔ سرگزشت کا بھی ایک شمارہ مجھے 300 میں پڑتا ہے مگر اہل علم جنہیں کتاب سے سچا عشق ہو وہ سود و زیاں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ پک تکی ہر سرگزشت میں ڈاکٹر یاور عباس سے آشنائی ہوئی۔ شیر شاہ سوری مرد آہن تھا جس نے مغلوں کو محض اپنے اقدامات کے بل بوتے پر ہندوستان سے بے دخل کر دیا تھا اور بابر کے جانشین ہمایوں کو فرار ہونا پڑا۔ شیر شاہ سوری نے 1535 سے 1540 تک مختصر سے عرصے میں وہ اقدامات کیے کہ جن کی یادگاریں آج بھی قائم ہیں۔ ہمایوں کی خوش نصیبی کہ 1540 میں شیر شاہ سوری کی وفات کے بعد اس کے جانشین تخت نشینی کے لیے آپس میں الجھ گئے اور یوں شاہ ایران کی مدد سے ہمایوں دوبارہ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ روہتاس بھی شیر شاہ سوری کی منفرد یادگار ہے۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

غلام نبی، ملتان۔ ریحان احمد، قصور۔ راشد علی خان، سکھر۔ محمد ارشد، بھکر۔ نصیر احمد، رحیم یار خان۔ زاہد خان، گجرات۔ خالق داد، لیہ۔ عبدالحکیم قمر، کراچی۔



آخری حصار

زویا اعجاز

تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ ہم نے شکست کا مزہ تب چکھا جب ہمارے اپنوں نے کمین گاہ میں بیٹھ کر ہم پر تیر برسائے، ہماری پیٹھ میں ہمارے اپنوں نے ہی خنجر آزمائے۔ سات سمندر پار سے آنے والے تاجر کبھی کامیاب نہ ہوتے۔ ہمیں غلام نہ بناتے اگر ان کا ساتھ دینے والے ہمارے اپنے نہ ہوتے۔ نواب علی وردی خاں نے ازراہ ہمدردی انہیں اپنے علاقے میں پڑاؤ ڈالنے، تجارت کرنے کی اجازت دے کر جو غلطی کی تھی اس کا خمیازہ اس کے جانشین نے بھگتا اور آہستہ آہستہ پورا برصغیر ہاتھ سے نکل گیا۔ حاکم محکوم ہو گئے۔ دینے والے کاسۂ گدائی بن گئے مگر یہ سب ہوا کیسے، انگریزوں نے کس طرح سازشوں کا جال بُنا، کس طرح اپنے پیر پھیلائے؟

تاریخ کے صفحات سے کشید کردہ ایک سورما کا زندگی نامہ

اس کی تلوار میں برق کی سی کوندتھی۔

اعتماد، جرأت اور جوش وجذبہ نے دستے پر گرفت کو مزید مضبوطی عطا کر رکھی تھی۔ مقابل کے ہر دار پر گہری نظر رکھتا، وہ لمحاتی چوک کے لیے بھی تیار نہ تھا۔ آہنی ٹکراؤ کی کھنکناہٹ اعصاب میں مزید سنسنی پیدا کرتی اور نتیجتاً اس کے وار میں جوش فزوں تر ہو جاتا۔ یہ تلوار بازی ایک تجربہ کار اتالیق اور نوآموز شاگرد کے درمیان تھی۔

"بہت خوب مرزا احمد! آج تم سے اس مقابلے میں مجھے اصل معنوں میں لطف محسوس ہو رہا ہے۔" اتالیق نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ اس کا جسم پھرتیلا اور آنکھوں میں تجربہ واعتماد کی گہری چمک تھی۔ وہ پیشہ وارانہ کاملیت کا حامل تھا۔ اپنے اصول وضوابط پر کسی قسم کا سمجھوتا اسے گوارا نہ تھا لیکن آج جانے کس رو میں بہتے ہوئے اس نے کمسن مرزا احمد کی والہانہ تعریف کر دی۔

"شکریہ استاد محترم!" مرزا نے تابعداری سے کہا تاہم اس کا دھیان اب بھی اپنی شمشیر اور داؤ پیچ پر ہی تھا۔ اس نے کسی اسفنج کی طرح اپنے استاد کی سکھائی گئی مہارت اور تکنیکی امور قلب وروح میں جذب کر رکھے تھے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر یونہی جاری رہا۔ دو طرفہ توانائی میں رتی بھر بھی کمی دیکھنے میں نہیں آ رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا کہ ہتھیار تھک کر ٹوٹ جائیں گے لیکن انسانی عزم وحوصلہ کسی صورت شکست تسلیم نہیں کرے گا۔ یہ کشمکش اعصاب کی مضبوطی آزماتی اور پھر لمحہ کے ہزارویں حصہ میں ملنے والے موقع سے مرزا احمد نے بھرپور فائدہ اٹھا لیا۔ اتالیق کی تلوار یکدم اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ لاشعوری طور پر برق رفتاری سے شمشیر زنی کرتے مرزا کے ہتھیار سے اتالیق کے ہاتھ پر خراش آ گئی۔

اس کا دل بے اختیار دھک سے رہ گیا۔ اس نے بے اختیار تلوار پھینکی اور مضطرب ہو کر آگے بڑھا۔

"کیا ہوا استاد محترم! آپ ٹھیک تو ہیں؟ میں معذرت خواہ ہوں کہ....." وہ تشویش اور نرمی سے کہتا یکدم ساکت ہو گیا۔ مقابل نے چشم زدن میں ہی اپنی زمین بوس تلوار تھام کر اس کا سینہ نوک کی زد پر رکھ لیا۔ اتالیق کی آنکھوں سے جھلکتی سنجیدگی، ناپسندیدگی اور طیش کی غیر مرئی لہریں مرزا کو اپنا وجود بھسم کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے علم ہو گیا تھا استاد محترم کو یہ حرکت بہت ناگوار گزری ہے۔

"کیا آپ جانتے ہیں مرزا احمد کہ اس وقت ہم کہاں موجود ہیں؟" انہوں نے سختی سے استفسار کیا۔

"جی! آپ نے فرمایا تھا کہ اس مقابلے کو میدانِ جنگ

سمجھ کر مشق کروں۔" وہ سر جھکا کر گویا ہوا۔

"میدانِ جنگ میں ہتھیار چھوڑ کر مخالف کی خیریت دریافت کرنے کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟" انہوں نے ایک اور کڑا وار کیا۔

"میں معذرت خواہ ہوں محترم!" اس نے صفائی دینی چاہی لیکن یہ کوشش صورتِ حال کو مزید ابتر بنا گئی۔

"کیا آپ میدانِ جنگ میں ہتھیار گرا کر دشمن کو لگائے جانے والے زخموں پر معذرت طلب کریں گے؟ آپ کو ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک لمحہ کی بھی رعایت دے گا۔"

"آیندہ ایسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا محترم!" مرزا نے اپنی شرمندگی ضبط کرتے ہوئے بمشکل کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ ساری صورت حال اس کے امتحان ہی کے لیے رچائی گئی تھی۔

"ہمارا دشمن کون ہے مرزا احمد؟" استاد نے ایک بار پھر اسے کئی دفعہ کا ازبر کروایا گیا سبق پوچھا۔

"اس ملک میں ہم ہر جانب سے دشمنوں میں ہی گھرے ہوئے ہیں۔ ہماری حالت بتیس دانتوں میں زبان کی سی ہے۔"

"ہندوستان کو سب سے زیادہ خطرہ کس سے درپیش ہے؟"

"فرنگیوں سے......وہ عیار و خطرناک ترین دشمن ہے۔ اس کے وسائل لامحدود ہیں۔" وہ روانی سے کہتا چلا گیا۔

"میری آنکھیں مستقبل میں ہندوستان کے سیاسی افق پر ٹڈی دل سا ایک لشکر نمودار ہوتے دیکھ رہی ہیں مرزا احمد! اس وقت کے لیے تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ فرنگی لومڑی کی طرح عیار اور گرگٹ کی مانند رنگ بدلنے والے ہیں۔ بھیڑیوں کی خونخواری اور موقع پرستی نے انہیں بہت خطرناک بنا رکھا ہے۔ ایسی قوم کے کسی بھی فرد پر اعتبار کرنے کی غلطی بہت مہلک ثابت ہوگی۔ مستقبل میں موقع ملتے ہی ان پر قابو پاتے ہی فوری خاتمہ کو ترجیح دینا۔ اعتبار و رحم دلی کی کبھی کوئی غلطی نہ کرنا۔" وہ متانت و ٹھہراؤ سے کہنے لگے۔

مرزا خاموشی و سنجیدگی سے سب باتیں ذہن نشین کرتا رہا۔ ہندوستان کے سیاسی و عسکری معاملات کی نزاکتیں سمجھاتے ہوئے بھلا کس کو اندازہ تھا کہ مرزا احمد نے فرنگیوں کے علاوہ اپنے ہم مذہب و ہم وطن افراد سے ایسا دھوکا کھانا ہے جو تاریخ کے اوراق میں ایک نئی داستان رقم کردے گا۔

☆......☆

نواب علی وردی خاں اس وقت اپنے خصوصی کمرے میں موجود تھا۔ اس کے مقابل مرزا احمد کا اتالیق دست بستہ کھڑا تھا۔ نواب علی وردی کی تین بیٹیاں تھیں۔ اولادِ نرینہ سے محرومی اس کی زندگی کی سب سے بڑی خلش تھی۔ مرزا احمد کے والد 'زین الدین' بہار کے حکمران تھے۔ والدہ امینہ بیگم بہنوں میں سب سے چھوٹی اور مثبت دل و دماغ کی حامل خاتون تھیں۔ نواب علی اپنے اس نواسے کی پیدائش کو ذاتی حیثیت میں بہت خوش قسمتی گردانتے تھے کیونکہ اسی روز انہیں بہار کا صوبے دار مقرر کیا گیا تھا۔ انہوں نے مرزا احمد کی تعلیم و تربیت کا بیڑہ خود اٹھالیا چنانچہ اس کی پرورش نواب کے محلات میں ہی ہونے لگی۔ علی وردی خاں کی جہاندیدہ نظروں نے اپنے نواسے میں پوشیدہ بہادری، حمیت اور جنگجوانہ صلاحیتیں بھانپ لی تھیں [illegible] میں ہی اسے بہترین اساتذہ کے حوالے کردیا گیا تا[illegible] کی مکمل تراش خراش کے بعد ہند کی سیاست میں خیر [illegible] پیدا کی جاسکے۔ درون خانہ وہ مرزا احمد کو اپنا جانشین [illegible] فیصلہ کرچکے تھے لہٰذا اس کی تربیت کے ہر ایک پہلو کی بابت باخبر رہنے کا اشتیاق فطری تھا۔

"مرزا احمد ایک بہترین جنگجو ہے حضور!" اتالیق نے نواب کے استفسار پر بتایا۔

"بے شک اسے ہونا بھی چاہیے۔ یہی تو ہمارے اسلاف کی روایات ہیں۔" انہوں نے وقار سے کہا۔

"وہ نڈر ہے......صاف گو ہے......ذہانت سے مالا مال بھی ہے......لیکن تشویشناک حد تک بامروت اور رحمدل ہے۔" اتالیق نے کہا۔ "حکمران کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ ہر دشمن رحمدلی یا ترس کے قابل نہیں ہوتا۔ اسے سفاکی سے پیش آنا بھی سیکھنا چاہیے۔ ہمارا دشمن ہرگز مروت و معافی کے قابل نہیں۔" اس انکشاف پر نواب علی وردی خاں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا معاندانہ اور مشکوک کردار کسی سے بھی پوشیدہ نہ تھا۔

1600ء میں ملکہ الزبتھ اول سے ہندوستان کے لیے تجارت کا پروانہ پانے والی اس کمپنی نے 1613 میں 'سورت' کے مقام پر پہلی کوٹھی قائم کی تھی۔ اس زمانے میں ان کی تجارت زیادہ تر 'جاوا' اور 'سماٹرا' وغیرہ سے تھی جہاں سے مصالحہ جات برآمد کرکے یورپ میں بھاری داموں فروخت کیا جاتا تھا۔ 1623 میں جب ولندیزیوں نے انگریزوں کو 'جزائر شرق الہند' سے باہر نکال دیا تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی

تمام تر توجہ ہندوستان پر مرکوز کردی۔ 1662 میں بمبئی بھی اس کے حلقہ اثر میں آگیا اور کچھ عرصہ بعد شہر ایک اہم تجارتی بندرگاہ بن گیا۔ 1689 میں کمپنی نے علاقائی تسخیر کا آغاز کردیا جس کے باعث وہ مقامی حکمرانوں کی نظروں میں بری طرح کھٹکنے لگے تھے۔ نواب علی وردی خاں نے بھی انہیں اصل حیثیت یاد دلانے کے لیے سخت ترین تجارتی قوانین نافذ کردیے۔

"یہ امر بلاشبہ تشویشناک ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ جنگ و جدل کے عملی میدان میں قدم رکھتے ہی اس کے مزاج میں بھرپور تبدیلی پیدا ہوگی۔" انہوں نے پراگندہ خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹکتے ہوئے اتالیق سے کہا۔ یہ پیشگوئی بہت جلد سچ ثابت ہونے لگی۔ مرزا احمد نے میدانِ جنگ میں نانا کا ہم قدم بنتے ہی شجاعت و خوش بختی میں اپنا لوہا منوالیا۔ عملی جنگ کی ان کٹھنائیوں کی بھٹی میں تپ کر کندن بنتے مرزا احمد نے نانا کا دل جیت لیا۔ نواب علی وردی نے بالآخر اسے 1752 میں سرکاری طور پر اپنا جانشین مقرر کیا تو محل میں موجود دیگر افراد اپنی انا کا زخمی ناگ سنبھالنے میں ناکام ہوچکے تھے۔ جانشینی کا اعلان ہوتے ہی سب سے پہلے خونی رشتوں نے اپنے کردار کے بھیانک پہلوؤں کی نقاب کشائی کردی۔

☆......☆

بڑھاپے اور ضعف نے علی وردی خاں کو کئی ایک بیماریوں میں مبتلا کردیا تھا۔ [illegible] استقاء تو بہت ہی بری طرح اس کے وجود سے چمٹ بیٹھا تھا لیکن اس نازک صورتِ حال کے باوجود وہ ملکی حالات کے پیشِ نظر اپنے فرائض اور رعایا گیری سے چشم پوشی کے لیے تیار نہ تھا۔ ایک روز رعایا کے چند سربرآوردہ لوگ اس سے ملاقات کے لیے چلے آئے۔

"حضور! اس ملک میں ہمیں خدا کے بعد صرف آپ کا ہی سہارا ہے۔ آپ نے کبھی انصاف سے منہ نہیں موڑا۔"

"پروردگار ہمیں ہمیشہ یونہی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی سعادت عطا فرماتا رہے۔ حکمران چرواہا ہوتا ہے جس کے ذمہ اپنی رعیت کی حفاظت و امان ہے۔" نواب نے اپنے مخصوص باوقار انداز میں جواب دیا۔ اس کی کہنہ سال نظریں بھانپ گئی تھیں کہ چنیدہ افراد کا یہ گروہ کسی خاص مسئلہ کے لیے یہاں آیا ہے۔ "اپنے آلام کھل کر ہم سے بیان کیجیے۔"

"حاکم ڈھاکا کے متعلق بہت سے تحفظات لاحق رہنے لگے ہیں حضور!" ایک امیر نے نوازش محمد کی بابت کہا۔ نوازش، علی وردی کی صاحبزادی 'مہرالنسا' عرف 'گھسیٹی بیگم' کا شوہر تھا۔

"وہ عوام پر بہت سختی کرنے لگے ہیں سرکار! لگان کی مقرر کردہ رقم سے زیادہ وصول کرتے ہیں۔ اگر کوئی ان کی طلب کردہ رقم دینے سے انکار کرے تو اسے زندان میں پھینک دیا جاتا ہے۔ رعایا ان مظالم سے بہت تنگ ہے۔ اب تک جانے کتنے لوگ ان کے قہر کا نشانہ بن چکے ہیں۔" دوسرے فرد نے کہا۔ ان اشخاص کی آنکھوں میں دبے دبے شکوے اور بے یقینی سی کیفیت دیکھ کر نواب علی وردی کی پیشانی شکن آلود ہونے لگی۔ ان کی بصیرت پل بھر میں ہی بھانپ گئی تھی کہ اگر نوازش محمد سے باز پرس نہ کی گئی تو یہ عوامی تاثر پختہ ہوجائے گا کہ یہ سب کچھ نواب ہی کے ایما سے ہو رہا ہے۔ ان تمام افراد کو تشفی دے کر رخصت کرنے کے بعد انہوں نے داماد کو طلب کیا اور کڑے تیوروں سے دریافت کرتے ہوئے کہا:

"تمہارے متعلق ایسی بہت سی باتیں ہمارے علم میں آئی ہیں جو کسی بھی طور قابلِ قبول نہیں۔ تمہیں اپنی یہ روش ترک کرنی ہوگی بصورت دیگر ہمیں سزا کا تعین کرتے ہوئے کوئی قباحت نہیں ہوگی۔"

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے ابا حضور!" نوازش نے چاپلوسانہ انداز میں جواب دیا۔ "یہ ہوائی یقیناً کسی دشمن نے اڑائی ہے۔"

"تم یہ مت سمجھنا نوازش محمد! کہ ہمارا داماد ہونے کی بدولت تمہیں کھلے عام ظلم و ستم کی اجازت مل جائے گی۔ ہم اپنے اصولوں پر ہر رشتہ قربان کرسکتے ہیں۔ ہمارے اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والا ہر شخص ہمارا دشمن ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ علی وردی خاں اپنے دشمنوں کو پناہ دینے کا قائل ہی نہیں۔" وہ سختی سے گویا ہوئے۔

"میں نے ایسا کیا کردیا ہے ابا حضور؟" نوازش نے ڈھٹائی کا عظیم الشان مظاہرہ کیا۔

"تم نے ہر وہ غلطی کی ہے جو کسی اچھے اور منصف مزاج حکمران کو زیب نہیں دیتی۔ یہ وقت ملک و ملت کے لیے بہت نازک ہے۔ ہماری ملت کو باحمیت اور صادق و امین رہنماؤں کی ضرورت ہے۔ ڈھاکا کی عملداری سے ملنے والا مال سرکاری خزانے میں جمع کروایا جانا چاہیے تھا۔"

"لیکن ابا حضور! آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی......" گھسیٹی بیگم نے لب کشائی کی۔

"حکومتی معاملات میں عورتوں کی دخل اندازی ہمیں کسی طور بھی قبول نہیں، گوارا نہیں۔ تم خاموش ہی رہو تو بہتر ہے۔" نواب نے سختی سے بیٹی کو پھٹکارا۔ والد کے وہاں سے جاتے ہی وہ نوازش کے لتے لینے لگی۔

"ناناجان کا ہر ایک شکوہ بجا تھا خالہ جان! خالو محترم نے حکومتی خزانے کو واقعی بہت نقصان پہنچایا ہے۔" وہاں موجود مرزا محمد نے صاف گوئی سے کہا۔ (اس وقت تک وہ سراج الدولہ کے خطاب سے پکارا جانے لگا تھا)

"تم اپنے خالو کو غدار کہہ رہے ہو سراج!" گھسیٹی بیگم غصہ سے بھڑکی۔

"ہرگز نہیں! میں صرف آپ کو آئینہ میں حقائق کا عکس دکھا رہا ہوں۔ سرکاری خزانے تک مال پہنچا دینے میں ہی دانشمندی ہے۔ غاصبین کی حکومتِ زیادہ عرصہ قائم نہیں رہا کرتی۔" بھانجے کے اس نڈر انداز نے گھسیٹی بیگم کو طیش میں مبتلا کر دیا۔ وہ تن فن کرتی والد کے پاس شکایت لیے جا پہنچی۔ وہاں بھی دال نہ گلی تو انگاروں پر لوٹ کر رہ گئی۔ جاہ پسندی لالچ نے اسے کچھ اس طرح اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا کہ زخمی انا سے اٹھتی ٹیسیں سہلاتی بہن کے پاس چلی آئی۔

"مجھے آپ سے سخت گلہ ہے۔ آپ نے اپنی اولاد کی یہ کیسی تربیت کی ہے کہ اسے رشتوں کا لحاظ ہی نہیں رہا۔" وہ رکھائی اور کبیدگی سے بولی۔

"ایسا کیا کر دیا آخر مرزا بیٹے نے؟" امینہ بیگم اپنی ہیراصفت اولاد کی برائی کیونکر سہہ پاتی۔

"یہی تو نکتہ ہے! وہ مرزا محمد کے محور و مدار سے باہر نکل آیا ہے۔ اب وہ سراج الدولہ ہے۔ بنگال کے صوبیدار کا منہ چڑھا نواسا۔ جسے مستقبل کی جانشینی کے تصور نے ہی فرعونیت میں مبتلا کر دیا ہے۔" وہ سخت انداز میں بھانجے کی 'کوتاہیاں' جتاتی ہوئی خودساختہ مظلومیت کے ڈھول پیٹنے لگی۔

"میں اسے سمجھاؤں گی، اسے اپنی خالہ سے اس قسم کی باتیں کرنے کی جسارت پر معافی مانگنی ہوگی۔" امینہ بیگم نے بہن کی دلجوئی کی لیکن گھسیٹی بیگم کو کسی بھی طور اطمینان مل کے ہی نہ دے رہا تھا۔ اس کے شاطر دماغ نے صورتِ حال کا اچھی طرح جائزہ لیا اور شطرنج کی اس بساط پر اپنے نئے مہرے کے پاس چل دی۔ شوکت جنگ کو سراج کے خلاف بھڑکانا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

"مجھے تمہارے ساتھ ہونے والی اس ناانصافی کا سخت افسوس ہے شوکت!"

"آپ شاید واحد فرد ہیں جنہوں نے میرے متعلق ایسا سوچا۔" اس نے اداسی سے کہا۔

"تم میں کس بات کی کمی ہے آخر؟ تمہاری خوبیاں کسی بھی طرح سراج سے کم تو نہیں۔ ابا حضور نے بہت غلط اور یکطرفہ فیصلہ کیا ہے۔" گھسیٹی بیگم نے شوکت کی دکھتی رگ دبائی۔

"نانا حضور کا یہ فیصلہ مجھے بھی قبول نہیں۔" وہ بے خوفی سے بولا۔

"[illegible] بھی کیسے سکتا ہے بھلا؟ میں تو خود برملا کہتی ہوں کہ شوکت [illegible] ہزار درجے بہتر اور قابل ہے۔ اگر بنگال کی صوبیداری [illegible] نہ سونپی گئی تو ملکی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔"

"کاش میں کچھ کر [illegible] جان!" اس نے تاسف سے کہا۔

"کر کیوں نہیں سکتے [illegible] بھی [illegible] وقت آنے دو۔ سب کچھ ٹھیک ہوتا جائے گا۔ میں سب کچھ [illegible] کر لوں گی۔ تم 'بہار' کے حاکم ہو اور سراج ابھی [illegible] نامزد جانشین۔ اپنی حیثیت پر غور تو کرو۔ حاکم کے پاس [illegible] ہوا کرتی ہے۔" گھسیٹی بیگم نے بساط پر ایک اور مہرہ آگے بڑھایا۔

"درست فرمایا!" شوکت کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ نے جھلک دکھائی۔

"میرے پیارے بھانجے! بحیثیت حاکم فوج سے کون سا کام نہیں لیا جا سکتا۔" اس نے بھی معنی خیز مسکراہٹ اچھالی۔

"پورنیا کی فوج بے کار ہی ہے خالہ جان! اگر کہیں سے فاضل رقم کا بندوبست ہو جائے تو ہی اس کا سدھار ممکن ہو سکے گا۔" وہ معصومیت سے گویا ہوا۔

"تم حاکم بہار ہو برخوردار! تمہاری جنبش دست سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا؟" خلوص جتاتی گھسیٹی بیگم نے لمحاتی توقف کیا اور رازدارانہ انداز میں ارد گرد دیکھتے ہوئے پست آواز میں سلسلہ کلام کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "کیا پٹنہ میں فرنگی تجارتی کارخانے کے ناظم سے تمہارا کوئی تعارف ہے؟"

"جی ہاں! میری اس سے کئی بار ملاقات ہو چکی ہے۔"

"یہ تو خوش آئند بات ہے۔ میں بھی ذاتی طور پر فرنگی ناظم اعلیٰ 'راجر ڈریک' کے نام ایک خط بھیج دوں گی۔ اس طرح بات مزید پُراثر ہو جائے گی۔ اس کا نمائندہ تم سے ملنے چلا آئے گا۔"

"آپ کے اس خلوص نے تو مجھے خرید لیا ہے خالہ جان!" شوکت نے اس کی خود پسندی کو ہوا دی۔ وہ گھسیٹی بیگم کے کردار، سوچ اور اصل ارادوں سے اچھی طرح واقف تھا تاہم اس وقت اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہنا ہی بہترین حکمت عملی تھی۔ اسے بنگال، بہار اور اڑیسہ کا حاکم بننے کے لیے خالہ کے اثر و رسوخ کی بے حد ضرورت تھی۔ سراج الدولہ کا مقابلہ تن تنہا کیا ہی نہ جا سکتا تھا۔ وہ ایک مضبوط حریف تھا جسے بنگال کے صوبیدار نواب علی وردی خاں کے علاوہ عوامی حمایت و پسندیدگی بھی حاصل تھی۔

گھسیٹی بیگم اپنی حالیہ کارکردگی سے مکمل طور پر مطمئن تھی۔ وہ کسی بھی قیمت پر سراج الدولہ کو مسندِ اقتدار سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ اس امر کے لیے اسے ہندوستان کی جڑیں کھوکھلی کرتے موقع پرست انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کرنے میں بھی کوئی عار نہ تھا۔ ہندوستان، سونے کی چڑیا سمجھا جانے والا مغلیہ تہذیب و تمدن کے عروج کا گہوارہ جہاں ہر سمت سے غیر ملکی اقوام نے اس چڑیا کو دبوچنے کے لیے خوفناک پنجے پھیلا رکھے تھے۔ تجارت کے بہانے فرانسیسی، ولندیزی اور فرنگی ملک کے اندرونی خلفشار سے بھرپور فائدہ اٹھانے میں مگن تھے۔ مرکز کمزور ہو چکا تھا۔ ہندو برادری توازل سے ہی مسلمانوں کو بیرونی حملہ آور سمجھ کر انہیں بحالتِ مجبوری برداشت کیا کرتی۔ اس صورتِ حال میں ان کے ہاتھ مضبوط کر[illegible] مسلمانوں کے خلاف نفرت و عناد جتا کر ان کی حکومت کے [illegible] والے انگریز ہندوؤں کی آنکھوں کا تارا کیونکر نہ [illegible] کی مکاری بھی لاثانی تھی۔ انہیں ضلع در ضلع مال برآمد [illegible] اجازت تھی۔ وہ حکومت کو کوئی محصول ادا نہ کرنے کے [illegible] البتہ ملکی تاجروں پر یہ پابندی عائد تھی کہ محصول بہر صورت ادا کیا جائے۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ملکی تاجران نے [illegible] تلاش کر لی تھی۔ انگریزوں کو رشوت کی ادائیگی کے [illegible] خصوصی پروانہ حاصل کر لیا جاتا جس سے ارباب اقتدار [illegible] کیا جاتا کہ یہ مال فرنگیوں کا ہے۔ اس طریقہ کار سے محصول کی رقم ادا نہ کرنی پڑتی۔ دونوں فریقین بھرپور فائدہ میں رہتے اور سیاسی و معاشی طور پر کھوکھلی ہوتی حکومت مزید کمزوری کا شکار ہونے لگتی۔ گھسیٹی بیگم کے ذہن میں کلبلانے والا کیڑا اسے انگریزوں سے اتحاد کی جانب پیش رفت کے لیے مکمل مائل کر چکا تھا لیکن پے در پے لگنے والے دو جھٹکوں نے اس ارادہ کو وقتی طور پر مؤخر کر دیا۔

☆......☆

نواب علی وردی خاں کے چہرے پر نقاہت کے بادل چھائے تھے۔

گذشتہ کچھ عرصے سے وہ بہت سے مسائل کا شکار رہے تھے۔ ایک بھرپور عسکری و جری زندگی گزارنے والے علی وردی کے لیے بستر نشین ہونا ہی کسی سانحہ سے کیا کم تھا کہ عزیز از جان بیٹی مہرالنساء کے شوہر نوازش محمد کی ناگہانی موت نے انہیں جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ایک عالم نواب علی وردی خاں کے مضبوط اعصاب، بہادری اور آہنی عزم کا قائل تھا لیکن بہترین خوبیوں کا حامل حکمران ہونے کے علاوہ وہ ایک باپ بھی تو تھے۔ اولاد کے لیے موم کی طرح پگھل جانے والا باپ جسے بیٹی کی بیوگی اور ممکنہ مستقبل کی سوچ کسی طور چین ہی نہ لینے دیتی۔ اس پہ مستزاد اپنی بیماری کے بعد بنگال میں فتنوں کی طرح سر اٹھاتے فرنگیوں اور ہندوؤں کے گٹھ جوڑ نے بھی ان کی پریشانی سوا کر رکھی تھی۔ گوناگوں خوبیوں کے مرقع سراج الدولہ پر اعتبار کے باوجود وہ اس کی سمت بڑھتے نادیدہ سائے پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ ان سانحات میں بہر حال اطمینان یہ بھی تھا کہ فوج کے سپہ سالار اور نواب کی سوتیلی بہن کے شوہر 'میر جعفر' نے قرآن پر حلف لے کر سراج الدولہ سے وفاداری نبھانے کا عہد کیا تھا۔ مہرالنساء نے بھی اپنے مضبوط اعصاب کی بدولت شوہر سے دائمی جدائی کا صدمہ جھیل لیا تھا۔ زیرک، جہاندیدہ اور دور اندیش نواب علی وردی خاں لاعلم تھا کہ میر جعفر کے حلف میں فتور تھا اور گھسیٹی بیگم کو شوہر کی وفات سے رتی بھر فرق نہ پڑا تھا۔ اس موقع پرست اور خودغرضی کی انتہائیں چھوتی خاتون کی زندگی میں 'نذیر علی' نامی ایک روزن نوازش محمد کی حیات میں ہی موجود تھا اور آج کل یہ گٹھ جوڑ ایک نیا رخ اختیار کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

☆......☆

نذیر علی سے گھسیٹی بیگم کا تعلق بہت پرانا تھا۔

شوہر کی زندگی میں گو ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ محدود تھا تاہم چوری چھپے میل ملاپ جاری رہتا تھا۔ نوازش محمد جب بھی سرکاری یا ذاتی کام کے لیے شہر سے باہر جاتا تو وہ اپنے معتبر ملازم کے ذریعہ نذیر کو طلب کر لیتی۔ شب کے اندھیرے میں بھیس بدل کر محل میں داخل ہونے والا نذیر صبح ہونے سے پہلے رخصت ہو جاتا۔ طلب و ضرورت کا یہ رشتہ کسی خلوص پر مبنی ہرگز نہ تھا۔ نذیر بھی معاشی تنگدستی کے دنوں میں

حاکم ڈھاکا کی چہیتی بیگم مہر النساء کو الفاظ کی چاشنی میں گندھا کوئی نہ کوئی ایسا پیغام ضرور بھیجتا کہ وہ تمام تر احتیاطی تدابیر بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے محبوب سے ملنے کے لیے مضطرب ہوجاتی۔ مختلف حیلے بہانوں سے کام نہ چلتا تو وہ آرام وتفریح کا عذر تراشے 'موتی جھیل' کے محل میں منتقل ہوجاتی۔ مذکورہ محل خوبصورتی و دلفریبی میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس کے چاروں جانب جھیل پھیلی ہوئی تھی۔ گویا محل کی حیثیت کسی ایسے جزیرے کی سی تھی جس کی چہار سمت سمندر ہو اور مکینوں کے لیے آسائشات بھی وافر مقدار میں موجود ہوں۔ شب گئے نذیر کی کشتی جھیل کے کنارے پہنچتی اور وہ چور دروازوں سے ہوتا ہوا محل میں داخل ہوجاتا جہاں مضطرب گھسیٹی بیگم اس کے والہانہ استقبال کے لیے تیار ہوتی۔ نوازش کی وفات کے بعد سابقہ خوف کی بدولت خودساختہ عائد پابندیوں میں نرمی تو پیدا ہوئی تھی تاہم اب بھی وہ اغیار کے سامنے گھسیٹی بیگم سے بے تکلف ہونے سے گریز ہی کرتا۔ اسے جھک کر سلام کرتے ہوئے رعایا ہی کی مانند نذرانہ پیش کرتا۔ اسے بھی علم تھا کہ گھسیٹی کی باغیانہ طبیعت والد اور بھانجے کو خاطر میں نہیں لاتی۔ مرحوم شوہر نے ان گنت دولت جمع کر رکھی تھی۔ محصول کی رقوم بڑھانے کے علاوہ نوازش نے خود بھی تجارت کی تھی۔ مہنگائی میں ہوشربا اضافہ سے عوام کو جی بھر کر لوٹا تھا۔ اس کی جمع شدہ رقم پر گھسیٹی بیگم نے اپنا قبضہ برقرار رکھتے ہوئے شاہی خزانچی کو کورا جواب دے دیا۔ اس سونے کی چڑیا کو نذیر علی اپنے شکنجے سے آزاد کرنے کے لیے کیونکر تیار ہوتا؟ اس رات بھی وہ مخصوص رستے سے ہوتا محل میں چلا آیا تھا۔

''تم بن بلائے کیوں چلے آئے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ سراج الدولہ ہمارے متعلق کس قدر مشکوک ہوچکا ہے۔ تمہیں میری عزت کا ذرا بھی پاس نہیں رہا کیا؟ میں بنگال کے صوبیدار کی بیٹی ہوں۔ تمہاری یہ بے احتیاطی کس قدر قاتل ثابت ہوسکتی ہے کبھی سوچا تم نے؟'' گھسیٹی بیگم نے سراج الدولہ پر آنے والا غصہ نذیر پر اتار دیا۔

''تم نے یہ کیونکر سوچ لیا کہ نذیر کو تمہاری عزت کا خیال نہیں؟ میں اس قدر خطرات مول لے کر صرف تمہارے لیے ہی تو آیا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے کہتا پلنگ پر بیٹھا اور لگاوٹ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ گھسیٹی بیگم کے تیور محض اپنی اہمیت جتانے کے لیے ہیں۔ نذیر اس کے مزاج کی ہر رمز سے آشنا تھا۔ شہزادی مہر النساء پر جان چھڑکنے کا دعویدار یہ شخص درحقیقت اسے میر جعفر کی منظور نظر طوائف 'منی بیگم' سے زیادہ درجہ نہیں دیتا تھا۔

''کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟'' حسب توقع وہ موم ہوگئی۔

''مرشدآباد سے اطلاع آئی ہے کہ نواب علی وردی خاں پر پرانے مرض نے بھرپور شدت سے حملہ کیا ہے اور اس بار ان کے جانبر ہونے کے مواقع بہت کم ہیں۔'' وہ افسردگی جتاتے ہوئے بولا۔ گھسیٹی کے دل پر گھونسا سا لگا۔ باپ سے دائمی جدائی کی خبر سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''اگر خدانخواستہ نواب صاحب رحلت فرما گئے تو صوبیداری کی مسند سراج الدولہ کو حاصل ہوجائے گی۔ اس کے بعد وہ تمہارے لیے کس قدر مہلک ثابت ہوسکتا ہے یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔'' نذیر نے اپنی آمد کا اصل مقصد بیان کیا۔

''اگر تم کسی قابل ہوتے تو آج مجھے یہ دن دیکھنے نصیب ہی نہ ہوتے۔'' وہ جھنجلائی۔ سراج الدولہ کے تصور اور ممکنہ جانشینی کے خیال سے ہی اسے وحشت ہونے لگتی تھی۔

''میں کیا کرسکتا ہوں شہزادی صاحبہ؟'' وہ بے بسی سے بولا۔

''میری فوج کی رہنمائی تو کر ہی سکتے ہو۔'' اس نے کوفت سے جواب دیا۔

''بالکل کرسکتا ہوں! لیکن تمہاری مٹھی بھر فوج ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ بنگال کے حکمران کے خلاف بغاوت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے مہرو!''

''ڈھاکا میں نوازش کی وفات کے بعد میں ہی سیاسی اقتدار کی مالک ہوں۔ آج وقت آگیا ہے کہ اس اقتدار کو کام میں لایا جائے۔ میں جانتی ہوں کہ شوکت کبھی سراج سے تعاون نہیں کرے گا۔ اگر ہم دونوں اس کے خلاف علم بغاوت بلند کردیں تو سراج کو میدان چھوڑ کر بھاگتے ہی بنے گی۔ ان تبدیل شدہ حالات میں سپہ سالار اعظم میر جعفر خان بھی ہمارا ہی ساتھ دے گا۔'' اس نے اپنا منصوبہ تفصیل سے بیان کیا۔ نذیر نے اس کی کم فہمی پر طنزیہ قہقہہ لگایا اور مزید انکشافات کرتے ہوئے گویا ہوا:

''ایسے شخص پر صرف وہی اعتماد کرسکتا ہے جس کی عقل گھاس چرنے گئی ہو۔ وہ اپنے مفاد کے لیے سگے رشتوں کو فروخت کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ میر جعفر نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر سراج الدولہ کا ساتھ دینے کا حلف لیا ہے۔''

''اوہ خدایا! یہ تو بہت برا ہوا۔'' گھسیٹی بیگم کے اعصاب منتشر ہوئے۔ ''اب کیا کریں گے ہم؟''

''اب ہمارے سامنے صرف ایک ہی رستہ باقی ہے کہ فرنگیوں سے مدد طلب کی جائے۔ تم نہیں جانتیں کہ بنگال کے بارسوخ تاجر 'امی چند' (کچھ روایات میں اوما چند بھی لکھا ہے) 'جگت سیٹھ' اور 'خواجہ واحد' جیسے جغادری انہی کے طفیلیے ہیں۔ یہ فرنگی تقدیر بدل دینے پر قادر ہیں۔ انہیں بھی اس وقت ہمارے تعاون کی ضرورت ہے کیونکہ سراج الدولہ کی موجودگی میں وہ اپنا تجارتی وسیاسی اقتدار قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے صرف وہی شوکت اور تمہاری مدد کرسکتے ہیں۔'' نذیر کے منطقی تجزیے سے وہ متفق تھی۔ اسے علم تھا کہ بنگال میں بے ترتیبی سے پھیلے ان فرنگیوں کے لیے اپنی دولت ومکاری سے تاجروں اور امراء کو خریدنا چنداں مشکل نہ تھا۔ امراء کی مخالفت سے سراج الدولہ کی صفوں میں انتشار لازماً پھیلے گا جس کے نتیجہ میں سراج کے قدم خود بخود اکھڑ جائیں گے۔ شوکت جنگ سے ہونے والی سابقہ ملاقات میں بھی اس ضمن میں گفتگو ہوچکی تھی۔ حاکم بننے کے بعد وہ جذبہ احسان سے مغلوب ہوکر گھسیٹی بیگم کے اقتدار کو بھرپور سہارا دیتا رہے گا۔ کچھ دیر مزید گفتگو کے بعد وہ بنگال میں فرنگی ناظم امور 'راجر ڈریک' کو خط لکھنے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس موقع پر بھی اسے نواب علی وردی کے وفادار کارندوں اور مخبروں سے فطری خوف لاحق تھا۔ نذیر کے روانہ ہوتے ہی اس نے اپنے جانثار 'منیر بیگ' کو طلب کرلیا۔ وہ منیر پر آنکھیں بند کرکے اعتبار کرتی تھی۔ اس کے مرحوم والد کبیر بیگ پانچ سو سواروں کے سالار تھے۔ علی وردی کی رحلت کے بعد وفاداری کے عوض گھسیٹی نے بچپن ہی سے منیر کی پرورش کا ذمہ اس کی والدہ سے لے لیا تھا۔ منیر کو بھی کسی ... اور اقتدار کی تمناؤں کا مرض لاحق تھا۔ گھسیٹی بیگم کے الفاظ وہ بلا چوں چرا اس خط کے قالب میں ڈھالنے لگا۔

''منجانب مہر النسا بیگم بیوہ نوازش محمد حاکم ڈھاکا بنام جانب والئی مہتمم اور نگ فرنگی قاسم بازار وضاحت کرتی چلوں کہ یہ نامہ خفیہ طور پر آپ کی خدمت میں ارسال کیا جارہا ہے۔ مطلوب محض یہ اطلاعات فراہم کرنا ہے کہ نواب بنگال علی وردی خاں مہلک علالت میں مبتلا ہیں۔ نواب صاحب سراج الدولہ کو اپنا جانشین مقرر کرچکے ہیں۔ سراج ہندوستانی سرزمین پر فرنگی کمپنی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ وہ آپ کے تجارتی وسیاسی مفادات کو کبھی پنپنے نہیں دے گا۔ ایسے کوتاہ بین شخص کو مسند اقتدار سے دور رکھنے میں ہی دانشمندی ہے۔ پورنیا کے حاکم نواب شوکت جنگ بھی ہمارے ہم خیال ہیں۔ اگر فرنگی اکابرین شوکت کی تخت نشینی کے لیے اعانت کریں تو پورنیا اور ہماری افواج مرشدآباد پر حملہ کے بعد دارالحکومت پر قابض ہوسکتے ہیں۔ اس ضمن میں بخشی میر جعفر بھی ہماری مدد کرسکتے ہیں۔ ان کی فطرت ومزاج دیکھتے ہوئے ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کا اٹھایا گیا حلف وقت آنے پر اپنی حیثیت کھودے گا۔ نواب کی علالت فی الحال طشت ازبام نہیں کی جارہی اس لیے موقع سے فائدہ اٹھانا ہی دانشمندی ہے۔ تاخیر کی صورت میں بقاء کو درپیش خطرات سے آپ ہم سے زیادہ باخبر ہوں گے۔''

دستخط ثبت کروانے کے بعد منیر بیگ نہایت احتیاط سے قاسم بازار میں فرنگی کوٹھی کے مہتمم کی 'قدم بوسی' کے لیے روانہ ہوگیا۔

☆......☆

فورٹ ولیم کی فرنگی کونسل کے اراکین ایک کمرے کے وسط میں مستطیل میز کے گرد قرینے سے رکھی کرسیوں پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔

ان کے زیر بحث دو اہم ترین معاملات تھے جن پر باہمی مباحثہ سے کسی بھی حتمی نتیجہ تک پہنچنا بے حد ضروری تھا۔ ان کا تنفس بے ترتیب تھا۔ شاطر دماغ کسی بھی فیصلہ تک پہنچنے کی ہمت ہی نہ کرپارہے تھے۔ بلند ہوتے فشار خون سے کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں اور آنکھوں کی پتلیاں ہنوز گھسیٹی بیگم کے اس خط پر ساکت تھیں جو ان کے سامنے میز پر کھلا پڑا تھا۔

سوانحی خاکہ:

مکمل نام...... مرزا محمد سراج الدولہ
والد...... زین الدین احمد خان
والدہ...... امینہ بیگم
پیدائش...... 1733 مرشدآباد۔ صوبہ بنگال
وفات...... 12 جولائی... 1757 مرشدآباد
مدفین...... خوش باغ...... مرشدآباد
مذہب...... شیعہ اسلام۔
عہد حکومت...... اپریل 1756...... تا 2 جون ۱۷۵۷
شریک حیات...... لطف النسا بیگم
اولاد...... قدوسیہ بیگم

”عزت مآب کا ؤنسل کا کیا فیصلہ ہے؟“ گورنر راجر ڈریک نے سکوت توڑا۔

”اگر یہ سازش ناکام ہوئی تو کمپنی کو خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔“ ایک رکن نے اپنی رائے دی۔

”نتائج کی پروا کیوں کر رہے ہو؟“ ہالویل نامی اعلیٰ افسر نے تندی سے قطع کلامی کی۔ ”اس سازش میں شرکت ہماری بقاء کے لیے بے حد ضروری ہے۔“

”میں متفق نہیں۔“ ایک اور صدا ابھری۔ ”ہمارے لیے اس سازش کا عملی حصہ بن کر نواب سراج الدولہ کو اپنا دشمن بنانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ ہمارا کام اسی طرح بہت اچھا چل رہا ہے۔“

”آپ ایک اہم نکتہ فراموش کر رہے ہیں کہ ہم اس کھیل میں شریک ہوئے بناء اپنی بقاء و دوام حاصل نہیں کر سکتے۔“ ہالویل نے مزید تندی دکھائی۔ ”مجھے میر جعفر کی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد ہے۔ وہ اس عہد کا سب سے بڑا سیاست دان، ابن الوقت اور ہوا کا رخ دیکھ کر چلنے والا شخص ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وقت آنے پر وہ اپنی مقدس کتاب پر لیے گئے حلف سے بھی منحرف ہو جائے گا۔“

”تو پھر یہ بات طے ہوئی کہ گھسیٹی بیگم کو اس کے خط کا مثبت جواب دے دیا جائے۔“ راجر ڈریک نے ٹھہراؤ سے کہا۔

”بالکل! اسے یقین دلایا جائے کہ عزت مآب ایسٹ انڈیا کمپنی ان دونوں کی مدد کے لیے تیار ہے۔“ ہالویل اپنے مخصوص اکھڑ انداز میں بولا۔

”میرے لیے کیا حکم ہے؟“ فورٹ ولیم کے فوجی دستے کے کمانڈار کپتان جارج منچن نے پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیا۔ اسے کاؤنسل اجلاس کے دوران اعزازی ممبر کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا تھا۔ فوجی نقل و حرکت، قلعے کے دفاع یا حملے کے متعلق بات چیت میں اس کی رائے ضرور طلب کی جاتی تھی۔ وہ دفاع یا حملہ سے متعلق اپنی تدابیر کاؤنسل اراکین کے سامنے پیش کر دیا کرتا تاہم تجارتی یا سیاسی موضوعات پر اسے طویل خاموشی اختیار کر کے ہالویل جیسے بدماغ افسروں کی تقاریر سننی پڑتیں۔ اس وقت بھی ایسی صورت حال کا سامنا کر کے وہ ذہنی طور پر کوفت زدہ ہو چکا تھا۔

”آپ اپنی فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دیجیے۔ عین ممکن [illegible] سراج الدولہ کے خلاف چڑھائی کرنی [illegible] ڈریک نے جواب دیا۔

”دیسی سپاہیوں پر اعتبار کرنا دانشمندی نہیں محترم گورنر!“ کپتان منچن نے واضح کیا۔ ”یہ جنگ ان کے وطن اور حکمران کے خلاف ہوگی۔“

”وطن...... حکمران...... مذہب......“ ہالویل نے قطع کلامی کرتے ہوئے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ ”میں ان لوگوں کا مزاج آشنا ہوں کپتان! ان لوگوں کا مذہب اور وطن صرف دولت و اقتدار ہے۔ یہ ہماری طرح وطن پرست نہیں ہیں۔ دولت کے لیے اپنے پیدا کرنے والوں کے خلاف ہتھیار اٹھا سکتے ہیں۔ اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو فروخت کر سکتے [illegible] ان کی بے حیثیتی سے فائدہ اٹھانے کا گر آنا چاہیے [illegible] وحشت سے کہتا چلا گیا۔

”یہ گر آپ [illegible] سکھا دیں پھر!“ کپتان نے اپنی ناگواری ضبط کی۔ وہ ہالویل [illegible] اور منہ پھٹ مزاج سے بہت خار کھاتا تھا۔

”آپ کل ہی سے ان کی تنخواہوں میں اضافہ کا اعلان کر دیں۔ یہ خبر بنگال کے دیہات تک پہنچتے ہی [illegible] دیہاتیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ فوج میں شمولیت کے لیے [illegible] بل دوڑے چلے آئیں گے۔ اس کے علاوہ عسکری [illegible] قلعہ بندیوں کے استحکام کی جانب بھی فوری توجہ [illegible] چاہیے۔“ ہالویل کا تحکمانہ انداز ہمیشہ ہی کی طرح ناقابل برداشت تھا۔ وہ روز اول ہی سے نہایت بھونڈے اور مکروہ الفاظ میں ہندوستان اور اس کے باشندوں کی تحقیر کیا کرتا تھا۔ اس کا ذاتی نظریہ تھا کہ اہل ہندوستان ناقابل اعتبار، بزدل اور کم ظرف ہیں۔ یہ کالے اور بھورے لوگ محض سفید فام افراد کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ پیدائشی غلام ہیں جو تاریخ کی کسی غلطی کے باعث حکمران بنے ہیں۔ ان غیر مہذب اور درندہ صفت افراد کو حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اپنے نظریات کا سرعام پرچار کرنے والے ہالویل کی اپنی فطرت کسی درندے سے کم نہ تھی۔ وہ ہندوستانیوں کے لیے سراپا قہر تھا۔ اپنے دیسی ملازمین کو ذرا سی غلطی پر وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنا ڈالتا۔ اس نے اپنے ہم خیال ساتھیوں کے ہمراہ قلعہ میں ہی ایک جیل بنا رکھی تھی جسے 'بلیک ہول' کہا جاتا تھا۔ مذکورہ مختصر زمین دوز کمرا چھ گز لمبا اور [illegible] ہی چوڑا تھا۔ اس کے اکلوتے دروازے پر لوہے کی سلاخیں موجود تھیں۔ ملازمین کی کسی معمولی ترین خطا پر بھی انہیں اس کوٹھری میں قید کر دیا جاتا۔ یہاں ہوا اور روشنی کا گزر ناممکن تھا۔ تپتی ہوئی دوپہروں میں انسانی جسم ایندھن کی طرح جلنے لگتے تھے۔ پاخانے یا پیشاب کے لیے بھی کوئی جگہ موجود نہ تھی۔ تعفن سے قیدیوں کے دماغ مختل ہونے لگتے۔ ہوا اور روشنی کے لیے بلکتے ان مظلوموں کی فریاد کا کسی پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ دن میں ایک بار بلیک ہول کا آہنی دروازہ کھول کر سوکھی روٹیاں اندر پھینک کر دروازہ فوری طور پر بند کر دیا جاتا۔ اندھیری کوٹھری میں روٹی کے ٹکڑوں کی چھینا جھپٹ انسانیت کو شرمانے لگتی تھی۔ پانی کے لیے ہونے والی آہ و بکا سے پتھروں کا کلیجہ شق ہونے لگتا لیکن فرعون صفت انگریز ٹس سے مس نہ ہوتے۔ گرما میں پانی کے لیے چیختے قیدیوں کی آوازیں سرما کی یخ بستہ سردی میں حلق میں ہی منجمد ہونے لگتیں۔ اس دردناک عذاب سے گزرتے افراد گڑگڑا کر رب تعالیٰ سے موت طلب کرتے۔ ہالویل اپنے کئی ملازمین کو اس زنداں کے حوالے کر چکا تھا۔ جارج منچن اور راجر ڈریک اسے پرسکون رکھنے کی کوششوں میں ہلکان ہو چکے تھے لیکن اس کی فرعونیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ اپنے معتوب افراد کو قلعے کی فصیل کے ساتھ پھانسی لٹکانے پر زور دینے لگا۔ کمپنی افسران کے ساتھ گستاخی سے پیش آنے والے ہر ملازم کو قلعہ کی بڑی دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے جسم میں کیل گاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینے اور گولی مار دینے کے احکامات صادر کرتا۔ ہندو برادری کو مسلم حکومت کے خلاف بھڑکایا کرتا تھا۔ انہیں غیر ملکی اور حملہ آور قرار دیتے ہوئے انتشار برپا کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ دہلی کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرنگیوں کی [illegible] عملی دکن میں نہایت کامیاب رہی اور اب بنگال میں [illegible] رچایا جا رہا تھا۔ نواب علی وردی خاں کے سخت احکامات [illegible] والے ہمیشہ ہی نالاں رہتے تھے اس لیے اب ضروری [illegible] کہ نواب سراج الدولہ کو آغاز حکومت میں ہی جلنے کا کوئی موقع نہ دیا جائے۔

صبح کے ناشتے کے بعد شروع ہونے والا کاؤنسل کا اجلاس دوپہر کھانے کے وقت [illegible] جاری رہا۔ ہالویل اور راجر ڈریک نے اراکین پر واضح کر [illegible] تھا [illegible] تاریخ نے ان کے سامنے ہمیشہ دو قسم کے بادشاہ پیش کیے ہیں [illegible] بادشاہت کا دارومدار امراء کی وفا و تعاون پر ہوا کرتا [illegible] حکمرانوں سے عوام کبھی خوش نہیں ہوتے کیونکہ وہ لوٹ کھسوٹ کرنے والے امراء کو نفرت کی حد تک ناپسند کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے حکمران عوام کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں کیونکہ ان کی عوام دوست حکمت عملیاں امراء کو لوٹ کھسوٹ کی اجازت نہیں دیتیں۔ سراج الدولہ مؤخر الذکر حکمرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ فرنگی اطلاعات کے مطابق امراء اسے علی وردی خاں کے بعد بنگال، اڑیسہ اور بہار جیسے زرخیز و متمول علاقوں کا حاکم تسلیم کرنے میں چیں بہ چیں تھے۔ ایسے سخت گیر نواب کا اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے بھی مہلک ثابت ہوتا۔ ان تمام نکات پر بات چیت کے بعد ایک حتمی فیصلہ کیا گیا جس کے تحت گورنر راجر ڈریک نے گھسیٹی بیگم اور نواب شوکت جنگ کے نام مختلف خطوط لکھے۔ انہیں سراج الدولہ کے خلاف کمپنی کی اعانت کا یقین دلاتے ہوئے شوکت کو خصوصی طور پر ہدایات دی گئیں کہ علی وردی خاں کے عدم آباد سدھارتے ہی علم بغاوت بلند کر دے۔ اس کے بعد اپنا کوئی معتبر نمائندہ ہندوستان کے کٹھ پتلی بادشاہ کے پاس دہلی بھیج کر اپنے اعلان کی توثیق کروائے اور بنگال کی صوبیداری سنبھال لے۔ خط میں اس کی افواج کو مرشد آباد پر حملہ کرنے کے لیے بھی ذہنی تیاری کا عندیہ دیا گیا۔ زمینی حقائق اور امراء کی ناگواری ذکر خاص کرتے ہوئے راجر ڈریک نے ان مراعات کی ایک فہرست بھی منتھی کر دی جن کے عوض کمپنی سراج الدولہ کے خلاف شوکت جنگ کی مدد کرنے پر آمادہ ہوئی تھی۔ اسی متن کا ایک مکتوب گھسیٹی بیگم کو بھی لکھا گیا اور احتیاطی تدابیر مدنظر رکھتے ہوئے نہایت ہوشیاری سے دو ہندوستانی سواروں کو پورنیا اور ڈھاکا روانہ کر دیا گیا۔

☆......☆

سرزمین بنگال کے افق پر رنج، اضطراب اور سنسنی کی ملی جلی کیفیات سے سحاب چھائے تھے۔

10 اپریل 1756 کو فرشتۂ اجل اپنی ازلی خاموشی اور پرسکون انداز میں نواب علی وردی خاں کو ابدی منزل تک لے گیا تھا۔ اپریل کے دوسرے عشرے کا آغاز ہوتے ہی نئے ہنگامے بیدار ہو گئے۔ علی وردی خاں کی وصیت کے مطابق ستائیس سالہ مرزا محمد سراج الدولہ کے روپ میں مسند شاہی پر جلوہ افروز ہو چکا تھا۔ وہ ایک خوش شکل، وجیہہ اور کڑیل جوان تھا جس کے رگ و پے میں لہو کی جگہ اپنی قوم کا درد بہتا تھا۔ وہ ذاتی حیثیت میں ایک درویش صفت انسان تھا جسے حکومت و اقتدار سے رتی بھر لگاؤ نہ تھا۔ اس کی اولین خواہش یہی تھی کہ وہ ادنیٰ حیثیت میں ملک و قوم کی خدمت کرتا رہے لیکن تعیشات اور لالچ میں غرق یہ قوم اپنی طرف بڑھتے خطرات سے نابینا ہو چکی تھی۔ نواب کے وفات پاتے ہی دو وفادار امراء نے اسی ضمن میں سراج سے خصوصی طور پر ملاقات کی۔

”حضور! سرزمین بنگال کٹھن ترین دور سے

دوچار ہونے والی ہے۔اس وقت ہمیں آپ کی چٹانی سوچ' ارادوں اور اسی شجاعت کی ضرورت ہے جس کے باعث بے حمیت امراء ہی نہیں بلکہ فرنگی بھی لرزہ بہ اندام رہتے ہیں۔"سرفراز نامی اس شخص نے ادب سے کہا۔اس کی ریش سفید' قد لمبا اور کاٹھی بے حد مضبوط تھی۔

"ہماری تمام تر وفاداریاں آپ کے ساتھ ہیں اور تادم مرگ آپ ہی کا دم بھریں گی۔"امیر ہادی نامی دوسرے شخص نے کہا۔وہ قدرے کم عمر' فربہ اندام اور پستہ قد کا مالک تھا۔

"ہم اپنے جانبازوں کے جذبات کی دلی قدر کرتے ہیں ساتھیو! انشاء اللہ ہم سب مل کر اس کٹھن وقت کو اپنے حق میں ڈھال لیں گے۔"سراج الدولہ نے متانت سے جواب دیا۔

"ہمیں آپ کے پُرخلوص مشوروں پر بھی عمل کرنے میں کبھی کوئی عار محسوس نہ ہوگا۔"

"یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے جہاں پناہ! اس ناچیز کی رائے یہ ہے کہ آپ کو بنگال کے قرب وجوار میں مزید جانثاروں کی تلاش کرنی چاہیے۔ایسے چند افراد کو تو میں جانتا بھی ہوں جو آپ کے خلاف کوئی بھی بدگوئی سنتے ہی مقابل کی حیثیت وقوت بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے چیر پھاڑ دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔"سرفراز نے کہا۔

"بہت خوب! ہم ایسے گوہر نایاب افراد کی بھرپور قدر کرتے ہیں۔"سراج کا لہجہ پُرخلوص اور مشکور تھا۔"آپ انہیں ہماری ہراول فوج کے دستے میں شمولیت کا عندیہ دے سکتے ہیں۔"

"قبلہ عالم! میں ظہیر بیگ نامی ایک نوجوان کو فوری طور پر مرشد آباد بلوانے کی التجا کروں گا۔اس نے حالیہ طور پر ہی خواجہ پطرس' فخر التجار خواجہ واحد اور عالم خاں جیسے بااثر امراء کو ناکوں چنے چبوائے ہیں۔آپ کی حمایت کا خم ٹھونک کر اعلان کرنے پر عالم خاں اپنا منصب فراموش کرتے ہوئے اس سے دوبدو لڑائی پر اتر آیا اور ایک طویل خونریز لڑائی کے بعد موت سے ہم آغوش ہو گیا۔"سرفراز نے آگاہ کیا۔

"ظہیر بیگ......"سراج الدولہ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔"یہ کہیں کبیر بیگ کا بیٹا تو نہیں جو ڈھاکا کے فوجدار نوازش محمد کی فوج میں پانچ سو سواروں کا سالار تھا اور زمیندار شریف مرزا کو مرہٹوں سے بچاتے ہوئے جان کی بازی ہار دی تھی۔"

"جی قبلہ عالم! وہ زمینیں تو سنبھالتا ہی ہے لیکن سپاہیانہ جواہر میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔اپنے گاؤں کے سینکڑوں جوانوں کا اتالیق ہے۔اس کا بھائی منیر بیگ نواب گھسیٹی بیگم کے خصوصی کارندوں میں سے ہے لیکن ظہیر کی وفاداری میں کوئی دو رائے نہیں۔"امیر ہادی نے بتایا۔سراج الدولہ نے دونوں امراء کو ظہیر سے ملاقات اور اپنی مختصر سپاہ کے ساتھ شاہی فوج میں شمولیت کا کام سونپ دیا۔اسے اپنے اردگرد مکڑی کی طرح جال بنتے سازشی عناصر کی موجودگی کا بخوبی احساس تھا۔غیر ملکی اقوام کی یلغار نے ملک میں عجیب افراتفری پیدا کر رکھی تھی۔انتشار پسند عناصر کے لیے یہ حالات بہت پسندیدہ تھے۔انہی سازشوں نے مرکز کو ٹمٹماتی ہوئی شمع بنا دیا تھا۔داخلی بحران نے سلطنت کے [illegible] کر دیئے تھے۔اس صورت حال میں صوبہ بنگال ہی سالمیت اور وقار کا آخری حصار تھا۔نواب علی وردی خاں نے ہر [illegible] کی تھی کہ اس چراغ کو شدید آندھیوں میں بھی جلائے [illegible] کامیاب رہے۔ملک بھر میں چھائی تاریکیوں میں روشنی کی [illegible] کرن یہی صوبہ تھا۔فرنگیوں کی صورت میں بڑھتی تاریک [illegible] راہ میں بند نہ باندھا جاتا تو ہندوستان سے آزادی [illegible] اور تہذیب کی تمام شمعیں گل ہو جاتیں۔غلامی کے اتھاہ اندھیرے میں یہ قوم اپنی شناخت اور نام ونسب سے محروم ہو جاتی۔سراج الدولہ نے اپنے نانا کی تڑپ اور جدوجہد کا بہت قریبی مشاہدہ کیا تھا۔مرکزی حکومت کے کمزور ہو جانے کے بعد فرنگی کسی درندے کی طرح بنگال پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔اس کی زرخیز اور سنہری ریشے کی سرزمین ندی نالوں کا ایک جال تھی۔سونا اگلتی اس خوبصورت دھرتی میں نیل کی فصل کے علاوہ ایسی چیزیں پیدا ہوتی تھیں جو روئے ارض کے کسی اور کونے میں دستیاب نہ تھیں۔دکن کے ایک ہندو نے قبول اسلام کے بعد اس سلطنت کو استحکام بخشا تھا۔اورنگزیب نے مرشد قلی خاں نامی اس نومسلم کو علاقے کا حاکم مقرر کر دیا۔بعدازاں اسی نے مرشد آباد جیسا بے مثال شہر آباد کیا۔اس کے عہد حکومت میں بنگال ایک پُرامن اور خوشحال صنعتی مرکز تھا۔یہاں بننے والی ململ کا کہیں کوئی مقابلہ نہ تھا۔دولت کی اسی ریل پیل نے غیر ملکی تاجروں کو متوجہ کیا جس کے نتیجے میں دریائے ہگلی کے کنارے تجارتی کوٹھیاں قائم کر لی گئیں۔

نواب مرشد قلی خاں کے بعد شجاع الدولہ کے دورِ حکومت میں بھی اس علاقے میں خوشحالی کا دور دورہ تھا۔نادر شاہ کے دہلی پر حملہ' قتل عام اور ذاتی ترجیحات وحرص کی بادسموم نے مرکز کو کمزور کرتے ہوئے ہر سو انتشار برپا کر دیا۔اس کٹھن وقت میں خودداری اور حق اقتدار کی اصل روح پر صرف بنگال ہی پورا اتر تا تھا اور اب یہی سرزمین شدید ترین خطرات کی زد میں تھی۔

☆......☆

ہالویل' ولیم واٹس اور راجر ڈریک صدمہ وطیش سے بے حال تھے۔

سازشوں' طمع' رشوت اور مراعات کا جال بچھا دینے کے بعد وہ پُرامید ہو چکے تھے کہ نواب علی وردی خاں کے وفات پاتے ہی ان کے حواری فوری بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے سراج الدولہ کا تختہ الٹ دیں گے لیکن علی وردی کے سپرد خاک ہوتے ہی سراج نے اس قدر سکون واطمینان سے حکومت سنبھالی کہ کمپنی کے اراکین ششدر رہ گئے۔یہ ایک معجزاتی امر تھا۔سراج الدولہ کے مخالفین کی ایسی بزدلانہ خاموشی اور اپنا داؤ ضائع ہونے پر انگریز شدید غم وغصہ میں مبتلا تھے۔اس شخص کا مسند حکومت سنبھالنے کا واضح مطلب ان کے سیاسی وتجارتی اقتدار کی موت تھا۔

"بھئی! ماننا پڑے گا۔وعدہ شکنی اور بزدلی میں اس قوم کا کوئی جواب نہیں۔"راجر ڈریک نے جام کا گھونٹ بھرتے ہوئے تلخی سے کہا۔"کیا سوچا تھا اور کیا ہو کر رہ گیا؟"

"اتنی جلدی ہمت کیوں ہار رہے ہو؟"ہالویل اپنے مخصوص متکبرانہ انداز میں گویا ہوا۔"مجھے اب بھی یقین ہے کہ میر جعفر خاں [illegible] اور گھسیٹی بیگم سراج الدولہ کو قدم جمانے کا موقع نہیں [illegible]۔میرے ترکش میں ابھی بہت سے تیر باقی ہیں۔تمہیں صرف [illegible] کرنا ہوگا کہ فورٹ ولیم کے تمام فرنگیوں کو فوری ہدایات [illegible] قلعہ بندیاں مزید مستحکم کروانے کے بعد زیادہ سے زیادہ فوج جمع کرو۔"

"کیا ایسا کرنا مناسب ہوگا؟ [illegible] ہمارے خلاف فوری کارروائی کرنے پر نہ تل جائے۔[illegible] مقابلہ کرنے کے اہل نہیں ہیں۔"ڈریک [illegible] اختیار اپنا لاشعوری خوف بیان کر دیا۔

"ہمیں اس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"ہالویل خباثت سے مسکرایا۔"ذرا دھیرج سے کام لو۔نواب سراج الدولہ کے ہم وطن ہی اس ملک کو ہمارے حوالے کریں گے۔وہی ہندوستان کا یہ آخری حصار ہمارے قدموں میں لا کر پھینکیں گے۔"ہالویل کے دعوے پر راجر ڈریک خاموش ہو گیا۔وہ اس کی مکار فطرت سے آگاہی کے باوجود نفسیاتی دباؤ اور خوف میں مبتلا تھا۔ہالویل نے کچھ سوچ بچار کے بعد ایک ہرکارہ کے توسط میر جعفر کو خط لکھ بھیجا۔

"کمپنی اس بات کی وضاحت چاہتی ہے کہ ہم سے کیے گئے وعدے ایفاء کیوں نہ ہوئے؟ آپ کے ساتھیوں کے دعوؤں کی بلند وبالا عمارت ایک ہی جھٹکے سے زمین بوس کیونکر ہو گئی۔ہماری مہیا کردہ مراعات کے جواب میں یہ بزدلانہ خاموشی کسی بھی طور قابل برداشت نہیں۔"

سخت اور دوٹوک الفاظ میں لکھا گیا یہ خط اکسیر ثابت ہوا۔میر جعفر نے کسی بھی تاخیر کے بغیر جواب ارسال کیا:

"عزت مآب کمپنی اور ہالویل صاحب کو گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔سراج الدولہ اگر بناء مزاحمت حاکم بن گیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم نے اسے نواب تسلیم بھی کر لیا ہے۔وہ بنگال میں اپنے قدم کبھی نہیں جما پائے گا۔میں کسی مصلحت کے باعث خاموش ہوں۔مناسب وقت آنے پر میری افواج آندھی کی طرح اٹھیں گی اور خس وخاشاک کی مانند اس کی حکومت کا شیرازہ بکھیر دیں گی۔اس خطرناک امر کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی میری چند شرائط تسلیم کرنی پڑیں گی۔آپ نے اب تک نااہل اور بزدل افراد کی سرپرستی کی ہے۔انہیں اپنی ذات کے سوا کسی کی پرواہ نہیں ہے۔آپ کو مکمل طور پر میرے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔"

اس حوصلہ افزا خط کے بعد راجر ڈریک کے بشرے سے بھی اطمینان جھلکنے لگا۔

نواب سراج الدولہ کا تعلق شیعہ مسلک سے تھا۔اس نے اپنے دارالحکومت مرشد آباد میں ہندوستان کی سب سے بڑی امام بارگاہ' نظامت امام باڑہ ہزار دواری' تعمیر کروائی۔اس امام بارگاہ کے اندر ایک مسجد کی بنیاد بھی رکھی گئی جس کی بنیادوں میں مدینہ منورہ سے لائی گئی مٹی ڈالی گئی۔یہ مسجد آج بھی اپنی اصل حالت میں موجود' مدینہ مسجد' کے نام سے مقبول ہے۔

☆☆☆

سراج الدولہ کی جائے شہادت میر جعفر کی رہائش گاہ تھی جسے بعدازاں عوام نے 'نمک حرام ڈیوڑھی' کا نام دے دیا۔اس کے جسد خاکی کو ہاتھی پر رکھ کر مرشد آباد کی گلیوں میں گھمایا گیا تاکہ عوام کو اس کی موت میں کہیں کوئی ابہام نہ رہے۔

"تم خواہ مخواہ ہمت ہارے بیٹھے تھے راجا!" ہالویل نے طنز کیا۔ "جس سراج الدولہ سے تم خوفزدہ ہوئے بیٹھے تھے اس کی افواج کا سپہ سالار ہمارے قدموں میں لوٹ رہا ہے۔"

راجہ ڈریک خفت سے قہقہہ لگا کر رہ گیا۔

☆......☆

نواب سراج الدولہ اپنے دربار میں شاہی مسند پر براجمان گہری نظروں سے درباریوں کے چہرے ٹٹول رہا تھا۔

اس کی داہنی سمت سپہ سالار میر جعفر اور اس کا بیٹا 'میرن' بیٹھے تھے۔ بائیں جانب نواب کے محل کی حفاظت پر مامور فوجی دستوں کا سپہ سالار 'میر مدن' تھا۔ سراج الدولہ ذاتی طور پر اس شخص کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہ اپنے پیشہ میں یکتا، قابل اعتبار، ملک و قوم کے لیے مخلص اور انتشار پسندوں سے سخت متنفر تھا۔ مختلف درباریوں کے جذبات و احساسات بغور پڑھتے نواب کی نظریں بارہا میر جعفر کے چہرے سے ٹکرائیں جس کی آنکھوں میں بے چینی اور اضطراب کی لہریں ہلکورے لے رہی تھیں۔ وہ اندرونی طور پر کسی گہری کشمکش میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا۔ میرن کی حالت بھی کم و بیش ایسی ہی تھی۔ یہ حالت صرف انہی پر موقوف نہ تھی۔ اکثر درباری ایسی ہی گھبراہٹ کا شکار تھے۔ بے یقینی، خوف اور اپنے مستقبل کے متعلق اندیشوں نے انھیں ہراساں کر رکھا تھا۔ دربار پر غیر فطری سکوت طاری تھا۔ سہمے ہوئے افراد اسی شش و پنج میں تھے کہ سراج الدولہ ان کی موت کے احکامات جاری کردے گا لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ پُرسکون اعصاب کا حامل نواب سراج عجلت میں کوئی بھی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے اردگرد سازشیوں کے ہجوم سے واقفیت کے باوجود وہ تحمل سے کام کرنے کا خواہشمند تھا۔ میر جعفر اور میرن کی قسموں پر اعتبار کرتے ہوئے وہ تحمل اور تیل کی دھار دیکھنے کا قائل تھا۔

ان درباریوں کے علاوہ وہاں فرانسیسی اور ولندیزی نمائندے بھی موجود تھے جو حسب دستور حاکم کی وفات پر تعزیت اور نئے حکمران کی مسند نشینی پر مبارکباد دینے آئے تھے۔ صوبہ بنگال میں تین غیر ملکی ادارے تجارت کے مجاز تھے۔ فرانسیسی و ولندیزی نمائندوں کے ساتھ انگریز کا غیاب سراج الدولہ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کررہا تھا۔ دربار میں آنے والے لوگ ایک طرف بیٹھے سرکاری خزانچی کو حاکم کی خدمت میں پیش کیے گئے نذرانوں کی رقوم جمع کروا رہے تھے۔ ملکی امرا اور حکام کے بعد غیر ملکی تاجروں کی باری تھی۔

"یور ہائی نس! فرانس کی جانب سے نذرانہ قبول کیجیے۔" لملڈ نامی اس شخص نے دونوں ہاتھوں میں کچھ روپے تھام کر نواب کی خدمت میں پیش کیے۔ سراج الدولہ نے ان روپوں پر ہاتھ رکھا اور رقم خزانچی کے حوالے کر دی گئی۔ ولندیزی نمائندہ 'بسڈم' نے بھی یہی عمل دہرایا۔ نذرانہ گزاری کی اس رسم کا اختتام ہونے تک بھی دربار میں کوئی فرنگی نمائندہ نظر نہ آیا تھا۔

"میر جعفر خاں! یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی ہرکارہ کیوں نظر نہیں آ رہا؟" اس کے چبھتے ہوئے انداز پر سپہ سالار کے اوسان خطا ہونے لگے۔ دل میں پوشیدہ چور سے واہموں اور اندیشوں کے بھوت رقصاں دکھائی دینے لگے۔ دیگر درباری بھی متعجب [illegible] اس قدیم دستور کی خلاف ورزی کا مطلب حاکم وقت [illegible] قابل ہی تھا۔

"کیا انھیں یہ جسارت اس لیے [illegible] ہے کہ نواب گھسیٹی بیگم اور نواب شوکت جنگ نے [illegible] تعاون کا اعتماد فراہم کررکھا ہے۔" سراج الدولہ گرجا۔

"ان کی یہ حماقت ناقابل معافی ہے [illegible] عالم!" میر جعفر نے اپنی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "یہ مٹھی بھر فرنگی اپنی اوقات فراموش کرتے جارہے ہیں۔ فوج صرف حاکم اور منصب دار رکھتے ہیں۔ کسی متوازی قوت کی ایسی حرکات کا مطلب بغاوت اور شوریدہ سری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ انھیں اس ملک میں تجارت کی اجازت دینے کا براہ راست مطلب یہی ہے کہ یہ لوگ اب ہماری رعایا ہیں۔ اس صورت میں فوج اور قلعہ بندیوں کو کیونکر نظرانداز کیا جائے؟ یہ سازشی عناصر جنوبی ہند میں انتشار برپا کرکے وہاں کی حکومت تباہ و برباد کرچکے ہیں۔ یہ تجارت کی آڑ میں ریشہ دوانیوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ انھیں علم ہونا چاہیے کہ علی وردی خاں کے جانشین کی حیات میں وہ کبھی اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ بنگال ہماری عظمت و سطوت کا آخری حصار ہے۔ آپ سب کو میرے ساتھ متحد ہوکر فرنگیوں کی یلغار کا مقابلہ کرنا ہوگا بصورت دیگر یہ سیلاب سب کچھ ملیامیٹ کردے گا۔" اس نے بھرپور انداز میں اپنی حکمت عملی واضح کرتے ہوئے درباریوں کے چہروں کا جائزہ لیا جہاں ندامت کی آبشار بہتی نظر آرہی تھی لیکن مطلوبہ جوش و ولولہ اور جذبہ ناپید تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو دربار برخاست کردیا گیا۔ کھانے سے فراغت پاکر سراج

الدولہ اپنی اہلیہ لطف النساء بیگم اور والدہ امینہ بیگم کے پاس چلا گیا۔ وہ سخت کبیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"پروردگار ... تمہارا ضرور حامی ... و ناصر ہوگا۔ اپنے اعصاب پُرسکون رکھو اور ابا حضور کی ہدایات کو مشعل راہ بنائے آگے بڑھتے رہو۔" والدہ نے محبت سے کہا۔

"مجھ سے جو بن پڑا ضرور کروں گا لیکن اپنی درویش صفتی سے بھی عاجز ہوں۔ میں بزدل ہوں اور نہ کمزور فطرت۔ مجھے بہت سی مصلحتیں درپیش ہیں ورنہ دربار میں قتل و غارت کا ایک بازار گرم ہوجاتا۔" وہ شدید ذہنی دباؤ اور تھکاوٹ میں مبتلا تھا۔ دونوں خواتین اس کی ممکنہ پریشانیوں کا تصور کرکے آبدیدہ ہونے لگیں۔

"میں خالہ جان سے جواب طلبی ضرور کروں گا اماں جان!" اس نے ٹھہراؤ سے کہا۔ "مجھے اس بات کی قطعی پرواہ نہیں کہ وہ مجھے ناپسند کرتی ہیں لیکن سلطنت کے خلاف کی جانے والی سازش ناقابل معافی جرم ہے۔"

"ملکی سالمیت کے خلاف سازش کرنے والے غدار کو معافی ملنی بھی نہیں چاہیے خواہ وہ سگی ماں ہی کیوں نہ ہو۔" امینہ بیگم کا لہجہ غیر متزلزل تھا۔ سراج نے طمانیت سے سرہلایا۔ وہ سب سے پہلے نواب گھسیٹی بیگم سے اس دولت کا حساب لینا چاہتا تھا جو اس نے ناجائز ذرائع سے حاصل کی تھی۔ وہ ڈھاکا سے دولت راج ولبھ کو فوری طور پر طلب کرنے کے منصوبہ کی جزئیات طے کرتا قیلولہ کے بعد ایوان خاص میں چلا آیا۔ نماز [illegible] فراغت پاکر اس نے میر جعفر اور میرن کو بلا بھیجا۔ وہ باپ بیٹا [illegible] طور پر نواب کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے آمادہ ہوچکے تھے۔ سراج الدولہ کا ساتھ دے کر گھسیٹی بیگم اور شوکت جنگ سے نجات حاصل کرکے فرنگیوں کے ہاتھوں نواب کی سرکوبی کوئی مہنگا سودا نہ تھا۔ میر جعفر کے آتے ہی سراج نے منشی کو لکھوایا گیا خط بہ آواز بلند پڑھنے کا حکم دیا۔ منشی نے فوری اطاعت کرتے ہوئے متن سے [illegible] شروع کردیا۔

"بنام مہر النسا بیگم المعروف بہ گھسیٹی بیگم بیوہ نوازش محمد مرحوم ڈھاکا۔

ازطرف عزت مآب عالی جناب امیر سراج الدولہ حاکم بنگال۔

ہمیں علم ہوا ہے کہ آپ کی تحویل میں کچھ ایسی رقوم بھی ہیں جو ڈھاکا کے عوام سے ناجائز طور پر حاصل کی گئی ہیں۔ اس قسم کی وصولی ایک حاکم کے شایان شان نہیں۔ ان رقوم کو اب تک مرشد آباد کے مرکزی خزانے میں جمع ہوجانا چاہیے۔ سرکاری دولت کو اپنی تحویل میں رکھنا مروجہ ریاستی قوانین کے خلاف ہے۔ ہم بحیثیت حاکم اعلیٰ بنگال یہ حکم دیتے ہیں کہ خط ملتے ہی اس روپے کو سرکاری خزانے میں جمع کروا دیا جائے۔ ہمیں اُمید ہے احکامات کی فوری تعمیل کی جائے گی۔" منشی مکمل خط پڑھ کر خاموش ہوگیا۔

"حضور! جان کی امان پاؤں تو ایک عرض کروں کہ اس نفس مضمون میں ایک فقرہ یہ بھی شامل کرلیجیے کہ بصورت حکم عدولی میر جعفر علی خاں کی سرکردگی میں فوج باغی عناصر کی سرکوبی کے لیے روانہ کردی جائے گی۔" میر جعفر کی اس بات پر نواب کے اعصاب یکدم پُرسکون ہوگئے۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ میر جعفر حقیقتاً اپنی قسم پر قائم ہے۔ خط روانہ کرنے کے بعد نواب شوکت جنگ کا ذکر خیر چھڑ گیا۔ اس بارے میں بعض درباریوں کا خیال تھا کہ شوکت کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے ایک لشکر پٹنہ بھیج دیا جانا چاہیے جبکہ میر جعفر کی رائے یہ تھی کہ اس مہم سے قبل سراج الدولہ کو مرکز سے اپنی مسند نشینی کی توثیق کروالینی چاہیے۔ امیر ہادی اس تجویز پر جزبز ہونے لگا۔ وہ میر جعفر کی چال سمجھ رہا تھا۔ مرکزیت کے قائل نواب سراج الدولہ کو اس معاملہ میں الجھا کر وہ یقیناً دہلی دربار میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتا یا شوکت جنگ کو بھی یہی قدم اٹھانے کے لیے قائل کرکے سلطان کے سامنے دو خالہ زاد بھائیوں کی چپقلش واضح کردیتا تاکہ اس قضیہ کو ختم کرنے کے لیے سلطان کسی تیسرے فرد کو حاکم بنادے۔ امیر ہادی نے دبے دبے لفظوں میں نواب کو اس معاملہ میں الجھنے سے منع کیا لیکن بے سود۔ نواب نے ایک ہرکارہ دہلی روانہ کرکے ہی دم لیا۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کاؤنسل کے گورنر کو خط لکھ کر ان کی حدود کا اعادہ کروایا گیا کہ وہ تجارتی سرگرمیوں کی آڑ میں جنگی تیاریوں سے گریز کریں۔ قلعوں کے استحکام سے گریز اور کلکتہ کے شمال میں کھودی گئی خندق کو پاٹ دینا ہی ان کی بقاء کے لیے بہتر ہے بصورت دیگر انہیں سیاسی حریف سمجھتے ہوئے شاہی فوج کارروائی پر مجبور ہوجائے گی۔

اس نامہ کو ہالویل نے اپنے دلائل سے چٹکی میں اڑا دیا۔ اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوچکی تھی کہ اپنی دولت و عیاری کے بل بوتے پر وہ نواب کے سپاہیوں کو ہی اس کا گلا کاٹنے پر آمادہ کرلے گا۔ اس کے قائل کرنے پر نہایت بے نیازی سے جواب ارسال کیا گیا۔

"ہم آپ کے احکام کی تعمیل کرنے سے خود کو معذور

پاتے ہیں۔ مذکورہ خندق کا براہ راست ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اہلیان کلکتہ نے مرہٹوں کے حملوں سے بچاؤ کے لیے کھودی ہے۔ ہم اسے کیونکر پاٹ سکتے ہیں؟ قلعہ بندیوں کا استحکام ہمارا داخلی معاملہ ہے۔ یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگ کا نقارہ کسی بھی لمحہ بج سکتا ہے۔ چونکہ ہندوستان میں بھی فرانسیسی تجارتی کوٹھیاں موجود ہیں لہٰذا ہمیں خطرہ سے بچاؤ کا جبلی حق حاصل ہے۔“

راجر ڈریک کے اختلاف کے باوجود ہالویل نے نفس مضمون میں کوئی رد و بدل نہ کیا۔ نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ سراج الدولہ شدید طیش و اہانت میں مبتلا ہو گیا تاہم چند لمحوں بعد ہی یہ جذبات احساس بے بسی میں ڈھل گئے۔ اسے علم تھا کہ فرنگی اس کی کمزوریوں سے کھیل رہے ہیں۔ ملک و ملت سے بے پناہ خلوص کے باوجود وہ مکمل ہم خیال افراد سے محروم تھا۔ امراء جاہ طلب اور لالچی نہ ہوتے، سپہ سالار کمزور نہ ہوتے تو وہ ان کے تجارتی کارخانے بند کر کے پل بھر میں ہی ملک بدر کر دیتا۔ وہ کئی گھنٹے کمرے میں ٹہلتا اس خط کے مضمرات پر غور کرتا رہا۔ ان بے مروت تاجروں کی رچائی گئی سازشوں کا خاتمہ بے حد ضروری ہو چکا تھا لیکن فوج کمزور تھی اور خزانہ تقریباً خالی۔ مہنگائی کی نئی لہر نے عوام کو بھی ناآسودگی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ مشکلات کی ایک طویل قطار کے سامنے تن تنہا کھڑا سراج الدولہ گھسیٹی بیگم، شوکت جنگ، فرنگی اور سازشوں کے اس نئے گھن چکر میں مسائل کا کوئی بھی حل تلاش نہ کر پا رہا تھا۔ اسی اثناء میں میر جعفر بھی اس کے پاس چند مزید تشویشناک خبریں لیے چلا آیا۔ اسے ملنے والی اطلاعات کے مطابق گھسیٹی بیگم اور راج ولبھ نے دولت کی حوالگی سے صاف انکار کر دیا تھا۔ سراج الدولہ نے فوری فیصلہ کر لیا۔ فوج کے چند دستے ڈھاکا بھیج دینے کا حکم دیتے ہوئے اسے ظہیر بیگ کے سپاہیوں سے کمک لینے کا خیال آیا تو میر جعفر نے فوراً وار کرتے ہوئے کہا:

”گھسیٹی بیگم کے محافظ دستے کا سالار منیر بیگ ہے قبلہ عالم! ایک بھائی دوسرے کے خلاف ہتھیار کیسے استعمال کر سکے گا؟“

”ہمیں ظہیر بیگ پر مکمل اعتماد ہے۔ ہمارے احکامات کی فوری تعمیل کی جائے۔“ اس رکھائی پر میر جعفر دل مسوس کر رہ گیا۔ اسے ڈھاکا نہ جانے کا دکھ تو بہت تھا لیکن فرنگیوں کے اس نئے جال میں قدم رکھتے سراج الدولہ کا ممکنہ انجام دیکھ کر مسرت بے بہا تھی۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر ایک خصوصی ہرکارے کے توسط سے ہالویل کے نام مکتوب لکھ بھیجا۔

”میرے شفیق، کشادہ دل اور مہربان دوست کی جانب سے نواب کو ملنے والے نڈر اور دبنگ خط پر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ آپ کو بھی یہ جان کر مسرت ہوگی کہ نواب کی پریشانی اس کی خفگی پر بھاری نظر آتی ہے۔ اس کی یہ حالت جلد ہی اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردے گی۔ مجھے اُمید ہے کہ میری خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔ تازہ ترین اطلاع ہے کہ نواب نے گھسیٹی بیگم کے خلاف فوج کشی کا حکم جاری … “

… یہ پیغام روانہ کرنے کے بعد وہ اپنی منظورِ نظر طوائف … کے ہمراہ بنت انگور سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ سرور و کیف کا یہ عالم اگلی صبح راج ولبھ کی گرفتاری کی خبر سے دو آتشہ ہوا۔ وہ … کام کے سلسلہ میں چھپتا چھپاتا ڈھاکا سے مرشد آباد آیا … قسمت نے اسے … گرفتار کرتے ہی وصولیوں کا حساب طلب کیا گیا۔ تفتیشات میں غریق راج ولبھ ایک پائی کا بھی حساب نہ دے سکا اور نتیجتاً اسے مرشد آباد کے قید خانے کا دائمی مہمان بنا دیا گیا۔ میر جعفر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس کے مخالف … فنا ہو رہے تھے۔ اس نے گھسیٹی بیگم کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر کے اس کھیل میں مزید سنسنی پیدا کر دی۔ اپنے فائدہ کے لیے وہ کوئی بھی موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نواب سراج الدولہ سے رہائی اب زیادہ مشکل نظر نہ آتی تھی۔

☆......☆

نواب سراج کی جانب سے امیر ہادی اور سرفراز کے توسط اپنی فوج تیار رکھنے کا حکم ظہیر بیگ کے لیے بے پایاں عزت افزائی، مثبت تحریک اور مسرت تھی۔ دوسری جانب اس کی والدہ آمنہ بیگم کے دل و دماغ میں قیامت برپا تھی۔ گھسیٹی بیگم اور نواب سراج الدولہ کی ممکنہ جنگ سے اس کے دونوں بیٹے تلواریں سونت کر ایک دوسرے کے سامنے آتے۔ کسی ایک کی فتح دوسرے کی شکست پر منتج ہوتی۔ وہ دکھی دل سے خیر و عافیت اور جنگ ٹلنے کی دعائیں کرتی رہی لیکن یہ ٹکراؤ ناگزیر ہو چکا تھا۔ گھسیٹی بیگم کے محل میں بھی ہنگامی صورت حال نافذ تھی۔ راج ولبھ کی گرفتاری پر دہائیاں دیتا اس کا بیٹا کشن داس والد کی رہائی کی صورت پیدا کرنے پر مصر تھا۔ درون خانہ وہ اپنی تمام تر دولت سمیٹ ڈھاکا سے فرار کے لیے تیار ہو چکا تھا تاہم اہتمام حجت کے لیے محل میں یہ ناٹک بہرحال بہت ضروری تھا۔ منیر بیگ اور

گھسیٹی بیگم البتہ ممکنہ فتح کے لیے پُراُمید تھے۔ انہیں یقین تھا نواب کے مرشد آباد سے روانہ ہوتے ہی شوکت جنگ عقب سے افواج لیے چڑھائی کردے گا۔ اس کے بعد سراج الدولہ جیسے ایمانداری اور اجتماعی فوائد کو ترجیحات دینے کے امراض میں مبتلا ناپسندیدہ حکمران سے نجات بالکل مشکل ثابت نہ ہوتی۔

”تمہارے بھائی کی حماقتوں کا بھی جواب نہیں منیر!“ گھسیٹی بیگم نے یکدم موضوع گفتگو تبدیل کیا۔ ”ڈوبتی ہوئی کشتی کے ساتھ خود بھی غرق ہونے پر تلا ہے۔ تم اسے ایک بار ہماری فوج میں شامل ہونے کے لیے قائل ضرور کرنا۔ میں اس جنگ کے ختم ہوتے ہی تم جیسے دلیروں کے لیے دولت اور عہدوں کے خزانے کھول دوں گی۔“ گھسیٹی بیگم کی اس پُرخلوص پیشکش پر منیر کو بڑے بھائی کی عاقبت نااندیشی اور حماقت پر شدید غصہ آنے لگا۔

☆......☆

چھوٹے بھائی کے ان جذبات سے بے خبر ظہیر اس وقت ایک دوسرے گاؤں میں اپنی جماعت کے سرگرم کارکن کی تیمارداری کے لیے موجود تھا۔ یہاں اس کی ملاقات ’راجا رام‘ نامی کمپنی کے ملازم سے ہوگئی جو کچھ عرصہ قبل اسے نیل کی … فرنگیوں کو فروخت کرنے پر خاصی بھاری بھرکم رقم کی پیشکش کر چکا تھا۔ راجا رام آج بھی فصل کی خریداری کے لیے ہی اس گاؤں میں آیا تھا۔ ظہیر کو دیکھ کر وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ وہ … اسے احمق اور جذباتی نوجوان ہی سمجھتا تھا۔ باتوں باتوں میں وہ اسے اپنی وفاداری تبدیل کرنے پر آمادہ کرنے لگا۔

”اب تو آر یا پار صورت حال پیدا ہو چکی ہے راجا رام جی! کمپنی نے نواب صاحب کو للکار کر اپنی شامت کو خود ہی آواز دے لی ہے۔ نواب حضور رعایا کی بہتری کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہو جائیں گے۔“ ظہیر نے … سے کہا۔

”اجی چھوڑو مہاشے! آپ جیسوں کی انہیں کیا فکر؟ وہ تو صرف مسلمانوں کے حاکم ہیں۔ ہم ہندوؤں کے ساتھ تو شروع ہی سے ہر بادشاہ انیائے کرتا آیا ہے۔ آپ کو جیسے علم نہیں کہ نواب مرشد قلی خاں نے اپنا مزار بنوانے کے لیے چار کوس کے رقبے میں سب مندر مسمار کروا دیئے تھے۔“ راجا رام نے آزردگی سے کہا۔

”ایسا کیسے ممکن ہے؟ نواب مرشد تو مسلمان ہونے سے پہلے ہندو تھے۔ وہ بنگال کے نواب تھے۔ انہیں بھلا جگہ کی کیا کمی؟ یہ کہانی بالکل جھوٹ ہے۔“

”اپنا دھرم بدلنے والے یونہی پاکھنڈ مچایا کرتے ہیں۔ تم کیا جانو؟“ راجا رام نے سر جھٹکا۔

”میں سب کچھ جانتا ہوں۔ آپ بھی سمجھ لیجیے کہ کمپنی دو طرفہ منافقت کا کھیل رچائے بیٹھی ہے۔ ایک طرف وہ ہندو برادری کو بھڑکاتی ہے کہ ایرانی، افغانی، غیر ملکی تم سے خدمت گزاری کرواتے ہیں، تمہارے مندر مسمار کرواتے ہیں، اورنگزیب روزانہ چار سو ہندوؤں کو قتل کرنے کے بعد ناشتا... کرتا تھا لہٰذا ہندوؤں کے لیے بغاوت ناگزیر ہے۔ دوسری جانب مسلمانوں سے ہمدردی جتاتے ہیں کہ ملکی تجارت پر قابض ہندو غیر ملکی سمجھ کر تم سے نفرت کرتا ہے۔ انہیں اپنے جامہ سے باہر مت آنے دینا۔ کمپنی کی یہی چالیں تو ہندوستان میں انتشار برپا کیے ہوئے ہیں ورنہ پہلے بھی تو سب ہنسی خوشی اکٹھے رہتے تھے۔ رہی بات مرشد قلی خاں کی تو یہ جھوٹی کہانی بھی فرنگیوں ہی کی پھیلائی ہوئی ہے۔ یہ کینہ پرور قوم کیسے بھول سکتی ہے کہ مرشد نے 1706 میں قاسم بازار میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کے لیے فرنگیوں سے پچیس ہزار روپے طلب کیے تھے۔ یہی چوٹ کیا کم تھی جو 1717 میں مرشد نے دہلی کے ایک فرمان کے خلاف جاتے ہوئے کمپنی کو مطلوبہ مراعات سے محروم کر دیا۔ آپ کو تو آج سے دو سال قبل کا خط بھی یاد نہیں ہوگا جس میں کمپنی کے ’کرنل اسکاٹ‘ نے انگلستان میں ’نوبل‘ نامی شخص کو واضح طور پر لکھا تھا کہ بنگال کے ہندو مسلمانوں کے خلاف بغاوت کے خواہشمند ہیں لیکن ان کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر کمپنی نے ان کی امداد کی تو مسلمانوں کے خلاف بدامنی پیدا ہو جائے گی۔“ راجا رام ان انکشافات پر دنگ تھا لیکن ظہیر اس کی حالت سے بے نیاز اپنی ہی رو میں کہتا چلا گیا۔

”مجھے آج بھی نواب علی وردی خاں کے فرنگیوں کے متعلق کہے گئے وہ الفاظ یاد ہیں کہ انگریز شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح ہیں۔ ہم ان کے شہد سے فائدہ تو اٹھا سکتے ہیں لیکن یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ شہد کی مکھیاں زہریلے ڈنک کی مالک بھی ہوتی ہیں۔ آج یہ لوگ کلکتہ، ڈھاکا، بالاسور، قاسم بازار اور لکھی پور میں اپنے قدم جما کر ہماری تجارت کو نقصان پہنچاتے مسلم حکومت کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔“ ظہیر نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہر کوٹھی میں لگ بھگ ہزار گورے سپاہی، پانچ ہزار دیسی سپاہی، توپ خانہ، بندوقوں کی کیا توجیہہ پیش کریں گے؟"

"میں نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا۔" راجا رام نے شکست خوردگی سے جواب دیا۔

"تو کب سوچیں گے؟ ایسٹ انڈیا کمپنی کا محل آپ جیسے لوگوں کے دم سے استوار ہے۔ آپ اس منافق کمپنی سے تعاون بند کر دیں تو ان کا کاروبار دو دن میں چوپٹ ہو جائے گا۔"

"کیسی اناپ شناپ باتیں کر رہے ہو مہاشے؟ اگر کام چھوڑ دیا تو ہمارے گھر کا چولہا کیسے جلے گا؟" راجا رام بدک گیا۔

"جیسے پہلے چلتا تھا۔ ان لوگوں کی آمد سے پہلے بھی تو آپ لوگ زندہ تھے ناں! اب بھی وقت ہے راجا رام جی! خدارا سنبھل جائیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا کوئی خونی رشتہ ہتھیار سونت کر سامنے آ کھڑا ہو۔" وہ کرب سے کہتا منیر بیگ کو یاد کرنے لگا۔ راجا رام اس کے ذہنی توازن پر مشکوک ہوتا خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہی رویہ ہندوستان کا ایک عمومی مرض بن چکا تھا۔ فرنگیوں کی جانب سے دکھائے گئے خوابوں، تعیشات کی فراہمی اور لالچ نے ہر کسی کی سماعت و بصارت ایسے مفلوج کی تھی کہ اپنے سروں پہ منڈلاتے نوچ کھانے کے لیے تیار گدھ دکھائی دیتے تھے نہ ہی طوفان کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔

☆......☆

نواب سراج الدولہ کا پیغام ملتے ہی ظہیر نے ڈھاکا کے باہر ڈیرہ ڈال لیا۔ اب اسے مرشد آباد سے آنے والے دستوں کا انتظار تھا۔ جنگ کی بھرپور تیاریاں کرواتی گھسیٹی بیگم اس موقع پر ذہنی دباؤ کا سامنا کرنے سے عاجز ہو چکی تھی۔ طمع اور حرص نے اسے حاکم وقت کے سامنے لا کھڑا تو کر دیا تھا لیکن اپنی کمزوریوں سے آگاہی کے علاوہ نواب سراج کی شخصی خوبیاں، حق گوئی اور شجاعت نے فطری طور پر ہی اسے ہراس میں مبتلا کر رکھا تھا۔ نواب سراج کی بہادری سے ٹکرانے کا خیال ہی عوام کی نظر میں گھسیٹی بیگم کا مقام گرا دینے کے لیے کافی تھا۔ عوامی ناپسندیدگی نے لامحالہ طور پر افواج میں بھی سراسیمگی پیدا کر دی۔ سپاہی اس قدر بددل ہوئے کہ وہ جنگ کے بغیر ہی شکست تسلیم کر بیٹھے۔ گھسیٹی بیگم کی پریشانی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اسے اپنے خوابوں کا شیش محل بری طرح چکنا چور ہوتا نظر آ رہا تھا۔ نواب شوکت جنگ کی جانب سے خاموشی نے اسے بالکل ہی توڑ کر رکھ دیا۔ منیر بیگ کے لیے بھی صورت حال بہت مایوس کن تھی۔ اس کے ذہن میں تصور کا ایک محل آباد تھا کہ خونریز جنگ کی صورت میں اسے بھی خوب جوہر دکھانے کے مواقع ملیں گے جس کے نتیجے میں انعام و اکرام اور کسی پرگنہ کی صوبیداری کا حقدار ٹھہرا دیا جائے گا لیکن یہاں تو گنگا ہی الٹی بہہ نکلی تھی۔ اس مایوسی، کوفت [illegible] جھنجلاہٹ میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب نہتا ظہیر [illegible] میں چھوٹے بھائی سے ملنے چلا آیا۔ اس نے تلوار [illegible] باہر سائیس کے حوالے کر دی تھی۔

"[illegible] بھائی جان آپ؟ نواب سراج الدولہ [illegible] ڈوبتی نیا میں کیوں وقت برباد کر رہے ہیں؟" منیر نے کہا۔

"تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو میرے بھائی؟ نواب [illegible] ساتھ دینے میں ہی اس وقت سب کی بھلائی ہے۔" ظہیر نے نہایت دردمندی و خلوص [illegible] گلے [illegible] اسے سمجھاتا رہا کہ تاریخ ظالم و جابر [illegible] کر دیتی [illegible] بزدلوں کو بھی رعایت دینے کے لیے [illegible] بدکردار افراد بھی بعد از موت اچھے الفاظ میں یاد کیے جاتے ہیں لیکن غداری کبھی بھی معاف نہیں کی جا سکتی۔ ذاتی [illegible] اور مفاد کی خاطر حاکم وقت کے خلاف کھڑے ہو جانا غداری کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ منیر بیگ کی ابتر [illegible] حالت بڑے بھائی کی صاف [illegible] کوئی برداشت نہ کر پائی [illegible] تلوار تھامے بھائی پر حملہ آور ہو گیا۔ ظہیر کو اس موقع پر بھی والد سے کیا گیا عہد یاد تھا کہ منیر کی اس تلوار سے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ وہ اپنا دفاع کرتا ہوا نرمی سے اسے سمجھانے [illegible] کوشش میں اپنی ران زخمی ہونے سے بچا نہ پایا۔ خون کا [illegible] نکلتے دیکھ کر منیر بیگ صدمے سے ساکت ہو گیا اور [illegible] پھوٹ کر رونے لگا۔

"مجھے معاف کر دیں بھائی جان! یہ کیا کر دیا [illegible] نے؟" وہ ظہیر کے قدموں میں گر گیا۔

اسی اثناء میں خیمہ کے باہر ایک عجیب سا شور بلند ہوا۔ ایک سپاہی فق چہرہ لیے اندر داخل ہوا۔

"حضور! نواب کی فوج شہر میں داخل [illegible] ہے۔ ہمارے سپاہی ہتھیار ڈال کر فرار ہو گئے ہیں۔ آپ اپنی جان بچائیے۔" یہ سنتے ہی منیر خیمہ سے باہر لپکا اور نواب سے معافی دلوانے کی ظہیر کی صدائیں نظر انداز کرتا ہوا گھوڑا کھول کر سرپٹ فرار ہو گیا۔ ظہیر کا دل اداسی [illegible] بھر گیا۔ وہ بوجھل دل لیے اپنے خیمہ میں آیا اور سپاہیوں کو شہر [illegible]

[illegible] لیے بھی حقوق کی پاسداری کی یاددہانی کرواتے ہوئے خاموشی و امن سے شہر میں داخل ہو گیا۔ بازاروں کی گہما گہمی میں سہم اور ہراس واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ گھسیٹی بیگم کے محل پر ماتمی پھریرا لہراتا نظر آنے لگا۔ کشن داس بھی اپنی تمام تر قیمتی اشیا کشتی پر لدوائے ڈھاکا سے فرار ہو گیا۔

نواب گھسیٹی بیگم کے اقتدار نے آخری ہچکی بھر لی تھی۔

☆......☆

سراج الدولہ کا ستارہ مکمل طور پر گردش میں تھا۔ اس کے لیے کوئی بھی خوشی اپنے جلو میں نئی آزمائشیں لاتا گویا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ ڈھاکے کا محاذ کسی خون خرابے کے بغیر فتح کرنے کا سکون ابھی مکمل طور پر محسوس ہی نہ کیا تھا کہ دہلی کے سلطان نے اس کے لیے نیا قضیہ کھڑا کر دیا۔ کچھ عرصہ قبل اس نے میر جعفر کے مشورے اور اپنی منشا کے تحت مرکز سے اپنی سلطنت کی توثیق طلب کی تھی۔ میر جعفر نے حسب سابق دہرا کھیل کھیلتے ہوئے شوکت کو بھی یہی رائے کہلوا بھیجی تھی کہ سلطان دہلی پر دباؤ ڈالنے سے فیصلہ اس کی حمایت میں ہی آئے گا۔ سراج الدولہ سے ناخوش امراء اس [illegible] آملیں گے۔ ایسی صورت میں اگر جنگ درپیش بھی ہوئی تو نواب [illegible] کو شکست یقینی ہوگی۔

شوکت کو یہ تجویز بہت پسند آئی تھی۔ وہ بھی میر جعفر کو اپنا خیر خواہ [illegible] تھا۔ اس نے اپنا ایک نمائندہ دہلی روانہ کر دیا۔ میر جعفر کا ذاتی خیال [illegible] کہ سلطان کے سامنے اس مسئلہ کا حل یہی ہوگا کہ وہ دونوں درخواستیں مسترد کر کے کسی تیسرے شخص کو حاکم مقرر کر دے گا مگر سلطان [illegible] کمزور قوت ارادی اور نااہلی نے نہایت مضحکہ خیز صورت حال [illegible] اس نے دونوں درخواستوں پر دستخط کرتے ہوئے سراج الدولہ اور شوکت جنگ کو بیک وقت بنگال پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس احمقانہ اور بچگانہ فیصلے سے عوام پر [illegible] کی کمزوری عیاں ہو گئی۔ سراج الدولہ نے اسے ڈگمگاتے ہوئے اقتدار کو سنبھالنے کا سنہری موقع فراہم کیا تھا [illegible] تدبر اور دلیری سے کام لینے کی بجائے سلطان نے غیر ملکی [illegible] داروں کو مزید کھل کھیلنے کا موقع فراہم کر دیا۔

"مجھے سلطان سے ایسی کمزوری کی امید نہ تھی۔ اس طرح تو معاملہ اور بھی الجھ کر رہ گیا ہے۔" سراج الدولہ اپنے دربار میں موجود تھا۔

"فی الحال تو بنگال کا جائز حکمران صرف ایک ہی تھا۔ اب فریق ثانی بھی خود کو جائز حقدار تصور کرنے لگے گا۔" امیر ہادی نے تاسف سے سر ہلایا۔

"اس صورت حال سے کیونکر نکلا جا سکتا ہے؟" سراج نے الجھ کر رائے طلب کی۔

"قبلہ عالم! نواب شوکت جنگ کے خلاف لشکر کشی کا یہی مناسب وقت ہے۔" میر جعفر نے کہا۔ امیر ہادی کو بھی اس تجویز سے کوئی اعتراض نہ تھا۔

"مجھے خدشہ ہے کہ ہمارے اس اقدام کو سلطان اپنی تذلیل نہ گردانیں۔" سراج الدولہ شش و پنج میں مبتلا تھا۔

"آپ کی یہ سوچ اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے عالم پناہ!" امیر ہادی کی افسردگی میں مرکز کے لیے دبا دبا غصہ بھی شامل تھا۔ "لیکن سلطان نے اپنی بادشاہت پر خود سوال پیدا کیے ہیں۔ کیا انہیں علم نہیں کہ اس صوبے کے مسائل کس قدر گمبھیر ہیں۔ فرنگی نے یہاں تجارت کی آڑ میں اپنے قدم جما لیے ہیں۔ نواب شوکت بھی اسی مکار قوم کا پروردہ ہے۔ اگر بنگال کی حکومت ایسے شخص کے ہاتھ لگی تو اس قوم کی تباہی یقینی ہے۔"

"امیر ہادی! میں دنیا کی ہر اس طاقت کے خلاف جنگ کرنے کے لیے تیار ہوں جو ہندوستان کو اندرونی طور پر کمزور کرنا چاہے گی۔" سلطان کے اس فیصلے سے پیدا ہونے والے نتائج نے سراج الدولہ کو بھی طیش میں مبتلا کر دیا تھا۔ "شوکت جنگ ایک باغی ہے اور ہم اس سلطنت میں باغیوں کو پناہ دینے کی روایت نہیں ڈال سکتے۔"

"گھسیٹی بیگم اور ان کے ساتھیوں کے متعلق آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے قبلہ عالم!" میر جعفر نے دبے لفظوں میں دریافت کیا۔

"وہ بنگال کے لیے اب بے ضرر ہیں۔" سراج بے نیازی سے بولا۔

"مگر قبلہ عالم! انہیں سزا نہ دی گئی تو دوسرے شرپسند عناصر کو کیسے عبرت ہوگی؟"

"بخشی میر جعفر! اگر ہم دشمنوں کو سزا دینے کا [illegible] کر دیں تو بنگال میں سبھی افراد زیر عتاب آ جائیں گے۔" نواب کے دوٹوک اور گمبھیر انداز پر اس کا دل بے اختیار کانپ کر رہ گیا۔ اسے واہمے ستانے لگے کہ کہیں سراج الدولہ اس کے بارے میں بھی مشکوک تو نہیں ہو گیا۔ اس کی کامیابی کا انحصار 'فریب' کی طویل العمری پر تھا۔

"ہمیں اصل غصہ کشن داس پر ہے جس نے دولت کو باپ پر ترجیح دی اور یاترا کا عذر لیے فرار ہو گیا۔ کلکتہ ہی وہ

''ہر کوٹھی میں لگ بھگ ہزار گورے سپاہی' پانچ ہزار دیسی سپاہی' توپ خانہ بندوقوں کی کیا توجیہہ پیش کریں گے؟''

''میں نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا۔'' راجا رام نے [illegible] سے جواب دیا۔

''تو کب سوچیں گے؟ ایسٹ انڈیا کمپنی کا محل آپ جیسے لوگوں کے دم سے استوار ہے۔ آپ اس منافق کمپنی سے تعاون بند کردیں تو ان کا کاروبار دو دن میں چوپٹ ہوجائے گا۔''

''کیسی اناپ شناپ باتیں کررہے ہو مہاشے؟ اگر کام چھوڑ دیا تو ہمارے گھر کا چولہا کیسے جلے گا؟'' راجا رام بدک گیا۔

''جیسے پہلے چلتا تھا۔ ان لوگوں کی آمد سے پہلے بھی تو آپ لوگ زندہ تھے ناں! اب بھی وقت ہے راجا رام جی! خدارا سنبھل جایئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا کوئی خونی رشتہ ہتھیار سونت کر سامنے آ کھڑا ہو۔'' وہ کرب سے کہتا منیر بیگ کو یاد کرنے لگا۔ راجا رام اس کے ذہنی توازن پر مشکوک ہوتا خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہی رویہ ہندوستان کا ایک عمومی مرض بن چکا تھا۔ فرنگیوں کی جانب سے دکھائے گئے خوابوں تعیشات کی فراہمی اور لالچ نے ہر کسی کی سماعت و بصارت ایسے مفلوج کی تھی کہ اپنے سروں پہ منڈلاتے نوچ کھانے کے لیے تیار گدھ دکھائی دیتے تھے نہ ہی طوفان کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔

☆......☆

نواب سراج الدولہ کا پیغام ملتے ہی ظہیر نے ڈھاکا کے باہر ڈیرہ ڈال لیا۔ اب اسے مرشد آباد سے آنے والے دستوں کا انتظار تھا۔ جنگ کی بھرپور تیاریاں کرواتی گھسیٹی بیگم اس موقع پر ذہنی دباؤ کا سامنا کرنے سے عاجز ہوچکی تھی۔ طمع اور حرص نے اسے حاکم وقت کے سامنے لا کھڑا تو کردیا تھا لیکن اپنی کمزوریوں سے آگاہی کے علاوہ نواب سراج کی شخصی خوبیاں، حق گوئی اور شجاعت نے فطری طور پر ہی اسے ہراس میں مبتلا کر رکھا تھا۔ نواب سراج کی بہادری سے ٹکرانے کا خیال ہی عوام کی نظر میں گھسیٹی بیگم کا مقام گرا دینے کے لیے کافی تھا۔ عوامی ناپسندیدگی نے لامحالہ طور پر افواج میں بھی سراسیمگی پیدا کردی۔ سپاہی اس قدر بددل ہوئے کہ وہ جنگ کے بغیر ہی شکست تسلیم کر بیٹھے۔ گھسیٹی بیگم کی پریشانی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اسے اپنے خوابوں کا شیش محل بری طرح چکنا چور ہوتا نظر آرہا تھا۔ نواب شوکت جنگ کی جانب سے خاموشی

نے اسے بالکل ہی توڑ کر رکھ دیا۔ منیر [illegible] کر لے بھی یہ صورت حال بہت مایوس کن تھی [illegible] کا ایک محل آباد تھا کہ خونریز جنگ کی صورت میں اسے بہادری کے خوب جوہر دکھانے کے مواقع ملیں گے جس کے نتیجے میں وہ انعام و اکرام اور کسی پرگنہ کی صوبیداری کا حقدار ٹھہرا دیا جائے گا لیکن یہاں تو گنگا ہی الٹی بہہ نکلی تھی۔ اس مایوسی' کوفت اور جھنجلاہٹ میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا جب نہتا ظہیر بیگ ذاتی حیثیت میں چھوٹے بھائی سے ملنے چلا آیا۔ اس نے اپنی تلوار خیمہ کے باہر سائیس کے حوالے کردی تھی۔

''کیسے ہیں بھائی جان آپ؟ نواب سراج الدولہ کی ڈوبتی [illegible] کیوں وقت برباد کررہے ہیں؟'' منیر نے کہا۔

''تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو میرے بھائی؟ نواب کا ساتھ دینے میں ہی اس وقت ہم سب کی بھلائی ہے۔'' ظہیر نے نہایت دردمندی و خلوص سے جواب دیا۔ اگلے چند لمحے وہ اسے سمجھاتا رہا کہ تاریخ ظالم و جابر افراد کو معاف کردیتی ہے' بزدلوں کو بھی رعایت دینے کے لیے تیار ہوجاتی ہے' بدکردار افراد بھی بعد از موت اچھے الفاظ میں یاد کر لیے جاتے ہیں لیکن غداری کبھی بھی معاف نہیں [illegible] ذاتی تمناؤں اور مفاد کی خاطر حاکم وقت کے خلاف [illegible] غداری کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ منیر بیگ [illegible] حالت بڑے بھائی کی صاف گوئی برداشت نہ کر [illegible] تلوار تھامے بھائی پر حملہ آور ہوگیا۔ ظہیر کو اس موقع پر بھی [illegible] سے کیا گیا عہد یاد تھا کہ منیر کی اس تلوار سے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ وہ اپنا دفاع کرتا ہوا نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش میں اپنی ران زخمی ہونے سے بچا نہ پایا۔ خون کا فوارہ نکلتے دیکھ کر منیر بیگ صدمہ سے ساکت ہوگیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''مجھے معاف کردیں بھائی جان! یہ کیا کردیا میں نے؟'' وہ ظہیر کے قدموں میں گر گیا۔

اسی اثناء میں خیمہ کے باہر ایک عجب [illegible] ایک سپاہی فق چہرہ لیے اندر داخل ہوا۔

''حضور! نواب کی فوج [illegible] کر فرار ہوگئے ہیں [illegible] ہے۔ ہمارے سپاہی ہتھیار ڈال کر [illegible] اپنی جان بچایئے۔'' یہ سنتے ہی منیر خیمہ سے باہر نظر انداز کرتا ہوا [illegible] سے معافی دلوانے کی ظہیر کی صدائیں نظر انداز کرتا ہوا گھوڑا کھول کر سرپٹ فرار ہوگیا۔ ظہیر کا دل اداسی سے بھر گیا۔ وہ بوجھل دل لیے اپنے خیمہ میں آیا اور سپاہیوں کو شہر [illegible]

حقوق کی پاسداری کی یاددہانی کرواتے ہوئے خاموشی و امن [illegible] ہوگیا۔ بازاروں کی گہما گہمی میں سہم اور ہراس [illegible] آرہا تھا۔ گھسیٹی بیگم کے محل پر ماتمی پھریرا لہراتا نظر آنے لگا۔ کشن داس بھی اپنی تمام ترقیمتی اشیا کشتی پر لدوائے ڈھاکا سے فرار ہوگیا۔

نواب گھسیٹی بیگم کے اقتدار نے آخری ہچکی بھر لی تھی۔

☆......☆

سراج الدولہ کا ستارہ مکمل طور پر گردش میں تھا۔ اس کے لیے کوئی بھی خوشی اپنے جلو میں نئی آزمائشیں لانا گویا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ ڈھاکے کا محاذ کسی خون خرابے کے بغیر فتح کرنے کا سکون ابھی مکمل طور پر محسوس ہی نہ کیا تھا کہ دہلی کے سلطان نے اس کے لیے نیا قضیہ کھڑا کردیا۔ کچھ عرصہ قبل اس نے میر جعفر کے مشورے اور اپنی منشا کے تحت مرکز سے اپنی سلطنت کی توثیق طلب کی تھی۔ میر جعفر نے حسب سابق دہرا کھیل کھیلتے ہوئے شوکت کو بھی یہی رائے کہلوا بھیجی تھی کہ سلطان دہلی پر دباؤ ڈالنے سے فیصلہ اس کی حمایت میں ہی آئے گا۔ سراج الدولہ سے ناخوش امراء اس سے آملیں گے۔ ایسی صورت میں اگر جنگ درپیش بھی ہوئی تو نواب کی شکست یقینی ہوگی۔

شوکت کو یہ تجویز بہت پسند آئی تھی۔ وہ بھی میر جعفر کو اپنا خیر خواہ سمجھتا تھا۔ اس نے اپنا ایک نمائندہ دہلی روانہ کردیا۔ میر جعفر کا ذاتی خیال یہ تھا کہ سلطان کے سامنے اس مسئلہ کا حل یہی ہوگا کہ وہ دونوں درخواستیں مسترد کرکے کسی تیسرے شخص کو حاکم مقرر کردے گا مگر سلطان کی کمزور قوت ارادی اور نااہلی نے نہایت مضحکہ خیز صورت حال پیدا کردی۔ اس نے دونوں درخواستوں پر دستخط کرتے ہوئے سراج الدولہ اور شوکت جنگ کو بیک وقت بنگال پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس احمقانہ اور [illegible] فیصلے سے عوام پر بھی سلطان کی کمزوری عیاں ہوگئی۔ سراج الدولہ نے اسے ڈگمگاتے ہوئے اقتدار کو سنبھالنے کا سنہری موقع فراہم کیا تھا لیکن تدبر اور دلیری سے کام لینے کی بجائے سلطان نے غیرملکی اداروں کو مزید کھل کھیلنے کا موقع فراہم [illegible]

''مجھے سلطان سے ایسی کمزوری کی امید نہ تھی۔ اس طرح تو معاملہ اور بھی الجھ کر رہ گیا ہے۔'' سراج الدولہ اپنے دربار میں موجود تھا۔

''فی الحال تو بنگال کا جائز حکمران صرف ایک ہی تھا۔ اب فریق ثانی بھی خود کو جائز حقدار تصور کرنے لگے گا۔'' امیر ہادی نے تاسف سے سر ہلایا۔

''اس صورت حال سے کیونکر نکلا جاسکتا ہے؟'' سراج نے الجھ کر رائے طلب کی۔

''قبلہ عالم! نواب شوکت جنگ کے خلاف لشکر کشی کا یہی مناسب وقت ہے۔'' میر جعفر نے کہا۔ امیر ہادی کو بھی اس تجویز سے کوئی اعتراض نہ تھا۔

''مجھے خدشہ ہے کہ ہمارے اس اقدام کو سلطان اپنی تذلیل نہ گردانیں۔'' سراج الدولہ شش و پنج میں مبتلا تھا۔

''آپ کی یہ سوچ اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے عالم پناہ!'' امیر ہادی کی افسردگی میں مرکز کے لیے دبا دبا غصہ بھی شامل تھا۔ ''لیکن سلطان نے اپنی بادشاہت پر خود سوال پیدا کیے ہیں۔ کیا انہیں علم نہیں کہ اس صوبے کے مسائل کس قدر گھمبیر ہیں۔ فرنگی نے یہاں تجارت کی آڑ میں اپنے قدم جما لیے ہیں۔ نواب شوکت بھی اسی مکار قوم کا پروردہ ہے۔ اگر بنگال کی حکومت ایسے شخص کے ہاتھ لگی تو اس قوم کی تباہی یقینی ہے۔''

''امیر ہادی! میں دنیا کی ہر اس طاقت کے خلاف جنگ کرنے کے لیے تیار ہوں جو ہندوستان کو اندرونی طور پر کمزور کرنا چاہے گی۔'' سلطان کے اس فیصلے سے پیدا ہونے والے نتائج نے سراج الدولہ کو بھی طیش میں مبتلا کردیا تھا۔ ''شوکت جنگ ایک باغی ہے اور ہم اس سلطنت میں باغیوں کو پناہ دینے کی روایت نہیں ڈال سکتے۔''

''گھسیٹی بیگم اور ان کے ساتھیوں کے متعلق آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے قبلہ عالم!'' میر جعفر نے دبے لفظوں میں دریافت کیا۔

''وہ بنگال کے لیے اب بے ضرر ہیں۔'' سراج بے نیازی سے بولا۔

''مگر قبلہ عالم! انہیں سزا نہ دی گئی تو دوسرے شرپسند عناصر کو کیسے عبرت ہوگی؟''

''بخشی میر جعفر! اگر ہم دشمنوں کو سزا دینے کا آغاز کردیں تو بنگال میں سبھی افراد زیر عتاب آجائیں گے۔'' نواب کے دوٹوک اور گھمبیر انداز پر اس کا دل بے اختیار کانپ کر رہ گیا۔ اسے واہمے ستانے لگے کہ کہیں سراج الدولہ اس کے بارے میں بھی مشکوک تو نہیں ہوگیا۔ اس کی کامیابی کا انحصار 'فریب' کی طویل العمری پر تھا۔

''ہمیں اصل غصہ کشن داس پر ہے جس نے دولت کو باپ پر ترجیح دی اور یاترا کا عذر لیے فرار ہوگیا۔ کلکتہ ہی وہ

"ہر کوٹھی میں لگ بھگ ہزار گورے سپاہی، پانچ ہزار دیسی سپاہی، توپ خانہ، بندوقوں کی کیا توجیہہ پیش کریں گے؟"

"میں نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا۔" راجا رام نے شکست خوردگی سے جواب دیا۔

"تو کب سوچیں گے؟ ایسٹ انڈیا کمپنی کا محل آپ جیسے لوگوں کے دم سے استوار ہے۔ آپ اس منافق کمپنی سے تعاون بند کر دیں تو ان کا کاروبار دو دن میں چوپٹ ہو جائے گا۔"

"کیسی اناپ شناپ باتیں کر رہے ہو مہاشے؟ اگر کام چھوڑ دیا تو ہمارے گھر کا چولہا کیسے جلے گا؟" راجا رام بدک گیا۔

"جیسے پہلے چلتا تھا۔ ان لوگوں کی آمد سے پہلے بھی تو آپ لوگ زندہ تھے ناں! اب بھی وقت ہے راجا رام جی! خدارا سنبھل جائیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا کوئی خونی رشتہ ہتھیار سونت کر سامنے آ کھڑا ہو۔" وہ کرب سے کہتا منیر بیگ کو یاد کرنے لگا۔ راجا رام ان کے ذہنی توازن پر مشکوک ہوتا خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہی رویہ ہندوستان کا ایک عمومی مرض بن چکا تھا۔ فرنگیوں کی جانب سے دکھائے گئے خوابوں، تعیشات کی فراہمی اور لالچ نے ہر کسی کی سماعت و بصارت ایسے مفلوج کی تھی کہ اپنے سروں پہ منڈلاتے نوچ کھانے کے لیے تیار گدھ دکھائی دیتے تھے، نہ ہی طوفان کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔

☆......☆

نواب سراج الدولہ کا پیغام ملتے ہی ظہیر نے ڈھاکا کے باہر ڈیرہ ڈال لیا۔ اب اسے مرشد آباد سے آنے والے دستوں کا انتظار تھا۔ جنگ کی بھرپور تیاریاں کرواتی گھسیٹی بیگم اس موقع پر ذہنی دباؤ کا سامنا کرنے سے عاجز ہو چکی تھی۔ طمع اور حرص نے اسے حاکم وقت کے سامنے لا کھڑا تو کر دیا تھا لیکن اپنی کمزوریوں سے آگاہی کے علاوہ نواب سراج کی شخصی خوبیاں، حق گوئی اور شجاعت نے فطری طور پر ہی اسے ہراس میں مبتلا کر رکھا تھا۔ نواب سراج کی بہادری سے ٹکرانے کا خیال ہی عوام کی نظر میں گھسیٹی بیگم کا مقام گرا دینے کے لیے کافی تھا۔ عوامی ناپسندیدگی نے لامحالہ طور پر افواج میں بھی سراسیمگی پیدا کر دی۔ سپاہی اس قدر بزدل ہوئے کہ وہ جنگ کے بغیر ہی شکست تسلیم کر بیٹھے۔ گھسیٹی بیگم کی پریشانی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اسے اپنے خوابوں کا شیش محل بری طرح چکنا چور ہوتا نظر آ رہا تھا۔ نواب شوکت جنگ کی جانب سے خاموشی نے اسے بالکل ہی توڑ کر رکھ دیا۔ منیر بیگ کے لیے بھی یہ صورتِ حال بہت مایوس کن تھی۔ اس کے ذہن میں تصورات کا ایک محل آباد تھا کہ خونریز جنگ کی صورت میں اسے بہادری کے خوب جوہر دکھانے کے مواقع ملیں گے جس کے نتیجہ میں انعام و اکرام اور کسی پرگنہ کی صوبیداری کا حقدار ٹھہرا دیا جائے گا لیکن یہاں تو گنگا ہی الٹی بہہ نکلی تھی۔ اس مایوسی، کوفت اور جھنجھلاہٹ میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب نہتا ظہیر بیگ ذاتی حیثیت میں چھوٹے بھائی سے ملنے چلا آیا۔ اس نے اپنی تلوار [illegible] سائیس کے حوالے کر دی تھی۔

"[illegible] بھائی جان آپ؟ نواب سراج الدولہ کی ڈوبتی نیا میں [illegible] کر رہے ہیں؟" منیر نے کہا۔

"تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو میرے بھائی؟ نواب کا ساتھ دینے میں ہی اس وقت [illegible] کی بھلائی ہے۔" ظہیر نے نہایت دردمندی و خلوص سے [illegible] اگلے چند لمحے وہ اسے سمجھاتا رہا کہ تاریخ ظالم و جابر افراد کو معاف کر دیتی ہے، بزدلوں کو بھی رعایت دینے کے لیے تیار ہو جاتی ہے، بدکردار افراد بھی بعد از موت اچھے الفاظ میں یاد کر لیے جاتے ہیں لیکن غداری کبھی بھی معاف نہیں کی جا سکتی۔ ذاتی [illegible] اور مفاد کی خاطر حاکم وقت کے خلاف کھڑے ہو جانا سنگین غداری کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ منیر بیگ کی ابتر ذہنی حالت بڑے بھائی کی صاف گوئی برداشت نہ کر پائی اور وہ تلوار تھامے بھائی پر حملہ آور ہو گیا۔ ظہیر کو اس موقع پر بھی والدہ سے کیا گیا عہد یاد تھا کہ منیر کی اس تلوار سے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ وہ اپنا دفاع کرتا ہوا نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش میں اپنی ران زخمی ہونے سے بچا نہ پایا۔ خون کا فوارہ نکلتے دیکھ کر منیر بیگ صدمہ سے ساکت ہو گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"مجھے معاف کر دیں بھائی جان! یہ کیا کر دیا میں نے؟" وہ ظہیر کے قدموں میں گر گیا۔

اسی اثناء میں خیمہ کے باہر ایک عجیب سا شور بلند ہوا اور ایک سپاہی فق چہرہ لیے اندر داخل ہوا۔

"حضور! نواب کی فوج شہر میں داخل ہو گئی ہے۔ ہمارے سپاہی ہتھیار ڈال کر فرار ہو گئے ہیں۔ آپ بھی اپنی جان بچائیے۔" یہ سنتے ہی منیر خیمہ سے باہر لپکا اور نواب سے معافی دلوانے کی ظہیر کی صدائیں نظر انداز کرتا ہوا اپنا گھوڑا کھول کر سرپٹ فرار ہو گیا۔ ظہیر کا دل اداسی سے بھر گیا۔ وہ بوجھل دل لیے اپنے خیمہ میں آیا اور سپاہیوں کو شہری

حقوق کی پاسداری کی یاد دہانی کرواتے ہوئے خاموشی و امن سے شہر میں داخل ہو گیا۔ بازاروں کی گہما گہمی میں سہم اور ہراس واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ گھسیٹی بیگم کے محل پر ماتمی پھریرا لہراتا نظر آنے لگا۔ کشن داس بھی اپنی تمام تر قیمتی اشیا کشتی پر لدوائے ڈھاکا سے فرار ہو گیا۔

نواب گھسیٹی بیگم کے اقتدار نے آخری ہچکی بھر لی تھی۔

☆......☆

سراج الدولہ کا ستارہ مکمل طور پر گردش میں تھا۔ اس کے لیے کوئی بھی خوشی اپنے جلو میں نئی آزمائشیں لانا گویا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ ڈھاکے کا محاذ کسی خون خرابے کے بغیر فتح کرنے کا سکون ابھی مکمل طور پر محسوس ہی نہ کیا تھا کہ دہلی کے سلطان نے اس کے لیے نیا قضیہ کھڑا کر دیا۔ کچھ عرصہ قبل اس نے میر جعفر کے مشورے اور اپنی منشا کے تحت مرکز سے اپنی سلطنت کی توثیق طلب کی تھی۔ میر جعفر نے حسبِ سابق دہرا کھیل کھیلتے ہوئے شوکت کو بھی یہی رائے کہلوا بھیجی تھی کہ سلطان دہلی پر دباؤ ڈالنے سے فیصلہ اس کی حمایت میں ہی آئے گا۔ سراج الدولہ سے ناخوش امراء اس سے آملیں گے۔ ایسی صورت میں اگر جنگ درپیش بھی ہوئی تو نواب کی شکست یقینی ہوگی۔

شوکت کو یہ تجویز بہت پسند آئی تھی۔ وہ بھی میر جعفر کو اپنا خیر خواہ سمجھتا تھا۔ اس نے اپنا ایک نمائندہ دہلی روانہ کر دیا۔ میر جعفر کا ذاتی خیال یہ تھا کہ سلطان کے سامنے اس مسئلہ کا حل یہی ہوگا کہ وہ دونوں درخواستیں مسترد کر کے کسی تیسرے شخص کو حاکم مقرر کر دے مگر سلطان کی کمزور قوت ارادی اور نا اہلی نے نہایت مضحکہ خیز صورت حال پیدا کر دی۔ اس نے دونوں درخواستوں پر دستخط کر کے سراج الدولہ اور شوکت جنگ کو بیک وقت بنگال پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس احمقانہ اور بچگانہ فیصلے سے عوام پر بھی سلطان کی کمزوری عیاں ہو گئی۔ سراج الدولہ نے [illegible] اقتدار کو سنبھالنے کا سنہری موقع فراہم [illegible] تدبر اور دلیری سے کام لینے کی بجائے سلطان نے غداروں کو مزید کھل کھیلنے کا موقع فراہم کر دیا۔

"مجھے سلطان سے ایسی کمزوری کی اُمید نہ تھی۔ اس طرح تو معاملہ اور بھی الجھ کر رہ گیا ہے۔" سراج الدولہ اپنے دربار میں موجود تھا۔

"فی الحال تو بنگال کا جائز حکمران صرف ایک ہی تھا۔ اب فریقِ ثانی بھی خود کو جائز حقدار تصور کرنے لگے گا۔" امیر ہادی نے تاسف سے سر ہلایا۔

"اس صورتِ حال سے کیونکر نکلا جا سکتا ہے؟" سراج نے الجھ کر رائے طلب کی۔

"قبلہ عالم! نواب شوکت جنگ کے خلاف لشکر کشی کا یہی مناسب وقت ہے۔" میر جعفر نے کہا۔ امیر ہادی کو بھی اس تجویز سے کوئی اعتراض نہ تھا۔

"مجھے خدشہ ہے کہ ہمارے اس اقدام کو سلطان اپنی تذلیل نہ گردانیں۔" سراج الدولہ شش و پنج میں مبتلا تھا۔

"آپ کی یہ سوچ اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے عالم پناہ!" امیر ہادی کی افسردگی میں مرکز کے لیے دبا دبا غصہ بھی شامل تھا۔ "لیکن سلطان نے اپنی بادشاہت پر خود سوال پیدا کیے ہیں۔ کیا انہیں علم نہیں کہ اس صوبے کے مسائل کس قدر گمبھیر ہیں۔ فرنگی نے یہاں تجارت کی آڑ میں اپنے قدم جما لیے ہیں۔ نواب شوکت بھی اسی مکار قوم کا پروردہ ہے۔ اگر بنگال کی حکومت ایسے شخص کے ہاتھ لگی تو اس قوم کی تباہی یقینی ہے۔"

"امیر ہادی! میں دنیا کی ہر اس طاقت کے خلاف جنگ کرنے کے لیے تیار ہوں جو ہندوستان کو اندرونی طور پر کمزور کرنا چاہے گی۔" سلطان کے اس فیصلے سے پیدا ہونے والے نتائج نے سراج الدولہ کو بھی طیش میں مبتلا کر دیا تھا۔ "شوکت جنگ ایک باغی ہے اور ہم اس سلطنت میں باغیوں کو پناہ دینے کی روایت نہیں ڈال سکتے۔"

"گھسیٹی بیگم اور ان کے ساتھیوں کے متعلق آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے قبلہ عالم!" میر جعفر نے دبے لفظوں میں دریافت کیا۔

"وہ بنگال کے لیے اب بے ضرر ہیں۔" سراج بے نیازی سے بولا۔

"مگر قبلہ عالم! انہیں سزا نہ دی گئی تو دوسرے شرپسند عناصر کو کیسے عبرت ہوگی؟"

"بخشی میر جعفر! اگر ہم دشمنوں کو سزا دینے کا آغاز کر دیں تو بنگال میں سبھی افراد زیرِ عتاب آ جائیں گے۔" نواب کے دوٹوک اور گمبھیر انداز پر اس کا دل بے اختیار کانپ کر رہ گیا۔ اسے واہمے ستانے لگے کہ کہیں سراج الدولہ اس کے بارے میں بھی مشکوک تو نہیں ہو گیا۔ اس کی کامیابی کا انحصار 'فریب' کی طویل العمری پر تھا۔

"ہمیں اصل غصہ کشن داس پر ہے جس نے دولت کو باپ پر ترجیح دی اور یاترا کا عذر لیے فرار ہو گیا۔ کلکتہ ہی وہ

واحد جگہ ہے جہاں بنگال کے باغی افراد کا کھلی بانہوں سے استقبال کیا جاتا ہے۔اسے بھی یقیناً ہالویل اور گورنر راجر ڈریک نے ہی پناہ دی ہے۔'' سراج کے کامل اندازے پر میر جعفر کا دل ایک بار پھر زور و شور سے دھڑکنے لگا۔

''ہمیں فرنگیوں سے کشن داس کی واپسی کا مطالبہ کرنا چاہیے۔وہ ہمارا ریاستی مجرم ہے۔'' امیر ہادی نے سنجیدگی سے تجویز دی۔

''اس کی بھلا کیا ضرورت ہے؟'' میر جعفر یکدم ہراساں ہوا۔

''دشمن کو پناہ دینا ان فرنگیوں کے بدترین عزائم کی نشاندہی ہے بخشی میر جعفر! اب کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنا بے حد ضروری ہو چکا ہے۔ہم آئے روز کی ان شورشوں سے تنگ آ چکے ہیں۔'' سراج نے طیش سے کہا اور پھر تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد گورنر کے نام خط لکھا گیا۔

''اس سرزمین کے مالک ہم ہیں۔ہم نے یہاں آپ فرنگیوں کو تجارت کی اجازت دی ہے۔وہ ہماری رعایا ہیں۔ اگر آپ کو یہ مقام منظور نہیں تو وہ ہندوستان میں رہنے کے مجاز بھی نہیں ہیں۔آپ قلعہ بندیوں کو ختم کرنے' نئے مورچے بنانے اور کلکتہ کی شمالی خندق پاٹنے کے سابقہ احکامات مسلسل نظر انداز کرنے کی گستاخی کر رہے ہیں۔اس جسارت کی سزا بہت مہنگی ثابت ہوگی۔یورپ میں فرانس سے ہونے والی ممکنہ جنگ کی آڑ لے کر ہندوستان میں قلعہ بندیاں کرنے کا خیال احمقانہ ہی نہیں' متنازعہ بھی ہے۔اس ملک میں رہائش پذیر تمام غیر ملکی ہماری رعایا ہیں۔رعایا کا ایک گروہ دوسرے پر حملہ آور ہو تو مجرم کو سزا دینے کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔فرنگیوں کا رشوت ستانی' سازشوں اور ہمارے دشمنوں کو پناہ دینے کا وتیرہ ہمارے وقار کے منافی ہے۔انہیں مطلع کیا جاتا ہے کہ اب ہم اپنے ملکی مفاد کو نقصان پہنچانے والے ہر شخص کو نیست و نابود کر دیں گے۔ہم بحیثیت حاکم بنگال کمپنی کو حکم دیتے ہیں کہ دیوان ڈھاکا راج ولبھ کے بیٹے کشن داس کو لوٹی ہوئی رقم کے ہمراہ ہمارے حوالے کرے' پرانی قلعہ بندیاں مسمار کرے اور نئے مورچے بنانے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔حکم عدولی کی صورت میں سنگین نتائج بھگتنے کی تمام تر ذمہ داری کمپنی پر ہی ہوگی۔''

نواب کے مزاج' خط کی سخت زبان اور متوقع فرنگی ردِعمل نے میر جعفر کی سٹی گم کر دی۔

''حضور! کہیں ایسا نہ ہو کہ کمپنی شوکت جنگ سے گٹھ جوڑ کر لے۔'' اس کے خدشات بالآخر زبان پر آ گئے۔

''گھسیٹی بیگم کوشہ دے کر انہوں ہمارا کیا بگاڑ لیا؟ ہم نواب شوکت سے بھی آہنی ہاتھوں نمٹ لیں گے۔اب ریاست کے خلاف کوئی شوریدہ سر برداشت نہ کی جائے گی۔'' نواب سراج الدولہ کے تیوروں نے درباریوں پر لرزہ طاری کر دیا۔

☆......☆

حاکم بنگال کا خط راجر ڈریک اور ہالویل پر بجلی بن کر گرا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے یہ ملازم ایسے بے خوف انداز اور سرزنش سے اب تک نا آشنا تھے۔انہوں نے مرکز میں کمزور حکمران ہی دیکھے تھے جن کی تن آسانی' آرام پسندی' عیش و عشرت اور نا اہلی نے ہی کمپنی اہلکاروں کی آنکھوں میں اقتدار پر قبضہ کے خواب سجائے تھے۔نواب علی وردی خاں اور سراج الدولہ کی صورت میں غیور اور چٹانی سوچ رکھنے والے حکام سے پالا پڑتے ہی انہیں دیار غیر میں اپنی اصل حیثیت اور خوابوں کا شیرازہ بکھرنے کا ادراک ہوا تو بوکھلاہٹ یقینی تھی۔سراج الدولہ کے خط میں تیور بھانپنے کے بعد ہالویل جیسے بد دماغ شخص کا بھی یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ملازمین سے بے اختیار تکریم کا برتاؤ کرنے لگا۔لاشعور میں غالباً یہ امر کارفرما تھا کہ حکمران کے تعاون اور وقار نے اگر ان کی عزت نفس بحال کر کے خوابیدہ غیرت اجاگر کر دی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ان سب تبدیلیوں کے باوجود ذہن اسی سہانے خواب کے زیر اثر تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہر افسر ہندوستان کے ابتر سیاسی حالات دیکھ کر اپنی آنکھوں میں سجائے بیٹھا تھا۔انہیں اپنا تجارتی اقتدار سیاسی غلبہ میں تبدیل کرنا تھا۔اس راہ میں سراج الدولہ کی صورت میں حائل آخری چٹان کے ہٹتے ہی 'سونے کی چڑیا' ان کے قبضے میں چلی آتی۔اس خواب ہی کو اپنی قوت و تحریک بنائے ہالویل' راجر ڈریک اور جارج منچن نے ایک بار پھر اپنا حوصلہ مجتمع کر لیا۔ہالویل نے میر جعفر سے دربار کے اندرونی حالات کی مصدقہ اطلاعات حاصل کیں اور نواب کو جوابی خط ارسال کرتے ہوئے اکھڑ اور بے نیاز رویّہ سے اپنا مدعا واضح کر دیا کہ ہندوستانی حکمران ان کی حفاظت کے اہل نہیں ہیں۔فرنگی تاجر اپنا بھلا برا خود سمجھتے ہیں۔وہ اپنے پاس پناہ گزین افراد کو بھی حکومت کے حوالے نہ کریں گے۔

کمپنی افسران کو علم تھا کہ اس جسارت کے بعد وہ بارود کے ڈھیر پر آ بیٹھے ہیں لہٰذا انہوں نے کسی بھی تاخیر کے بناء اپنی افواج اور قلعہ کو مضبوط تر کرنے کا آغاز کر دیا۔اس سلسلہ میں دولت کی ضرورت پیش آنے پر وہ کشن داس کے درپے ہو گئے۔

''ہمیں اپنے دفاع اور تم جیسے بھگوڑوں کو پناہ دینے کے لیے نواب سے براہ راست ٹکراؤ کی نوبت درپیش ہے۔ اپنی دولت ہمارے حوالے کر دو!'' ہالویل نے رکھائی سے کہا۔

''لیکن حضور! دولت کے بغیر میں کیا کروں گا؟ میں نے اسے بچانے کے کارن پتاجی کو نواب کی قید میں رہنے دیا۔'' کشن داس بلبلا اٹھا۔

''تمہارے نواب نے ہمیں للکارتے ہوئے بھگوڑے افراد کو اس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی ہے۔اب فیصلہ کر لو کہ جان بچانی ہے یا دولت؟'' راجر ڈریک نے اس کے لیے تمام راہیں مسدود کر دیں۔

کشن داس کا مال و متاع ہڑپنے کے بعد انہوں نے 'امی چند' سے بھی یہی مطالبہ کر دیا۔امی چند ہوشیار تھا۔اس نے کشن داس کی طرح واویلوں اور انکار سے گریز ہی کیا۔

''حضور! یہ مال و دولت آپ ہی کا ہے۔جب چاہیں لے لیں۔میں مرشد آباد سے واپس آتے ہی سب کچھ آپ کے سپرد کر دوں گا۔'' وہ مکاری سے بولا۔

''یہ بات بہتر رہے گا۔تم وہاں ضرور جاؤ اور شاہی دربار کے کچھ افراد کو توڑنے کی کوشش کرو۔ہمیں سراج الدولہ کو زیادہ سے زیادہ کمزور کرنا ہے۔'' اسے زادِ راہ اور مطلوبہ افراد کو رشوت دینے کے لیے لاکھوں روپے دیے گئے۔امی چند مرشد آباد پہنچ گیا جہاں نواب سراج الدولہ سازشوں اور امراء سے عاجز آ چکا تھا۔میر جعفر نے اس کی لاعلمی میں قدموں تلے بارود بچھا دیا تھا۔اس بارود کو آگ لگانے کے لیے وہ فرنگی آقاؤں کے ایک اشارے کا منتظر تھا۔کلیو نے اپنے اس 'خفیہ ہتھیار' کی خبر امی چند کو بھی نہ ہونے دی تھی۔دوسری جانب سے شوکت جنگ کی ہٹ دھرمی نے نواب کو ایک الگ آزار میں مبتلا کر رکھا تھا۔درباری امراء کی سازشوں کا یہ عالم تھا کہ سراج الدولہ اگر ایک پہلو سے اپنا دفاع کرتا تو کوئی دوسری جانب سے دھاوا بول دیتا۔اسے دبوچتا تو کوئی تیسرا فتنہ سر اٹھا لیتا۔ان سب سے قطع نظر ان سازشی عناصر کا بھی شمار ہی نہ تھا جو منافقت کی چادر اوڑھے خاموشی سے اسے نقصان پہنچانے کے درپے تھے۔اس ماحول میں گستاخ خط ملتے ہی سراج الدولہ کے طیش میں مزید اضافہ ہو گیا۔اس نے امیر ہادی کے ساتھ صلاح مشورہ کے بعد ظہیر بیگ کو خصوصی خلعت اور خنجر نوازتے ہوئے اپنے ساتھ قاسم بازار روانگی کا حکم صادر کر دیا۔وہ بے لگام فرنگیوں کا قلعہ قمع کرنے کے بعد ہی شوکت جنگ سے نمٹنے کے لیے پٹنہ کوچ کرنا چاہتا تھا۔ملکی سالمیت کے لیے اب برق رفتار سرگرمیاں ناگزیر تھیں۔

☆......☆

قاسم بازار قلعہ فرنگی تکبر کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ دیواروں پر رکھی توپیں ہولناک منظر پیش کیا کرتیں۔ سربلند برجیاں اور فصیلوں پر کھڑے نعرے لگاتے فرنگی اپنے مذموم ارادے بہ بانگ دہل بیان کیا کرتے۔سراج الدولہ کی فوج اسی قلعہ کے سامنے موجود تھی۔نواب کے حکم پر ظہیر کو بطور خصوصی سفیر مہتمم ولیم واٹس کے پاس روانہ کر دیا گیا۔قلعہ کے اندر ان گنت فرنگی ایک کمرے میں موجود تھے۔ان کے تکبر اور بد اخلاقی کا یہ عالم تھا کہ کسی نے بھی سفارتی آداب کا پاس رکھنے کی زحمت نہ کی۔

''حاکم بنگال کی افواج قلعہ پر حملہ کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ہم بے جا خون بہانے کے قائل نہیں ہیں۔ہمیں اُمید ہے کہ اپنی حماقتوں کا ادراک کرتے ہوئے آپ سابقہ روش ترک کر کے نواب صاحب کی اطاعت قبول کر لیں گے۔ہتھیار ڈالنے کی صورت میں قلعہ کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے گا۔آپ کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہوگی۔آپ جہاں چاہیں گے' ہم پہنچا دیں گے۔بصورت دیگر اس قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر خواتین اور بچوں کے سوا کسی کو پناہ نہ دی جائے گی۔'' ظہیر نے دبنگ انداز میں کہا۔ولیم واٹس کے ایک اہم ساتھی 'سرجن فورتھ' نے ظہیر کی گفتگو کو انگریزی قالب میں ڈھال کر مہتمم کے گوش گزار دیا۔

''میں نے سفیر کی پیشکش سن لی۔اس علاقہ میں فرنگی اورنگوں کا حاکم اعلیٰ میں نہیں ہوں۔مجھے فورٹ ولیم کاؤنسل کی جانب سے (ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفاتر) دو بدو مقابلہ کا حکم دیا گیا ہے۔نواب نے ہماری طاقت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔اس کوٹھی کی حفاظت کے لیے ہمارے پاس 'چوراسی' توپیں موجود ہیں۔ان آگ اگلتی توپوں کے علاوہ آٹھ ہزار سپاہیوں کی عددی قوت سب سے سوا ہے۔میں یہ قلعہ نواب کے حوالے نہیں کر سکتا۔تو پچیوں کو سفیر کے روانہ ہوتے ہی گولہ باری کا حکم صادر کر دیا گیا ہے۔'' ولیم واٹس

کا فیصلہ بزبان مترجم سنتے ہوئے ظہیر نے تاسف سے سر ہلایا اور کمرے سے باہر نکل کر گھوڑے پر سوار قلعہ کے صدر دروازہ تک چلا آیا۔ اسے دیکھتے ہی سپاہیوں نے دروازہ کھول دیا۔ ظہیر ابھی نواب کے پاس پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ اسے توپوں کی گرج سے مغرور فرنگیوں کا جواب مل گیا۔

"اس گولہ باری کا بھرپور جواب دیا جائے! اگر فرنگی یہی چاہتے ہیں تو یونہی سہی۔" نواب نے حکم دیا۔ توپچی اسی حکم کے منتظر تھے۔ انہوں نے برق رفتاری سے توپ کو مشغل دکھائی اور توپ کا ایک گولہ پرواز کرتا ہوا قاسم بازار کے قلعہ میں جا گرا۔ جنگ کا نقارہ بج چکا تھا۔ تمتمایا چہرہ لیے ظہیر بیگ بھی سراج الدولہ کے پاس چلا آیا۔

"فرنگیوں کو اپنی قوت بازو اور بارود کا بہت زعم ہے قبلہ عالم! وہ خون خرابہ چاہتے ہیں۔"

"ہم قاسم بازار کو اس غرور کا مدفن بنا کر ہی جائیں گے۔" نواب پرعزم تھا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے حضور؟" ظہیر نے ادب سے استفسار کیا۔

"آج گولہ باری کا جواب اسی زبان میں دیا جائے گا۔ کل تمہارا دستہ عمر بیگ کے دستوں کے ہمراہ قلعہ پر حملہ کے لیے تیار رہے!" نواب کا عندیہ ملتے ہی ظہیر نے سرشاری سے سر ہلایا۔ اسی لمحہ فرنگی توپ کا ایک گولہ ان کے قریب آ گرا۔ مٹی کا غبار اڑا اور زمین پر گڑھا پڑ گیا۔

"حضور! آپ یہاں سے ہٹ جائیے۔" ایک سپاہی نے عرض کی۔ "وہ ہماری توپ کے مقام نصب سے آگاہ ہو گئے ہیں اور متواتر اسی رخ پر گولہ باری کر رہے ہیں۔"

"ہماری پرواہ نہ کرو۔ توپ کو کسی صورت میں نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔" سراج نے بے نیازی سے کہا۔ "جنگیں احتیاط اور دفاع سے نہیں بلکہ دلیری و بے باکی سے جیتی جاتی ہیں۔"

توپچیوں نے فوری طور پر حکم کی تعمیل کی۔ سورج غروب ہونے تک یہ سلسلہ یونہی جاری رہا۔ تاریکی گہری ہوتے ہی توپیں خاموش ہو گئیں۔ قلعہ پر مشعلیں جگمگاتے دیکھ کر نواب کے ذہن میں ایک خیال سرسرایا۔

"غنیم کو دوبارہ گولہ باری کا حکم دے دو ظہیر بیگ! مشعلوں کی روشنی میں نشانہ خطا نہیں ہو سکتا۔"

اس حکم کی تعمیل سے فرنگی خیموں میں ہراس پھیل گیا۔ انہیں مشعلیں گل کرتے ہی بنی۔ اگلی صبح سورج طلوع ہوتے ہی ظہیر اپنے ساتھیوں کے پاس چلا آیا۔ وہ بھی آگے بڑھ کر دشمن پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بے تاب تھے۔ ظہیر نے جوشیلے انداز میں انہیں ہدایات دیں اور تلوار لہراتے ہوئے قلعہ کی دائیں جانب گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ عمر بیگ بائیں جانب سے محاذ سنبھالے ہوئے تھا۔ گذشتہ رات توپوں کی گولہ باری سے فصیل میں ایک جگہ شگاف پیدا ہو چکا تھا۔ ظہیر گولیوں کی بوچھاڑ میں اسی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس کے چند سپاہی زخمی ہو گئے تھے لیکن ہر زخم سپاہ کا جوش و ولولہ بڑھا رہا تھا۔ فرنگی سپاہی بھی تلواریں تھامے دیوار بنانے چلے آئے۔ دست بدست لڑائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ لہو کے اچھلتے فوارے وحشت میں اضافہ کرنے لگے۔ تلواروں کی کھنکھناہٹ اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ ظہیر اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے پوری قوت سے مقابل کو دھکیلتا فصیل کے اندر داخل ہو گیا۔ قلعہ کا دروازہ کھل چکا تھا۔ فرنگی سپاہی پیچھے ہٹتے انہیں نرغہ میں لیتے ہوئے عقب سے حملہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سراج الدولہ بھی اسی موقع کا منتظر تھا۔ اس نے دروازہ کھلتے دیکھا تو اپنی تیار و بے تاب فوج کے ہمراہ ان پر جھپٹ پڑا۔ پل بھر میں ہی وہاں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ عمر بیگ بھرپور انداز میں قلعہ میں داخل ہو چکا تھا۔ تینوں اطراف سے کامیاب یورش دیکھ کر دشمن کی صف میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ جان بچانے کے لیے منتشر ہونے لگے۔ ولیم واٹس کے پاس شکست تسلیم کرنے اور صلح کا سفید علم لہرانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ نواب سراج الدولہ کی جانب سے جنگ بندی کا حکم دے دیا گیا۔ فرنگی خیموں میں ایک کہرام برپا تھا۔ وہاں موجود خواتین کی آہ و زاری فلک شگاف تھی۔ انہیں یہی بتایا گیا تھا کہ مسلم اور ہندوستانی وحشی، بدتہذیب اور جنگلی ہیں۔ عورتوں کی بے حرمتی کرنے اور ایذارسانی میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔ نواب کی فوج قلعہ میں داخل ہوئی تو ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ سب ولیم واٹس کی بیوی کے پاس پناہ گزین تھیں۔ شور سنتے ہی چند سپاہی مکان کے دروازے پر رک گئے۔ خواتین کی موجودگی کا علم ہونے پر وہ بردباری سے کہنے لگے:

"دروازہ بند کر لیجیے! ہم یہاں دو پہریدار چھوڑے جا رہے ہیں۔ آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اگر کسی سپاہی نے کوئی زیادتی کی تو نواب صاحب اسے تختہ دار پر لٹکانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ شیرخوار بچوں کے

دودھ اور آپ لوگوں کے لیے کھانا پکانے کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ اگر چاہیں تو سرکاری لنگر سے پکا پکایا کھانا بھی فراہم کیا جا سکتا ہے۔ نواب صاحب کا حکم ہے کہ اپنی ماؤں بہنوں کی طرح آپ کا احترام کیا جائے۔" اس پیشکش اور مہذب انداز پر وہ سب عورتیں دنگ تھیں۔ اب انہیں اپنے مردوں کی عافیت کا خیال ستانے لگا جنہیں نواب کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔

"یہ لوگ ہمارے ملک کے دشمن ہیں لیکن ہم ان سے بہترین حسن سلوک کے قائل ہیں۔" وہ اپنی روایتی رواداری کی زد میں تھا۔

"قبلہ عالم! انہیں کوئی تو سزا ملنی ہی چاہیے۔" عمر بیگ نے ادب سے کہا۔

"ان کی یہی سزا کافی ہے کہ آئندہ تجارت پر مکمل پابندی عائد ہوگی۔ یہ اپنے قدم دوبارہ کبھی نہیں جما سکیں گے۔ اگر اللہ کی رضا شامل حال ہوئی تو ہم اس مکار قوم کے ہر فرد کو سمندر میں دھکیل دیں گے۔" سراج الدولہ نے اپنی حکمت عملی واضح مرتب کر لی تھی۔

"ہمارے لیے اب کیا حکم ہے حضور؟" عمر نے دریافت کیا۔

"اب ان لوگوں کے گرد شکنجہ کسنا ہے جن کی شہ پر ولیم واٹس نے ہمارے سامنے مزاحمت کی جسارت کی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ [illegible] سرزمین کی طرف کوچ کیا جائے جہاں سازشیں جنم لیتی ہیں۔" نواب نے کہا۔ اسے گورنر راجر ڈریک اور ہالویل سے نمٹنا تھا۔

فرنگی اور نگ کے مرکز [illegible] تک پہنچنے کے لیے شاہی فوج نے ایک سو ساٹھ میل کا فاصلہ گیارہ دنوں میں طے کیا۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں فتنوں کو نہایت [illegible] سے پروان چڑھانے کے بعد دوسرے علاقوں تک پہنچایا جاتا تھا۔ یہاں جنگی سازوسامان کی بھی بے جا کثرت تھی۔ [illegible] ڈریک اور جارج منچن انتظامات کا جائزہ لے کر سپاہیوں کا حوصلہ بڑھانے میں مصروف تھے۔

"ہمیں اس وقت صرف سفید شہر کی حفاظت پر توجہ دینی چاہیے۔" ہالویل نے کہا۔ وہ ڈریک کے ساتھ مباحثہ میں الجھا تھا۔ کلکتہ میں مختصر فاصلے پر دو آبادیاں موجود تھیں۔ ایک بستی میں کمپنی کے سفید فام ملازم اپنے اہل خانہ کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ اس مناسبت سے اسے 'سفید شہر' کہا جاتا تھا۔ مقامی ملازمین اور اہل خانہ کی آبادی الگ تھی جسے 'کالا شہر' کا نام دیا گیا تھا۔ گورنر دونوں شہروں کی حفاظت کا حامی تھا۔

"یہ لوگ بھی ہماری ذمہ داری ہیں۔ ہمارے لیے اپنے نواب سے لڑ رہے ہیں۔" جارج منچن نے بھی اخلاقیات جتائی۔

"ہمارے لیے نہیں، یہ صرف اپنے مطلب اور لالچ کے لیے لڑ رہے ہیں۔ مجھے ان کے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ نفرت و حقارت سے بولا۔ "مجھے انسانیت و اخلاق کے درس دینے کی بجائے قاسم بازار کی ذلت کا ادھار چکانے پر توجہ دو۔ نواب کو یہاں آمد کی بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی۔" اس کے حکم پر فرنگیوں نے نواب سراج الدولہ کو اپنے دستے مرتب کرنے کی مہلت دیے بغیر ہی گولہ باری کا آغاز کر دیا۔ قلعہ مضبوط تر تھا۔ شاہی توپوں کی اگلتی آگ سے رتی بھر فرق نہ پڑتا۔ شہر کے شمالی طرف ایک وسیع و عریض خندق تھی جس کی دوسری جانب ہتھیار بدست فرنگی سپاہی براجمان تھے۔ کالے اور سفید شہروں کو فتح کرنے اور خندق عبور کرنے کے بعد ہی قلعہ تک رسائی ممکن تھی۔ مسلسل گولہ باری سے توپوں کے دہانے گرم ہو چکے تھے لیکن پیش قدمی اب بھی صفر تھی۔ چت پور کے مقام پر ہونے والے حملہ نے شاہی فوج کے قدم اکھاڑ دیے۔ وہ پسپائی اختیار کرتے ہوئے 'دم دم' تک آپہنچے۔ یہ خبر سن کر نواب کے لیے خاموش رہنا ممکن ہی نہ تھا۔ اس نے برستی گولیوں اور دھماکوں میں اپنے ساتھیوں سے ولولہ انگیز خطاب کیا۔

"یہ پسپائی ہمیں ہرگز قابل قبول نہیں ساتھیو! آج اگر ہم اس مقام سے واپس لوٹ گئے تو تاریخ میں بزدل کہلائیں گے۔ ایسا کیونکر ممکن ہے؟ ہم تو وہ قوم ہیں جس کا ماضی بہادری کی درخشندہ مثالوں سے اٹا ہے۔ کیا تم سب نہیں جانتے کہ ہم اس نبی ﷺ کی امت ہیں جس کے نواسہ نے سجدے میں گردن کٹا دی تھی لیکن باطل کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئے تھے۔ آج اگر شکست تسلیم کر لی تو ہماری عورتیں فرنگیوں کی ہوس کی سیج پر پامال ہونے لگیں گی۔ ہمارے بچوں کے سر نیزوں کی انیوں پر اچھالے جائیں گے۔ اٹھو میرے ساتھیو! کسی آندھی کی طرح دشمن پر چھا جاؤ۔ ان مٹھی بھر فرنگیوں کو ان کی اصل اوقات یاد کروا دو۔ اٹھو! آگے بڑھو۔" نواب نے یہ الفاظ ادا کرتے ہی اپنا خنجر نکالا اور پوری قوت سے دشمن کی صفوں کی جانب پھینک دیا۔ خنجر کچھ فاصلے پر گر کر زمین میں پیوست ہو گیا۔ وہ

[illegible] بری طرح [illegible] [illegible] قلعہ [illegible] انتظار [illegible] تھا [illegible] سپاہی نے ناقابلِ یقین بہادری کا مظاہرہ کر کے [illegible] تھا۔ [illegible] سیلاب کی یورش سے بچاؤ کے لیے شہر میں تمام فرنگی مکان خالی کروا لیے گئے۔ عورتوں اور بچوں کے لیے قلعہ میں رہنے کا حکم تھا۔ دوسری جانب کالے شہر کے مکینوں کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ کم ظرفی کا عظیم ترین مظاہرہ کرتے ہوئے [illegible] ڈالنے سے رسد کا تمام تر سامان قلعہ میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر سراج الدولہ کی روح کانپ [illegible] گرفتار ہو گیا تھا۔ پیش رفت کی صورت میں ان ہی کے ہم وطن افراد انہی کے گھوڑوں کے سموں تلے کچلے جاتے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ ان کے باپ بھائی اور بیٹے چند سکوں کے عوض اپنا ضمیر فروخت کر کے فرنگیوں کی جھولی میں جا بیٹھے تھے۔ کالے شہر کے رہائشیوں کو محفوظ رستہ دینے کے انتظار کے بعد آگے بڑھنے کی صورت میں، مکار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہرکاروں کو ستانے اور اپنی قوت مجتمع کرنے کی مہلت مل جاتی۔ نواب کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خندق تھی۔ مرہٹوں سے بچاؤ کے لیے کھودی گئی اس خندق نے آج ثابت کر دیا تھا کہ انگریزوں نے اس جنگ کی تیاری جانے کب سے شروع کر رکھی تھی۔

اگلی صبح شدید دوطرفہ گولہ باری ہوئی۔ نواب کے حکم پر چند سوار شمالی خندق میں کود گئے۔ واقعات بہت تیزی سے رونما ہو رہے تھے۔ شاہی فوجیں شہر کی قریبی عمارتوں پر قابض ہو کر پوری قوت سے آتش باری کر رہی تھیں۔ ظہیر بیگ کی للکار پر سپاہیوں میں ایک نئی جان پیدا ہو گئی۔ عرفان مرزا نامی سپاہی خندق کے پار پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر دیگر سپاہیوں کا ولولہ بھی مہمیز ہو گیا۔ دشمن کی گولہ باری اور عرفان کی شہادت نے ان سبھی کو جنون میں مبتلا کر دیا۔ وہ جسم و جان کی تمام تر قوت سے دشمن سے بھڑ گئے۔ خوش قسمتی انہیں کمک ملتے ہی یہ حملہ مزید مؤثر ہو گیا۔ شاہی فوج کے خندق عبور کرتے ہی فرنگی لشکر میں انتشار برپا ہو گیا۔ آن کی آن میں [illegible] ہو گیا تھا۔ فرار ہوتے فرنگی اپنے پیچھے [illegible] چھوڑ گئے تھے۔ شاہی افواج دونوں اطراف سے [illegible] فصیل کی قریبی عمارتوں پر تو قبضہ ہو ہی چکا تھا۔ انگریزوں کے پاس فصیل سے بھی بھاگنے کے سوا کوئی [illegible] نہیں تھا۔ [illegible] بیت سے ظہیر اور اس کے ساتھی مزاحمت کا حق ادا کر رہے تھے۔ گولہ باری نے تباہی و بربادی کی ایک نئی داستان رقم کر دی تھی۔ قلعہ کا دروازہ کسی کج ادا محبوب کی بانہوں کی طرح وا ہوتا نظر آ رہا تھا۔

[illegible] دونوں اطراف سے بڑھنے والی سپاہ شہر کے مرکز میں آ [illegible] شہر کی مرکزی عمارت پر بھی شاہی علم لہرا دیا گیا۔ فرنگی اب قلعہ میں محصور ہو چکے تھے۔ شہر فتح ہوتے ہی سراج الدولہ نے امی چند کے مکان میں ڈیرہ جما لیا۔ اس فتح کے بعد آرام و سکون کی بجائے [illegible] نے متفقہ طور پر طبلِ جنگ بجائے بغیر چاندنی رات [illegible] اٹھاتے ہوئے دوبارہ حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ حکمت [illegible] کامیاب ثابت ہوئی۔ سپاہی اپنی توپیں قلعہ کے قریب لے [illegible] توپوں کی گھن گرج [illegible] لمحے قیامت خیز تھے۔ آگ برساتی [illegible] در و دیوار لرزا رہی تھی۔ ہالویل اور ڈریک کی [illegible] ہو گئی۔ بوکھلاہٹ میں مبتلا ان فرعون صفت افراد کو کسی درمیانی راہ کی تلاش تھی۔ اس وقت ذہن میں فوری خیال دریائے ہگلی میں لنگر انداز جہازوں 'پرنس جارج'، 'ہنٹر'، 'ڈوروالے'، 'فیم'، 'لائیٹ لی'، 'ڈلی جنس'، 'فارچون'، 'ایڈن'، 'لنڈن' اور 'نیپچون' کی طرف گیا۔ خواتین اور بچوں کو ان جہازوں پر سوار کروانے کا منصوبہ بناتے ہوئے یقینی شکست کی صورت میں خود بھی راہِ فرار اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ان کے حواریوں شوکت جنگ اور میر جعفر نے بے طرح مایوس کیا تھا لیکن ہالویل کا شیطانی دماغ اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں سے کہاں تھا؟ اس نے شاہی افواج کو تقسیم کرنے کے لیے ایک خصوصی دستہ 'سکھ ساگر' بھیج دیا۔ اس دستے کو قتلِ عام اور بربریت کی کھلی اجازت تھی۔ اگلے کچھ ہی گھنٹوں کے اندر سکھ ساگر میں ایک قیامت برپا ہو چکی تھی۔ نواب سراج الدولہ تک یہ خبر پہنچی، عالمِ طیش سے اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس نے فوری طور پر اپنے سپاہیوں کو ان درندوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کر دیا۔ اس محاذ پر بھی ناکامی کے بعد ہالویل اور راجر ڈریک نے کمپنی کا خزانہ جہازوں پر منتقل کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ ان کی اس حرکت نے کمپنی ملازمین اور فوج کے حوصلے پست کر دیے۔ اگلی صبح شاہی فوج نے ایک اور حملہ کیا جس کے [illegible]

ڈریک فرار ہو کر جہاز پر سوار ہو گیا۔ ہالویل نے اپنی خودنمائی سے مغلوب طبیعت سے مجبور ہو کر عین موقع پر فرار کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ نواب سراج الدولہ کی رحم دل فطرت کے باعث اسے یقین تھا کہ وہ کمپنی افسران کے متعلق کوئی انتہائی فیصلہ نہیں کرے گا لہٰذا اپنے سپاہیوں کی رہنمائی اور ہیرو بننے کے لیے وہ مہم جو بن کر وہیں موجود رہا۔

چند گھنٹوں کی لڑائی کے بعد شاہی فوج بالآخر قلعہ میں داخل ہو گئی۔ ظہیر نے اپنے دستے کے ساتھ بحری جہازوں پر دھاوا بول دیا۔ شاہی کشتیاں دریا میں دیکھتے ہی 'پرنس جارج' کے کپتان نے لنگر اٹھا دیا لیکن بدقسمتی سے جہاز کنارے کی دلدل میں پھنس گیا۔ سپاہیوں کو گرفتار کرنے کے بعد جہاز کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ 'نیپچون' اور 'کلکتہ' پر قبضہ کے باوجود آٹھ جہاز اپنے بچاؤ میں کامیاب رہے۔ ان دونوں جہازوں پر مال و دولت کے علاوہ خواتین اور بچے بھی تھے تاہم اخلاقیات کا روایتی مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں پناہ دے دی گئی...... ہالویل اب ہر سمت سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس نے بحالتِ مجبوری صلح کا پرچم بلند کر دیا۔ سکھ ساگر کے اس درندہ صفت انسان کو نواب کے سامنے پیش کیا گیا تو مکاری و منافقت میں اپنی مثال آپ ہالویل نے دانستہ طور پر پشیمانی اور شرمندگی کا اظہار شروع کر دیا۔ [illegible] ہاں وہ بات الگ تھی کہ اس کے [illegible] میں ایک اور موقع ملتے ہی ہندوستانی حکومت کے [illegible] کے جذبات مچل رہے تھے۔ سراج الدولہ کے حکم [illegible] مرشد آباد بھجوا دیا گیا۔ وہ اس کے متعلق پورنیا سے واپسی پر کوئی [illegible] چاہتا تھا۔

ہالویل سے فراغت [illegible] کرشن داس کو طلب کیا گیا...... مال و دولت [illegible] کے باپ کو زنداں برد کر دینے والا کرشن اپنی متاع [illegible] کے ہاتھوں لٹوا دینے کے بعد کسی بھکاری سے بھی ابتر حالت [illegible] نے اس کی گریہ و زاری اور آہ و فغاں سن کر اپنی رحم دل فطرت سے مجبور ہوتے ہوئے کرشن داس کو معافی کا پروانہ تھما دیا۔ [illegible] کے بعد ڈریک اور اس کے ساتھی 'فلتا' فرار ہو گئے۔ نواب کو بالآخر سکون کا سانس میسر آیا۔ اب وہ شوکت جنگ کے خلاف مہم پر بھرپور توجہ مرکوز کر سکتا تھا لیکن اس اطمینان میں بھی خلش کا ایک کانٹا مکمل شدت سے اسے بےکل رکھے ہوئے تھا۔ اس کی فوج میں بیشتر توپچی فرانسیسی اور پرتگالی تھے۔ اکثر توپیں چلاتے ہوئے ان کے نشانے خطا ہو جاتے۔ نواب کی بصیرت کے لیے یہ بھانپنا مشکل نہ تھا کہ وہ اپنے غیرملکی [illegible] اولادوں نے [illegible] کو نشانے کے [illegible] [illegible] چند کو حاکم کلکتہ مقرر کرنے کے بعد پورنیا کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ نواب شوکت جنگ کا کانٹا نکالنا بھی لازم تھا۔ منیر بیگ اپنے بزدل عزیز حکمران کے ساتھ جانے کے لیے بہت پُرجوش تھا۔ اس بے خبر کو معلوم ہی نہ تھا کہ اپنی تمناؤں اور اعلیٰ عہدہ پانے کی خواہشات کی ڈگڈگی پر رقصاں منیر بیگ گھسیٹی بیگم کی ناکام بغاوت سے بددل ہو کر شوکت جنگ کی فوج میں شامل ہو چکا تھا۔

تقدیر نے دو خالہ زاد بھائیوں کی اس جنگ میں ماں جایوں کو بھی تلوار بدست بنا کے دو بدو لانے کا مکمل اہتمام کر لیا تھا۔

☆......☆

منیر بیگ کے خواب بہت بلند تھے۔

وہ شوکت جنگ کی فتح کے بعد کسی ضلع کا حاکم بن کر عش آفتاب زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ شوکت کو اس کے کئی مصاحبین نے سراج الدولہ کے فرنگیوں سے الجھاؤ کا فائدہ اٹھانے پر اکسایا تھا لیکن عیش و عشرت میں غرق اس عاقبت نااندیش کے لیے شراب نوشی اور اپنے حرم کے سوا کہیں رخ کرنے کا یارا ہی نہ تھا۔ اس کی یہ حرکات منیر کو دلی آزار میں مبتلا کر دیتیں۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ گھسیٹی بیگم کے بعد ایک بار پھر اس نے اپنی آرزوؤں کا محور غلط شخص کو منتخب کر لیا ہے۔ شوکت جنگ جام لنڈھائے دربار میں آتا، تخت پر بیٹھا اول فول باتیں کرتا اور طبیعت گھبرانے پر کنیزیں طلب کر لیتا۔ اس کی اول جلول حرکات پر درباری پیٹھ پیچھے خوب ہرزہ سرائی کرتے۔ وہ اپنی نوعیت کا واحد حکمران تھا جو کوئی اہم موضوع زیرِ بحث پاتے ہی کنیزوں سے بغلگیر ہوتے ہوئے حرم میں جانے کو ترجیح دیا کرتا۔ شراب کے نشہ میں ہمہ وقت مخمور شوکت کو دربار میں موجود ہر شخص سراج الدولہ کا جاسوس محسوس ہوتا تھا۔ ذہنی پراگندگی کا یہ عالم تھا کہ ذاتی حیثیت میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قاصر رہتا۔ نواب سراج الدولہ نے 'راس بہاری' کو اپنا سفیر بنا کر اس کے پاس بھیجا تو شوکت نے سفارتی آداب کی دھجیاں اڑاتے ہوئے بہاری کو بے عزت کرتے ہوئے دربار سے نکال دیا۔ اسے سلطان دہلی کی جانب سے پروانہ تعیناتی پانے کا بہت زعم تھا۔ شوکت کی زبان سے ادا ہونے والی مغلظات ان سب سے سوا تھیں۔

سراج الدولہ کو ان حرکات کا علم ہوا تو وہ گہرے صدمہ میں مبتلا ہوگیا۔ اس کا حساس دل ہندوستان میں کسی خودرو پودے کی طرح پروان چڑھتی غداری اور فتنہ پروری سے بے حد بوجھل رہتا۔ فضائیں زہر آلود تھیں۔ اپنے خالہ زاد بھائی کے خلاف لشکر کشی کرتے ہوئے اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ ناسور بننے والے اس عضو بدن کو کاٹے بغیر اب کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس نے اپنی فوج کو پیش قدمی کا حکم صادر کردیا۔

دوسری جانب شوکت جنگ کی سپاہ بھی پٹنہ سے روانہ ہو چکی تھی۔ سراج الدولہ اس روز بہت پژمردہ تھا تاہم اپنے لشکر سے بھرپور خطاب کرتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کا فریضہ بہترین انداز میں نبھایا۔ شوکت کی سپاہ بے ترتیبی سے پھیلی تھی۔ اس کے سالار فن حرب سے کسی بھی قسم کے لگاؤ سے عاری محسوس ہورہے تھے۔ منیر بیگ ہی وہ واحد شخص تھا جو مکمل ذمہ داری اور خلوص سے اپنی ذمہ داریاں نبھا رہا تھا۔ خود شوکت کا تو یہ عالم تھا کہ وہ ہاتھی پر بیٹھا شراب نوشی میں مگن تھا۔ اپنی گولہ باری کے نتیجہ میں سراج الدولہ کی فوج میں انتشار دیکھ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے سپاہیوں کو جھیل کے پار حملہ کرنے کا حکم جاری کردیا۔ اس کم فہم اور احمق شخص کی ذہنی پراگندگی اس حقیقت کا ادراک کرنے سے عاری تھی کہ جھیل کے دوسری جانب موجود دلدل اس کی فوج کے لیے موت کا پروانہ ثابت ہوسکتی ہے۔ خودکشی کے مترادف اس حکم کے بعد وہ شراب کے نشے میں دھت اپنے حرم سرا کی جانب بڑھ گیا جسے وہ میدان جنگ میں بھی ساتھ لیے موجود تھا۔ اس کے خیمہ میں عیش و عشرت کا بازار گرم تھا۔ میدان جنگ میں اس کے احمقانہ حکم کی تعمیل کرتے سپاہی ایک نئے آزار میں مبتلا ہوگئے۔ وہ جھیل کے پانی سے نکلتے تو دلدل میں پھنس جاتے۔ اس بلائے جان سے نجات پا کر سخت زمین تک پہنچ ہی پاتے کہ سراج الدولہ کی فوج ہتھیاروں کی زد میں لے لیتی۔ مایوسی ذہنی شکستگی میں تبدیل ہونے لگی۔ شوکت جنگ کے خیمہ تک دشمن کی آمد کی خبر پہنچی تو کنیزوں میں ایک کہرام برپا ہوگیا۔ شوکت کسی نہ کسی طرح ہاتھی پر سوار کروایا گیا۔ نشہ کی شدت سے وہ اپنا وجود تک سنبھالنے سے قاصر تھا۔ بددل سپاہ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اسے کسی نہ کسی طرح جھیل تک پہنچایا گیا لیکن اسی لمحہ مخالف سمت سے آئی ایک اندھی گولی نے اس کی پیشانی میں سرخ روزن بنا کر سانسوں کی ڈور منقطع کردی۔ شوکت کی موت نے سپاہیوں کے رہے سہے حوصلے بھی ختم کردیے۔ ان کے قدم مکمل طور پر اکھڑ گئے تھے۔ منیر کی حالت سب سے زیادہ قابل رحم تھی۔ گھسیٹی بیگم اور شوکت جنگ کی مدد سے بدترین ہزیمت اٹھانے والے منیر بیگ کے دل میں اب بھی آرزوؤں کی سسک جواں تھی۔ شاہی فوج کو جرنیل موہن لال کی رہنمائی میں مفرور سپاہیوں کا تعاقب کرتے پا کر وہ گھنے جنگلوں میں روپوشی اختیار کرتا 'قلتا' جا پہنچا۔ خوابوں کے جگنو مٹھی میں بند کرلیتا [illegible] اسے مزید خلشوں میں مبتلا کرنے والی تھی۔

☆......☆

نواب سراج الد[illegible] پورنیا پر قابض ہوچکا تھا۔

ان پے در پے فتوحات کے علاوہ خزانے سے موصول ہونے والی نوے لاکھ کی رقم سے ملنے والا اعتماد سب سے سوا تھا۔ اس جذبہ ہمدردی [illegible] ہوکر ہالویل کو رہا کردیا۔ اس زہریلے انسان نے قید [illegible] نجات پاتے ہی قلتا کا رخ کیا جہاں اس کا مطلوبہ [illegible] رہا تھا۔ نئے حاکم کلکتہ 'مانک چند' کے محبوب و مخصوص [illegible] متر' نے زنداں میں ایک نئے کھیل کا آغاز کر رکھا تھا۔ وہ پہریداروں اور دیگر ملازمین کی مٹھیاں گرم کرکے قلتا تک حساس خبریں پہنچانے لگا تھا۔ ہالویل کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے منیر کو بھیس بدل کر کلکتہ روانہ کردیا۔ منیر رشوت دے کر گوبند رام سے ملا اور اسے 'سرکاری' طور پر خبر رسانی کا عہدہ سونپ آیا۔ اسی دوران امی چند بھی کلکتہ چلا آیا تھا۔ راجر ڈریک نے اپنے اس دیرینہ کرم فرما کو قلتا آنے کے لیے مدعو کیا لیکن وہ نواب سراج الدولہ سے حقیقتاً خوفزدہ ہوچکا تھا۔ امی چند ڈریک کو کلکتہ بلوانے پر مصر رہا مگر اب کسی بھی فرنگی میں وہاں جانے کا یارا نہ تھا۔ اس موقع پر ایک بار پھر قرعہ فال منیر کے نام ہی نکلا جس نے امی چند کی مطلوبہ رقم کمپنی سے لے کر بحفاظت اسے پہنچا دی۔ سازشوں کا بازار ایک نئے سرے سے گرم ہوگیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد جگت سیٹھ بھی اس 'کارخیر' میں شامل ہوگیا۔ وہ سراج الدولہ کی جانب سے لگائے گئے نئے ٹیکسز کے باعث ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ ان شرپسند عناصر کے مابین اپنا 'شملہ' بلندترین رکھنے کے لیے ہالویل ایک نئی کہانی تراش کر ہم وطنوں کی ہمدردیاں سمیٹنے لگا۔ زنداں میں گزرے چند دن کا احوال بیان کرتے ہوئے اس نے مبالغہ آمیزی کی انتہا کردی۔ نواب سراج الدولہ کی اس قید کو 'بلیک ہول' ثابت کرتے ہوئے اس نے نہایت افسانوی انداز میں خود پر ڈھائے گئے جبر وستم کی دہائیاں دینی شروع

کردیں۔ چھ گز وسیع و عریض اس کمرے میں شام کے بعد سپاہیوں کو قید کیا گیا تو جلتی ہوئی عمارتوں کی تپش ناقابل برداشت تھی۔ گرمی کی شدت بڑھتی ہی چلی جارہی تھی.... قیدیوں کو مزید اذیت دینے کے لیے زنداں میں دھواں چھوڑ دیا گیا۔ کھانسی سے بے حال ہوتے قیدی دروازے اور کھڑکیوں کی طرف لپک کر جان بچانا چاہتے تھے لیکن ایک دوسرے کے قدموں تلے روندے جاتے رہے۔ اس بھگدڑ اور دھوئیں میں سوا سو افراد جان کی بازی ہار گئے۔ باقی ماندہ تیئس لوگ نیم مردہ تھے جو زیادہ دیر تک موت کے سامنے مزاحمت نہ کرسکے۔ مجھے بھی مردہ سمجھ کر پھینک دیا گیا تھا لیکن قدرت کو ابھی میری زندگی منظور تھی۔" اس کے انداز بیان اور ڈرامائی کیفیات پر فرنگی عورتوں میں کہرام برپا ہوکر رہ گیا۔ وہ چلاتے ہوئے نواب سراج الدولہ اور مسلم حکومت کو کوسنے دینے لگیں جو تہذیب و انسانیت کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے۔ انگریز افسران ہندوستانی حکومت کے پرخچے اڑا دینے کی قسمیں کھا رہے تھے۔ ان تمام شوریدہ سر افراد کی یکجائی ہی کیا کم تھی کہ بنگال کے سیاسی افق پر ایک ایسے بھیڑیا صفت انسان کی آمد ہوئی جس کی مکاری اور بربریت نے ہندوستان کی تاریخ کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔

کرنل رابرٹ کلائیو مدراس سے 'ایڈمرل واٹسن' کا جنگی بیڑا لیے قلتا آن پہنچا تھا۔

☆......☆

[illegible] 1756 کو [illegible] تکھم' نامی نمائندہ کے توسط بنگال کے بدترین حالات کی خبریں مدراس کی فرنگی کاؤنسل تک پہنچیں تو کاؤنسل [illegible] پیدا ہوگئی۔

بنگال میں ہونے والی اس ذلت آمیز شکست کے ذمہ دار سراج الدولہ کو کچلنا ان کے لیے بے حد ضروری ہوگیا تھا بصورت دیگر ہندوستانی سرزمین ان [illegible] کے لیے تنگ پڑ سکتی تھی۔ نواب سراج سے مقابلہ اب [illegible] وسائل کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ کاؤنسل کے [illegible] شاہ انگلستان کے ملازم امیرالبحر واٹسن کو وطن پرستی کی [illegible] ہوئے تعاون کرنے کے لیے رضامند کرلیا۔ یہ جنگ [illegible] دہلی اور لندن کے مابین نہ تھی تاہم عزت و وقار کی بحالی اور اقتدار کی بقاء کے لیے سمندری بیڑے کا استعمال ازخود جائز تصور کرلیا گیا۔

امیرالبحر کے ماتحت 'کینٹ'، 'کمبرلینڈ'، 'سالسبری'، 'ٹائیگر' اور 'برج واٹر' نامی جہاز تھے۔ کمپنی نے مدراس سے فرنگی اور دیسی سپاہی بنگال روانہ کرنے کے لیے 'والپول'، 'بلینز' اور 'مارلبرو' کے شاہی بیڑے بھی ہمراہ کردیے۔ توپ بردار 'پروٹیکٹر' کے علاوہ 'لیپوگ' اور 'باٹیا' نے بھی ان کی طاقت میں کئی گنا اضافہ کردیا۔ سمندری کمانڈر واٹسن جبکہ بری فوج کی کمان کلائیو کے پاس تھی۔ رابرٹ کلائیو ایک خطرناک شخص تھا جو اس سے قبل بھی مدراس میں کئی معرکوں کا اہم حصہ رہ چکا تھا۔ دیسی سپاہیوں کی نفسیات پر مکمل عبور کے باعث اسے علم تھا کہ ان کی شکست سے دلبرداشتہ ہوکر سراج الدولہ کے پاس پہنچنے والے افراد کی یہ کیفیت عارضی ہے۔ انگریزی قوت کا ادراک ہوتے ہی وہ ان کے خیمہ کا رخ کرلیں گے۔

واٹسن بالاسور میں لنگر انداز ہو چکا تھا۔ اس نے ولندیزی و فرانسیسی نمائندوں بسڈم اور رینو پر دباؤ ڈالتے ہوئے اس بات پر مجبور کردیا کہ وہ سراج الدولہ کی مدد سے کنارہ کش ہوجائیں۔ حکم عدولی کی صورت میں انگلستان کے شاہی بیڑے سے گولہ باری کی دھمکی ہی انہیں ہراساں کردینے کے لیے کافی تھی۔ فرانسیسیوں اور ولندیزیوں سے اس نئے معاہدہ کی توثیق کے لیے واٹسن پندرہ دسمبر کو قلتا پہنچا جہاں اسے 'ڈلاویز' اور 'کنگ فشر' کی صورت میں مزید طاقت مل گئی۔ کرنل کلائیو بھی فورٹ ولیم کی فرنگی کاؤنسل کے اجلاس میں مکمل دلچسپی لے رہا تھا۔ اس اجلاس میں میر جعفر سے فائدہ اٹھانے کے طریقے زیر بحث رہے۔ کرنل نے اپنے اراکین کو واضح کردیا کہ اس کا مطمع نظر محض کلکتہ کی فتح نہیں بلکہ اس علاقہ پر فرنگی اقتدار کا دائمی تسلط اور سراج الدولہ کی یقینی ہلاکت ہے۔ نواب کی موجودگی میں ان کی بقاء کسی بھی طور ممکن ہی نہ تھی۔ کلائیو نے منیر بیگ کو طلب کیا اور پُررعونت انداز میں بات کرتے ہوئے کہنے لگا:

"میں نے تمہاری کارکردگی کی بہت تعریفیں سن رکھی ہیں منیر! وقت آگیا ہے کہ اپنی وفاداری دکھاتے ہوئے خود کو مزید انعام و اکرام کا اہل ثابت کرو۔"

"میں نے ہمیشہ جان ہتھیلی پر رکھ کر عزت مآب کمپنی کی مدد کی ہے۔" منیر نے کہا۔

"بالکل کی ہوگی اس کے بدلہ راتب بھی خوب پایا ہوگا۔" اس نے تکبر سے جتایا۔ "ابھی میں تمہیں اور امی چند کو میر جعفر کے پاس روانہ کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری طرح ہم بھی سراج الدولہ کے دشمن ہیں اس لیے میر جعفر کو بنگال کی حاکمیت سونپنا چاہتے ہیں۔"

منیر کی روح پر یہ الفاظ خاردار کوڑے کی طرح

برسے۔اس انقلابی لمحہ میں منیر بیگ پر اپنا ہی کردار بہت بھیانک انداز میں آشکار ہوا تھا۔ذاتی اقتدار کی خواہش نے اسے نجس جانور کے درجہ تک پہنچادیا تھا۔وہ ان تیزابی الفاظ کی اذیت برداشت کرنے کی کوشش میں بے حال ہورہا تھا۔اس کی یہ کیفیت و تغیر کلائیو کی عقابی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔کرنل نے کسی بھی غیر متوقع صورت حال سے بچاؤ کے لیے منیر کو نظر بند کرنے کے احکام جاری کردیئے۔قید تنہائی میں اپنے اعمال پر آتشیں آنسو بہاتا منیر ایک آخری موقع کے لیے دعا گو تھا۔وہ اپنی تمام تر غلطیوں کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔خود احتسابی کی اذیت اس کے وجود کے لیے رستے ہوئے آبلے بننے لگی تھی۔

☆......☆

کرنل رابرٹ کلائیو کی افواج کلکتہ کی طرف رواں دواں تھیں۔

اس کی کمان میں ڈیڑھ ہزار سپاہی شامل تھے۔دشوار گزار آبی و دلدلی رستوں سے گزرتے یہ سپاہی 'قلعہ بج بج' سے ڈیڑھ میل قبل ہی رک گئے۔مانک چند نے اطلاع ملتے ہی تین ہزار سپاہیوں کے ہمراہ پیش قدمی کا آغاز کردیا۔شومئی قسمت کرنل کے محافظ دستے کے علاوہ تمام سپاہی محو استراحت تھے۔موقع سے فائدہ اٹھاتے ہی مانک چند نے حملہ کا حکم دے دیا۔وقتی بھگدڑ کے بعد فرنگی سپاہ سنبھل گئی۔ان کے پاس بہتر توپیں تھیں جن سے بارش کی برستے گولوں نے مانک چند کی راہیں مسدود کردیں۔نتیجتاً ان کے قدم اکھڑ گئے۔

دوسری جانب واٹسن کا بحری بیڑہ بھی فرانسیسی اور ولندیزی جہاز رانوں کی مدد سے دریائے ہگلی سے بج بج کے قریب پہنچ گیا تھا۔جہازوں کی توپیں قلعہ پر آگ برسانے لگیں۔دیسی سپاہی مزاحمت جاری نہ رکھ سکے۔ان کے میدان چھوڑتے ہی قلعہ فتح ہوگیا۔مانک چند نے اس صورت حال پر قابو پانے کے لیے دریائے ہگلی میں موجود چند جہازوں کو غرق کرواکر رکاوٹیں کھڑی کرنے کا حکم صادر کردیا۔اس ضمن میں 'ہابو سارنگ' نامی ایک پیشہ ور ملاح کی خدمات حاصل کی گئیں تاکہ وہ دریا کے وسط میں جہاز ڈبو کر بحری بیڑے کی پیش قدمی روک دے۔یہ حکمت عملی بہت کامیاب اور اثر انگیز ثابت ہوسکتی تھی لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ ہابو سارنگ کا ضمیر بھی غداری کی باد سموم نے مردہ کردیا تھا۔اس نے واٹسن کو مکمل منصوبے سے باخبر کردیا اور انعام و اکرام کے عوض کلکتہ تک راہ ہموار کردی۔واٹسن نے براستہ ہگلی اور کلائیو نے خشکی کی راہ سے کلکتہ پر دھاوا بول دیا۔اس موڑ پر مانک چند کی قوت برداشت اور ظرف کا پیمانہ بھی لبریز ہوگیا۔اس نے نواب سراج الدولہ کے لیے اس بیگار سے خلاصی بہتر سمجھتے ہوئے سہولت و آسائشات کے عوض کلکتہ فرنگیوں کے حوالے کردیا۔

ہگلی فتح کرتے ہی نواب سراج الدولہ کے اناج کے ذخائر تباہ و برباد کردیئے گئے۔انگریز سپاہ نے دیہاتوں میں ظلم و بربریت کی شرمناک داستانیں رقم کرتے ہوئے شیطان کو بھی شرمانے پر مجبور کردیا۔کلکتہ پر قابض ہوتے ہی وہ مزید پیش قدمی جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن نواب کی آمد نے اس ارادہ پر عمل پیرا نہ ہونے دیا۔سراج الدولہ کی شجاعت سے خائف فرنگی اعلیٰ افسران نے رضامندی سے باقاعدہ جنگ کا اعلان کردیا۔3 جنوری کو انہوں نے بھی انگلستان کے شاہی نمائندہ کی حیثیت سے اس اعلان پر دستخط کر دیئے۔تاریخ میں پہلی بار انگلستان اور ہندوستان کی جنگ کا آغاز ہوگیا تھا۔ایک جانب انگلستان اس سونے کی چڑیا کو دائمی قید میں جکڑنے کے لیے اپنے تمام تر وسائل جھونک رہا تھا تو دوسری طرف سلطان دہلی ہنوز خواب غفلت کا شکار تھا۔

نواب سراج الدولہ نے اپنے امراء کی رضامندی کے خلاف بے جگری سے لڑائی جاری رکھی۔اس کی عددی اکثریت، دلیری اور جنگی حکمت عملی سے رابرٹ کلائیو کا پتا بھی پانی ہورہا تھا۔سراج الدولہ کے اٹھارہ ہزار سوار، پندرہ ہزار پیادہ سپاہی، چالیس ہزار قلی، چالیس توپوں اور پچاس ہاتھیوں کی خبریں ...اسے ہراس زدہ کیے ہوئے تھیں۔یہ بات تو اب طے تھی کہ میدان جنگ میں باوقار انداز میں جنگ فرنگیوں کے لیے ممکن ہی نہ رہی تھی۔ایسے مواقع پر ان کے شاطر دماغوں کی پٹاری میں سازشیں وافر مقدار میں موجود ہوتی تھیں۔رابرٹ کلائیو نے میر جعفر اور امی چند پر کچھ اس طرح دباؤ ڈالا کہ ان بے ضمیروں نے نواب کو جنگ بندی کے لیے مجبور کرنا شروع کردیا۔

"یہ آپ کیسی باتیں کررہے ہیں امی چند؟ فرنگی جسارت اب ناقابل برداشت ہوچکی ہے۔انگلستان کی شاہی افواج براہ راست اس جنگ میں شامل ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم جنگ بندی کا اعلان کردیں۔" امیر ہادی بلبلا اٹھا۔

"میں امیر ہادی سے متفق ہوں۔یہ جنگ جاری رہے گی۔فرنگیوں کی یہ یورش روکی نہ گئی تو وہ کسی بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح بنگال کو تہس نہس کرتے دہلی کی طرف بڑھ جائیں گے۔دہلی میں اتنی بساط نہیں رہی کہ وہ اس خطرہ کا سامنا کرسکے۔اس وقت صرف بنگال ہی مزاحمت و دفاع کا آخری قلعہ ہے۔" سراج الدولہ نے کہا۔

"عالم پناہ! یہ تاجر طبقہ ہی کی نہیں بلکہ سپاہیوں کی دلی آرزو بھی ہے۔" میر جعفر نے انکشاف کیا۔"سپاہی مسلسل جنگوں سے بیزار، بددل اور مایوس ہوچکے ہیں۔ایسی صورت میں وہ لڑائی کا حوصلہ کیونکر برقرار رکھ سکتے ہیں۔انہیں تازہ دم ہونے کی ضرورت ہے۔"

سراج الدولہ صدمہ و دکھ سے ساکت رہ گیا۔سپہ سالار کی سنائی گئی اس خبر نے اسے اعصابی شکستگی میں مبتلا کردیا تھا۔وہ رات اس کے لیے بہت بھاری تھی۔ذہنی دباؤ نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔اس کی جبری رضامندی بھانپ کر دو فرنگی نمائندے صلح نامہ لیے حاضر ہوگئے۔کرب و اذیت کی انتہائی حدوں سے گزرتے سراج الدولہ نے تار تار ہوتی روح کے ساتھ دستخط کرکے انگریزوں کی سابقہ تجارتی مراعات بحال کردیں۔برطانیہ سے آئی مصنوعات پر ٹیکس نہ لگائے جانے، کمپنی کو ہونے والے نقصان کے ازالہ اور فرنگیوں کے دشمنوں کو پناہ نہ دینے کے وعدے اس سے سوا تھے۔کپکپاتے ہاتھوں اور نم آنکھوں سے دستخط کرتے وہ شدت سے موت کی تمنا کررہا تھا۔

صلح نامہ کے بعد ہندوستانی امراء اور تاجروں کا جشن دیدنی تھا۔ان کا یہ جوش و خروش اور ولولہ انگیز خوشیاں دیکھ کر سراج الدولہ کو سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ شکست، ذلالت اور آبرو باختگی کے تمغے اپنے گلے میں لٹکائے یہ قوم آخر کس بات پر مسرت و شادمانی منا رہی ہے؟ انہیں یہ حقیقت سمجھ کیوں نہیں آتی کہ فرنگی ان کے لیے جال بچھا چکے ہیں جس میں جکڑے جانے کے بعد وہ صدیوں تک بھی پھڑپھڑاتے رہیں تو قفس سے رہائی ممکن نہ ہوسکے گی۔ اس کے درد کا کہیں کوئی درماں نہ تھا۔

☆......☆

جنگ بندی کی خبر قید خانے میں موجود منیر پر بجلی بن کر گری تھی۔اس نے دو پہریداروں کو گفتگو کرتے سنا تو اپنی ہی سماعت پر یقین کرنا دشوار ہونے لگا۔

"کیا یہ سب سچ ہے؟ نواب ایسا کیسے کرسکتا ہے؟" وہ قید خانہ کے دروازے تک چلا آیا۔

"خدا جانے کہ اسے کیا سوجھی؟" ایک سپاہی نے کہا۔

"میں نے تو سنا ہے فرنگیوں نے ہگلی کے دیہاتوں کو نذر آتش کرکے کھلیان بھسم کردیئے ہیں۔بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کردیا گیا ہے۔" دوسرا سپاہی قدرے بے اطمینان تھا۔

"تو اس قدر غمگین کیوں ہورہے ہو؟" منیر نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔"وہ تمہارے تو کچھ بھی نہیں لگتے ہوں گے۔تمہاری زندگی سلامت ہے، اہل خانہ فرنگیوں کے راتب پر خوب پھل پھول رہے ہیں سو تمہیں تو کوئی غم چھو کر بھی نہیں گزرنا چاہیے۔"

"کیا کہا تم نے؟" وہ سپاہی چلا اٹھا۔"راتب......"

"اب غیرت کو تازیانہ کیوں لگا؟" منیر تلخ ہوا۔"مجھے دیکھو! میں نے اپنی امنگوں کے لیے گھسیٹی بیگم کا ساتھ دیا، شوکت جنگ کے ناکارہ وجود کو وفادار جانور کی طرح میدان جنگ میں ڈھوتا رہا لیکن کیا صلہ ملا؟ مجھے اس زندان میں پھینک دیا گیا۔تم لوگ بھی وہی غلطی کررہے ہو۔ہماری فصلیں تباہ ہورہی ہیں، بچے قتل اور عورتیں پامال ہورہی ہیں اور تم ابھی تک فرنگی قید خانوں پر پہرہ دے رہے ہو۔ان قید خانوں پر جہاں تمہارے ہی ہم وطن محبوس ہیں۔کیا ہم انسان کہلانے کے بھی حقدار ہیں؟ ہم غدار ہیں۔وطن فروش ہیں۔انسانیت کے نام پر دھبّا ہیں۔اپنے ہاتھوں سے مادر وطن کی عصمت

> "میں نے تاریخ کی سب سے بڑی جنگ کو کئی برس بہت قریب سے دیکھا ہے۔جتنی سیاہی جنگ کے بادلوں میں ہوتی ہے آپ اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔جنگ کے اندھیرے گھپ اندھیرے ہوتے ہیں لیکن جتنی تیز اور خیرہ کرنے والی سفید روشنی سخت آزمائش کے دنوں میں زندہ قوموں اور باکردار افراد کے طرز عمل سے پیدا ہوتی ہے آپ اس کی طرف بھی آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتے۔روشنی جب اتنی روشن ہوجائے کہ آپ اسے دیکھ بھی نہ سکیں تو اسے نور کہتے ہیں۔" کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے۔"کہیں آپ مجھ سے مل کر صرف اس لیے مایوس تو نہیں ہوئے کہ میں اب کہکشاں کے رنگین جھولے پر جھولنے کو زندگی کا مقصد سمجھنے کی بجائے اس کا زیاں سمجھتا ہوں۔بے مقصد زندگی ناشکری ہے، زندگی کا زیاں گناہ ہے، میں گناہ سے بچنا چاہتا ہوں۔"
>
> اقتباس: آواز دوست

کا سودا کرنے والے ہیں۔" منیر ہذیانی انداز میں کہتا چلا گیا۔ دونوں سپاہیوں کے چہرے بھی متزلزل تھے۔ آگہی یکدم ہی کسی عذاب کی مانند نازل ہوئی تھی۔ وقتی فوائد، مادہ پرستی اور تعیشات کی چمک نے آنکھوں پر یہ کیسی پٹی باندھی تھی کہ وہ اپنی مادرِ وطن کو خود ہی نیلام کر بیٹھے تھے۔ ملامت، پشیمانی اور کراہیت کے احساس نے انہیں خود سے آنکھ ملانے کے قابل بھی نہ چھوڑا۔ آتشیں آنسوؤں کی جلن برداشت کرتے وہ انقلاب کی زد میں تھے۔ آن کی آن میں انہوں نے فرار کا منصوبہ بنالیا۔ یہ راہ بھی آسان تو ہرگز نہ تھی۔ قید خانے میں انہیں فرنگیوں کے وفادار اپنے ہم وطن افراد سے مقابلہ بھی کرنا پڑا۔ جنگلوں، ویرانوں اور جھاڑیوں میں روپوش ہوتے وہ دریائے ہگلی کے کنارے پہنچے تو وہاں تعینات محافظ دستے نے انہیں مشکوک گردان کر گولیوں کی زد میں رکھ لیا۔ منیر بیگ کی ٹانگ زخمی ہوگئی۔

"الٰہی! مجھے ایک موقع عطا فرمانا! میں اپنے وطن کا قرضدار ہو کر نہیں مرنا چاہتا۔" اس کا تڑپتا ہوا دل صدا زن تھا۔

☆......☆

صلح نامہ پر دستخط کے بعد سراج الدولہ کی ذہنی و جذباتی کیفیات نہایت مخدوش تھیں۔

لطف النساء ہر ممکن طریقے سے اس کی دلجوئی کرتی لیکن غم و غصے سے بوجھل دل کسی بھی طور بہلتا ہی نہ تھا۔ اس کی بصیرت مستقبل قریب میں ہندوستانی عوام کو 'سفید ناگ' کی گرفت میں تڑپتے اور زہر سے نیلگوں وجود لیے ایڑیاں رگڑتے دیکھ رہی تھیں۔ اس کشمکش میں اضافہ اس وقت ہوا جب امی چند لارڈ کلائیو کا خط لیے چلا آیا۔ یورپ میں برپا انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگ کے باعث کلائیو 'چندر نگر' میں فرانسیسی بستیوں پر حملہ آور ہونے کی اجازت کی آڑ میں درحقیقت اطلاع فراہم کر رہا تھا۔ سراج الدولہ کا طیش ضبط کے سارے بندھن توڑنے لگا۔ اس کی رعایا کا ایک گروہ دوسرے پر حملہ کرنے کے درپے تھا۔ اس سے زیادہ ذلت کی انتہا اور کیا ہو سکتی تھی؟

"قبلہ عالم! صلح نامہ کی شرائط میں یہ شق بھی درج تھی کہ حضور کی جانب سے فرنگیوں کے دشمنوں کو پناہ نہیں ملے گی۔" میر جعفر نے فدویانہ انداز میں کہا۔ اسے علم تھا کہ نواب کو محل میں ہونے والی سازشوں اور اپنے بدخواہوں سے آگاہی ہے۔ وہ محض کسی مصلحت کی بناء پر براہِ راست اقدام سے گریزاں ہے۔ میر جعفر کے لیے یہ مہلت آبِ حیات تھی۔ وہ فوج کے بیشتر سالاروں کو اپنا ہمنوا بنا چکا تھا۔ مختلف محاذوں پر جنگ آزما نواب ان سازشوں میں بے طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

"میں اس صلح نامہ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں اپنی سرزمین فرنگی گھوڑوں کے سموں تلے روندنے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا۔" میر جعفر اس کے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ اس کے سازشی دماغ میں متبادل راہ تو پہلے سے ہی موجود تھی۔ لارڈ کلائیو کے سامنے اپنی اہمیت اور اثر و رسوخ ثابت کرنے کے لیے اس نے منشی سے رجوع کیا۔

"کیسے ہو منشی جی؟ زندگی میں یہی دال روٹی چلانی ہے یا تھوڑی ہمت کر کے مرغ مسلم بھی حاصل کرنا چاہو گے؟" میر جعفر کے معنی خیز انداز پر وہ چونک گیا۔ اس کے لیے تو پہلے ہی یہ نوکری جنجال تھی کیونکہ دیگر درباریوں کی طرح اس کے پاس انعام و اکرام پانے کے مواقع نہ تھے۔

"حضور! آپ مائی باپ ہیں۔ مہربانی کریں گے تو تا عمر احسان مند رہوں گا۔" منشی کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"یہ دنیا اس ہاتھ لو اور اس ہاتھ دو کے تحت چلتی ہے منشی جی! تم میرے لیے نواب صاحب کی جانب سے خط لکھ دو۔ میں تمہارے دلدر دور کر دوں گا۔" میر جعفر نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔ معاملہ کی سنگینی بھانپ کر منشی ساکت رہ گیا۔

"مم...... مگر...... نواب صاحب کو علم ہوا تو وہ مجھے زندہ گاڑ دیں گے۔"

"ڈرتے کیوں ہو؟ ہمارے ہوتے ہوئے کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔" میر جعفر ہنسا اور اپنی انگلی سے معمولی مالیت کا ہیرا جڑی ایک سونے کی انگوٹھی اتار کر اسے تھما دی۔ ہیرے کی چمک نے منشی کی نگاہیں خیرہ کر دیں۔ اس نے بلا تامل نواب سراج الدولہ کی جانب سے لارڈ کلائیو کو 'اجازت نامہ' لکھ دیا۔ میر جعفر کی مکاری یہیں پر ختم نہ تھی۔ اس نے ذاتی حیثیت میں بھی ایک نامہ ارسال کرنے کا اہتمام کر رکھا تھا۔

"میرے مہربان و مربی!

نواب سراج الدولہ کی حالیہ گفتگو شدید خطرے کی گھنٹی بجاتی محسوس ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے ہمارے تعلقات کا علم ہو چکا ہے اور وہ محض موقع کی تلاش میں ہے تاکہ مجھے حراست میں لے کر اپنے انتقام کی بھینٹ چڑھا سکے۔ بنگال پر قبضہ اور سراج الدولہ کو مغلوب کرنے کے لیے آپ کو میری فوری مدد کرنا ہوگی۔ تاخیر کی صورت میں نقصان ناقابل تلافی ہوگا۔ میں آپ کا حکم ملتے ہی علم بغاوت بلند کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس ناچیز کا ایک اور مشورہ مان

لیجیے کہ ہمارے مابین ہونے والے معاہدوں سے امی چند کو یکسر لاعلم رکھا جائے۔ وہ پرلے درجے کا لالچی شخص ہے جو یقینی طور پر میرے علاوہ آپ سے بھی پیسے وصولتا ہوگا۔ اس سے کچھ بعید نہیں کہ نواب کی کسی پیشکش کے جواب میں تمام تر راز اگل کر ہمارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دے۔ میری جانب سے پیغامات اور خبریں میرن پہنچاتا رہے گا۔ میں آپ کی جانب سے فوری قدم اٹھانے کا منتظر ہوں۔"

آپ کا واحد بہی خواہ
میر جعفر

ہندوستان کی تقدیر نازک ترین مقام پر چلی آئی تھی۔ رہبر ہی رہزن بنے ایک نئی تاریخ رقم کرنے کے درپے تھے۔ سراج الدولہ کے لیے وہ وقت بہت کٹھن تھا۔ سپہ سالار میر جعفر کی بدطینتی اب واضح ثبوتوں کے ساتھ اس کے سامنے عیاں ہوتی جا رہی تھی۔ کلکتہ پر فرنگی قبضہ کے بعد کمپنی زعماء کو بھیجے جانے والے تحائف کی خبر کے بعد ہی نواب اسے گرفتار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا عہدہ اور اثر و رسوخ کے باعث ایسا ممکن نہ ہو پایا۔ لارڈ کلائیو سے ہونے والی باقاعدہ خط و کتابت نے بالآخر اسے یہ موقع فراہم کر دیا۔ ان خطوط کے باعث بنگال میں فتنہ انگیزی زور پکڑنے لگی تھی۔ سراج الدولہ نے میر جعفر کو نظر بند کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کی رہائش گاہ کو ہر جانب سے محصور کرنے کے بعد وہ رابرٹ کلائیو سے نمٹنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اسے بہرصورت بنگال سے ان شر پسند عناصر کا خاتمہ کرنا تھا۔

☆......☆

میر جعفر کی نظر بندی سے کلائیو پر گھبراہٹ طاری تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ہندوستان کے اس آخری دفاعی حصار کے خاتمہ کی واحد امید وہی تو تھا لیکن اس کی نظر بندی نے سارے خواب دھرے کے دھرے کر دیے۔ معاملات کی سنگینی پر سوچ بچار کے بعد اسے چار و ناچار امی چند سے ہی مدد طلب کرنی پڑی۔

"وہ ہمیں کسی بھی صورت میں میر جعفر [illegible] امی چند! تم کوئی نہ کوئی راہ نکالو ورنہ نواب اپنے لشکر لیے ہمارے سر پر آ کھڑا ہوگا۔"

"حضور! اگر آپ میرا ساتھ دینے کا وچن دیں تو میں آپ کے سفیر کو سر کھشا سے مکان کے اندر لے جا سکتا ہوں۔" وہ مکاری سے بولا۔ 'تیس لاکھ' پر معاملہ طے کر کے امی چند نے سفیر کے ہمراہ عورتوں کا روپ دھارا اور پالکی میں بیٹھ کر نظر بند سپہ سالار کی رہائش گاہ تک جا پہنچے۔ پہریدار بھی اسی مغالطہ میں رہے کہ میر جعفر کی خواتین سے کوئی مستورات ملنے آئی ہیں۔ پالکیاں کسی بھی تلاشی کے بغیر منزل مقصود تک پہنچ گئیں۔ میر جعفر اور میرن ایک کمرے میں موجود تھے۔

"اپنی بات چیت جلد از جلد ختم کیجیے۔ اگر کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو نواب کے قہر سے کوئی نہ بچا سکے گا۔" امی چند اتنا بڑا خطرہ مول لے کر فطری گھبراہٹ کا شکار بھی تھا۔

"تو آپ تھوڑی دیر کمرے کے باہر رکھوالی دے دیجیے۔" سفیر نے اپنی ازلی مکاری جتائی۔ اسے میر جعفر کی آنکھوں میں امی چند کے لیے گریز اور بے یقینی واضح نظر آئی تھی۔ اس اہم ترین معاہدہ کے موقع پر امی چند وہاں سے حرکت بھی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن نواب کا خوف فی الوقت کسی بھی خواہش سے بالاتر تھا۔

"یہ شخص ہرگز قابل بھروسا نہیں ہے میں بتائے دیتا ہوں۔" میر جعفر نے اس کے جاتے ہی کہا۔

"جی ہاں! آپ درست کہہ رہے ہیں۔ اس نے ہمیں یہاں تک لانے کے لیے تیس لاکھ روپے اور ان تمام خزانوں میں سے پانچ فیصد حصہ طلب کیا ہے جو آپ کو مسند نشینی پر ملے گا۔" سفیر کے اس فقرہ میں پنہاں نوید سے میر جعفر کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ "ہم نے بنگال کی حکمرانی کے لیے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ اب ذرا اگلے معاملات بھی طے کر لیے جائیں تو بہتر ہے۔ آپ کی اس مسند نشینی سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا۔"

"آپ کو اس ملک سے نکالنے کے درپے دشمن کا خاتمہ، کمپنی کی تمام تر سابقہ مراعات کا اجراء، فرانسیسیوں کی گرفتاری، ان کے کارخانوں اور کوٹھیوں کی تباہی۔" وہ بلا تامل قومی مفادات کو انگلیوں کی پوروں پر گنتا قربان گاہ کی جانب دھکیل رہا تھا۔

"لیکن ہمیں تو اس سے بھی زیادہ درکار ہے۔" سفیر غیر مطمئن تھا۔

"کلکتہ کے گرد و نواح میں کمپنی کو مزید زمین مل جائے گی۔" اس نے ایک اور پتا پھینکا۔

"نواب سراج الدولہ کی یلغار سے ہونے والے نقصانات کی ادائیگی کون کرے گا؟ ہمیں پچانوے لاکھ سے زائد خسارہ برداشت کرنا پڑا ہے۔" سفیر نے معنی خیزی سے کہا۔

"آپ کا یہ خادم ہے ناں! میں سب خسارے منافع

[illegible]

ایک [illegible] کاغذ لے آیا۔ میر جعفر نے نچلے کونے پر اپنے دستخط کرتے ہوئے کاغذ سفیر کو تھما دیا۔

"آپ اس سادہ کاغذ پر جو چاہیں لکھ دیں۔ مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔" بظاہر اس کی یہ حرکت فرنگی سفیر کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔

میر جعفر کی بے چینی کسی بھی طور ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ وہ فرنگی آقا کو ہر قیمت پر اپنی وفاداری و جاں نثاری ثابت کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور طاق پر رکھا مخملیں غلاف میں لپٹا نسخہ کیمیا تھام لایا۔ اس کے چہرے پر وحشت و سنجیدگی کا ایک طوفان موجزن تھا۔

"یہ کیوں لے آئے میر جعفر؟" سفیر کی حیرانی بجا تھی۔ "یہ تو مسلمانوں کی مقدس کتاب ہے ناں؟"

"جی ہاں! اور آپ بخوبی جانتے ہیں کہ کسی بھی مسلمان کے لیے قرآن پاک کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ ہم اس کے تقدس کی خاطر کٹ مرنے کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔ خدا اور اس کا رسول ﷺ گواہ ہیں کہ ہر انسان مذہب کے بعد اولاد کے لیے بہت جذباتی ہوتا ہے۔" اس نے دائیں ہاتھ میں تھامے قرآن کو احتیاط سے متوازن کرتے ہوئے بایاں ہاتھ اپنے بیٹے کے سر پر رکھ دیا۔

"میں قسم کھا کر اقرار کرتا ہوں کہ بنگال کا حکمران بننے کے بعد بھی سدا کمپنی کا وفادار رہوں گا۔"

"بہت خوب نواب میر جعفر! ہمیں آپ کے جذبات پر اب کوئی شک نہیں۔" سفیر مطمئن تھا۔ تھوڑی سی بحث کے بعد عہد نامہ کی دو نقول بنالی گئیں۔ یہ سارا کھیل امی چند کو دھوکا دینے کے لیے رچایا جا رہا تھا۔ اصل معاہدہ میں تیس لاکھ روپے کا ذکر ہی نہ تھا۔ امیر البحر واٹسن نے اس فریب کا حصہ

[illegible] مہیا کریں گے؟" کلائیو زچ ہونے لگا۔

"[illegible] ان کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ [illegible] کیا تو وہ سراج الدولہ کی گود میں جا بیٹھے گا کہ ہمارا [illegible] میں ہی چوپٹ ہو کر رہ جائے گا۔"

"تم جو [illegible] ہر وہ [illegible] کا حصہ نہیں بنوں گا۔" واٹسن اپنے موقف [illegible] آج بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ کلائیو اس اہم ترین موڑ پر کسی [illegible] ارانہ اخلاقیات کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتا تھا۔ اس نے [illegible] دستخط کر کے کسی نہ کسی طرح امی چند کو مطمئن کر دیا۔ [illegible] بنگال پر اپنی گرفت مضبوط تر کرنے لگی [illegible]

☆......☆

شاہی اجازت کے بغیر چندر نگر پر حملہ اور فرانسیسی بستیوں پر قبضہ کی جسارت سراج الدولہ کے لیے نظرانداز کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ عمل درحقیقت شاہی وقار و دبدبہ پر براہِ راست اور شدید ترین حملہ تھا۔ اس امر میں بھی اب کوئی دو رائے نہ رہی تھی کہ کمپنی کے افسران اسے ہر ممکن طریقہ سے زچ کر کے اقتدار سے الگ کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی بے بسی اور مجبوریوں سے مکمل حظ اٹھا رہے تھے۔ کلائیو کی جانب سے بھیجے گئے خصوصی نامہ میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ باہمی غلط فہمیوں کے خاتمہ کے لیے نواب اپنے سپہ سالار میر جعفر اور دیوان راج ولبھ سے تفصیلی صلاح مشورہ کر لے۔ اگر ان کی رائے یہ ظاہر کرے کہ معاہدہ کی خلاف ورزی کے مجرم ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکار ہیں تو وہ اپنے مطالبات واپس لینے میں ذرا متامل نہ ہوں گے۔ اس کے برعکس نواب کے قصوروار ثابت ہونے کی صورت میں کمپنی کے تمام تر نقصان کی ذمہ داری اسے ہی اٹھانی پڑے گی۔

اس اعلیٰ ترین ہٹ دھرمی نے سراج الدولہ کو مزید ذہنی دباؤ میں مبتلا کر دیا۔ وہ ہمدردی، رواداری اور حسن سلوک کا بہتیرا قائل و پیروکار بھی لیکن اب کمپنی کو سبق سکھانا بے حد ضروری ہو چکا تھا۔ نواب نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اب تک کامل خلوص سے قومی عزت نفس کی سربلندی اور آزادی کی بقاء میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ تمام تر کوششوں کے باوجود

ناکامی کا زہر چکھتے سراج الدولہ کی مسلمہ ذہانت ایک معمولی نکتہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس کی ہمدردی و مروت دشمن کو ہر بار کھیل کھیلنے کا موقع دیا کرتی ہے۔ ماضی قریب و بعید میں یہ غلطیاں بارہا دہرانے والے نواب نے اس نازک ترین موقع پر بھی وہی عمل دہرا لیا۔ میر جعفر نظربندی کے باوجود تاحال کسی سخت سزا سے محروم تھا۔ سراج الدولہ مرحوم نانا کے ساتھ اس سپہ سالار کے رشتے اور سابقہ خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ایک اور موقع فراہم کرنے کا فیصلہ کرتے ملاقات کے لیے جا پہنچا۔ فرنگی یلغار سے نبردآزما ہونے کے لیے نواب کو میر جعفر کے تجربہ اور بصیرت کی بہرحال کافی ضرورت تھی۔

"اس ناچیز کا آخر کیا قصور تھا قبلہ عالم؟ میں نے آپ کے نانا کی خدمات سرانجام دے کر اعتبار کی پونجی کمائی، اور کچھ نہیں تو آپ میری سفید ریش کی لاج ہی رکھ لیتے۔" اس کی آزردگی دیدنی تھی۔

"ہمارے حاکم بننے کے بعد آپ کے رویہ اور فرنگیوں سے ہونے والے گٹھ جوڑ سے اور کیا مطلب اخذ کیا جا سکتا تھا میر جعفر؟" سراج الدولہ نے متانت سے کہا۔

"یہ ہوائی ضرور کسی دشمن نے اڑائی ہوگی عالم پناہ! میرے دل میں آپ کے خلاف کوئی منفی جذبہ نہیں۔ میں آج بھی آپ کا خادم اور ایک اشارے پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہوں۔" وہ کسی بھی طرح اسے اپنی وفاداری ثابت کر کے ہی دم لینا چاہتا تھا۔

"اچھا! تو پھر اس صلح نامہ پر دستخط کو کیا نام دیں گے آپ؟" [illegible] بھی اپنی ہر خلش مٹانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

"وہ مصلحت [illegible] کے سوا کچھ بھی نہیں۔" میر جعفر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "پھر بھی اگر آپ بے یقین ہیں تو میں میدانِ جنگ میں اپنی گردن کٹوانے کے لیے تیار ہوں۔ میں اس فرنگی [illegible] مزید بڑھنے سے قبل کچل دینے کے جہاد میں شانہ بشانہ آپ کا ساتھ دوں گا۔" اس نے گھمبیر انداز میں کہا اور ایک بار پھر [illegible] ہاتھوں میں تھام لیا۔

"میں اس الہامی و بابرکت کتاب 'خالق کائنات' اور اس کے رسول کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں سدا سے آپ ہی کا جاں نثار تھا۔ مستقبل میں کسی بھی جنگ کی صورت میں خون کے آخری قطرہ اور جسم میں آخری سانس تک صرف نواب علی وردی خان کے جانشین نواب سراج الدولہ سے وفا نبھاؤں گا۔"

میر جعفر کے ان الفاظ نے سراج کے [illegible] کر دیے۔ وہ سپہ سالار کی جانب سے مطمئن ہو کر [illegible] سے جنگ کے بارے میں منصوبہ بندی [illegible]۔ کلائیو کی فوج اس وقت کلکتہ سے شمالی جانب [illegible] پلاسی کے مقام پر موجود تھی۔ نظربندی کا خاتمہ ہوتے ہی میر جعفر کو سابقہ عہدے پر بحال کر دیا گیا۔ میر جعفر پر اعتماد کے باعث نواب نے اسے پندرہ ہزار [illegible] کے ہمراہ پلاسی پہنچنے کا حکم دیا جسے اس نے بسروچشم منظور کر لیا۔ سراج الدولہ نے اس کی روانگی کے بعد کوچ کرنا تھا۔ صورتِ حال سے مکمل طور پر مطمئن ہو کر میر جعفر نے کلائیو کو خصوصی خط لکھ بھیجا۔

"کل بروز عید میرا لشکر بعد از نماز یہاں سے روانہ ہوگا۔ میں اپنا خیمہ دیگر خیموں سے کچھ دور ہراول کی دائیں سمت نصب کرواؤں گا۔ خبروں کی مزید ترسیل میں اب کچھ خطرات درپیش ہوں گے کیونکہ نواب کی جانب سے شاہراہوں پر چوکیاں قائم کر دی گئی ہیں۔ میں پلاسی پہنچتے ہی دس ہزار سپاہیوں کے ہمراہ آپ کے ساتھ مل جاؤں گا۔" نواب سراج الدولہ کو اپنے اعتبار اور حلف سے یقینی شکست کے جبڑوں میں دھکیلنے والے میر جعفر کو شدت سے اقتدار کا تاج اپنے سر پر جگمگاتے دیکھنے کی تمنا تھی۔

☆......☆

ظہیر بیگ کے دل و دماغ میں افسردگی اور اضطراب غالب تھا۔

زخموں سے چور اور ضمیر کی پکار پر تائب ہونے والے منیر نے بالآخر داعی اجل کو لبیک کہہ دیا تھا۔ وقتِ نزع اس کی سسکیاں دلدوز تھیں۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو کسی بھی طرح طمع کے جال میں الجھنے سے بچانا چاہتا تھا۔ اس کی حالت نے ظہیر پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ اسی دوران نواب کی جانب سے پلاسی پہنچنے کے حکم نے وجود میں پارہ بھر دیا۔ فرنگیوں سے ہونے والا یہ آخری معرکہ ہی ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کر سکتا تھا۔

نواب سراج الدولہ کے گرد مکڑی کا جال بننے والا کلائیو دریا کے اس پار تھا۔ اسے میر جعفر سے ملن کا انتظار تھا۔ اگر اس موقع پر وہ اپنا قول نہ نبھا پاتا تو شاہی فوج ان کا لشکر بہ آسانی نگل لیتی۔ حقیقت تو یہی تھی کہ عددی اکثریت اور جنگی حکمت عملی و شجاعت میں مقامی افواج سے انگریز ہمیشہ خائف رہے تھے۔ ان کی یہ تمام تر اچھل پھاند محض سازشوں اور غداری ہی کی مرہون منت تھی۔ دل میں ہزاروں وسوسے لیے کلائیو نے

اپنے نائب کو وزیا میور کرنے کا حکم دیا۔ ان خدشات کا خاتمہ میر جعفر کی جانب سے ملنے والی اطلاع پر ہوا۔ سراج الدولہ نے منکورہ نامی مقام پر مورچہ زن ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ فرنگی سپاہ کے لیے اب رتی بھر تاخیر کی گنجائش نہ رہی تھی۔ دو گھنٹے میں دریا پار کرکے پلاسی کے مقام تک پہنچے تو میر جعفر کو وہاں بھی غیر موجود پا کر کلائیو ہراساں ہو گیا۔ شاہی افواج ہلال کی صورت میں بالکل سامنے تھیں۔ بائیں سمت پر میر مدن جبکہ میر جعفر کا لشکر دائیں جانب تھا۔ خوفناک توپوں کی دید بھی کم اعصاب شکن نہ تھی۔ کلائیو کو اپنی موت صاف نظر آنے لگی۔ اس نے جھنجلا کر امی چند کو طلب کر لیا:

”میر جعفر اب تک نواب کے ساتھ کیوں ہے؟ وہ اس طرح وعدہ خلافی کیسے کر سکتا ہے؟“ وہ چلا اٹھا۔

”ضرور کوئی مجبوری ہی ہوگی حضور! اگر آپ کہیں تو میں میر جعفر سے کسی طرح ملاقات کرا دوں؟“ امی چند کے دل میں ایک بار پھر لالچ نے سر اٹھایا۔ اس پیغام رسانی کے لیے دس لاکھ اینٹھنے کا خیال بہت خوش کن تھا۔

”نواب کے اس لشکر کا مقابلہ کرنا ہماری بساط سے باہر ہے۔ ہم تو یہ جنگ نصف گھنٹے میں ہی ہار جائیں گے۔ میں اس 'خودکشی' کی بجائے واپسی کو ترجیح دوں گا۔“ کلائیو کا منصوبہ سن کر امی چند کے اوسان خطا ہونے لگے۔ نواب کے کلکتہ پر دوبارہ قبضہ کا مطلب یہی تھا کہ اس بار کسی غدار اور منافق کو کوئی رعایت نہ ملے گی۔ اس کے مزید کچھ کہنے یا کرنے سے پیشتر ہی گولہ باری کا آغاز ہو گیا۔ دھماکوں سے قرب و جوار بری طرح لرزنے لگے تھے۔ انگریز کیمپ سے چلایا گیا کوئی گولہ میر مدن کے لیے موت کا پروانہ ثابت ہوا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کے بعد میر جعفر اور اس کے زرخرید دیگر سالاروں نے اپنا اصل کھیل شروع کرنا تھا۔ وہ سب کلائیو کے قدموں میں لوٹنے کے لیے بے تاب تھے۔ ظہیر کا لشکر اب بھی دیوانہ وار لڑ رہا تھا لیکن انہیں کسی جانب سے کوئی کمک میسر ہی نہیں آرہی تھی۔ انتشار، بے یقینی، ہڑبونگ اور اعصاب زدگی کا ایک عجیب عالم تھا۔ سراج الدولہ کی اس بچی کھچی سپاہ کو فرنگی پوری قوت سے پیچھے دھکیلنے لگے۔ وہ آخری لمحہ تک اپنے ساتھی دستوں کی آمد کا انتظار کرتے رہے لیکن وہاں تو غداری اور ہوس نے اقتدار و دولیات کے سبھی بھرم چاک کر دیے تھے۔ سراج الدولہ کے وہ سبھی جاں نثار اپنے ہی لہو میں لتھڑے حسرت و یاس کی تصویر بنے بے نور آنکھوں سے افق کی لامتناہی حدود کھنگال رہے تھے۔

فوج کی اس ناقابل یقین تقسیم کے بعد کلائیو اور اس کے ساتھی نواب کے خیمہ پر حملہ آور ہو کر اپنے دشمن اول کو عبرت کا نشان بنا دینے کی منصوبہ بندیوں میں مشغول تھے لیکن سراج الدولہ اپنے گنے چنے ساتھیوں کے ہمراہ باہمی رضامندی سے مرشد آباد روانہ ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں بصورت زندگی ایک اور یادگار مزاحمت کی خواہش نے دم نہیں توڑا تھا۔ تقدیر نے اسے اپنی آخری تمنا کا بھی ہولناک [illegible] وصول کیا۔

☆......☆

سراج الدولہ کے منظر سے ہٹتے ہی میر جعفر کو بنگال کی عنان حکومت سونپ دی گئی۔ اس تاریخ ساز غداری سے اسے کوئی ملال یا رنج نہ تھا۔ پلاسی سے مرشد آباد پہنچنے والے سراج اور لطف النسا بھیس بدل کر محل [illegible] روپوش ہو گئے تھے۔ بوسیدہ ٹوپی اور کپڑوں میں کسی غریب [illegible]کش کا روپ دھارے بنگال کے اس حکمران کی اہلیہ بھکارن کا حلیہ بنائے ہوئے تھی۔ ان کے پاس محض جواہرات کا ایک ڈبہ ہی کل متاع تھا۔ ایک جاں نثار خواجہ سرا انہیں کشتی میں سوار کروا کے ویران باغ تک لے آیا۔ سراج الدولہ کو اس دربدری سے زیادہ اذیت اپنے ہم وطنوں کی کم فہمی سے تھی۔ انہیں علم ہی کہاں تھا کہ فرنگی کی صورت میں انہوں نے ایسا جہنم خرید لیا ہے جس کی تپش اور کھولن صدیوں تک بلبلانے پر مجبور کرتی رہے گی۔

تھکاوٹ، کرب اور تار تار ہوتی روح کی سسکیاں برداشت کرتے وہ دونوں بھوک پیاس سے نڈھال ہو چکے تھے۔ خواجہ سرا نے حق نمک ادا کرتے ہوئے ان کے لیے کھانے کا بندوبست کر دیا۔ بدقسمتی سائے کی طرح ان کے ساتھ موجود تھی۔ کسی راہگیر نے اس بدحالی میں بھی انہیں شناخت کر کے میر داؤد کو مطلع کر دیا۔ میر جعفر کے اس چھوٹے بھائی نے کسی بھی تاخیر کے بغیر انہیں حراست میں لے کر ذلت و پستی کی ایک زندہ مثال بنا دیا۔ زنجیروں میں جکڑے سراج الدولہ کو مرشد آباد کے گلی کوچوں میں گھسیٹا گیا اور بالآخر شقی القلب میرن کی تلوار نے اس کی زندگی کا مکمل خاتمہ کر دیا۔

ہندوستان کی سالمیت کے خواب دیکھنے کا وہ 'مجرم' اپنی وفائیں نچھاور کر کے تہی دامنی کا استعارہ بن گیا۔

ماخذات:
سراج الدولہ......از احمد شجاع پاشا
وکی پیڈیا......تاریخ بنگال



مصورِ جنوں

زین مہدی

اس کے فن پارے کروڑوں میں بکتے تھے۔ دنیا اس کے فن کے سامنے سرنگوں تھی لیکن تعصب کی آگ نے اس کے ہم وطنوں کو پاگل کردیا۔ وہ اسے قتل کرنے پر آمادہ تھے۔ اس کے گھر کو آگ لگا چکے تھے۔ وہ بے سر و سامانی میں وطن سے فرار ہوا تھا کہ ایک عرب ریاست نے اسے اپنی شہریت دے دی۔

فٹ پاتھ سے محل تک پہنچنے والے کی داستان

پندھار پور، ایک چھوٹا سا قصبہ نما شہر۔ چاروں جانب ہرے بھرے جنگلوں سے گھرا ہوا، چھوٹی بڑی پہاڑیوں سے [illegible] بھاگا ندی کے کنارے بسا ہوا۔ اگر کوئی دور پہاڑی [illegible] دیکھے تو اسے ایسا لگے گا جیسے کسی مصور کا کینوس اس کے سامنے ہو اور کینوس پر لینڈ اسکیپ بنا ہوا ہو۔ ایسا خوبصورت منظر کہ جو دیکھے بس دیکھتا رہ جائے۔ ایک طرف ندی کا تیز بہاؤ اور دوسری طرف ہرے بھرے درختوں سے گھرا ایک بڑا قصبہ۔ اس قصبے میں دور تک پھیلے مکانات۔ چھوٹے چھوٹے مٹی کی دیواروں اور پھونس کی چھتوں والے۔ گھاس پھونس کی چھتیں ایسی دلفریب نظر آتیں

کہ بس دیکھتے رہو۔ان کچے مکانات کی قطاروں میں ایک ترتیب تھی۔یہی ترتیب اس کے حسن میں اضافہ کر رہی تھی۔بچوں کا ایک کھلونا ہوتا ہے جسے جھنجھنا کہتے ہیں۔یہ قصبہ بھی اسی قسم کا تھا۔یعنی دور پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو یہ قصبہ بھی جھن جھنے جیسا لگتا تھا۔لمبائی میں دو رویا مکانات اور پھر تیلی کی طرح لمبائی میں پھیلی آبادی جو آگے بڑھ کر بڑے سے گول دائرے میں پھیل جاتی تھی۔یہ لمبائی والا حصہ بازار تھا جس کے سرے پر ایک بڑا سا مندر تھا اور دائرے والا حصہ رہائشی علاقہ۔اس قصبے کی رونق کی وجہ صرف اور صرف میلہ تھا۔ایسا میلہ جس میں دور دور سے لوگ آتے تھے۔

یوں تو ہندوؤں کی سینکڑوں دیوی ہیں اور اسی قدر دیوتا ہیں۔ہر ریاست ہر صوبے کا اپنا دیوتا اپنی دیوی ہے۔یوپی کی دیوی درگا تو بنگال کی کالی، بہار کی چھٹ میا، گجرات کی بہوچارا ماتا، اندھرا [illegible] کی پولیراما، راجستھان کی نندنی ماتا۔ مراٹھیوں میں گنیش۔لیکن گنیش کے علاوہ وٹھل، وڑھل بھی مروج بھگوان ہے۔اس بھگوان کے مندر تقریباً ہر شہر میں ہے لیکن مہاراشٹر کے شولہ پور کا وٹھل مندر زیادہ مشہور ہے۔اسے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔یہاں بھگوان وٹھل کی پوجا کے لیے مہاراشٹر کے کونے کونے سے بھگت جن کھنچے چلے آتے ہیں۔خاص کر اساڑھ کے مہینے میں جب بھگوان وٹھوبا کی یاترا نکلتی ہے تب تو منتیں لے کر آنے والوں کا سیلاب امنڈ آتا ہے۔ہر ایک کا دل بھگتی سے بھرا ہوتا، دل میں منتوں کا انبار، اور لبوں پر اشلوک ہوتے۔ماتھے پر قشقہ، ہاتھوں میں زنہار۔مرکزِ نگاہ ایک قدیم مندر۔شہر کی رونق بڑھ جاتی۔کہتے ہیں کئی صدی سے ایسی ہی رونق اساڑھ میں نظر آتی تھی۔

نئے نئے لوگوں کی آمد کی وجہ سے بازار کی رونق کبھی ماند نہیں پڑتی۔تاجروں کی تجوری بھری رہتی۔ان کا کاروبار خوب چلتا۔یہ چھوٹا موٹا تجارتی مرکز بن چکا تھا۔اسے تجارتی مرکز بنایا تھا باہر کے تاجروں نے۔یہاں ہر علاقے کے تاجر نظر آتے۔جو بھی تاجر ایک بار یہاں آتا وہ ہمیشہ کے لیے یہاں کا ہو رہتا۔

دوسرے علاقے سے آکر یہاں بسنے والوں کے کئی محلے تھے۔ان میں ہندو محلے بھی تھے اور مسلمان محلے بھی۔باہر سے آئے ہندو تاجر ہندو محلے میں رہنا پسند کرتے اور مسلمان مسلم محلے کو ترجیح دیتے۔

سو سال پہلے بھی اسی انداز میں لوگ بسے ہوئے تھے۔ہندو تاجر ہندو محلے میں اور مسلمان تاجر مسلمان محلے میں۔1900 کی پہلی دہائی میں مسلمان محلے میں رہنے والوں میں فدا حسین کا گھرانا بھی تھا۔وہ لوگ گجرات سے آکر یہاں بس گئے تھے۔ان کا پیشہ ریشمی کپڑوں کی تجارت تھی۔

مندر کے درشن کو آنے والے واپسی پر تحفہ ضرور خریدتے تھے۔اسی وجہ سے یہاں تاجروں کی بھرمار تھی۔ہر قسم کی چیزیں بکتی تھیں۔کپڑے تو ہر ایک کی ضرورت ہے۔درشن کرنے والے ان [illegible] دکانوں سے کپڑے خریدتے، اس لیے فدا حسین کا کاروبار خوب چلتا [illegible]۔

فدا حسین کی بیوی کا نام زینب تھا۔وہ مسلکی اعتبار سے بوہرا تھے، سلمانی بوہرا۔بوہری جماعت میں مذہبی رجحان زیادہ ہوتا ہے۔اپنے تہوار وہ [illegible] کے ساتھ منانا پسند کرتے ہیں۔فدا حسین بھی بیوی کے [illegible] گجرات چلے جاتے تھے لیکن اس بار جانے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے اور محرم کا مہینا بھی قریب آپہنچا تھا۔ان کے پڑوسی [illegible] نے ایک دن ان سے پوچھا۔"بیوی کی حالت صحیح نہیں تھی تو تین چار ماہ پہلے ہی چلے جانا چاہیے تھا۔اب بیوی کو اس حالت میں لے کر کیسے جاؤ گے؟"

"بس یاترا میلہ قریب تھا کچھ پیسے زیادہ جمع ہو جائیں گے اسی خیال سے رک گیا تھا۔" فدا حسین نے کہا۔

"وہ تو جو ہونا تھا ہو گیا۔اب کیا کرنا ہے؟ کیا بیوی کو اسی حالت میں لے جاؤ گے؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ اس بار گھر نہ جاؤں۔"

"یہاں تمہارا کوئی رشتے دار ہے نہیں۔اس مرحلے کو کیسے طے کرو گے؟"

"اللہ مالک ہے۔" فدا نے سر آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے بیوی سے کہہ دوں گا۔وقت نزدیک آتے ہی وہ یہاں آجائے۔اس طرح زینب کو آرام مل جائے گا۔"

17 ستمبر 1915 کو صبح سے ہی زینب کی طبیعت بگڑنے لگی۔اس نے پڑوسیوں کے ہاں خبر بھجوا دی۔محلے کی کئی عورتیں اس کے گھر آگئیں۔دن گزرا اور رات آئی۔ابھی رات گہری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان کے گھر ایک بچے نے جنم لیا۔اس بچے کا نام انہوں نے مقبول رکھا۔اس وقت انہیں یہ پتا بھی نہ تھا کہ آنے والے وقت میں یہ بچہ مقبولیت کے اوج پر ہوگا۔انہوں نے تو یہ نام اپنے خاندان کے ایک بزرگ کے نام پر رکھا تھا۔

بچے کی پیدائش کے بعد سے مقبول کی ماں جو پہلے ہی کمزور تھی اب اور زیادہ کمزور ہو گئی تھی۔اس کمزوری میں اسے آرام کی ضرورت تھی لیکن گھر اکیلا تھا۔کوئی قریبی رشتے دار بھی نہیں تھا جو گھر سنبھالنے میں اس کی مدد کرتا۔وہ بے چاری اس حالت میں بھی گھر کے تمام کام انجام دیتی تھی۔نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بستر سے لگ گئی۔بچے کو سنبھالنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔وید کی دوا چل رہی تھی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔وہ کمزور سے کمزور ہوتی جا رہی تھی۔اس پر غضب یہ ہوا کہ اسے بخار رہنے لگا۔کمزوری اس پر بخار نتیجہ یہ نکلا کہ مقبول ابھی ڈیڑھ مہینے کا ہوا تھا کہ زینب کی آنکھ بند ہو گئی۔مٹی کا کھلونا پانی میں گل جاتا ہے۔انسان بھی تو مٹی سے بنا ہے۔اسے موت پانی بن کر گلا دیتی ہے۔بیوی کو اس نے شولہ پور کی مٹی کے حوالے کیا اور سفر کی تیاری کرنے لگا۔پردیس میں وہ اتنے چھوٹے سے بچے کو کیسے سنبھالتا؟ فدا حسین نے اپنا کاروبار سمیٹا اور واپس گجرات چلا گیا۔اس کے یمن سے آکر گجرات میں بسے تھے۔وہاں اس کے بہت سے رشتے دار تھے۔مگر کوئی بھی اتنے چھوٹے بچے کو سنبھالنے پر تیار نہ تھا۔سب کا ایک ہی مشورہ تھا کہ وہ شادی کر لے، بیوی خود بچے کو سنبھال لے گی۔کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا اس لیے اس نے دوسری شادی کر لی۔دوسری بیوی مقبول کی سوتیلی ماں تھی پھر بھی اس نے اس ننھے سے بچے کو بخوبی سنبھال لیا۔فدا حسین نے دو سال اپنے پشتینی گھر میں گزارے اور پھر وہ اندور چلا آیا۔مدھیہ پردیش کا شہر اندور کئی معنوں میں بڑا شہر تھا۔یہاں ترقی کے مواقع تھے، وہ اسی امید پر اندور آیا تھا کہ یہاں اس کا کاروبار مستحکم ہو جائے گا۔اندور کاروبار [illegible] زیادہ مناسب تھا۔مگر وہاں اسے وہ کامیابی نہ ملی جس کا وہ متلاشی تھا۔مجبوراً وہ گجرات کے شہر برودا چلا آیا۔برودا زیادہ [illegible] شہر تھا۔تاریخی شہر۔اس شہر پر کئی بادشاہوں نے راج کیا۔[illegible] کے قطب شاہی کے زیرِ نگرانی رہا اور کبھی نظام دکن کے [illegible] مہاراجا میسور کے زیرِ انتظام رہا اور کبھی مہاراجا جموں [illegible] تسلط رہا۔پھر مہاراجا گائیکواڑ نمبر دو کے زیرِ انتظام چلا آیا۔اس وقت بھی وہاں گائیکواڑ کی حکومت تھی۔اور اس شہر کو کاروبار کے لیے بہت اچھا سمجھا جا رہا تھا۔یہاں آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگر وہ اپنے ہی علاقہ میں رہتا تو شاید جمع پونجی نہ بچتی۔

یہاں آکر اس نے نئے سرے سے کاروبار کی داغ بیل ڈالی۔تجربہ اس کے پاس تھا۔اس نے اسے آزمایا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کاروباری دنیا میں جم گیا۔قدم جمے تو اسے بچے کی تعلیم کی فکر ہوئی۔اس وقت مسلمانوں کی روایت تھی کہ بچے کی تعلیمی ابتدا مدرسہ سے ہونی چاہیے۔گھر کے نزدیک ایک تعلیم گاہ بھی اس نے مقبول کو اسی تعلیم گاہ میں پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔مقبول خاصا تیز ذہن کا تھا۔اس نے تعلیم میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔کلاس کے ہونہار بچوں میں اس کا شمار ہونے لگا تھا۔ہر سال اچھے نمبروں سے پاس کرتے ہوئے اگلی کلاس تک کا سفر کر رہا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے سات سال گزر گئے اس نے کئی کلاس پاس کر لیے تھے۔

وہ تعلیم میں خوب دلچسپی لیتا تھا اس لیے امتحان پاس کر لیتا تھا مگر اسے ایک اور شوق بھی تھا۔وہ اسکول سے آنے کے بعد کھانا کھا کر باہر نکل جاتا۔اس وقت بڑودا شہر اتنا بڑا نہیں تھا بس ایک چھوٹا سا شہر تھا۔مقبول شہر کی ایک ایک گلی کو پہچانتا تھا۔وہ بھی اس لیے کہ اسکول سے آنے کے بعد کھانا کھاتا اور پھر مٹر گشتی کے لیے نکل جاتا۔شام تک وہ اِدھر سے اُدھر چکراتا رہتا۔لوگ اسے آوارہ گردی کہتے لیکن اس شوق نے اسے بہت سارے تجربے سے روشناس کرایا تھا۔جب وہ گلیوں گلیوں چکراتا تھا تو اِدھر اُدھر پھرنے والے چہروں کو بغور دیکھتا۔انسانی چہروں میں پتا نہیں کیا تلاش کرتا تھا۔وہ ہر چہرے کو اس طرح دیکھتا کہ جیسے وہ چہروں میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔اس کی یہ عادت بعد میں بہت کام آئی۔اسی تجربے کے تحت وہ چہروں کے، خدوخال کی باریکیوں کو نہایت آسانی سے ابھار لیتا تھا۔اسی دوران اسے شوق ہوا کہ وہ خطاطی سیکھے۔خطاطی میں کئی خط اہم ہیں اور ان کی ساخت الگ ہے۔ان خطوں میں سب سے مشکل خط "خطِ کوفی" ہے۔وہ اس خط کو سیکھنے کے لیے استاد کے پاس جانے لگا۔اسے شوق تھا اس لیے دلچسپی سے خطاطی سیکھ رہا تھا۔مسلسل مشق کی بدولت وہ دوسرے طلبا سے کافی آگے نکل گیا تھا۔استاد کہتے کہ اس کے ہاتھ میں فن ہے۔دراصل اسے سیکھنے کی چاہ تھی اس لیے وہ خط کوفی میں مہارت حاصل کرنے لگا تھا۔

خط کوفی، مصوری کے بہت نزدیک ہے۔اس نے مصوری میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دی۔اسے کاغذوں پر نقش و نگار بنانا اچھا لگتا تھا۔وہ اسکول کی کاپیوں میں بھی اپنے خیالات کو منتقل کرتا رہتا جس کی وجہ سے اسے اکثر مار بھی پڑتی ڈانٹ بھی سنتا لیکن اپنے اس شوق سے دستبردار ہونے پر وہ تیار نہ تھا۔سارا دن مٹر گشتی میں گزارتا اور شام کو جب گھر لوٹ کر آتا تو ذہن میں بس گئے مناظر میں سے کوئی ایک منظر کو وہ کاغذ پر منتقل کر دیتا۔گو کہ ابھی اس کی انگلیوں میں وہ بات نہیں

آ پائی تھی کہ وہ اس کام میں ماہر مانا جاتا۔ اسے سکھانے والا بھی تو کوئی نہیں تھا۔ بڑودا شہر میں کافی سارے مصور تھے لیکن اس کی ابھی کم عمری تھی اس لیے وہ ان بڑے آرٹسٹوں کو دور ہی سے دیکھتا اور دل کو تسلی کر لیتا۔ ان سے ملنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ دوسرے مصوروں کا فن پارا دیکھتا اور پھر خود ہی اسے کاپی کرنے کی کوشش کرتا۔ اس پریکٹس سے اسے ایک فائدہ ہوا اس کے اندر کا آرٹسٹ بیدار ہونے لگا۔ اس کے دل میں یہ بات کھب کر رہ گئی تھی کہ وہ آرٹسٹ بنے گا۔ سوچ لینا آسان ہے لیکن اس خواب کو پورا کرنا آسان نہیں۔ وہ بس خواب دیکھے جاتا۔ وقت گزرتا رہا اور 1930 کی آمد ہو گئی۔

اب وہ اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ اکیلے سفر کر سکتا تھا۔ وہ تو شروع دن سے باغی تھا۔ ماں باپ اسے منع کرتے کہ یوں آوارہ گردی نہ کرو تو وہ اور زیادہ آوارہ گردی کرتا۔ جس کام سے اسے منع کیا جاتا وہ اسی کام کو کرتا۔ اسی دوران اس کے ذہن میں سودا سما گیا کہ وہ مصوری میں نام پیدا کرے گا۔ بڑودا کوئی بہت بڑا شہر تو تھا نہیں وہاں مصوری سیکھنے کے لیے کوئی اسکول نہ تھا۔ ایسے اسکول صرف بڑے شہروں میں ہوتے ہیں۔ کلکتہ، دہلی، لاہور اور بمبئی۔ اس وقت یہی چار شہر بڑے مانے جاتے تھے۔ اس نے پتا کر لیا تھا کہ بمبئی میں ایسے کئی اسکول ہیں جہاں مصوری کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن بمبئی میں کہاں ٹھہرے گا اسی الجھن نے اسے الجھائے رکھا اور مزید کچھ سال گزر گئے۔ وہ مسلسل بمبئی جانے کا خواب دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے اپنی کشتی ہواؤں پر رکھ دی۔ قسمت میں جو ہوگا دیکھا جائے گا یہ سوچ کر اس نے بمبئی جانے کی ٹھان لی۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ اسے بمبئی پکار رہا ہے اسی لیے وہ وہاں جانے کے لیے بے تاب ہے مگر جب یہ خبر باپ تک پہنچی تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ اب تم اس قابل ہو چکے ہو کہ میرا ہاتھ بٹا سکو تمہیں دکان پر بیٹھنا چاہیے مگر وہ تو مصوری کا دیوانہ تھا اس لیے اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ ہر حال میں بمبئی جائے گا۔ ماں سے لڑ جھگڑ کر اس نے کچھ پیسے حاصل کیے اور بمبئی کے لیے نکل پڑا۔ اس وقت رسل و رسائل کی اتنی زیادہ سہولت نہ تھی۔ ریل سروس ہی دور دراز انجان ڈگر لے جایا کرتی تھی لیکن ریل کی رفتار بھی آج اتنی نہ تھی پھر بھی لوگ اسے ہی ترجیح دیتے تھے۔ وہ بڑودا اسٹیشن سے بمبئی کی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ یہ 1937 جون کا مہینا تھا۔

اس سے پہلے جب بھی وہ ٹرین میں سوار ہوا تھا ساتھ میں والدین ہوتے تھے لیکن اس بار وہ اکیلا تھا۔ ذہن و دل پر ایک خوف سا طاری تھا۔ اتنا لمبا سفر کس طرح کرے گا۔ یہ خیال اسے ستاتا رہا اور راستہ کٹتا رہا۔ ایک کے بعد ایک اسٹیشن آتے رہے گزرتے رہے۔

بالآخر بمبئی آ گیا۔ وہ بمبئی کے اسٹیشن وکٹوریا ٹرمینس (جس طرح بمبئی کو ممبئی کر دیا گیا اسی طرح اس اسٹیشن کو چھترپتی شیواجی ٹرمینس کر دیا گیا ہے) سے باہر نکلا تو اس کی عقل گم ہو گئی۔ باہر اتنے لوگ، اتنے لوگ۔ ایسی بھیڑ کہ وہ چکرا کر رہ گیا۔ ایک انسانی سمندر تھا جو ٹھاٹیں مار رہا تھا۔ اس پر گاڑیوں کی پوں پوں۔ ہر طرف سے بھونپو جسے دبا کر گاڑی والے ایسی کریہہ آواز نکالتے کہ کان کے پردے پھٹتے محسوس ہوتے۔ کچھ دیر تک وہ کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اس نے خود سے کہا، میاں ایسے کھڑے رہے تو [illegible] جاؤ گے۔ یہاں سے باہر تو نکلو تبھی شہر دیکھو گے۔

آنے کو وہ بمبئی آ گیا تھا مگر اب [illegible] رہے [illegible] بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ اللہ کا نام لے [illegible] سیدھ میں چل پڑا۔ ٹرام، بسیں، ٹیکسیاں اور کاریں۔ ہر طرف گاڑیاں ہی گاڑیاں۔ وہ سڑک پار کرنا بھی چاہتا تو پار نہ کر سکتا اس لیے سیدھے سیدھے چلتا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ اب وہ اسٹیشن سے بہت دور نکل آیا تھا۔ کئی گھنٹے سے وہ چل رہا تھا۔ دھوپ کب کی رات کے آنچل میں جا چھپی تھی۔ اسے اب بھوک لگنے لگی تھی۔ جیب میں گنتی کے روپے تھے۔ اگر وہ بھی خرچ ہو گئے تو آگے کیا کرے گا۔ یہ سوچ اسے کسی ہوٹل میں گھسنے سے منع کر رہی تھی۔ تبھی اس کی نظر ایک خونچہ فروش پر پڑی۔ وہ اس خونچہ فروش کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اسے سامنے دیکھ خونچہ فروش نے پوچھا۔ "کی پائی جے؟"

اسے مراٹھی کی شدبدھ نہیں تھی اس لیے وہ خونچہ فروش کو ایک ٹک دیکھے گیا۔ تب خونچہ فروش نے پوچھا۔ "کیا چاہیے؟"

مقبول نے بڑے سے توے پر سینک رہی ڈبل روٹی کی طرف اشارہ کیا۔ خونچہ فروش نے ڈبل روٹی اٹھا کر اسے چاقو سے دو حصے میں درمیان سے الگ کیا اور اس میں تلی جا رہی سبزیوں کو بھر دیا۔ پھر اسے پلیٹ میں رکھ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بمبئی نیا آیا ہے؟ لے کھا بھگوان داس کا اسپیشل اوسل روٹی۔ ایسا کھا بمبئی میں کہیں نہیں ملے گا۔"

مقبول نے نوالا توڑتے ہوئے پوچھا۔ "کتنے کا ہے؟"

"ایک آنے کا۔" خونچہ فروش نے مسکرا کر کہا۔ "آج کھائے گا تو روز آئے گا۔"

اس نے اوسل پاؤ کھا کر اسے ایک آنہ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ پیٹ بھرا تو آنکھوں میں نیند اترنے لگی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ سوئے تو کہاں سوئے؟ اس بھرے پرے شہر میں کوئی بھی اس کا جاننے والا نہیں تھا۔ بس اللہ بھروسے وہ چلتا چلا جا رہا تھا۔ راستے بھر وہ ایک منظر دیکھتا آیا تھا کہ لوگ فٹ پاتھوں پر بستر لگائے سونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اسے یہ بات عجیب سی لگی مگر جا بہ جا ایسے منظر دکھائی دیے تو اسے یقین آ گیا کہ بمبئی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہاں فٹ پاتھ پر سونا عام سی بات ہے۔

گرانڈ روڈ کے فٹ پاتھ پر پہنچ کر اس نے خود سے کہا۔ "میاں، جب اتنے لوگ فٹ پاتھ پر سو سکتے ہیں تو تم کیوں نہیں سو سکتے۔" اس کے پاس بستر تو تھا نہیں وہ گھر سے ایک کپڑے میں آیا تھا اس لیے اس نے ہاتھ میں پکڑے آج کے اخبار کو جو اس نے اسٹیشن سے خریدا تھا اور پڑھ بھی نہ سکا تھا اسے زمین پر بچھا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی اسے وہاں لیٹے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک بندہ پہنچ گیا۔ اس نے زوردار آواز میں کہا۔ "اوئے تُو یہاں کس کی اجازت سے سویا ہے۔"

مقبول ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اس بندے نے پھر کہا۔ "نکال ایک پیسا۔"

"کس بات کے پیسے؟" مقبول نے سوال کیا۔

"کس بات کے پیسے.... یہاں سونے کے۔ ایک ہفتے کا ایک پیسا لگتا ہے۔ اگر ایک پیسا دے سکتا ہے تو دے ورنہ کسی اور کے علاقے میں جا کر سو۔"

مقبول [illegible] کچھ کہتا کہ اس کے قریب سو رہے ایک بندے نے [illegible] کہا۔ "دادا یہ لڑکا پڑھا لکھا لگ رہا ہے۔ دیکھ رہے ہونا اس نے انگریزی اخبار بچھا رکھا ہے۔ کچھ دیر پہلے یہ اس اخبار کو پڑھ رہا تھا۔ ایک دو دن کے بعد اس سے پیسے لے لینا۔ ابھی شاید اس [illegible] بھی نہیں۔ نیا نیا آیا ہے نا۔"

اس بندے نے غور سے مقبول کو دیکھا پھر کہا۔ "کہاں سے آیا ہے تو؟"

"بڑودا سے۔"

"بڑودا سے... تب تو تیرے کو ایک ہفتے کی چھوٹ ہے۔ میں بھی بڑودا کا ہوں۔ چل سو جا۔ اب اگلے سنڈے کو پیسا دے دینا۔" اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

اسے آگے گئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ وہی شخص جس نے اس کے حق میں بات کی تھی، بولا۔ "بڑودا سے آئے ہونا؟"

"جی ہاں۔"

"محمڈن ہو؟"

"جی ہاں... مسلمان ہوں اور میرا نام مقبول حسین ہے۔"

"میں بھی محمڈن ہوں اور میرا نام شاکر ہے۔"

"اچھا نام ہے۔"

"بمبئی نوکری کی تلاش میں آئے ہو یا بائیسکوپ

مقبول حسین نے بے شمار بڑی عالمی نمائشوں میں حصہ لیا۔ مشرقی مصوری کا نام روشن کیا۔ انہوں نے عالمی طور پر مشہور جن بڑی گیلریوں میں اپنے فن پارے نمائش کے لیے پیش کیے ان کے نام ہیں۔

, Royal Academy of Arts, London (1982)

Tate Gallery, London (1985)

Hirschhom Museum, Washington (1986)

Grey Art Gallery, New York 1986.

سولو نمائش کے لیے انہوں نے مندرجہ ذیل گیلریوں کو ترجیح دی۔

Zurich (Galerie Palette)

Prague (Manes) in 1956,

Frankfurt (Kunst-Kabinet) and Rome (1960), Tokyo(1961), Mumbai (1969), Calcutta (1973) Delhi (1978).

Salon de Mai in Paris (1951);

the Venice biennales (1953, 1955),

Tokyo Biennale (1959)

the São Paulo biennales (1959)

(سینما) میں کام کرنے کی خاطر؟"
"جی نہیں۔ نہ تو نوکری کی تلاش میں آیا ہوں اور نہ بائیسکوپ میں کام کرنے۔"

"تو پھر کیا یہاں کے دادا بننے آئے ہو؟" اس نے قہقہہ لگایا۔

"مجھے مصوری کا شوق ہے۔ میں مصوری سیکھنے کی چاہ میں بمبئی آیا ہوں۔ سنا ہے یہاں مصوری سکھانے کے بہت سے اسکول ہیں؟"

"ہوں گے مگر مجھے نہیں پتا۔ ویسے وہ سامنے جو بڑے بڑے سینما کے بورڈ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ بھی مصوری کرتے ہیں۔ وہی لوگ بتا سکیں گے۔"

مقبول نے گردن موڑ کر اس سمت دیکھا جدھر اس شخص نے اشارہ کیا تھا۔ ادھر کی اسٹریٹ لائٹ اندھیرے سے لڑ رہی تھی۔ ملگجی روشنی میں ادھر بہت سے بڑے بڑے ہورڈنگ رکھے دکھائی دیے۔ اس نے ادھر سرسری سا دیکھا پھر بولا۔ "کیا وہ مصوری سکھانے کا اسکول ہے؟"

"اسکول وسکول تو نہیں مگر ان کی آمدنی خوب ہے۔ دن بھر میں چار پانچ بار وہ لوگ چائے پیتے ہیں۔ مٹن کھاتے ہیں اور بریانی بھی کھاتے ہیں۔"

"ان لوگوں سے تمہاری جان پہچان ہے؟" مقبول نے پوچھا۔

"جان پہچان تو نہیں ہے لیکن انسان ہیں پوچھنے سے ناکاٹ نہیں کھائیں گے' ان سے اسکول کا پوچھ لینا۔"

"ابھی کیوں نا پوچھ لیں؟"

"ابھی تو وہ لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے ہیں۔ اب صبح ہی دکان کھلے گی تب تم پتا کر لینا۔ اب سو جاؤ۔"

مقبول نے بھی کروٹ بدل لی۔ وہ مسلسل ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ اگر اسکول والوں نے سکھانے کے پیسے مانگے تو کہاں سے دوں گا۔ اپنی سوچوں سے لڑتے لڑتے وہ نہ جانے کب نیند کی وادی میں اتر گیا۔

وہ رات اس کی زندگی میں انقلاب آفریں ثابت ہوئی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے سڑک پر کھڑے ہو کر ایک نئے طرز کا کھانا کھایا' فٹ پاتھ پر بغیر بستر کے سویا۔

ابھی رات نے صبح کا چولہ پہنا بھی نہیں تھا کہ لوگ جاگ اٹھے۔ دودھ کی بھاری گاڑیاں شور مچاتی ہوئی آجا رہی تھیں۔ ڈبل روٹی والے سر پر ٹوکرا رکھے آواز لگاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ وہ بھی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ گیا تھا۔

"وہ بولا ... [illegible] ... سوچ رہا تھا کہ اب کدھر جائے۔ کیا کرے تبھی اس کی نظر ایک چھوٹے بچے پر پڑی۔ دس بارہ سال کا بچہ "چائے چائے۔ مسکا پاؤ۔ کڑک پاؤ" کی آوازیں لگاتا ہوا اسی کی طرف آرہا تھا۔

اس کے برابر میں سوتے ہوئے شاکر نے انگڑائی لی پھر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شہزادے چائے پیے گا؟" پھر اس نے چائے والے بچے کو آواز دی۔ بچے نے ایک بڑی سی کیتلی اٹھا رکھی تھی جس میں کم سے کم تین چھوٹے چھوٹے گلاس چائے سے بھرے رکھے تھے۔ اس نے ایک گلاس خود لیا اور دوسرا نکال کر مقبول کی طرف بڑھا دیا۔ پھر اس بچے سے بولا۔ "ایک ایک مسکا پاؤ بھی دے۔"

بچے نے پیٹھ پر بندھے تھیلے سے نکال کر ایک ایک بن دونوں کو دیے۔ ڈیڑھ آنے میں دونوں نے ناشتا کر لیا۔ پیسے اسی شخص نے دیے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر مقبول سوچنے لگا کہ اب کدھر جایا جائے۔ تبھی اس بندے نے کہا۔ "شہزادے رات تو نے مصوری کے بارے پوچھا تھا نا کہ اسکول کہاں ہے۔ لے تیرا کام ہو گیا۔ وہ دیکھ سینما ہال پر جو بڑے بڑے بورڈ لگتے ہیں ان کے بنانے والے آگئے۔"

مقبول نے اس دکان کی طرف دیکھا۔ ایک بندہ دکان کے تالے کھول رہا تھا اور دوسرا بندہ باہر رکھے بورڈ کو سیدھا کر رہا تھا۔ مقبول اس دکان کی طرف بڑھ گیا۔

جب وہ دکان پر پہنچا تو دو بندے ایک ہورڈنگ پر کام شروع کر چکے تھے۔ وہ کھڑے ہو کر انہیں کام کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ کافی وقت نکل گیا لیکن مقبول نے ان سے نہ کچھ پوچھا اور نہ انہوں نے کوئی تعرض کیا کیونکہ ان کے کام کو اکثر لوگ کھڑے ہو کر دیکھتے رہتے تھے۔ ہورڈنگ اب تیار ہونے کو تھا کہ ان میں سے ایک نے ہاتھ میں پکڑے برش کو رکھتے ہوئے کہا۔ "جاوید بھائی۔ چلو ایرانی ہوٹل کی چائے پی کر آتے ہیں۔"

اسے کام روکتے دیکھ دوسرے بندے نے بھی کام چھوڑ دیا اور وہ دونوں سڑک کی دوسری طرف بنے ایرانی ہوٹل میں چائے پینے چلے گئے۔ ان کے ہٹتے ہی مقبول نے برش اٹھایا اور باقی کا کام پورا کرنے لگا۔

وہ دونوں چائے پی کر آئے تو حیران رہ گئے۔ جو کام باقی رہ گیا تھا اسے مقبول نے پورا کر دیا تھا۔ پہلے تو ایک نے غصہ دکھایا مگر مقبول کا کام دیکھ کر بولا۔ "واہ بیٹے کام تو اچھا ہے۔ کس کے شاگرد ہو؟"

ان میں سے ایک دوسرے آرٹسٹ نے پوچھا۔ "یہ تم نے بنائے ہیں؟"

"جی ہاں؟" حسین نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"ہاتھ میں صفائی ہے۔ پہلے کہاں کام کرتے تھے؟"

"کہیں بھی نہیں۔ بس آپ لوگوں کو کام کرتے دیکھا تو دل میں آیا کہ خود کو آزما کر دیکھوں، بس میں نے برش سنبھال لیا۔"

"اگر تم یہ کام کرنا چاہتے ہو تو ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ ہمیں پیسے ملتے ہیں اسے دو حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ مل جاؤ گے تو تین حصے میں بانٹ لیا کریں گے۔ بولو راضی ہو؟" اس نے دعوت دی۔

اندھا کیا چاہے' دو آنکھیں۔

"جی ضرور۔" مقبول نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ڈن... ادھر برش رکھا ہے۔ اسے اٹھا کر اس دوسرے ہورڈنگ پر لگ جاؤ۔ ہمارے پاس کام زیادہ ہے اور ہم وقت پر کام ختم نہیں کر پا رہے ہیں۔ تم ساتھ ہو جاؤ گے تو کام زیادہ نمٹا لیا جائے گا۔"

"میں راضی ہوں۔" کہتے ہوئے وہ ہورڈنگ کے پاس پہنچ گیا۔ یہ تو قسمت کی مہربانی تھی کہ اسے فوراً ہی نوکری مل گئی تھی ورنہ اسے فاقے کرنے پڑتے۔ اس نے شکر خدا کا ادا کرنے کے بعد ہورڈنگ کو سیدھا کیا۔ ابھی اس پر صرف رنگین پنسل سے آؤٹ لائین کھینچی گئی تھی۔ اس نے لکیروں پر رنگ پھیرنا شروع کر دیا۔ مقبول کے ہاتھ میں تیزی تھی۔ اس نے بہت کم وقت میں ہورڈنگ تیار کر دی۔ دکاندار نے اس کے کام کا معائنہ کیا پھر بولا۔ "لاجواب کام ہے۔ میرے ساتھ رہے تو بہت جلد اتنے پیسے کماؤ گے جس کا لوگ خواب دیکھا کرتے ہیں۔"

اب اس کی گاڑی چل پڑی تھی۔ ہورڈنگ جاتے ہی وہ پیسے آپس میں تقسیم کر لیتے۔ دکاندار کا نام سکندر تھا۔ وہ مسلمان تھا اسی وجہ سے اس نے بغیر کچھ پوچھے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔

کچھ ہی دنوں میں اس کے پاس اچھے خاصے پیسے جمع ہو چکے تھے۔ اب اسے پھر سے ہڑک اٹھی کہ وہ آرٹ اسکول میں داخلہ لے۔ جس مقصد کے لیے آیا ہے وہ تو پورا ہو۔ اس سلسلہ میں اس نے سکندر سے معلومات حاصل کیں۔ آرٹ اسکول کا پتا معلوم کیا اور ان کے ہاں جا پہنچا۔ اسکول والوں نے اس کا کام دیکھا پھر اسے داخلہ فارم دیتے ہوئے کہا۔ "اسے بھر دیں۔ آپ کا داخلہ ہو چکا ہے۔"

اس نے بمبئی کے مشہور زمانہ آرٹ اسکول "جمشید جی جیجی بھائی اسکول آف آرٹ" میں داخلہ لیا تھا۔ وہ مصوری کے ابجد سے واقف تھا۔ اس اسکول میں آنے کے بعد وہ اس فن کے اسرار و رموز سے بھی آگاہ ہوتا گیا۔ اس نے گرانٹ روڈ کے فٹ پاتھ کو اپنا مستقر بنا لیا۔ رات ہوتے ہی وہ گرانٹ روڈ پر آجاتا اور فٹ پاتھ پر دو ڈھائی تین گھنٹے سو کر نیند پوری کر لیتا۔

جیب میں کچھ پیسے آئے تو اس نے فٹ پاتھ کی زندگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے سامنے بنے ایک چال میں کمرا حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کی کوشش کامیاب ٹھہری اور ایک کمرا اسے مل گیا۔ وہ جس "چال" میں رہتا تھا وہیں اشرف بھائی صمد بھائی نامی شخص بھی رہتا تھا۔ وہ ردی کا کام کرتا تھا۔ اس کی دکان پر صبح سے شام تک خریداروں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہوتے تھے جو بڑے علاقوں میں دکان چلایا کرتے تھے۔ بڑے علاقوں میں کپڑوں کے تھیلے کم اور کاغذ کی پڑیا زیادہ مقبول تھیں۔ پڑیوں کے لیے ردی کاغذ کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس علاقے میں اس کی واحد دکان تھی اس لیے لوگ اس کے ہاں سے کاغذ خریدتے تھے۔ وہ بھی اکثر اس کی دکان پر جا بیٹھتا تھا۔

اس دن بھی وہ وہاں بیٹھا اشرف بھائی کی منگوائی ہوئی چائے پی رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے رکھے ردی کاغذوں کے ڈھیر میں دبی ایک کتاب کے سرورق پر پڑی۔ کتاب آدھی سے زیادہ باہر تھی۔ سرورق پر کسی نامور آرٹسٹ کی بنائی تصویر نظر آرہی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے چائے کے گلاس کو زمین پر رکھا اور اٹھ کر ردی کے ڈھیر تک پہنچا۔ اس کتاب کو کھینچ کر باہر نکالا اور پھر اپنی جگہ پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ اندر بھی بہت ساری تصویریں تھیں۔ مصور کا نام بھی لکھا تھا لیکن اسے نام سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو تصویروں کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس وقت اس کے دماغ میں ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ کاش وہ بھی ایسی کوئی تصویر بنائے۔ ایسی تصویر جو اسے ایک دم سے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دے۔ اس کی انگلیوں میں جادو تھا۔ وہ جیسی تصویر چاہتا بنا لیتا تھا لیکن وہ ان تصویروں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا تھا کیوں کہ وہ جو کچھ بناتا وہ نقل کہلاتی تھیں۔ اسے جو تصویر دی جاتی وہ اس کو بینر پر بنا دیتا تھا۔ ابھی تک اس نے اپنی کوئی تخلیق سامنے نہیں لائی تھی۔ گو کہ عمر اتنی نہ

تھی لیکن دل میں ارمان تھا کہ وہ کسی بڑے مصور کی طرح کوئی نئی چیز بنائے۔

بل بورڈ بنانے پر اسے جو پیسے ملتے وہ اتنے نہ تھے کہ زندگی میں آسودگی آجائے۔ بس ایک وقت کا کھانا کھا لیا کرتا تھا۔ اخراجات پورے کرنے کے لیے اسے کچھ اور کرنا ہوگا، اس سوچ نے اسے اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے پر مجبور کر دیا۔ صمد بھائی سے دوستی گہری ہو چکی تھی۔ صمد بھائی بھی اسے پسند کرتا تھا۔ اسی نے مشورہ دیا کہ پینٹنگ کے ساتھ کوئی اور کام بھی کرو، اس مشورہ پر اس نے جواب دیا۔ ”کوئی نوکری ملے تو سہی۔“

”میرا ایک یار ہے۔ بہت اچھا اور بہت سچا اس کے ساتھ ملاقات کرائے دیتا ہوں۔ اسے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو نئے نئے آئیڈیا اسے دے سکے۔“

”آئیڈیا؟ کس قسم کا آئیڈیا؟“

”وہ بچوں کے لیے کھلونا کرسی، بیڈ وغیرہ بناتا ہے۔ چلو آج میں تمہاری اس سے ملاقات کرا دیتا ہوں۔ آگے تمہاری محنت اور محبت ہے۔“

صمد بھائی اشرف بھائی اسے ساتھ لے کر بھنڈی بازار آیا، یہ علاقہ مسلمانوں کا مرکز کہلاتا تھا۔ یہاں صرف اور صرف مسلمان رہتے تھے۔ بازار کی تمام دکانیں مسلمانوں کی تھیں۔ بازار میں چھوٹی بڑی بلڈنگوں کا جال سا پھیلا تھا۔ یہ بلڈنگیں رہائشی بھی تھیں اور ہر بلڈنگ میں چھوٹے چھوٹے کارخانے بھی چل رہے تھے۔ انہی بلڈنگوں میں سے ایک کے نیچے اسلم بھائی کی دکان تھی۔ سامنے کے حصے کو اس نے شوروم بنا رکھا تھا اور عقبی حصے میں چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ اس کارخانے میں بچوں کی کرسیاں، بیڈ وغیرہ بنتے تھے۔ صمد بھائی جیسے ہی شوروم میں داخل ہوا اسے دیکھ کر اسلم بھائی خوش ہو اٹھا۔ اس نے بانہیں پھیلا کر کہا۔ ”ارے آج میرا یار آیا ہے۔ آ... آجا میرے سینے سے لگ جا۔“ پھر اس نے مڑ کر نوکر سے کہا۔ ”اپنا یار صمد بھنگار والا آیا ہے جلدی جا اور دو کڑک ملائی والی چائے لے آ۔“

صمد بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تو کبھی نہیں بدلے گا۔“

”ارے ہم بھی کوئی موسم ہیں کہ بدل جائیں؟ اب اپنی عادتیں تو قبر میں جا کر بدلیں گی۔“ اور پھر ایک بلند قہقہہ لگایا۔

”ان باتوں کو چھوڑ، اس دن تُو نے کہا تھا نا کہ تجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو اپنا دماغ لڑا کر نئے ڈیزائن بنا سکے؟“

”ہاں ہاں، میں ایک ایسے ہی آدمی کو ڈھونڈ رہا ہوں جو کرسیوں کے، بینچوں کے، بیڈ کے نئے نئے ڈیزائن بنا سکے۔ خریدار پرانے ڈیزائن کو دیکھ کر منہ بناتے ہیں۔ ان کھلونا کرسیوں کی بکری بھی اب کم ہو گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا بندہ مل جائے جو ان کرسیوں کو نیا ڈیزائن دے۔ ایسا ڈیزائن کہ لوگ دیکھتے ہی اسے خریدنے کی کوشش کریں۔“

”بس تو یوں سمجھو کہ تمہارا خواب پورا ہو گیا۔ یہ لڑکا تمہارے خواب کو تعبیر دے گا۔ اس کے ہاتھ میں جادو ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ دماغ بھی خوب چلتا ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو سمجھو کہ میں نے اسے رکھ لیا۔ اب یہ اپنا کمال دکھائے۔“ اسلم بھائی نے کہا۔

مقبول حسین نے اتنی دیر میں دکان کا جائزہ لے لیا تھا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اندر کارخانے کو دیکھنے چلا گیا۔ اس نے وہاں رکھی آدھی ادھوری کرسیوں کو دیکھا۔ چیزوں کو دیکھا۔ ان کی بناوٹ پر نظر ڈالی پھر باہر آ گیا۔

صمد بھائی نے پوچھا۔ ”کچھ سمجھ میں آیا؟ کام کرو گے؟“

”کیوں نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ ان کرسیوں کی قیمت کچھ بڑھانی ہو گی۔“

”بھائی میاں۔ ان داموں میں ہی یہ بک نہیں رہی ہیں اور تم کہتے ہو کہ قیمت بڑھانی ہو گی۔“ اسلم بھائی نے جواب دیا۔

”جب میرا ہاتھ لگے گا تو اس کی قیمت بڑھ جائے گی۔ بس اسلم بھائی کو میرے کہنے پر چلنا ہو گا۔ میں جیسے کہوں ان کو ویسا ہی کرنا ہو گا۔“

”ایک ہفتہ تک میں کچھ نہیں دوں گا۔ تم جو چاہو وہی کرنا لیکن ایک ہفتے کے بعد اگر صحیح رپورٹ نہ آئی تو میں تمہیں روکنے کا اختیار استعمال کروں گا۔“

”اوکے... کل سے میں کام شروع کروں گا۔ ایک ہفتے بعد آپ کو جو کہنا ہے کہہ لینا۔“

اتنا کہہ کر اس نے اسلم بھائی کو دیکھا۔ اسلم بھائی نے سر ہلا کر اسے اجازت دے دی۔ کافی دیر تک وہ لوگ اسلم بھائی کی دکان میں بیٹھے پھر واپس اپنی دکان پر آ گئے۔

اگلے دن سے اس نے کام شروع کیا۔ وہ شام چھ بجے آتا اور رات دیر گئے تک کاغذ پر لکیریں کھینچتا۔ سائیکل کی

تصویر بنا کر وہ اسے ایک ٹک دیکھتا۔ اسے خبر تھی کہ نئی سوچ کو رنگوں سے ابھارنا آسان نہیں اس لیے وہ صرف غور کر رہا ہوتا۔ کافی غور و خوض کے بعد اسے ایک آئیڈیا سوجھا۔ اس نے اسے تکمیل تک پہنچا کر اسلم بھائی کے سامنے ماڈل رکھا۔ اسلم بھائی ڈیزائن دیکھ کر پھڑک اٹھے۔ انہوں نے اسے سینے سے بھینچ کر مبارک باد دی۔ ”شہزادے کمال کر دیا۔ کل سے ہی اس ماڈل کو آزمانا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ ماڈل گاہک کو کھینچ لے گا۔ یوں سمجھ لو کہ اگر یہ ماڈل کامیاب ہو گیا تو تمہاری پکھار سو روپیا ہو جائے گی۔“

مقبول نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ گھگھو گھوڑا کو اس نے اتنا جاذب نظر بنا دیا تھا کہ دیکھنے والا متوجہ ہو جائے۔ پہلا ماڈل شوکیس میں رکھنے کے ساتھ اس نے مٹھائی منگوائی اور سب کے منہ میٹھے کرائے۔ ابھی دیگر کاریگروں نے مٹھائی ختم بھی نہیں کی تھی کہ دکان میں ایک گاہک داخل ہوا اس نے اس کی قیمت پوچھی اور اسی وقت خرید لیا۔

اسلم نے خریداروں کی ڈیمانڈ دیکھ کر تمام کاریگروں کو صرف اسی گھگھو گھوڑا بنانے پر لگا دیا۔ اب ہو یہ رہا تھا کہ اِدھر شوکیس میں ماڈل رکھا جاتا اور اُدھر اس کا خریدار پہنچ جاتا۔ ہر روز تین سے چار گھگھو گھوڑا بکنے لگا تھا۔ اسلم بھائی چاہ رہا تھا کہ مقبول حسین پارٹ ٹائم کی بجائے فل ٹائم دے۔ وہ اس کی تنخواہ تین سو تک کرنے پر راضی ہو گئے تھے لیکن مقبول کا کہنا تھا کہ مصوری میرا شوق ہے۔ میں کمانے نہیں سیکھنے بمبئی آیا ہوں۔

وہ پانی کے بل بورڈ بھی بناتا اور اسکول بھی جاتا۔ گھگھو گھوڑا کے بعد اس نے بہت سارے نئے انداز کے کھلونے بنائے۔ صرف اس کی محنت تھی کہ اسلم بھائی کا کارخانہ تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ اسلم بھائی اس کی محنت کا صلہ بھی اندازے سے زیادہ دیتے۔ وہ کہتے۔ ”یہ لڑکا بہت آگے جائے گا۔ اس نے میری کاروباری ساکھ کو بچایا ہے۔ میں تو اس پروفیشن کو ہی بدلنے کا سوچ رہا تھا کہ اس نے میری ڈوبتی کشتی کو سنبھالا ہے۔“

شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اس کا خوب دھیان رکھتے۔ اسے کبھی پیسے کی ضرورت پڑتی تو بغیر حساب کتاب کے اسے رقم دے دیتے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس کا لاابالی پن ختم ہو کر نہیں دیتا۔ جتنی بھی رقم اس کے پاس ہو وہ اسے فوراً ختم کر دیتا ہے۔ انہیں فکر ہونے لگی تھی کہ اس کے لاابالی پن کو کیسے ختم کیا

جائے؟ اس مسئلہ کا ایک ہی حل انہیں نظر آ رہا تھا کہ اس کی شادی کر دی جائے لیکن ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اسے بیٹی دے گا کون؟ انہوں نے اِدھر اُدھر ذکر کیا تو ایک ایسی لڑکی نظر آ گئی جو اسے سنبھال سکتی تھی۔ وہ گھرانا بھی انہیں کے مسلک کا تھا سو انہوں نے بات چلا دی۔ لڑکی والوں کو بھی وہ پسند آ گیا تھا۔ اسلم بھائی نے اس کے والدین کو خبر دی اور انہیں بھی بمبئی بلا لیا (بعض جگہ لکھا ہے کہ ان کی شادی گجرات میں ہوئی) اسلم بھائی نے ہی اس شادی کے اخراجات اٹھائے۔

1941ء میں فضیلہ اس کی زندگی میں دلہن بن کر آ گئی۔ اسلم بھائی کو امید تھی کہ فضیلہ اس کی زندگی بدل دے گی۔ اس کا لاابالی پن ختم ہو جائے گا۔ بہت حد تک اسلم بھائی کا اندازہ صحیح نکلا۔ فضیلہ کی خدمت، پیار نے اس بگٹٹ بھاگ رہے گھوڑے کو قابو کر لیا۔ وہی مقبول جو رات دو دو بجے گھر آیا کرتا تھا، جس کا کمرا کچرا گھر بنا رہتا تھا، اب واقعی گھر لگنے لگا تھا۔

فضیلہ ایک اچھی بیوی ہی نہیں ایک گرہستن لڑکی ثابت ہوئی۔ اس نے پہلے گھر کی حالت بدلی پھر اس کی حالت بدلنے میں لگ گئی۔ یہی مقبول جو کام کرتے کرتے تھک جاتا تو ایسے ہی سو جاتا۔ ہاتھ رنگوں سے لتھڑے ہوئے۔ کپڑے بے ترتیب۔ جو سامنے مل گیا کھا کر پیٹ کی آگ بجھا لی۔ یہ فضیلہ ہی تھی جس نے اسے ایک اچھے انسان کی شکل میں لا دیا۔ اب وہ کام ختم کرنے کے بعد پہلے ہاتھوں کی صفائی کرتا پھر کپڑے تبدیل کرتا۔ سلیپنگ سوٹ جو بستر پر رکھا ملتا اسے پہنتا پھر سونے جاتا۔ صرف ایک بات کا عادی نہیں بنا پائی۔

فضیلہ کی عادت تھی کہ وہ سونے سے پہلے کوئی دعا کوئی اوراد پڑھتی۔ اس نے مقبول کو بھی دعائیں سکھانے کی کوشش کی لیکن وہ عادی نہ ہو سکا۔ بس یوں ہی تھک کر بستر پر گر جاتا اور خراٹے گونجنے لگتے۔ اس کی اس عادت سے وہ تنگ تھی لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ خوا مخواہ شوہر کو تنگ

13 شہکار فن پارہ اسپر نکلنگ ہار میں سیریز جب نیویارک کے کرائسٹ آکشن میں پیش کیا گیا تو اس کی مجموعی قیمت 4.2 ملین ڈالر لگی جب کہ 1955ء میں اس کی ”یاترا“ سیریز 920,00 ڈالرز میں فروخت ہو کر ریکارڈ قائم کر چکی تھی۔ اس طرح یہ ایشیا کے سب سے مہنگے مصور مانے جاتے تھے۔

کرے۔ بس مشورہ دینے کو دیتی رہی اس اُمید پر کہ شاید کبھی سنبھل جائے۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔

یہ وہ وقت تھا جب برصغیر کا سیاسی افق گدلا رہا تھا۔ ہندو اور مسلم دو الگ سمت چل پڑے تھے۔ انگریزوں کا بوریا بستر بندھ رہا تھا اور کانگریس مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کی فکر میں تھی کہ مسلم لیگ نے علیحدہ وطن کی مانگ کر دی۔ اپنا حق مانگ لیا تھا۔ یہ بات ان لوگوں پر گراں گزری تھی جو مسلمانوں کو دبائے رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس مطالبے کو تعصب کا ایندھن بنا دیا۔ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے لگے۔ مسلمانوں نے بھی اپنے مطالبے کے حق میں آواز اٹھانا شروع کر دی۔ مسلم لیگ کا نعرہ ہر مسلمان کے دل کی آواز بن گیا۔

سیاست میں بھرپور ہلچل مچ رہی تھی لیکن مقبول کو کچھ پرواہ نہیں تھی۔ وہ جیسے کانوں سے بہرہ بن چکا تھا۔ اس کے ذہن پر بس ایک بات چھائی ہوئی تھی کہ وہ ایک بڑا آرٹسٹ بنے گا۔ اب اس کا ہاتھ اتنا صاف ہو چکا تھا کہ اس کی ہر لکیر اپنی مثال آپ نظر آتی۔ اس کے ساتھی اس کی خوب تعریف کرتے۔ اساتذہ بھی اس کے کام کو پسند کرتے۔ سب کا کہنا تھا کہ یہ ایک نامور آرٹسٹ بنے گا۔ وہ خود بھی خواب دیکھا کرتا کہ ایک دن بڑا مصور بنے گا لیکن منزل ابھی بھی دور تھی۔

بمبئی ایک ایسا شہر ہے جس میں ہر رنگ روپ کے لوگ بستے ہیں۔ ہر صوبے ہر زبان کے بولنے والے رہتے ہیں۔ ہر مذہب اور ہر فرقہ کے لوگ ملتے ہیں۔ بڑا شہر ہونے کی وجہ سے کسی کو کسی سے مطلب نہیں ہوتا۔ سب آرام سکون سے زندگی گزار رہے تھے کہ امن کی فاختہ کے پر کترنے کی مہم تیز ہو گئی۔ جس شہر میں کسی کو کسی سے مطلب نہ تھا اسی شہر میں یکایک ہندو مسلمان کا فساد پھیل گیا۔ مسلمان بکھرے ہوئے تھے۔ چار گھر اس محلے میں تو دس گھر اس محلے میں۔ ان بکھرے ہوئے گھرانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ انہیں گھروں سے نکال کر قتل کیا جانے لگا' گاجر مولی کی طرح کاٹا جانے لگا۔

یہ وقت بمبئی کے لیے بہت بھاری تھا۔ ہر طرف آگ اور خون کا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ ایسے وقت میں اسے گھر میں بند ہو کر رہنا چاہیے تھا لیکن مقبول کو چین نہ تھا۔ وہ انسانیت کی تذلیل پر کراہ اٹھا تھا۔ وہ امن کا متلاشی تھا اور اس کے سامنے لاشوں کی سیاست ہو رہی تھی۔ وہ گھٹ گھٹ کر جی رہا تھا۔

جب پاکستان کے قیام کی خبر عام ہو گئی اور اس کے جاننے والے زیادہ تر لوگ پاکستان منتقل ہونے لگے۔ ایسے وقت میں بھی اسلم بھائی نے اس کی مدد کی اور اسے گھر میں بیٹھ کر اپنا کام کرنے کی تلقین کی لیکن اس کے ذہن و دل پر پورے برصغیر سے لوٹ مار، قتل و غارت گری کی آتی خبریں آرا چلا رہی تھیں۔ انسانیت کی اس طرح تذلیل، خونِ انسانی کا اس طرح ارزاں ہو جانا اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اک ذرا سی بات پر لوگ اس طرح پاگل کیوں ہو گئے ہیں، کیوں ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں؟ وہ چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد یہ آگ بجھ جائے لیکن ایسا ممکن دکھائی نہیں دے رہا تھا کیونکہ اس آگ کو بھڑکانے میں کچھ ایسے لوگ شامل تھے جو اپنی دکان چمکانے کے لیے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے اور بجھتی آگ دوبارہ سے جل اٹھتی تھی۔ مسلمان ہر شہر ہر قصبہ میں تھے اس لیے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے تاجر، ریاست کے راجے، دولت کا انبار رکھنے والے سب کے سب ایک قطار میں آ گئے تھے۔ بھکاری بن گئے تھے یوں کہ مال و دولت لوٹ لیا گیا تھا۔

ان خبروں نے، ان اطلاعات نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ ایک وہ ہی نہیں، پورے برصغیر کے مسلمان فسادات سے ٹوٹ گئے تھے اور جان بچانے کے لیے پاکستان کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اسے بھی لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ وہ بھی پاکستان منتقل ہو جائے۔ آخر کو پاکستان بنا ہی مسلمانوں کے لیے ہے پھر اس ہندوستان میں رہ کر وہ کیا کرے گا؟ ہندو کبھی بھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے ہیں لیکن اس کی منطق کچھ اور تھی۔ اس کا کہنا تھا، ہم نے اس ملک پر آٹھ سو سال حکومت کی ہے۔ اس برصغیر کی تعمیر و ترقی میں ہمارے بزرگوں کا خون پسینا شامل ہے۔ ہم کیوں یہاں سے جائیں؟ ہم تو یہیں رہیں گے۔ ان کے سینے پر مونگ دلیں گے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہند کا نقشہ کیا تھا؟ کتنی ترقی تھی ان کی؟ یہاں والوں کو تو ہمارا احسان ماننا چاہیے تھا۔

اس کے زیادہ تر دوست، ساتھی مصور اشتراکی سوچ کے حامل تھے۔ ان کے نزدیک مذہب کی کوئی اہمیت نہ تھی بلکہ وہ تو مذہب کو ہی نہیں مانتے تھے۔ مقبول کی باتوں پر وہ لوگ جذباتی ہو کر اس کی پیٹھ ٹھونکتے کہ تم صحیح کہہ رہے ہو، یہ مذہب ہی ہے جس نے انسانوں کو انسان سے جدا کر دیا ہے۔ ایک انسان کئی خانوں میں بٹ گیا ہے۔ کوئی ہندو بن گیا ہے کوئی مسلمان مگر انسان کوئی نہ بن سکا۔ ہمیں انہیں ایک پلیٹ فارم پر لانا ہو گا۔

اس وقت جب پورا ہند خونی ہولی کھیل رہا تھا اس نے اپنے فن پارے نمائش میں پیش کر دیئے۔ یہ نمائش بمبئی آرٹ سوسائیٹی کے ہال میں لگائی گئی تھی۔ بمبئی کا ماحول ابھی بھی گدلا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو فساد شروع ہوا تھا جس میں کئی ہزار لوگ صرف بمبئی میں مارے گئے تھے اس کی ٹیس ابھی تک باقی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ہر ایک کے دل میں دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کب کہاں پھر سے بلوا شروع ہو جائے۔ گویا زخم ابھی تازہ تھا۔ اس لیے لوگ ڈر رہے تھے کہ مقبول کی پینٹنگ کوئی گل نہ کھلا دے لیکن نمائش کامیاب ٹھہری۔

یہ ایک مقصد کو اجاگر کرنے والی تصویری نمائش تھی۔ برش اور رنگ سے اس نے مذہب کے نام پر کھیلے گئے خونی ڈراموں کو' خون کی ہولی کھیلنے کے مناظر کو چابکدستی سے پیش کیا تھا۔ ہر دل دکھا ہوا' فسادات کی آنچ سے سہا ہوا تھا پھر بھی اس نمائش کو خوب پزیرائی ملی۔

وہ آرٹ کے چاہنے والوں میں اب پہچانا جانے لگا تھا۔ اگلے ہی سال 1948 میں اسے ایف این سوزا نے بمبئی کی معروف تنظیم پروگریسو آرٹسٹ میں شامل ہونے کی دعوت دے دی۔ یہ اس کے لیے ایک بہت بڑی بات تھی۔ اس لیے کہ اس تنظیم کا ایک نام تھا۔ اس کے اصول و ضوابط بہت سخت تھے۔ یہ سب کے سب اشتراکی ذہن کے تھے۔ ان کے ساتھ مقبول میں بھی اشتراکیت سرایت کرنے لگی۔ اب فیصلہ کی باتیں ان سے زہر لگتیں۔ کبھی کبھی وہ غصہ بھی کرنے لگتا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ مذہب ہی ہے جو انسان کو انسان کا دشمن بنا رہا ہے۔ اس لیے میں مذہب کی باتوں پر یقین نہیں کروں گا اور بیوی اسے سمجھاتی کہ مذہب برا نہیں ہوتا، اسے نام نہاد لوگ برا بنا دیتے ہیں۔

گھر اور باہر دونوں طرف اسے بے چینی مل رہی تھی اسی لیے اس نے اس سے فرار کا منصوبہ بنایا۔ اس نے دوستوں کے ساتھ اہم علاقوں کی سیر کا پروگرام بنایا اور گھومتے پھرتے ہوئے فطرت کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی۔ کیرالا کے ہرے بھرے جنگلوں میں کچھ وقت گزارا تو راجستھان کے صحرا کی تپتی ہوئی ہوا کے جھکڑ کو جھیلا اور کبھی ہمالیہ کی برف پوش پہاڑیوں کا نظارہ کیا۔ اس طرح اس نے ہند کے مزاج کو سمجھنے قابل دید مقامات کو دیکھنے کے بعد ذہن میں لینڈ اسکیپ ترتیب دینے کی سعی کی۔ وہ مظاہر فطرت کو اپنے انداز میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ مختلف النسل لوگوں سے ملتا ان کی کہانیاں سنتا اور اپنے ذہن میں اسے ترتیب دیتا رہا۔ اس دوران اس نے بہت سی قابل ذکر تصویریں بنائیں۔ اس کی ان تصاویر کو جس نے بھی دیکھا خوب پسند کیا۔

اب وہ پہچانا جا رہا تھا۔ اس کے کام کو پسند کیا جانے لگا تھا۔ اس کی تعریف ہو رہی تھی۔ دیگر شہروں سے اسے دعوتیں مل رہی تھیں کہ وہ ان کے ہاں بھی آئے۔ یہاں بھی نمائش کرے لیکن وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ ایسا پیش کرے جو اس سے پہلے کسی نے پیش نہیں کیا تھا۔ وہ مسلسل غور و فکر کر رہا تھا لیکن کوئی نکتہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

1950 میں قسمت نے اسے ایک راہ سجھائی۔ اس نے یورپ جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ذہن میں تھا کہ وہ وہاں ایک نمائش لگائے گا جس سے ڈھیر سارے پیسے آ جائیں گے۔ دوستوں نے اس مرحلے پر اس کی خوب مدد کی اور وہ سوئٹزر لینڈ کے لیے نکل پڑا۔ اس کا پڑاؤ زیورخ تھا۔ یہ شہر کئی معنوں میں اہم ہے۔ یہاں فن کی قدر ہے یہی سوچ کر اس نے ایک سولو ایکو بیشن کا اہتمام کیا۔ یہ نمائش لگی۔ لوگوں تک بات پہنچی کہ انڈیا سے ایک مصور آیا ہوا ہے جس کی تصویریں بولتی ہوئی ہیں۔ بہت عمدہ کام ہے۔ پہلے دن اتنے لوگ آئے نہیں لیکن دوسرے اور تیسرے دن ایک اژدہام امنڈ پڑا۔ اچھی خاصی تصویریں اچھے داموں فروخت ہوئیں۔ اس کامیاب نمائش نے اسے خوش کر دیا۔ وہ زیورخ سے یورپ کے دوسرے شہروں میں بھی گیا۔ اس نے یورپ کے نامور مصوروں سے بھی ملاقاتیں کیں جن میں پیکاسو، مت سے' پال کیلے شامل ہیں۔

وہ کیلے سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ کیلے انڈین آرٹ اور فلسفے کے بارے میں اچھی معلومات رکھتا تھا۔ مقبول کو اس کی معلومات نے حد سے زیادہ متاثر کیا۔ کامیابی کے جذبے سے سرشار واپس بمبئی آیا۔ اس نے ایک نئی راہ دریافت کر لی تھی۔ اب وہ ایک خاص نکتے پر غور کر رہا تھا۔ اس نے چین کے سفر میں مٹی سے بنے گھوڑوں پر تحقیق کی۔ یورپ کے سفر میں اس نے رینیسیس گھوڑوں پر تحقیق کی اور پھر اس کے ذہن میں گھوڑوں کو ایک نئے انداز میں پینٹ کرنے کا خیال جڑ پکڑ گیا۔

اب وہ اپنے کام کی وجہ سے خاصا مشہور ہو چکا تھا۔ اس کو لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کا نام وقار کا ضامن

بن چکا تھا۔ بھارت کے تقریباً ہر بڑے شہر میں اس کی نمائش لگ چکی تھی۔ لوگ اس کا نام دیکھ کر تصویر کی قیمت لگا دیتے تھے۔

اب اس کے بچے بھی بڑے ہوتے جا رہے تھے۔ چھ کے چھ بچے اس کی زندگی تھے۔ شمشاد حسین، رئیسہ حسین، عقیلہ حسین، مصطفیٰ حسین، اویس حسین، شفاعت حسین، وہ بچوں کو خود سے بہت قریب نہیں کرتا تھا لیکن ان سے پیار بھی بہت کرتا تھا۔ اس نے کبھی خود کو ایک دائرے میں محصور نہیں کیا۔ وہ کبھی شاعر کے روپ میں خود کو پیش کرتا اور کبھی موسیقار اور کبھی فوٹو گرافر، کبھی کھلونا ساز۔ اس میں یہ ساری خوبیاں تھیں اسی لیے وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔

مقبول حسین میں ایسی بات بھی تھی جو اسے سب سے الگ کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ خود کو سب سے الگ، سب سے اعلیٰ سمجھتا۔ اگر کوئی اس کے کسی کام کو ہلکا کام کہہ دیتا تو وہ اس تصویر ہی کو پھاڑ دیتا۔ 1959 میں بال چھابڑا نے ایک آرٹ گیلری بنائی۔ اس میں تقریباً تمام ماڈرن آرٹ کو جگہ دی۔ انہی دنوں پیرس سے ایس ایچ رضا آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے تجریدی کام نمائش کے لیے رکھا۔ اس پر قیمت کا ٹیگ دو ہزار لگایا۔ یہ خبر مقبول حسین تک پہنچی تو وہ اتنی قیمتی تصویر کو دیکھنے آ گئے۔ رضا کی تصویر دیکھی۔ اس کے برابر میں رکھی اپنی تصویروں کو دیکھا۔ ان کی تصویروں پر آٹھ سو نو سو کا ٹیگ لگا ہوا تھا۔ انہوں نے اگلے ہی دن گیلری میں لگی ہوئی اپنی دو تصویریں وہاں سے ہٹا لیں اور اس کی جگہ اپنی دو تجریدی آرٹ ورک لگا دیا اور اس پر قیمت کا ٹیگ لگایا تین ہزار۔ دوستوں سے کہا۔ ''جب رضا دو ہزار لگا سکتا ہے تو میں کیا اس سے چھوٹا آرٹسٹ ہوں۔ اس کی تصویر سے زیادہ میری تصویر پسند کی جائے گی۔'' اور یہی ہوا۔ ایک قدردان نے اس کی دونوں تصویریں چھ ہزار میں خرید لی۔

اس کی بچوں جیسی فطرت تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جانا۔ مقبول حسین کسی کام سے دہلی آئے ہوئے تھے۔ ان کی شہرت دہلی کے فنکار حلقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اوبرائے ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے نکلے تھے کہ گلیارے سے ایک نوجوان عورت نے انہیں نمسکار کیا۔ مقبول نے مڑ کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ''آپ کون ہیں۔ میں نے پہچانا نہیں؟''

''جی میں سنیتا کمار ہوں۔ نریش کمار جو بھارتیہ ڈیوس کپ کے کیپٹن ہیں ان کی پتنی ہوں۔ مجھے بھی آرٹ سے دلچسپی ہے۔''

''اوہ اچھا تو ایسا کرتے ہیں ہم ساتھ بیٹھ کر ایک ایک کپ کافی پیتے ہیں۔'' مقبول نے خود ہی دعوت دے دی۔

وہ دونوں ڈائننگ ہال میں آئے۔ کافی پینے کے دوران آرٹ اور کھیل پر کافی دیر تک باتیں ہوئیں۔ اسی دوران سنیتا کمار نے انہیں راشٹریہ ٹینس چیمپین شپ کے فائنل میچ کی دعوت دی۔ مقبول حسین نے مال ایڈرین کے جیتنے پر شرط بھی لگالی۔ اسی دوران سنیتا کے لیے کال آ گئی اور وہ فون سننے کے لیے [illegible] چلی گئی۔ مقبول حسین بھی اٹھ گئے۔ وہ اوپر جانے والی سیڑھیوں [illegible] بڑھتے چلے گئے تھے۔

اگلے دن [illegible] وہ [illegible] ڈنر پر پہنچی تو ریسپشنسٹ نے کہا۔ ''میم! مسٹر حسین آپ کے لیے ایک پیکٹ چھوڑ گئے ہیں۔''

سنیتا کو خوشی ہوئی کہ [illegible] مصور نے اسے یاد رکھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی [illegible] کبھی خواب دیکھا کرتی تھی کہ حسین جیسا بڑا مصور اس کے [illegible] اس کی تعریف کرے۔ لیکن اس کی پہنچ اتنی اونچائی [illegible] ابھی اتنی بڑی مصورہ بن نہیں پائی تھی۔ ابھی وہ اس [illegible] نو وارد تھی۔ ابھی اس کا برش جادو جگانے سے کوسوں [illegible] تھا۔ ابھی تو وہ رنگوں کے سحر کو سمجھ بھی نہیں پائی تھی۔ مقبول حسین جیسے بڑے مصور نے اسے یاد رکھا یہ بھی اس کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ اس نے پہلے سمجھا تھا کہ شاید وہ میچ کے پاس ملنے پر شکر گزار ہیں، اسی سلسلہ میں شکریہ کا نوٹ لکھ گئے ہوں گے لیکن جب اس نے پیکٹ کو دیکھا تو اس کا دل دھڑک اٹھا کیونکہ پیکٹ کافی بڑا تھا۔ اس میں کیا ہو سکتا ہے یہ دیکھنے کے لیے اس نے اسے کھولا تو اس میں ان کی ایک نئی پینٹنگ تھی۔ دیکھنے سے ہی پتا چل رہا تھا کہ ابھی ابھی کینوس سے اتاری گئی ہے کیونکہ آئل پینٹ ہنوز گیلے تھے رنگ ابھی سوکھے نہ تھے یعنی کہ وہ رات بھر پینٹنگ تیار کرتے رہے ہیں۔ مقبول حسین جیسا بڑا مصور اس نے اپنی نئی پینٹنگ بطور تحفہ دیا ہے۔ یہ بات اس کے لیے بہت بڑی تھی۔ خوشی کی نوید تھی۔ وہ خوشی سے سرشار بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور پھر اس نے اسی وقت فون کر کے شوہر کو بتایا کہ اسے مقبول حسین نے ایک نادر تحفہ دیا ہے۔

مقبول حسین ایک عجیب عادت تھی کہ جس سے دل مل جائے اسے اپنی پینٹنگ بطور تحفہ ضرور دیتے تھے۔ ان کا یہ تحفہ جسے دیا جاتا وہ کتنا خوش ہوتا اس کا اندازہ عام لوگ نہیں کر سکتے ہیں۔ سنیتا کو بھی بے پناہ خوشی ملی تھی۔ وہ خوشی خوشی کو احساس کے ذریعہ محسوس کرنے والوں میں سے تھے۔ 1963 سے انہوں نے ایک عجیب عادت پال لی تھی۔ وہ ہمہ وقت ننگے پیر رہا کرتے تھے۔ پیروں میں نہ جوتا ہوتا اور نہ چپل۔ وہ ننگے پیر بڑی بڑی محفلوں میں جایا کرتے۔ اس بارے میں ایک بار بی بی سی کے لیے انٹرویو لینے والے نے سوال کیا تو وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔ ''اس کی ایک نہیں تین وجہ ہے۔'' تینوں وجہ بتاتے ہوئے مقبول نے کہا۔ ''اس عادت کی شروعات تب ہوئی جب میں مکتی بودھ کے جنازے میں گیا۔ مکتی بودھ میرا یار تھا۔ گو کہ وہ ہندی میں شاعری کرتا تھا اور ہندی ادب سے لگاؤ رکھنے والے اسے بہت بڑا شاعر کہتے تھے۔ جب وہ آنجہانی ہوا تو اس کی ارتھی میں میں بھی گیا۔ شمشان گھاٹ میں داخل ہوتے ہی میں نے پیروں سے جوتے اتار لیے۔ میں زمین کی تپش محسوس کرنا چاہتا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میرے ذہن میں کربلا کی جلتی ریت کا تصور تھا کہ تپتی ریت پر لاشے تڑپے تو کیا سماں ہوگا۔ آلِ رسولؐ کو کس قدر اذیت ہوئی ہوگی اور تیسری وجہ یہ تھی کہ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ میرے پیر میری ماں جیسے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ماں کے پیر دیکھے نہیں تھے۔ سوچا کہ میری ماں جیسے میرے پیر ہیں، میں اس پیر کی توہین برداشت نہیں کر سکتا' انہیں جوتے میں قید نہیں کر سکتا اور اس دن سے میں نے جوتا چپل چھوڑ دیا۔ ننگے پیر گھومتا ہوں۔ بڑی سے بڑی محفل میں جاتا ہوں تو ننگے پیر۔ یہاں تک کہ میں راج بھون یعنی اندرا گاندھی [illegible] بھی گیا تو ننگے پیر۔''

وہ کن [illegible] کے تھے۔ شاید اسی وجہ سے لوگ انہیں سنکی سمجھتے۔ ان کے دل [illegible] آجاتا وہ وہی کرتے۔ بالکل کسی بچے کی طرح۔ ایک بار [illegible] انہیں اپنے گھر لے گئیں کہ وہ ان کے ہاں ایک دن مہمان [illegible] ہوٹل کی ملاقات نے انہیں واقف کار تو بنا ہی دیا تھا۔ [illegible] واقفیت کے بھروسے پر انہوں نے مقبول حسین کو گھر بلا لیا تھا۔ [illegible] ہو گئے لیکن اس دن ایک عجیب بات ہوئی۔ دونوں میاں [illegible] کے منتظر بیٹھے تھے لیکن مقبول حسین کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

''لگتا ہے وہ نہیں آئیں گے۔'' یہ کہہ کر ان کے شوہر بیڈروم کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ٹیرس پر کھڑی سنیتا کمار زور سے بولی۔ ''لو وہ آ گئے۔''

نریش کمار واپس پلٹے اور تیزی سے ٹیرس پر آئے۔ وہ ٹیکسی سے اتر رہے تھے۔ نریش کمار حیران کہ ان کو لینے ائرپورٹ ان کا ڈرائیور گیا تھا۔ وہ کہاں رہ گیا؟

لیکن یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا وہ تیزی سے نیچے اترے اور انہیں خوش آمدید کہنے روش پر پہنچے۔ انہیں ساتھ لے کر اوپر آئے۔ اسی وقت ان کا ڈرائیور بھی آ گیا۔ اس نے بتایا۔ ''میں نے صاحب کو پہچان لیا تھا۔ ان سے کہا بھی کہ مجھے نریش جی نے بھیجا ہے لیکن یہ راضی نہ ہوئے۔ کہنے لگے کہ میں تو ٹیکسی میں جاؤں گا اور انہوں نے زبردستی ٹیکسی لے لی۔''

مقبول حسین نے ڈرائیور کو سہمی ہوئی حالت میں دیکھا تو بولے۔ ''سمجھا کرو۔ میں اسے جانتا بھی نہیں تھا پھر کیسے اس کی کار میں بیٹھ جاتا۔ تم نے کار کا جو نمبر لکھایا تھا وہ پرچی گھر میں ہی رہ گئی۔ سنتے ہیں دلی میں آج کل اغوا کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ کہیں یہ اغوا کار نہ ہو اس لیے میں نے اسے بھگا دیا اور ٹیکسی کر کے آ گیا۔ اب اسے تم ڈانٹنا نہیں۔ بالکل نہیں۔''

وہ رات مقبول حسین نے ان کے ہاں گزاری۔ دونوں میاں بیوی ادب سے ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ یکا یک مقبول حسین بولے۔ ''سنو!''

وہ دونوں چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔ اگلے دن انہیں افتتاحی تقریب میں شرکت کر کے واپس بمبئی جانا تھا اس لیے وہ باتوں کے درمیان بولے تھے۔ ''رات زیادہ ہو رہی ہے۔ تم لوگ ڈسٹرب ہو رہے ہو گے۔ جاؤ سو جاؤ۔'' اور صوفے سے اٹھ کر بیڈ کی طرف چل دیے جب کہ جو باتیں ہو رہی تھیں وہ ادھوری رہ گئیں؛ لیکن سنیتا اور نریش کمار ادب کی وجہ سے کچھ بول بھی نہ سکے اور اٹھ کر اپنے روم میں چلے آئے۔

اگلے دن تقریب میں ہی انہوں نے سنیتا سے کہا۔ ''بھائی تمہارے گھر میں میرے کچھ کپڑے ہیں وہ کسی سے بھجوا دینا۔ میں یہیں سے بمبئی جا رہا ہوں۔ ائرپورٹ جاؤں گا اور پھر وہاں سے بمبئی۔''

وہ لوگ کیا بولتے۔ خاموش رہ گئے۔ شام میں انہوں نے کہا۔ ''اب دیر ہو رہی ہے۔ ائرپورٹ بھی جانا ہے۔ ایسا کرو کہ ٹیکسی بلوا دو۔''

سنیتا نے کہا۔ ''ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ ہماری کار ہے نا۔ ڈرائیور آپ کو چھوڑ آئے گا۔''

سنیتا نے ڈرائیور کو ہدایت دی اور ان کا چھوٹا سا بیگ اٹھا کر وہ خود مرسڈیز تک آئی۔ انہیں سوار کرا کر بولی۔ ''اب ہم بھی گھر جا رہے ہیں۔ آپ کا سامان ابھی پیک کرا دوں گی۔ جیسے ہی کوئی بمبئی جانے والا ملا اس کے ہاتھ سے بھجوا دوں گی۔''

سنیتا بھی اسی وقت گھر کے لیے نکل گئی۔ وہ مدر ٹریسا کی

پیرس جانا ہی نہیں ... [illegible] ... سے ان کا ساتھ ... [illegible] ... تو وہ اسی وقت اس کام کو قبول کر لیتی تھیں۔ ان کا ایک خط آیا تھا۔ انہوں نے دہلی میں بے گھر بچوں پر ایک رپورٹ تیار کرنے کی فرمائش کی تھی۔ گھر پہنچتے ہی وہ رپورٹ تیار کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ اسے اگلے ہی دن یہ رپورٹ مدر ٹریسا کو بھیجنا تھا۔ ابھی وہ گھر پہنچی ہی تھی کہ ڈرائیور کا فون آ گیا کہ میم ایک عجیب بات ہوئی ہے۔ ائرپورٹ کے راستے میں جو چھوٹا سا میدان ہے وہ دیکھتے ہی میاں صاحب (مقبول حسین) نے کار رکوا دی اور کہا کہ میں یہاں سوؤں گا۔ اب وہ کار سے اتر کر میدان میں بیگ سر کے نیچے رکھے سو رہے ہیں۔ آتے جاتے لوگ ان پر ہنس رہے ہیں۔ اب میں کیا کروں؟"

"انہیں سونے دو۔ بس نظر رکھو کہ کوئی ان کا بیگ لے کر نہ بھاگ جائے۔ اگر وہ اتنی دیر سوتے رہیں کہ فلائٹ کا ٹائم نکل جائے تو انہیں گھر لے آنا۔"

"جی میم میں پی سی او سے بھی ان پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ کار میں جا کر بیٹھ جاتا ہوں جب اٹھیں گے تو ان سے پوچھ لوں گا کہ اب کہاں جانا ہے۔" ڈرائیور نے کہا اور لائین کاٹ دی۔

یہ کوئی نئی بات تو تھی نہیں۔ ان کے جاننے والے بھی جانتے تھے کہ وہ کب کیا فرمائش کر بیٹھیں کسی کو خبر نہیں۔ لیکن کوئی انہیں ایسے کسی کام سے روکتا بھی نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ ان کے اندر ایک بچہ ہے جو موقع پاتے ہی انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا ہے اور بچگانہ حرکتیں کرنے لگتا ہے۔

ایسی ہی ایک بچگانہ حرکت کا شکار ایس کے مشرا بھی ہو چکے تھے۔ ایس کے مشرا بھارت کے سابق وزیراعظم چندر شیکھر کے مشیر تھے۔ لیکن یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب وہ انڈیا ٹورازم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے قبرص میں ایک ہوٹل کھولا تھا۔ اس ہوٹل کی مشہوری کے لیے انہوں نے مقبول حسین کی تصویروں کی نمائش رکھی تھی۔ مہمان خصوصی کے طور پر قبرص کے صدر کو مدعو کیا تھا۔ مقبول حسین سے بات طے ہو چکی تھی۔ وہ اپنے ساتھ تصویریں لے کر آنے والے تھے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور مقبول حسین سے کوئی رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ پریشان پریشان پھر رہے تھے کیونکہ نمائش میں بس ایک دن رہ گیا تھا کہ انہیں اطلاع ملی کہ مقبول حسین آ رہے ہیں۔ وہ انہیں لینے ائرپورٹ پہنچ گئے۔

... [illegible] فلائٹ سے مقبول حسین اترے۔ مشرا ... [illegible] ... تو وہ گلے لگ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ مشرا حیران کہ وہ خالی ہاتھ آ گئے۔ ان سے رہا نہیں گیا تو انہوں نے پوچھ لیا۔ "آپ کی پینٹنگ کہاں ہے؟"

"وہ اگلی فلائٹ سے آ جائے گی۔" مقبول نے جواب دیا۔

یہ جواب مشرا کو تیر کی طرح لگا۔ غصہ سر چڑھ گیا ... [illegible] ... رہا تھا۔ اپنے غصے کو دبا کر وہ بولے۔ "لیکن بمبئی سے آنے والی فلائٹ تو آخری ہے۔ اب اگلے ہفتہ ہی دوسری فلائٹ آئے گی۔"

"ارے آپ فکر نہ کریں۔ پینٹنگ پہنچ جائے گی۔" مقبول حسین نے عام ... [illegible] ... میں کہا۔

اس حالت میں وہ کیا کریں ... [illegible] ... مشرا کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ملک کا صدر آ رہا ہے۔ ... [illegible] ... افتتاح اسے کرنا ہے اور پینٹنگ کا وجود نہیں۔ ان کا دل کر رہا تھا کہ ... [illegible] ... ان کا گلا دبا دے۔ ان کے چہرے کی بدلتی حالت دیکھ کر مقبول بولے۔ "آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ آپ کو پینٹنگ ہی چاہیے نا، وہ صبح مل جائے گی۔"

مشرا غصے میں بھر آئے اور سیدھے اپنے بیڈ روم میں چلے گئے۔ مقبول حسین کے لیے ہوٹل میں ہی انہوں نے انتظام کر دیا تھا۔ وہ ساری رات کروٹ بدلتے ہوئے مشرا نے گزاری۔ صبح وہ بستر سے اٹھے بھی نہیں تھے کہ مقبول حسین آ گئے۔ آتے ہی انہوں نے کہا۔ "چلو اس ہال میں چلتے ہیں جہاں میری پینٹنگ کی نمائش رکھی ہے۔"

"کیوں میرا وقت برباد کر رہے ہیں۔ شام میں نمائش کا اعلان ہوا ہے۔ کتنی بڑی بدنامی ہو گی اس کا آپ کو احساس بھی نہیں۔" مشرا نے غصے میں جواب دیا۔

"ارے بھائی آؤ تو۔ ایک نظر ہال کو دیکھ لینے سے کیا غلط ہو جائے گا۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی مشرا نے کپڑے تبدیل کیے اور مقبول حسین کے ساتھ اس ہال میں آئے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی حیرانی نے انہیں گھیر لیا۔ پورے ہال میں کل تیس پینٹنگ لگی ہوئی تھیں اور سب کے رنگ کچے تھے۔ آئل پینٹ ہونے کی وجہ سے تصویریں گیلی تھیں۔ مشرا جذبات میں مقبول حسین سے لپٹ گئے اور بچوں کی طرح رونے لگے۔ ان کی عزت بچانے کی خاطر مقبول حسین نے ساری رات جاگ کر

تیس پینٹنگ تیار کر دی تھیں۔ اتنا کام کوئی ایک رات میں کر سکتا ہے یہ بات بھی ناقابل یقین تھی لیکن مقبول حسین کے لیے کوئی بات ناممکن نہ تھی۔ وہ ایسے ہی مزاج کے شخص تھے۔

ان کے مزاج سے تو رام منوہر لوہیا جیسے بڑے اور معروف سوشلسٹ لیڈر بھی تنگ رہتے تھے۔ انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کی وجہ سے رام منوہر لوہیا کو ہندوستانی سیاست میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لوگ ان کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کرتے تھے۔ مگر مقبول حسین جو عادت کے مطابق باتوں کے دوران مقابل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالتے وہ اسی انداز میں ان سے باتیں کرتے۔

اگر دہلی میں دونوں کی ملاقات ہوتی تو وہ لوہیا کو کھینچ کر جامع مسجد ضرور لے جاتے۔ وہاں کریم ہوٹل کا مغلائی کھانا انہیں بہت پسند تھا۔ ایک بار جب وہ دونوں کریم ہوٹل میں بیٹھے تھے کہ لوہیا نے کہا۔ "یہ جو تم ٹاٹا اور برلا کے ڈرائنگ روم کے لیے تصویریں بناتے ہو اس دائرے سے نکلو اور رامائن پینٹ کرو۔"

یہ بات مقبول حسین کے دل پر لگ گئی اور اس نے اسی دن "گنجا دھر" کے عنوان سے گنیش کی تصویر بنائی جو اتنی مقبول ہوئی کہ لوگ خریدنے کے لیے پاگل ہو اٹھے تھے اور اسی ... [illegible] ... کا نتیجہ تھا کہ مقبول نے اپنا مرکزی نکتہ گاندھی، نہرو کو بنا ... [illegible] ... کو پینٹ کیا۔

1973 میں انہوں نے "وشومیترا" پینٹ کیا۔ اس تصویر نے ... [illegible] ... دی۔ ہندوؤں کے اس مذہبی کردار کو انہوں نے اس خوبصورتی سے پینٹ کیا تھا کہ لوگ تعریف کر کے نہ تھکتے تھے۔

45 تصویروں کے ... [illegible] ... انہوں نے Passage Through Human Space بنائی جس نے پوری دنیا کو متوجہ کر لیا۔ ملین ڈالرز قیمت لگی۔

شاعری، مصوری، فوٹو گرافی، ... [illegible] ... غرض ہر شعبہ میں انہوں نے کمال ہی کیا گویا ان کے ہاتھ میں جادو تھا۔ وہ جو کچھ بھی بناتے تعریف کے قابل بناتے۔ ... [illegible] ... انہیں ایک اور شوق نے گھیرا۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری ... [illegible] ... مقام رکھتی ہے۔ اس نگری میں قابل تعریف ہنرمندوں کی بھی کمی نہیں ہے لیکن مقبول حسین کو ان میں کوئی ایک بھی اپنے معیار کا نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ انہوں نے ٹھان لیا تھا کہ وہ بھی ایک فلم بنائیں گے۔ ایسی فلم جو دھوم مچا دے گی۔ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے غور و فکر شروع کر دیا۔

کئی مہینوں تک مختلف زاویئے سے انہوں نے غور کیا لیکن انہیں کوئی بھی ایسا شخص نظر نہیں آیا جسے ساتھ ملا کر وہ ٹیم بناتے کیونکہ یہ کوئی آرٹ ورک تو تھا نہیں کہ کینوس کے سامنے کھڑے ہو کر وہ برش اٹھاتے اور دن رات کی محنت سے کوئی شہکار تخلیق کر لیتے۔ فلم بنانے کے لیے ایک پوری ٹیم کی ضرورت تھی اور ٹیم میں شامل کرنے کے لیے انہیں کوئی نام سوجھ نہیں رہا تھا۔ خود کو الجھا پا کر انہوں نے ڈائری اٹھائی اور ٹیم میں شامل اہم کرداروں کے نام لکھنا شروع کر دیے۔

ٹیم ورک کے لیے پہلا کردار ڈائریکٹر لکھا پھر کہانی کار پھر دیگر کرداروں کا ذکر کیا۔ کردار لکھنے کے بعد انہوں نے غور کرنا شروع کیا کہ ہدایت کاری کس سے کرائی جائے؟ انہوں نے بمبئی فلم انڈسٹری کے تمام ہدایت کاروں کے کام پر نظر ڈالی۔ ذہن میں ایک ایک نام کو پرکھا لیکن ان میں سے ایک نام بھی ایسا نظر نہ آیا جس سے وہ اپنے مطلب کا کام کرا لیتے۔ وہ جس قسم کی فلم بنانا چاہ رہے تھے۔ ویسا کام ان میں سے کسی کے بس کا نہ تھا۔ کئی دن غور کرنے کے بعد انہوں نے ڈائریکٹر کے آگے اپنا نام لکھ دیا۔

فلم بنانے کے لیے کہانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر کہانی کے کوئی فلم کیسے بن سکتی ہے۔ انہوں نے بمبئی میں پھیلے ان تمام کہانی نویسوں پر نظر ڈالی جن کی کہانیاں پردہ سیمیں پر منعکس ہو کر ناظرین سے داد وصول کر لیتی ہیں۔ کئی ہفتے تک انہوں نے ان تمام کہانی نویسوں کی کہانیوں پر غور کیا پھر کہانی نگار کے آگے اپنا نام لکھ دیا۔ اب انہوں نے ڈائری بند کی اور کہانی سوچنے کی ابتداء کر دی۔ کئی ماہ تک وہ کہانی سوچتے رہے۔ ان کی یہ عادت تھی کہ جب وہ کوئی شہکار تخلیق کر رہے ہوتے تو وہ اپنے اسٹوڈیو میں بند ہو جاتے تھے۔ کسی کو بھی مخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ اس بار بھی انہوں نے یہی کیا تھا۔ اسٹوڈیو میں بند ہو کر وہ سارا سارا دن ساری ساری رات سوچتے رہے۔ باہر لوگ منتظر تھے کہ کوئی شہکار آنے والا ہے۔

تقریباً تین ماہ کی دماغ سوزی کے بعد انہوں نے کہانی کا خاکہ تیار کیا۔ اب اسکرین پلے کی ضرورت تھی۔ یہ کام کس سے کرایا جائے۔ انہوں نے پھر دماغ کے گھوڑے دوڑائے مگر کوئی نام انہیں جچا نہیں، انہوں نے اپنے حلقہ ارباب میں اسکرین پلے رائٹرز کو تلاشنے کا کہا۔ لوگوں نے کئی بڑے بڑے نام بتائے۔

وہ جانتے تھے کہ یہ بڑے نام اپنے کام میں مداخلت پسند نہیں کریں گے اس لیے انہوں نے تمام کے تمام مسترد کر دیئے۔ اسکرین پلے ایک ٹیکنیکل کام ہے۔ وہ اس کی گہرائی جانتے تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ اگر یہ کام بھی اپنے ذمے لے لیں گے تو اس میں کہیں نہ کہیں کمی رہ جائے گی۔ اس مسئلے کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ ایک کم مشہور اسکرپٹ رائٹر بلوایا اور پھر اس نے جس طرح مناظر کو ابھارا، مقبول حسین اس پر دوبارہ سے کام کرنا شروع کر دیا۔ لکھتے، کاٹتے رہے۔ ایک چھتری کو الٹا ہوا راستے کے درمیان پڑا دکھانا تھا۔ چھتری کا سین کم سے کم دس بار بدلا، ٹوٹی ہوئی لالٹین یا چھوٹا سا بچہ، ایک ایک انداز میں دکھانا ہے اس کا اینگل وہ بار بار بدلتے۔

اہم بات یہ تھی کہ اس پوری فلم میں ایک بھی ڈائیلاگ نہیں تھا۔ عوام کو جو کچھ بھی بتانا تھا، پیغام دینا تھا' منظر ناموں کے ذریعے ہی دینا تھا اس مشکل کام کو بھی انہوں نے انجام دے دیا۔ یہ فلم عوام کے لیے تو کبھی نہیں بنی لیکن آرٹ، دانشور، ثقافت کے دلدادہ نے بہت اہمیت دی۔ 1967ء کی جولائی میں جرمنی کے دارالحکومت برلن میں 70 فلم فیسٹیول منعقد ہوا تو اس فلم کو پہلا انعام دیا گیا اور اسے میوزیم آف ماڈرن آرٹ (MOMA) نیویارک نے خرید لیا۔ اسے گوا فلم فیسٹیول کے لیے بھی نامزد کیا گیا تھا مگر چند اعتراضات کی وجہ سے اسے روک لیا گیا۔ 1968ء میں اس فلم کو حکومت ہند نے نیشنل ایوارڈ سے نوازا۔

اب مقبول حسین اتنے مشہور ہو چکے تھے کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مسلمان ہوتے ہوئے بھی ان کی پزیرائی ضروری ہو چکی تھی۔ مجبوراً 1986ء میں انہیں پارلیمنٹ کا ممبر منتخب کر لیا گیا۔

سیاست وہ کیا جانیں مگر حکومت کی بات ماننی پڑی اور پابندی سے سیشن میں جانا پڑا۔ وہ اسمبلی میں جاتے اور پھر کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتے۔ کس نے کیا کہا انہیں اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ 1992ء تک پارلیمنٹ میں رہے۔

ہر سال بھارت میں ایوارڈ تقسیم ہوتا ہے۔ 1973ء میں انہیں بھارت کا ایک بڑا اعزاز پدم بھوشن دیا گیا۔ یہ تمغہ ثقافت اور ادب پر دیا جاتا ہے۔ اب لوگ ان پر رشک کرنے لگے تھے کہ زمین سے اٹھنے والا کتنا اوپر جا چکا ہے۔ ان سے حسد کرنے والے جلن میں مبتلا تھے کہ انہیں اتنا بڑا ایوارڈ ملا ہے لیکن 1991ء میں انہیں اس تمغے سے بھی بڑے "پدم وی بھوشن" سے نوازا گیا۔ یہی نہیں 1997ء

میں انہیں "ادیتہ وکرم برلا کلاشیکا" لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دیا گیا۔ اب تو ان سے حسد کرنے والوں کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگا۔ ابھی ان ایوارڈ کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ 2004ء میں "للت کلارتن ایوارڈ" للت کلا اکیڈمی نیو دہلی نے دیا۔

اسی سال 2007ء میں میسور یونیورسٹی نے آنرری ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا۔ 2007ء میں ہی دہلی کی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بھی اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ اسی سال بنارس ہندو یونیورسٹی نے بھی انہیں آنرری ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی اور اسی سال کیرالہ کی حکومت نے "راجا روی ورما ایوارڈ" سے نوازا۔ یہ ایوارڈ کیرالہ کی صوبائی حکومت کا سب سے بڑا ایوارڈ مانا جاتا ہے جو ادب اور فن پر دیا جاتا ہے۔

جلنے والے جل رہے تھے اور مقبول حسین اپنے سفر پر چل رہے تھے۔ یہ بات 1990ء کی ہے۔ مقبول اب مقبولیت کی معراج پر تھے۔ انہیں اب انڈین پکاسو کہا جانے لگا تھا۔ ان کے فن پارے کی قیمت لاکھوں میں لگتی تھی۔ جہاں بھی نمائش ہوتی آرٹ کے دلدادہ ان کی تصویریں خریدنے کے لیے ٹوٹ پڑتے۔ سال کے شروع میں ہی انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اس سال ایک اہم اور انوکھے فن پارے کی نمائش کریں گے۔ لوگ منتظر تھے۔ بالآخر نمائش کا اہتمام ہوا۔ لوگوں نے تصویروں کی قیمت ان کے اندازے سے بھی زیادہ لگائی۔

ان کے برش میں جادو تھا کہ وہ جو کچھ بھی پینٹ کرتے وہ مقبول عام ہو جاتا۔ ان کی تخلیق ان کے ہاتھوں کا کمال' ان کی مقبولیت کچھ لوگوں کو آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ چبھن پیدا کر رہی تھی کہ ایک مسلمان ہو کر وہ شہرت کی اوج پر پہنچ گئے ہیں۔ تعصب پرست انہیں نیچا دکھانے کی کوشش میں ہی تھے کہ انہیں ایک کلیو مل گیا۔ ایک بہانہ مل گیا۔ 1970ء میں انہوں نے کچھ ایسی تصویریں بنائی تھیں جو ہندوؤں کے مطابق ان کے مذہب کا مذاق اڑایا تھا۔ انہوں نے کئی دیویوں کی تصویریں شوخ رنگوں سے ابھاری تھی۔ ان تصویروں میں جدت پیدا کرنے کے لیے انہوں نے ان دیویوں کے جسمانی خطوط کو کچھ زیادہ ہی ابھار دیا تھا۔

بمبئی مہاراشٹر کا شہر ہے اور پورے مہاراشٹر میں بال ٹھاکرے کی پارٹی ایک بڑی طاقت بن کر ابھر رہی تھی۔ شیو سینا نامی وہ پارٹی مسلمانوں کے خلاف نعرے لگا کر تعصب پھیلا کر آگے بڑھ رہی تھی۔ آر ایس ایس اور ہندو مہا سبھا' بی جے پی سے زیادہ کٹر پن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ بال ٹھاکرے کی سیاست ہی مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات ابھار کر ووٹ لینا تھا۔ اس کی پارٹی نے ان پرانی تصویروں پر سیاست کھیلی۔ انہیں "وچار میمانشا" نامی میگزین میں شائع کیا اور یہ الزام لگایا کہ مقبول حسین مسلمان ہے اسی لیے اس نے ہماری دیویوں کو ننگا دکھایا ہے۔

اخبار کے مارکٹ میں آتے ہی پورے شہر میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی۔ مقبول حسین کے خلاف نعرے لگنے لگے۔ اس کے خلاف 8 کیس دائر ہوئے۔ متعصب ہندو آرگنائزیشن نے ہڑتال کی کال دے دی۔ ان کی بہت سی مشہور پینٹنگ کو آگ لگائی گئی۔ ان کے گھر پر کئی بار حملے بھی ہوئے۔

ایسی باتوں کو مقبول حسین زیادہ اہمیت بھی نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے جب 1947 میں ہندو مسلم فسادات کو اہمیت نہیں دی تھی اور اس وقت بھی فسادیوں کے خلاف پینٹنگ کی نمائش کی تھی تو شیو سینا کی دھمکیوں کو کب اہمیت دیتے۔ انہوں نے اس بات کو بہت ہلکا لیا۔ وہ اپنے کام میں لگے رہے۔

ہر فنکار حسن پرست ہوتا ہے۔ اسے بھی حسن سحر زدہ کر دیتا تھا۔ فطرت کا حسن ان کی کمزوری تھی۔ انہیں لہلہاتے کھیت نظر آ جاتے تو وہ وہیں بیٹھ جاتے اور گھنٹوں ہوا سے لہراتے پودوں پر نظریں گاڑے دیکھتے رہتے۔ اسی طرح انہیں دور تک پھیلے ریگستان بھی بہت بھلے لگتے تھے۔ وہ اسی سحر کو محسوس کرنے کے لیے راجستھان جایا کرتے تھے۔ کبھی جیسلمیر تو کبھی بیکانیر' اور گھنٹوں ریگستان میں کھڑے اڑتی، رخ بدلتی ہواؤں کو محسوس کرتے۔ ریگزار کی پل پل بدلتی شکل دیکھتے، کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ کئی کئی گھنٹے وہ اس مشغلے میں گزار دیتے۔ انہیں اچھی صورتیں بھی اچھی لگتیں۔ اگر کوئی خوب صورت چہرہ نظر آ جائے تو وہ ہونق بنے اسے دیکھتے رہ جاتے لیکن ایک احتیاط ضرور کرتے کہ اس شخصیت سے کچھ دور جا بیٹھتے اور وہاں سے وہ اسے دیکھتے رہتے لیکن جب ان کی ملاقات مادھوری ڈکشٹ سے ہوئی تو گویا وہ سدھ بدھ کھو بیٹھے۔ پہلے دور دور سے پھر قریب سے اسے دیکھتے رہتے۔ ایسا لگتا کہ انہیں اور کوئی کام یاد نہیں بس سامنے بٹھائے اسے دیکھے جاتے۔ بعض لوگ اسے پاگل پن کا نام دیتے اور بعض سنکی کہتے۔ ایک 80 سالہ شخص 26,25 سالہ لڑکی کو گھورتا

رہے تو اسے اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ کچھ لوگوں نے افواہ بھی اڑا دی کہ مقبول حسین مادھوری کے پیار میں پاگل ہو چکا ہے۔

''ہم آپ کے ہیں کون'' انہوں نے دیکھی تو وہ سو جان سے مادھوری ڈکشٹ پر فدا ہو گئے۔ انہوں نے اس فلم کو 67 بار دیکھا، پھر انہوں نے ''آجا نچلے'' دیکھنے کے لیے پورا سینما ہال بک کر لیا۔

وہ گویا اس کے دیوانے بن گئے تھے۔ ان کے کہنے پر ہی پروڈیوسر ریکیش ناتھ نے مادھوری ڈکشٹ کو ایک آرٹسٹ کے طور پر پیش کیا تھا۔ اس فلم میں مقبول حسین نے بھی خصوصی کردار ادا کیا تھا' مادھوری کے استاد کا۔ یہ فلم 19 ستمبر 1997 کو ریلیز ہوئی تھی۔

مقبول حسین کا کہنا تھا کہ مادھوری فن کی دیوی ہے۔ اس صدی کی سب سے حسین لڑکی ہے۔ انہوں نے 2000 میں ''گج گامنی'' جیسی آرٹ فلم بنانے کے لیے مادھوری ڈکشٹ کو راضی کیا اور رقم پانی کی طرح بہائی۔ آرٹ فلموں کے شوقینوں میں تو گج گامنی پسند کی گئی لیکن عام ناظرین نے اسے یکسر مسترد کر دیا۔ تمام پیسے ڈوب گئے لیکن انہیں غم نہیں تھا۔ یہ پیسے انہوں نے فلم پر نہیں لگائے تھے بلکہ انہوں نے مادھوری کا صدقہ اتارا تھا۔

2004 میں انہوں نے ایک اور فلم بنائی ''مینا کشی اے ٹیل آف تھری سٹی'' اس میں تبو کو مرکزی کردار دیا گیا' لیکن یہ فلم بھی متنازعہ بن گئی۔ مسلمانوں کی کئی تنظیموں نے الزام لگایا کہ اس کا ایک گانا مذہب کے خلاف ہے۔ اس فلم کو زبردستی سینما ہالوں سے اتار دیا گیا۔

یہ آگ ابھی ٹھنڈی بھی نہیں ہوئی تھی۔ صرف وقت کی راکھ میں دب گئی تھی کہ 2006 میں مقبول حسین کی ایک اور پینٹنگ سامنے آ گئی۔ ہندوستانیوں نے اپنی مادرِ وطن ''بھارت ماتا'' کی ایک خیالی تصویر بھی بنا رکھی ہے اور اسے پوجتے بھی ہیں۔ مقبول حسین نے ''بھارت ماتا'' کی تصویر کچھ اس طرح بنائی تھی کہ جیسے بھارت ماتا نے بھیگی ہوئی ساڑی پہن رکھی ہے۔ ساڑی سے جسم کے تمام خدوخال نظر آ رہے تھے۔ مقبول کی منشا یہ تھی کہ وہ اس نیم برہنگی کو مفاد پرستوں کی ہوس قرار دے مگر ہوا الٹا۔ لوگوں نے اس برہنگی کو صرف برہنگی مانا، تشبیہ نہیں۔ اور بال ٹھاکرے کے غنڈے ان کے گھر پر پتھراؤ کرنے پہنچ گئے۔ ان کے مکان پر اس قدر شدید غصہ اتارا گیا کہ مقبول حسین بھی خوفزدہ ہو گئے۔ انہوں نے ہندوستان چھوڑ دینے کی کوشش شروع کر دی۔ نہایت خفیہ انداز میں وہ ملک سے باہر نکل گئے۔ سیدھے قطر پہنچے۔

قطر کے حکمران نے اس موقع کا بھرپور استعمال کیا۔ انہیں وہاں کے مروج قوانین کو توڑ کر قومیت دے دی۔ ملتے ہی وہ قطر کے شہری بن گئے۔

دنیا بھر میں جس کی دھوم تھی ایسی شہرت کے حامل شخص کو شہریت دیتے ہی پوری دنیا میں قطر کا نام مشہور ہو گیا۔ پوری دنیا نے قطر کے اس اقدام کو سراہا ایک احسن قدم قرار دیا۔

اب انہیں نہ بھارت سے کوئی مطلب تھا نہ وہاں کی یادوں سے۔ وہ اپنی ہی دنیا میں کھوئے رہتے۔ ان کے فن پاروں کی نمائش یورپ اور امریکا کے مختلف شہروں میں تواتر سے شروع ہو گئی تھی۔ دولت برسنے لگی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتے انہیں انڈین [illegible] کے نام سے پکارا جاتا۔ ایک آرٹسٹ کی ایک فنکار کی کیا [illegible] ہوتی ہے یہ انہیں اب معلوم ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا کہ لوگ انہیں [illegible] کرنے پر اتر آئے ہیں۔

وہ اپنی اس پزیرائی سے بہت زیادہ خوش تھے۔ وہ اکثر جتایا کرتے کہ اب میں انگلینڈ میں ہی رہوں گا۔ ان کا کہا سچ ہو گا اس بارے میں کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ لندن کے اپنے فلیٹ میں بیٹھے تھے کہ انہیں سینے میں درد محسوس ہوا۔ وہ سینہ پکڑ کر کرسی پر ہی ڈھلک گئے۔ جلاوطنی کے ایام تھے پھر بھی ہمہ وقت دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ انہیں احباب اسپتال لے کر بھاگے۔ ڈاکٹروں نے اپنے پورے تجربے آزما لیے لیکن انہیں بچا نہ سکے۔ 9 جون 2011 کو رائل برمپٹن اسپتال لندن میں انتقال ہو گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ انہیں دفن کہاں کیا جائے؟ وہ قطر کے شہری تھے۔ ان کی لاش قطر بھیجی جائے؟ لیکن وہاں ان کا اپنا تھا کون؟ اگر لاش بھارت بھیجی جاتی ہے تو وہاں ایک بار پھر ہنگامہ شروع ہو جائے گا۔ شیوسینا کے غنڈے قبر بنانے نہیں دیں گے۔ ان کے بیٹوں سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے بھی مشورہ دیا کہ وہ سب آ رہے ہیں۔ انہیں وہیں دفن کر دیا جائے۔ بالآخر انگریزوں سے نفرت کرنے والا، انگریزی سامراج کے خلاف بطور احتجاج اپنی تصویری نمائش سے فن کی دنیا میں قدم رکھنے والا انگریزوں کے دیس میں بروک وڈ قبرستان میں مٹی اوڑھ کر سو گیا۔ ایک بڑے آرٹسٹ کی کہانی ہمیشہ کے ختم ہو گئی۔

وادیٔ موت

امجد رئیس

یہ دنیا اسرار سے بھری ہے اور ابن آدم کی جستجو ہے کہ وہ پردۂ اسرار ہٹا دے۔ صدیوں سے یہی ہوتا آرہا ہے۔ ہر دور میں مہم جوئی جاری رہی ہے۔ نئی سرزمین کی تلاش جاری رہی ہے۔ اس کی یہ جستجو اسے نئی نئی دنیا سے روشناس کراتی رہی ہے۔ وہ لوگ بھی نئی سرزمین کی تلاش میں نکلے تھے مگر اس بات سے بے خبر تھے کہ موت بھی ان کے ہمرکاب ہے۔ پھر بھی وہ حوصلہ مند تھے۔ موت کو پیچھے دھکیلتے رہے۔

عزم و حوصلے کا درس دیتی ایک مہم جو ٹیم کی روداد

دریا کی روانی میں جزائر کی موجودگی کی وجہ سے تیزی پائی جاتی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ دریا کے ان گنت بل کھاتے، گھومتے، چکراتے ہاتھ نکل آئے ہیں۔ دریا جزائر کے ساحل سے ٹکراتا، بل کھاتا بہہ رہا تھا۔ کہیں کہیں چھوٹے [illegible] تھے۔

[illegible] چھوٹی کشتیاں اس صورتِ حال کا سامنا کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ ہمیں ان جزیروں سے بچتے ہوئے [illegible] سے بھی نمٹنا تھا۔

1949ء [illegible] مہم کولمبیا اور ایمزون کے ان آبی راستوں کو [illegible]، جو نقشوں پر موجود نہیں تھے۔ نہ وہاں اس سے بیشتر [illegible] فرد کا گزر ہوا تھا۔

ظاہر ہے کہ فوٹو گرافی اس مہم کا لازمی جز تھی۔ ہمارا تعلق فرانس سے تھا اور ہم صرف تین آدمی تھے۔

☆......☆

ہم جس مشکل سے دوچار تھے وہ اچانک خطرے میں بدل گئی۔ ''پراہنا'' کے پرے کے پرے ہمارے اردگرد چکرا رہے تھے۔ Piranha چھوٹے سائز کی خون آشام مچھلی ہوتی ہے، جس کے دانت آری کی مانند ہوتے ہیں۔ یہ گروہ در گروہ حملہ آور ہوتی ہیں اور منٹوں میں تیز دھار دانتوں سے گوشت نوچ کر کسی بھی فرد کو ڈھانچے میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ ''پراہنا'' کے نام سے ہالی ووڈ میں فلم بھی بن چکی ہے جو کیبل نیٹ پر متعدد بار دکھائی جا چکی ہے۔ اس فلم کا



شمار ہارر فلموں میں ہوتا ہے۔

پراہنا کی مختصر جسامت کو دیکھتے ہوئے اس کی ہلاکت خیزی پر یقین نہیں آیا۔ پراہنا کی کم سے کم جسامت ساڑھے پانچ انچ اور زیادہ سے زیادہ سترہ انچ ہوتی ہے۔ بہرحال یہ دہشت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ ان پر قابو پانا بہت مشکل ہے۔ فرار ہی بچت کا راستہ ہے۔ جسامت اور کثیر تعداد کی وجہ سے کوئی بھی ہتھیار، وسیع پیمانے پر انہیں ہلاک نہیں کر سکتا۔ آتشیں ہتھیار سب بے کار ہوتے ہیں۔ ان کی مدد سے ایک دو درجن مچھلیاں ہی ماری جا سکتی ہیں۔

بدقسمتی سے ہم ان خونخوار مچھلیوں کے جھنڈ میں پھنس گئے تھے۔ ہمارے ساتھ دو مقامی ملازم تھے۔ گویا پانچ آدمی اور تین عام سی کشتیاں۔

مچھلیاں اچھل اچھل کر کشتیوں پر حملہ کر رہی تھیں۔ کشتی کی سخت لکڑی میں جہاں ان کے خونی دانت لگتے وہاں ایک انچ کے تیسرے حصے کے برابر گہرا نشان بن جاتا جس سے ان کی دانتوں کی تیزی اور مضبوطی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پراہنا، شارک اور دیگر خطرناک مچھلیوں کی مانند شکار کے پانی میں گرنے کا انتظار نہیں کرتیں، ان کے حملہ کرنے کی کیفیت جنونی ہوتی ہے۔

☆......☆

میرے ساتھیوں کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ ہم تینوں کشتیوں کو الٹنے سے بچانے کے لیے تمام تر تجربہ صرف کر رہے تھے۔ اگرچہ مہم کے آغاز سے اب تک ہم کئی خطروں سے کامیابی کے ساتھ نمٹ چکے تھے۔ ہمارے پاس مناسب اسلحہ بھی تھا۔ تاہم یہ خطرہ سب سے سنگین تھا۔ میرے ذہن میں الارم بج رہا تھا۔

ہمیں ڈر تھا کہ ہماری بیش قیمت فلمیں ضائع نہ ہو جائیں۔ ہمیں ڈوبنے کا خطرہ تھا۔ سب سے ہیبت ناک خیال یہ تھا کہ ملعون مچھلیاں ہمیں زندہ حالت میں نوچ نوچ کر کھا جائیں گی۔

ہم سب بخوبی آگاہ تھے کہ کوئی ایک کشتی الٹنے کی صورت میں بقایا افراد کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ میرے آگے والی کشتی میں لوئیس، مقامی ملازم کے ہمراہ تھا۔ میرے عقب میں سیکورٹی کی کشتی تھی۔ اگلی کشتی ایک چھوٹے جزیرے کے قریب مڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

دفعتاً میرے عقب میں چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ سیکورٹی کے ملازم کی ہراساں آوازیں تھیں۔

"لوئیس نیائی! لوئیس نیائی!" (لوئیس مر گیا، لوئیس مر گیا)۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ وہ ہم سے پیچھے تھے۔ انہوں نے کیسے دیکھ لیا؟ اتنی دیر میں میں بھی لوئیس کے پیچھے موڑ مڑ چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لوئیس کا ملازم ایک چٹان نما پتھر پر ہے اور خود لوئیس کنارے پر موجود ہے۔

میں سمجھ گیا کہ سیکورٹی کے آدمی کو چٹان پر صرف لوئیس کا ملازم نظر آیا تو وہ اعصاب زدہ ہو گیا اور یہی سمجھا کہ لوئیس ختم ہو گیا ہے۔

کشتی ایسی جگہ الٹی تھی کہ وہ دونوں پراہنا سے فی الفور بچ کر باہر نکل گئے۔ دونوں صحیح سلامت دکھائی دے رہے تھے۔

"میں نے نمبر ایک کو بچا لیا ہے۔" لوئیس نے چیخ کر بتایا۔ اتنی دیر میں سیکورٹی بھی وہاں پہنچ گیا۔

"بہت اچھے۔" سیکورٹی نے نعرہ لگایا۔ باکس نمبر ایک میں فلمیں تھیں۔ یہ بات عیاں تھی کہ لوئیس کی کشتی کے باقی باکس کشتی کے ساتھ ڈوب گئے تھے۔ تاہم خوشی کی بات یہ تھی کہ اس نے اہم ترین باکس بچا لیا تھا۔

معاً سیکورٹی اور میں نے ایک ساتھ، بقیہ دو باکس پانی میں ڈوبتے ابھرتے دیکھے۔ دونوں مقامی افراد کی چیخوں کی پروا کیے بغیر ہم دونوں نے باکس تک پہنچنے کی بھرپور کوشش کا آغاز کیا۔ دوسری طرف مقامی افراد کی چیخ و پکار بلند ہوتی گئی۔

"کیا مصیبت ہے؟" میں دہاڑا۔

ان میں سے ایک نے اشارہ کیا۔ میں نے اور سیکورٹی نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ ہمارے بالکل سامنے پندرہ فٹ کے فاصلے پر پانی گرجدار آواز کے ساتھ نامعلوم سوراخ میں جا رہا تھا۔ سیاہ سوراخ کا دہانہ تیل کی کپی کی مانند تھا۔ دو بکس پہلے ہی اس میں غائب ہو چکے تھے۔

ہم دونوں کو زبردست خطرے کا احساس ہوا۔ کشتیاں از خود سوراخ کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ کوئی لمحہ جاتا کہ کشتیاں رفتار پکڑ لیتیں۔

"واپس......!" سیکورٹی حلق پھاڑ کر چیخا۔

ہم چاروں نے مل کر زور لگانا شروع کیا۔ کشتیوں کی رفتار کم ہوئی۔ پھر وہ دھارے کی کشش سے نکل گئیں۔ ہم چاروں پسینے میں نہا گئے تھے۔ مختصر یہ کہ ہم

والے کنارے تک پہنچ گئے اور رسیوں کی مدد سے کشتیوں کو کنارے کے جھاڑ جھنکار سے باندھ دیا۔
میں حیران تھا کہ وہ خونخوار مچھلیاں کدھر چلی گئیں۔

☆......☆

رات گزارنے کے لیے ہم نے چھولدری نما خیمہ نصب کیا، پھر اپنے نقصانات کا جائزہ لیا۔ حادثے میں جو چھوٹے سائز کے بکس ضائع ہوئے تھے ان میں سے ایک میں مقامی یادگاری اشیاء تھیں۔ مچھروں سے بچنے والا جال بھی اسی میں رہ گیا تھا۔ دوسرے بکس میں ساؤنڈ ریکارڈر، الیکٹریکل ایکوپمنٹس اور اب تک کی تمام ریکارڈنگ تھی۔

دو امور مثبت تھے کہ کوئی ہلاک ہوا تھا نہ زخمی، نیز قیمتی فلمیں بچ گئی تھیں۔

پھر بھی خاصا نقصان ہو گیا تھا۔ ہمیں اب احساس ہوا تھا کہ ہمارے نقشوں میں غلطی تھی، جس کے باعث ہم غلط راستے پر آ گئے تھے۔ ہماری یہ خوش فہمی دور ہو چکی تھی کہ ہم ایک کامیاب مہم کے بعد منزل کے بہت قریب ہیں۔

رات ہم نے جیسے تیسے گزاری۔

ہم میں سے کسی کو بھی پتا نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں اور ہمیں کون سا رخ اختیار کرنا چاہیے۔

صبح ہم نے سب سے پہلے ضروری اور قیمتی اشیاء کی حفاظت کا بندوبست کیا کہ اگر پھر کوئی کشتی الٹ جاتی تو ہم مزید اشیاء کے ضیاع کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ مثلاً میں نے دو ہزار صفحات پر مشتمل نوٹ بکس ایک بستہ میں محفوظ کر کے گردن کے ساتھ باندھ لیا۔ مہم کی اب تک کی ساری کہانی ان صفحات پر لکھی گئی تھی۔ سب نے کچھ نہ کچھ اپنے جسم کے ساتھ باندھ لیا تھا۔ لوئیس نے دوائی کی ایک بوتل کا محلول پانی میں بہا دیا اور خالی بوتل میں ماچسیں بھر کر اسے اچھی طرح سر بند کر کے گلے میں لٹکا لیا۔

ہم سب خاموش تھے۔ غیر یقینی صورتِ حال کی وجہ سے ہم خیال آرائی سے پرہیز کر رہے تھے کہ حوصلہ شکن احساسات میں اضافہ نہ ہو۔

کشتیاں ہم نے دریا کے مرکزی بہاؤ میں اتار دیں۔ کچھ دیر بعد ہمیں عجیب مشکل کا سامنا کرنا پڑا، دریا اچانک آبشار کی مانند آٹھ نو فٹ نیچے اتر کر کچھ دور تک بہاؤ سیدھا رکھتا، پھر دوبارہ نیچے لڑھک گیا تھا، یوں لگ رہا تھا جیسے ہم آبی قدمچوں پر سفر کر رہے ہیں۔ ہر مرتبہ کشتیوں میں پانی بھر جاتا۔ شکر ہے کہ یہ آبی قد[illegible] سیڑھیاں آٹھ نو فٹ سے زیادہ گہری نہیں تھیں پھر کشتیاں بچانے کے لیے ہمیں زبردست مہارت[illegible] جدوجہد کو بروئے کار لانا پڑ رہا تھا۔ اسی افراتفری [illegible] میری ایک ٹانگ زخمی ہو گئی۔ تاہم اس وقت زخم کی جا[illegible] توجہ دینے کا ہوش نہ تھا۔ مجھے صرف اتنا احساس تھا کہ [illegible] کی نوعیت شدید نہیں ہے۔

[illegible]وپہر میں ایک بڑی لہر نے میری کشتی کو پوری طر[illegible] ڈھانپ [illegible] اس موقع پر [illegible] میں کشتی کی رسی تھامنے میں کامیاب [illegible] رہا اور خوش قسمتی سے میرے قدموں نے تہہ آب کو محسوس کیا۔

مقامی ملازم نے کشتی [illegible] اور اس کے سامان کو بچا لیا۔ تاہم ہم ایک بار پھر چند [illegible] محروم ہو گئے جن میں دو بندوقیں بھی شامل تھیں۔ میر[illegible] پانی خون کی سرخی سے آلودہ ہو گیا تھا۔ کسی نے مجھے اپنی پشت پر سوار کر کے کنارے تک پہنچا دیا۔

یہاں درخت نہیں تھے۔ صرف بڑے بڑے پتوں والی جھاڑیاں تھیں۔ اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ وہ رات ہماری مہم کی سب سے دشوار رات تھی۔

اگلے روز پھر سے ہم کچے راستے کی تلاش میں بھٹک رہے تھے، کھانے پینے کی راشن بندی کر دی گئی تھی۔ ہمارا گزارا پھلوں پر تھا اور وہ بھی قریب الختم تھے، کیلے ہمارے ملازم نے ایک ہفتہ قبل کسی جزیرے سے حاصل کیے تھے۔

ہر روز شام کو میں چھوٹے سے کیلنڈر پر ایک نشان لگا دیتا تاکہ دنوں کی تعداد کا علم رہے۔ وقت کا احساس مٹ گیا تھا اور پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جسمانی وزن خوراک کے باعث گرنے لگا تھا۔ تقریباً مہینا گزر چکا تھا ہماری حالت ناگفتہ بہ تھی۔

ہمارے گمان میں بھی نہ تھا کہ مہم کی تمام تر کامیابیوں کے باوجود اختتام اتنا ہولناک ہو گا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ درحقیقت ہم موت سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔

اچانک سیاہ فام ملازم نے پھر چلانا شروع کر دیا۔

''موت! موت۔''

ہم نے حواس مجتمع کیے تو معلوم ہوا کہ کشتیاں جھاگ اڑاتے آبشار کے سر پر ہیں۔ پانی کتنی گہرائی میں [illegible] رہا تھا۔ کچھ پتا نہ تھا۔ دس فٹ، پچیس فٹ، سو اور دو سو فٹ[illegible]

امکان یہی تھا کہ بہت زیادہ گہرائی نہیں ہو گی تاہم ہماری تباہی کے امکانات واضح تھے۔ ہمیں سوچنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔

ہم سب کشتیوں سمیت پانی میں غوطے کھا رہے تھے۔ پانی سے باہر کی جانب نکلی ہوئی ایک مخروطی چٹان کا کونہ کسی طرح میرے ہاتھ آ گیا۔ دونوں ملازم دوسری چٹان پر تھے اور اوپر سے گرنے والی کشتی کی رسی کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن یہ کوشش ناکام رہی اور بپھرے ہوئے دریا نے کشتی کو نگل لیا۔

کنارا مجھ سے تقریباً بارہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ دریا کا تیز بہاؤ ملازموں کو بھیگی ہوئی پھسلواں چٹان سے کھینچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ دونوں کشتی کی موت کو بھول کر اپنی جان بچانے کی دیوانا وار کوشش کر رہے تھے۔

اس مرتبہ ہم اپنی بستر نما اشیاء کے ساتھ شناختی کاغذات بھی کھو چکے تھے۔ یہ بستر رسیوں کی مدد سے دو درختوں کے درمیان جھولے کی مانند باندھے جاتے تھے۔ قیمتی تصاویر تقریباً تمام کی تمام پانی کی نذر ہو چکی تھیں۔ فلموں کا پچاس فیصد حصہ بھی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ہمارے پاس اب صرف ایک کشتی بچی تھی۔ تحریروں کا بستہ پانی پر تیر رہا تھا۔ تاہم اس کی ڈور کا حلقہ میری گردن میں تھا جو کچھ ہم لکھ چکے تھے اس کے بعد بستے میں موجود نوٹ بکس کی اہمیت دوچند ہو گئی [illegible]

میرا [illegible] کی طرح نڈھال تھا۔ چٹان کے سہارے میری بقا کن مراحل میں داخل ہو گئی تھی۔ مستزاد یہ کہ بارش [illegible] ہو گئی۔ نیچے اوپر ہر طرف پانی ہی پانی تھا جو زندگی کی علامت ہے لیکن اس وقت لگ رہا تھا کہ میرا فاقہ زدہ جسم پانی کے ساتھ پانی میں حل ہو کر فنا ہو جائے گا۔

ٹانگ کا زخم کھل گیا تھا اور دریا [illegible] سرخ رنگ کی آمیزش ہونے لگی تھی۔ وقت اور [illegible] کا احساس مٹ گیا تھا۔ میں خواب کی سی کیفیت میں جانے [illegible] تھا حالانکہ کنارا مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ معاً ساتھی مہم جو کی چیخ نے میرے ذہن کی دھند صاف کر دی۔ اس کی چیخ میں سکون اور حوصلہ افزائی کے ساتھ خطرے کا الارم بھی بج رہا تھا۔

''ایلن کنارے کی جانب آؤ، جلدی کرو۔''

"میں نہیں آسکتا۔" میں نے بے بسی کا اظہار کیا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔" پانی کا بہاؤ تند و تیز تھا جب کہ میرا بدن توانائی سے عاری۔

"ایلن ہمت کرو، جلدی کرو۔" اس نے میرا جواب نظر انداز کردیا تھا۔ اس مرتبہ اس کے لہجے کا اضطراب نمایاں تھا۔

میں نے چونک کر اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے پراہنا کی جھلک دیکھ لی تھی۔ خون کی بو نے انہیں میری جانب متوجہ کردیا تھا۔ پراہنا کے چنگل میں پھنسنے کا مطلب بھیانک اذیت والی موت کے سوا کچھ نہ تھا۔

غرقاب ہونے کی صورت میں بھی موت تھی لیکن دونوں صورتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

میرا ذہن جھرجھری لے کر بیدار ہوگیا۔ دیگر تمام خطرے پس منظر میں چلے گئے۔ نامعلوم گہرائی سے میں نے توانائی کے ذرے تلاش کیے اور چٹان کا کونا چھوڑ دیا۔ میں نے عقب میں دیکھنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ بوٹیوں کی شکل میں معمولی مچھلیوں کے پیٹ میں منتقل ہونے کا خیال ہی روح فرسا تھا۔

میں نے زندگی اور موت کی خوفناک جنگ جیتنے کا فیصلہ کرلیا۔

"شاباش ایلن، جلدی کرو۔" میرے کانوں میں لوئیس کی آواز آئی۔ عام حالات میں بارہ فٹ کا فاصلہ میرے لیے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ دریاؤں اور سمندروں میں ہی گزرا تھا لیکن اس وقت بارہ فٹ جیسے کھنچ کر میلوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ درمیان میں کانٹے دار شاخیں بھی تواتر کے ساتھ تیر رہی تھیں۔

انسان ہوں، وہ انسان جس نے پانی، خشکی اور ہوا میں ہر چیز کو مسخر کیا ہے۔ کیا میں اس چھوٹی سی مچھلی سے شکست کھا جاؤں گا؟ میں جو ماضی میں کئی بار شارک کے مقابل موت کو جل دے چکا تھا ہرگز نہیں۔

غصے نے نہ صرف میری توانائی میں اضافہ کردیا بلکہ دل سے خوف و دہشت کو بھی نکال پھینکا۔ تمام حسیات اور طاقت سمٹ کر ایک نکتے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ دریا کا کنارا محض بارہ فٹ دور تھا۔ تصور کی آنکھ سے میں نے پراہنا کے جھنڈ کو دیکھا جو تیر کی مانند مجھے دبوچنے آرہا تھا۔

میں نے عالم اشتعال میں ہاتھ پیر مارے۔ مجھے نہیں پتا کہ خاردار شاخوں نے میرے شکستہ جسم پر اور کہاں کہاں زخم سجائے۔ میرے قدموں نے تہہ آب کو محسوس کرلیا۔ عین اسی وقت ساتھیوں نے میرے بازو تھام کر مجھے گھسیٹا اور میں نے خود کو پانی سے باہر پایا۔

پہلی بار میں نے پلٹ کر دیکھا۔ خونخوار مچھلیاں اپنے ہی زور میں کنارے تک آگئی تھیں۔ وہ پہنچ گئی تھیں لیکن لمحوں کے فرق سے میں ان کی گرفت سے نکل گیا۔ میرے نیم عریاں بدن پر جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔

تاہم میں اذیت کے احساس سے عاری تھا۔ کچھ دیر قبل میں جس چیز کو ناممکن خیال کر رہا تھا اسے میں نے ممکن کر دکھایا تھا۔

مہم پوری طرح ناکام ثابت ہو چکی تھی اور اب ہم اپنی اپنی زندگی کی بقاء کے لیے فکرمند تھے۔ اتنے نقصان کے بعد ہمیں واپس ہونا ہی تھا لیکن اس ویرانے اور جہاز کے راستے سے ہٹے ہوئے جزیرے پر ہمیں مدد ملنا مشکل تھا۔ ہم نے جزیرے کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے آگے بڑھنا شروع کردیا۔ اس جزیرے کو ہم نے چھوٹا سمجھا تھا مگر جب چلنا شروع کیا تو مسلسل چار دن تک چلتے رہے۔ پانچویں دن ہم جزیرے کی دوسری سمت پہنچے۔ ادھر کا سمندر نسبتاً پرسکون تھا۔ اس جانب ناریل کے درختوں کی بہتات تھی۔ ہم نے ان درختوں کو توانائی کا ذریعہ سمجھ کر وہیں ڈیرا ڈال لیا۔

یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ دھوپ ابھی ابھی پھیلی تھی۔ میں اور ایک ملازم کنارے کی جانب رخ کیے بیٹھے تھے کہ ملازم چیخا "جہاز"۔

میں نے اس جانب دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا... پھر ہم دونوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر چیخنا شروع کردیا۔ ہماری چیخ و پکار سن کر دوسرے بھی دوڑ آئے اب ہم سب مل کر مدد کے لیے پکارنے لگے۔ تبھی ایک مزدور نے جیب سے چھوٹا سا آئینہ نکالا اور اس کی چمک جہاز کی جانب لہرانے لگا، اس کی بروقت کارروائی نے جہاز والوں کو متوجہ کرلیا۔ جہاز ساکت ہوگیا۔ اس سے ایک بوٹ پانی پر گرائی گئی جس نے ہمیں موت کی اس وادی سے آزاد کرالیا۔ آج بھی جب ہمیں وہ مہم یاد آتی ہے تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔

فلم نگری

فنکار بے مثال

انور فرہاد

فلم نگری میں کیسے کیسے باکمال لوگ آئے، اپنی فنکاری دکھائی اور گمنامی کے غار میں دفن ہو گئے، اگر ذہن پر زور دیا جائے تو ایسے بے شمار نام یاد آجائیں گے جو کبھی شہرت کی بلندیوں پر تھے۔ ان کا نام بکا کرتا تھا، لوگ فلم نہیں، انہیں دیکھنے کے لیے سنیما ہال کا رخ کرتے تھے مگر آج انہیں کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔

اپنے وقت کے قد آور فنکاروں کا تذکرہ



اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کس کے ساتھ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ اس روز میرے ساتھ بھی جو کچھ ہوا اس کا سان گمان بھی نہیں تھا۔ میں اپنی ایک تحریر مکمل کر کے اگلے مضمون کی منصوبہ بندی کررہا تھا کہ گھر کے سارے بچے اور ان کے ماں باپ شادی کی تقریب میں چلے جائیں تو میں سکون کے ساتھ لکھ پڑھ لوں گا۔ لو جی، ابھی میں اس بات پر جی ہی جی میں خوش ہو رہا تھا کہ صاحبزادے نے اچانک میرے پاس آکر کہا۔ "ابو! فوراً تیار ہو جائیے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"مطلب یہ کہ انکل کا فون آیا ہے اپنے ابو کو ضرور ساتھ لاؤ۔"

"تم نے ان سے کہا نہیں کہ......"

"کہا تھا مگر وہ بولے۔ ہمارے خاندان میں ان سے بڑا اور بزرگ کوئی نہیں اس لیے ان کی موجودگی بہت ضروری ہے۔"

"ارے بھئی! میں وہاں جا کر کون سا توپ چلاؤں گا؟ تم ان کو سمجھا دینا ابو کی طبیعت بھیڑ بھاڑ میں بگڑ جاتی ہے۔"

"سب کچھ کہہ چکا ہوں مگر وہ مانتے نہیں۔ ابو چلیے ناں۔ میری سسرال کا معاملہ ہے۔"

پھر بچے اور ان کی والدہ بھی ضد کرنے لگیں، نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ جانا پڑا اور میری ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی۔

شادی کی تقریب میں نزدیک اور دور کے سارے ہی عزیز و اقارب موجود تھے۔ مدت کے بچھڑے ہوئے افراد آ آ کر ملنے لگے۔ سب کا یہی کہنا تھا۔ "اچھا کیا آپ آ گئے۔ کتنے دنوں کے بعد آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔"

اسی دوران میری بڑی بیٹی کی بیٹیاں اپنی کچھ ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ آ گئیں۔ انہوں نے اپنی دوستوں سے میرا تعارف کرایا اور انہیں بتایا۔ "یہ ہیں ہمارے نانا ابو جو کہانیاں لکھتے ہیں۔"

"اور سرگزشت میں شوبز شخصیات پر مضامین بھی لکھتے ہیں۔" دوسری نواسی بھی بول پڑی۔

"انہیں تو ہم جانتے ہیں۔"

"ہم بھی ان کے قارئین ہیں۔"

"مگر ہمیں ان سے بڑی شکایت ہے۔"

عجیب لڑکیاں تھیں۔ ملنے کے بعد رسما بھی نہیں بولیں۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ الٹے شکایت لے کر بیٹھ گئیں۔

"کیا شکایت ہے بھئی؟"

"آپ صرف پاکستانیوں پر لکھ رہے ہیں۔"

"بھارتیوں کا آپ نے بائیکاٹ کر رکھا ہے۔"

"بائیکاٹ تو نہیں...... مگر بات دراصل یہ ہے کہ......"

"ہم جانتے ہیں بات دراصل گڑ کھاؤ اور گلگلوں سے پرہیز کی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ بھارتی فلمیں دیکھی اور دکھائی جائیں مگر ان پر لکھا پڑھا نہ جائے۔ دوسروں کے علاوہ اب سرگزشت نے بھی......"

میں نے جھٹ قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "سرگزشت پر الزام غلط ہے۔ خود میں متعدد بھارتی فلم والوں پر لکھ چکا ہوں۔ شمشاد بیگم، طلعت محمود، سہگل، لتا منگیشکر، محمد رفیع، دیو آنند اور پریتی زنٹا وغیرہ پر۔ شاید آپ لوگوں نے [illegible] پڑھا۔"

"ہم [illegible] ہے۔ آپ غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔"

میں نے اپنی تائید کرنے والے کی طرف دیکھا۔ یہ ایک پختہ عمر کے شخص تھے۔ ان کا چہرہ کچھ [illegible] پہچانا سا لگا۔ شاید یہ بھی دور پار کے کوئی رشتہ دار [illegible] سرگزشت کے حوالے سے لڑکیوں کو باتیں کرتے دیکھ کر کچھ [illegible] و حضرات بھی جمع ہو گئے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی [illegible] سرگزشت کے قارئین کا حلقہ خاصا وسیع ہے، ایک خاتون [illegible]

"انکل! بڑی اچھی بات ہے کہ آپ پاکستانیوں کو پروموٹ کر رہے ہیں مگر کبھی کبھی بھارتیوں سے بھی [illegible] ملاقات کرادیا کریں۔"

"سرگزشت ہمارا پسندیدہ میگزین ہے جو ہمیں عالمی سطح پر ایجوکیٹ کرتا ہے۔"

تقریب سے واپس آنے کے بعد میں سوچ رہا تھا۔ کیا شادی کی تقریب میں قدرت اس لیے مجھے لے گئی تھی کہ وہاں میرا گھیراؤ ہو۔ میرے قارئین مجھ سے احتجاجی سلوک کریں۔ اپنی شکایتوں کا پٹارا میرے سامنے کھول دیں۔

ہم لکھنے والے تو اپنے پڑھنے والوں کی خواہشوں کا احترام کرتے ہیں اس لیے میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کبھی کبھی بھارتی شوبز شخصیتوں پر بھی لکھوں۔

آج جن چند فنکاروں پر لکھ رہا ہوں وہ پری پارٹیشن سے لے کر بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کے بارے میں ہمارے آج کے قارئین کچھ نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں ان کی معلومات بھی سرسری سی ہیں۔

پری چہرہ نسیم بانو۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بہت سے پڑھنے والوں نے پری چہرہ نسیم کا صرف نام ہی سنا ہوگا اور اگر کسی کو کچھ معلوم ہوگا تو دلیپ کمار کے حوالے سے معلوم ہوگا کہ یہ خاتون اس لیجنڈ فنکار کی ساسو ماں ہیں۔ بعد میں ان

کی وجہ شہرت یہ بھی رہی کہ ان کی بیٹی سائرہ بانو دلیپ کی شریک حیات بنیں مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنے دور کی سپر سے بھی اوپر کی ہیروئن تھیں۔ گزشتہ صدی کی چوتھی دہائی میں بننے والی تاریخی فلم "پکار" میں ملکہ نور جہاں کا کردار ادا کر کے انہوں نے پورے ہندوستان میں دھوم مچا دی تھی۔ اس فلم میں ان کی لازوال اداکاری کے ساتھ ان کا گایا ہوا نغمہ جس کے شاعر حیات امروہوی اور موسیقار میر صاحب تھے،

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے

آپ نے سنا ہوگا یا پڑھا ہوگا کہ برصغیر میں پہلے خاموش فلمیں بنا کرتی تھیں۔ جی ہاں مکالموں اور موسیقی کے بغیر۔ ایک صاحب اردشیر ایرانی تھے جنہوں نے 1933ء میں "عالم آرا" نامی بولتی فلم کا آغاز کیا جس کے بعد ناطق فلموں کی بنیادیں سہراب مودی نے مستحکم کیں۔ وہ بیک وقت اداکار، فلم ساز اور ہدایت کار تھے۔ انہوں نے کئی باصلاحیت فنکار متعارف کرائے، پری چہرہ نسیم بانو کی دریافت کا سہرا بھی سہراب مودی کے سر ہے۔

نسیم بانو 1919ء میں دہلی میں پیدا ہوئیں۔ ان کا پہلا نام روشن آراء تھا جو بعد میں بدل دیا گیا۔ ان کی والدہ شمشاد بانو کا آبائی تعلق امرتسر کے ایک پنجابی گھرانے سے تھا۔ وہ عہد شباب میں شمالی ہندوستان کی جانی مانی کلاسیکل مغنیہ اور تھیٹر کی مشہور اداکارہ تھیں اور چھمیاں کے نام سے معروف تھیں۔ گھر میں اکثر مقفع اور مسجع اردو کے ساتھ پنجابی بھی بولتی تھیں۔ شمشاد بانو نے اپنی بیٹی کو کلاسیکل موسیقی کی تعلیم خود دی [illegible] نسیم بانو ان کی اکلوتی اولاد تھیں۔ انہوں نے بیٹی کو دہلی [illegible] اسکول میں داخل کرایا۔ نسیم بانو اسکول میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ اسکول میں اسٹیج کیے جانے والے ڈراموں میں بھی حصہ لیتی رہیں۔ 1933ء میں انہوں نے اسکول چھوڑ دیا اور والدہ کے ہمراہ دہلی سے حیدر آباد چلی گئیں۔

نظام دکن کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان معظم جاہ اس جیتے جاگتے مجسمہ حسن و شباب کے جادو کا پہلا شکار ہوئے۔ تاہم تقریباً دو سال بعد شمشاد بانو کو احساس ہوا کہ ان کی لاڈلی کا مستقبل ریاستی محل سراؤں میں ڈوب جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے نسیم بانو کو نہایت اور دانش مندی کے ساتھ معظم جاہ کے جال سے نکال لیا اور بمبئی کی آزاد فضاؤں میں لے آئیں جہاں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا

پری چہرہ نسیم بانو

پہلا خاندانی نام: روشن آراء
تبدیل شدہ نام: نسیم بانو
ولادت: 1919ء
مقام پیدائش: دہلی
والدہ: شمشاد بانو المعروف بہ چھمیاں
کیریئر کا آغاز: تھیٹر کی اداکاری اور گلوکاری سے کیا۔
نقل مکانی: 1933ء میں والدہ کے ساتھ دہلی سے حیدر آباد دکن چلی گئیں۔
پہلی فلم: خون کا بدلہ خون
شاہکار فلم: پکار (1939ء)
خطاب: پری چہرہ کا خطاب پکار کی نمائش کے بعد عوام نے دیا۔
شادی: فلم اجالا کے فلم ساز میاں محمد احسان سے 1943ء میں ہوئی۔
اولاد: سلطان، سائرہ بانو۔
آخری فلم: انوکھی ادا۔
علیحدگی: میاں محمد احسان سے علیحدگی کے بعد بچوں کے ساتھ بمبئی میں رہ گئیں۔ میاں احسان پاکستان چلے گئے۔
انتقال: 83 سال کی عمر میں 18 جون 2002ء میں ہوا۔

اور یوں نسیم بانو کو فلموں میں ابھرنے کے وسیع مواقع نصیب ہوئے۔

نسیم بانو کے پہلے رومان کی جھلک اردو کے ممتاز افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے اپنے تحریر کردہ شخصی خاکوں کے مجموعہ "گنجے فرشتے" میں دکھائی ہے۔ نسیم بانو اور معظم جاہ کے مابین وجہ نزاع بننے والے ایک پوسٹر کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو نسیم بانو اور ان کی والدہ شمشاد بائی کی حیدر آباد سے آمد کا اصل سبب بنا تھا۔

سہراب مودی 1935ء میں ولیم شیکسپیئر کے المیہ ڈراما "ہیملٹ" پر مبنی ایک فلم خون کا بدلہ خون بنانا چاہتے تھے اور اس کے مرکزی نسوانی کردار اوفیلیا کے متلاشی تھے۔ اسی دوران سولہ سال کی حسین و جمیل نسیم بانو پر ان کی نظر پڑی۔ سہراب مودی کو یوں لگا جیسے انہیں اوفیلیا مل گئی۔ فلم کے ہیرو

وہ خود تھے دیگر میں شمشاد بانو اور خادم حسین شامل تھے۔ یہ فلم تو کامیاب نہ ہو سکی تاہم نسیم بانو کی فلمی راہیں کھل گئیں۔

سہراب مودی نے بطور ہیروئن نسیم بانو کے ساتھ چار فلمیں یکے بعد دیگرے تخلیق کیں۔ خان بہادر (1937ء) میٹھا زہر (1938ء) وحشی (1938ء) اور شاہکار تاریخی فلم پکار (1938ء) جس میں نسیم بانو ملکہ نور جہاں بنیں۔ وہ حقیقی زندگی میں بھی کسی ملکہ سے طمطراق اور حسن میں کم نہ تھیں۔ آج بھی تاریخی فلموں میں ''پکار'' بلند ترین مقام پر فائز سمجھی جاتی ہے۔ اس کا کریڈٹ سہراب مودی سمیت فلم کے سبھی فنکاروں اور ہنرمندوں کو جاتا ہے۔ جن میں کمال امروہوی کی مضبوط کہانی اور زوردار مکالموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ شاہانہ انداز پذیرائی پر مبنی یہ اعلانیہ مکالمہ ''باادب باملاحظہ ہوشیار'' بھی کمال امروہوی کا ہی تخلیق کردہ ہے۔ خوش جمال اداکار چندر موہن شہنشاہ جہانگیر بنے تھے۔ سہراب مودی نے وفا شعار راجپوت سردار سنگرام سنگھ کا رول کیا تھا۔ پرنس آف منروا کے خطاب سے سرفراز ہونے والے صادق علی نے منگل سنگھ کی حیثیت سے اپنے جوہر دکھائے تھے اور اداکارہ شیلا، کنور بنی تھی۔ مظلوم دھوبن کے کردار میں سردار اختر نے دلوں پر اثر کرنے والی پرسوز اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا جس سے متاثر ہو کر ممتاز فلم ساز و ہدایت کار محبوب خان نے ان سے شادی کر لی۔ یاد رہے کہ سردار اختر بمبئی کی فلموں میں کام کرنے سے پہلے لاہور میں ڈلاری کے نام سے مشہور تھیں۔

فلم ''پکار'' خوش نما درباری مناظر اور شاندار مکالموں کی وجہ سے بھی ملک گیر طور پر کامیابی کا سبب بنی لیکن کشاں کشاں سینما گھروں کی طرف فلم بینوں کو کھینچ کر لانے کی اصل وجہ حسن و جمال اور شباب بے مثال کی ملکہ نسیم بانو تھی۔ یہ وہی فلم تھی جس سے انہیں پری چہرہ کا عوامی خطاب ملا اور وہ لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن گئیں۔

بمبئی کے ایک نوجوان سرمایہ کار میاں احسان نے تاج محل پکچرز کے نام سے ذاتی فلم ساز ادارہ بنا کر 1942ء میں اپنی فلم ''اجالا'' شروع کی تو اس میں بطور ہیروئن نسیم بانو کو کاسٹ کیا۔ جیسے جیسے اس فلم کی عکسبندی آگے بڑھتی گئی ویسے ویسے میاں احسان اور نسیم بانو ایک دوسرے سے قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔ ادھر فلم مکمل ہوئی، ادھر ان کی محبت کا بھی خوشگوار اینڈ شادی کی صورت میں سامنے آیا۔ پہلے ان کے بیٹے سلطان پیدا ہوئے اور پھر بیٹی سائرہ بانو ہوئیں۔ دریں اثناء ''پکار'' کی سپرہٹ کامیابی کے پیش نظر سہراب مودی نے منروا مودی ٹون کے بینر تلے ایک فلم ''تاج محل'' بنائی جس میں نسیم بانو کے مقابل ہیرو پرتھوی راج کپور تھے مگر اس فلم کو خاطر خواہ پذیرائی نہ مل سکی۔ اس کے بعد سہراب مودی نے نسیم بانو کو اپنی دیگر کامیاب فلموں سکندر، جھانسی کی رانی، شیش محل، نوشیرواں عادل اور طلاق میں اہم کردار دیے۔

اشوک کمار نے اپنی پہلی ذاتی فلم ''چل چل رے نوجوان'' [illegible] کی تو نسیم بانو کو اپنے مقابل ہیروئن لیا۔ یہ فلم باکس آفس پر [illegible] رہی۔ یاد رہے کہ اشوک کمار کے چھوٹے بھائی کشور کمار نے اسی فلم سے بطور اداکار اور گلوکار اپنے کیریئر کی ابتداء کی تھی۔

''انوکھی ادا'' نسیم بانو کی [illegible] جس میں انہوں نے سریندر کے مقابل پاگل لڑکی کا کردار [illegible]

فلم ''اجالا'' کے بعد میاں محمد احسان [illegible] نسیم بانو نے تاج محل پکچرز کے بینر تلے مزید چار فلمیں پیش کیں [illegible] 1945ء، ''ملاقات'' 1947ء، ''چاندنی رات'' 1949ء اور ''عجیب لڑکی'' 1952ء۔

دو بچوں کی پیدائش کے بعد میاں محمد احسان نے پاکستان چلے جانے کا پروگرام بنایا لیکن نسیم بانو ممبئی کا بھرا میلہ چھوڑ کر پاکستان جانے پر آمادہ نہیں ہوئیں۔ ایک طرف میاں احسان وہاں رہنے پر تیار نہیں تھے تو دوسری طرف نسیم بانو پاکستان جانے پر آمادہ نہیں تھیں۔ شاید یہی اختلاف ان دونوں کے مابین علیحدگی کا باعث بنا۔ میاں محمد احسان پاکستان چلے آئے اور نسیم بانو نے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ پالی ہل بمبئی کی رہائش گاہ میں باقی زندگی گزار دی۔

اشوک کمار اور فلمستان اسٹوڈیو کے مالک سبشدھر مکھ جی سے نسیم بانو کے گہرے خاندانی مراسم تھے۔ ایس مکھرجی، دلیپ کمار کے فلمی کیریئر کے آغاز ہی سے ان کے بھی دوست تھے۔ نسیم بانو کی بیٹی سائرہ بانو کو کامیاب فلمی اداکارہ بنانے میں بھی سبشدھر مکھرجی نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ سائرہ بانو کی پہلی فلم ''جنگلی'' کی کامیابی کے بعد ایس مکھرجی نے اپنے بیٹے جوائے مکھرجی کو ہیرو بنایا اور سائرہ بانو کے ساتھ چار کامیاب فلمیں دور کی آواز، آؤ پیار کریں، ساز اور آواز، شاگرد پروڈیوس کیں۔ دلیپ کمار اور سائرہ کے رشتے کی بات بھی ایس مکھرجی اور ان کے اہل خانہ نے ہی چلائی تھی۔ سائرہ بانو اور ان کی والدہ نسیم بانو ایس مکھرجی کو

اپنا ہمدرد اور گائیڈ قرار دیتی رہیں۔ انہوں نے میاں احسان کا ساتھ چھوڑنے کے بعد سلطان، سائرہ اور نسیم بانو کی سرپرستی بھی کی۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ بات پری چہرہ نسیم بانو کی ہو رہی تھی ان کے عروج کے دور کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ہم ان کے بچوں کی جوانی تک پہنچ گئے۔

پری چہرہ نسیم بانو پر ساڑی خوب جچتی تھی، تاہم وہ گھریلو ماحول میں زیادہ تر غرارہ سوٹ پہنتی تھیں۔ وہ مذہبی خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے دونوں بچوں کو گھر پر ہی دینی تعلیم سے آراستہ کرایا۔ فلمی ماحول میں رہنے کے باوجود نسیم بانو مشرقی روایات کی پاسداری کرتی رہیں۔ ان کی ایک انفرادیت یہ بھی تھی کہ انہوں نے فلموں میں مکالموں کی ادائیگی میں تھیٹریکل کی بجائے فطری انداز اپنائے رکھا۔ اس لحاظ سے نسیم بانو تصنع اور بناوٹ سے مبرا فطری اداکاری کا منفرد انداز متعارف کرا گئیں جسے بعد میں آنے والی اداکاراؤں نے اپنا کر مقبولیت حاصل کی اور یہ اسٹائل ہر دور میں پسند کیا گیا۔

نسیم بانو کی فلمی گائیکی بس واجبی ہی تھی۔ دراصل ان کے زمانے میں پلے بیک کا رواج نہیں تھا اس لیے فلمی ہیروئن کو خود ہی گانا پڑتا تھا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض فلمی صحافیوں کی طرف سے غلط فہمی پیدا کی گئی ہے کہ نسیم بانو 1944ء میں دلیپ کمار کی پہلی فلم ''جوار بھاٹا'' میں ان کے ساتھ بطور ہیروئن آئی تھیں [illegible] بات درست نہیں ہے۔ اس فلم میں دلیپ کمار کی جوڑی اداکارہ [illegible] لا کے ساتھ بنی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نسیم بانو کو 1963ء [illegible] برصغیر کے لیجنڈ فنکار دلیپ کمار کی خوش دامن (ساس) [illegible] کا اعزاز ضرور ملا۔

نسیم بانو کا انتقال پُرملال 18 جون 2002ء کو 83 سال کی عمر میں ممبئی میں ہوا۔ اس [illegible] یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ لکھنا پڑ رہی ہے کہ اپنے وقت [illegible] فلم اسٹار جو کبھی لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھی جس کی ایک جھلک دیکھنے کو ایک عالم تمنائی تھا، اس کی تدفین کے وقت معدودے چند لوگ ہی موجود تھے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ فلم انڈسٹری جس نے ان کے حوالے سے اپنی تجوریاں بھریں، اس سے وابستہ افراد بھی انگلی پر گنے جانے والے تھے۔ جس میں سائرہ بانو اور دلیپ کمار کے خاندان کے افراد کے علاوہ اداکارہ وحیدہ رحمٰن اور موسیقار نوشاد نمایاں تھے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

ہر گھڑی مطلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے

بمل رائے

بمل رائے جیسی لیجنڈ فلمی شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کی جنم بھومی بنگال کے بارے میں کچھ باتیں بتائی جائیں۔

تقریباً ایک صدی قبل بمبئی کے ایک پارسی سیٹھ جمشید جی فرام جی مدن نے کلکتہ میں مدن تھیٹر قائم کر کے بنگال میں فلم سازی کی ابتداء کی تھی۔ انہوں نے 1917ء میں پہلی خاموش فلم ''ستیہ وادی ہریش چندر'' بنائی پھر دھیرن گنگولی ان کے ساتھ شامل ہوئے۔ جنہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور سے فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی دور میں انگلستان سے تعلیم یافتہ ذہین فلم ساز پی این سرکار نے کلکتہ میں پہلا سینما ''چترا'' تعمیر کروایا اور 1920ء میں ٹالی گنج میں اعلیٰ ساز و سامان سے آراستہ فلم اسٹوڈیو ''نیو تھیٹرز'' قائم کیا۔ ٹیگور، شرت چندر چٹر جی اور بنکم بابو کی بنگلہ کہانیوں اور ناولوں کو پردۂ سیمیں پر پیش کرنے کا اعزاز نیو تھیٹرز کو حاصل ہوا۔ 1935ء میں پی سی بروا نے اپنی شہرۂ آفاق ناطق فلم ''دیوداس'' بنائی جس میں کے ایل سہگل اور خورشید نے مرکزی کردار ادا کیے۔ نوجوان بمل رائے ان کے معاون اور کیمرا مین تھے۔ انہوں نے بعد ازاں نیو تھیٹرز بند ہونے کے بعد بمبئی میں اپنا ادارہ بمل رائے پروڈکشن کے نام سے قائم کر کے حقیقت سے قریب تر کامیاب فلمیں تخلیق کیں۔ دیو کی بوس، کیدار شرما اور رشی کیش مکھرجی جیسے عہد ساز تخلیق کار اسی دور میں بمل رائے کے ساتھی بنے جب کہ ایک پنجابی نوجوان سمپورن سنگھ گلزار نے بمل رائے کی شاگردی اختیار کر کے بنگال کے حقیقت پسندانہ انداز کی شمع فروزاں رکھی اور فلم سازی میں کمالات دکھائے۔ بمل رائے بیک وقت پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور کیمرا مین تھے۔

بمل رائے جولائی 1911ء میں کلکتہ کے ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ایم اے نباتات تھی لیکن سینما کا شوق انہیں فلم نگری میں لے آیا۔ وہ نیو تھیٹرز سے وابستہ ہوئے اور ہدایت کاری پی سی بروا کی فلم وجوداست کی معاون ہدایت کار کی حیثیت سے شروع کی جب کہ انہوں نے اس فلم کی عکاسی بھی کی۔

شرت شندر چٹرجی کے ناول پر مبنی اس پہلی فلم سے بمل رائے مطمئن نہیں تھے کیونکہ بروا نے اصل کہانی میں کئی تبدیلیاں کی تھیں اور اسے غم واندوہ کی انتہاؤں تک لے گئے تھے۔ سہگل کی المیہ اداکاری اور پرسوز گیتوں نے ناظرین کے دلوں میں زندگی سے مایوسی کے جذبات پیدا کیے۔ بمل رائے نے اسی وقت اس بات کا ارادہ کرلیا تھا کہ جب بھی انہیں آزادانہ کام کرنے کا موقع ملے گا وہ ''دیوداس'' کو ناول کی روح کے مطابق بنائیں گے۔

اور کچھ عرصہ بعد یہ موقع آ ہی گیا۔ 1955ء میں بمل رائے نے خود ''دیوداس'' بنائی جس کے مرکزی ستارے دلیپ کمار، وجنتی مالا، سچترا سین اور موتی لال تھے۔ مکالمے راجندر سنگھ بیدی اور گلزار نے تحریر کیے تھے جب کہ گیت ساحر لدھیانوی نے لکھے تھے۔ موسیقی سچن دیو برمن کی تھی۔ ہدایت کار بمل رائے کی ذہانت نے فلم کا اصلاحی تاثر کامیابی سے ابھارا۔ ناظرین کے دلوں میں دیوداس، پارو اور چندر مکھی کے کرداروں سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے کہ کاش دیوداس پاربتی کو اپنانے میں جرأت کا مظاہرہ کرتا۔ کاش وہ چندر مکھی کو ہی اپنا لیتا اور وہ طوائف کی کھوکھلی زندگی سے نجات حاصل کرلیتی۔ کاش دیوداس شراب سے ہمیشہ کے لیے توبہ کرلیتا۔

بمل رائے کی ''دیوداس'' کا موازنہ اصل ناول اور اس پر مبنی دیگر فلموں سے کیا جائے تو بروا اور بھنسالی کی فلموں سے بدرجہا بہتر ہے۔ آج بمل رائے کی دیوداس کا شمار برصغیر کی کلاسیکی فلموں میں ہوتا ہے۔ ایک ایک منظر پر بمل رائے کی توجہ، محنت اور گرفت دکھائی دیتی ہے۔ حیرت صرف اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ بہترین نغمات

☆ وہ نہ آئیں گے پلٹ کر انہیں لاکھ ہم بلائیں
(آواز مبارک بیگم)
☆ کس کو خبر تھی کس کو یقیں تھا ایسے بھی دن آئیں گے (آواز طلعت محمود)

بمل رائے نے فلم میں شامل کرنا کیوں مناسب نہ سمجھا؟ حالانکہ ایس ڈی برمن انہیں ریکارڈ کر چکے تھے اور ان کے گراموفون ریکارڈ بھی فلم سے پہلے ریلیز کردیے گئے تھے۔

ان کے علاوہ لتا منگیشکر کے گائے نغمات
☆ اب آگے تیری مرضی ہو مورے سیاں
☆ جسے تو قبول کرلے وہ ادا کہاں سے لاؤں

نیز طلعت محمود کا گایا ہوا گیت
☆ متوالا گی رے یہ کیسی اَن بجھ آگ

فلم کی جان تھے۔ جو آج بھی مقبول ہیں۔

نیو تھیٹرز کی بندش کے بعد بمل رائے بمبئی چلے گئے تھے جہاں انہوں نے ''بمبئی ٹاکیز'' کے لیے فلم ''ماں'' بنائی جس کے مرکزی کردار لیلا چٹنس اور بھارت بھوشن نے ادا کیے تھے۔ 1953ء میں بمل رائے نے شرت چندر کے دوسرے ناول ''پری نیتا'' پر فلم بنائی جس کے مرکزی ستارے مینا کماری اور اشوک کمار تھے۔ اسی سال بمل رائے نے بمبئی میں ذاتی ادارہ بمل رائے پروڈکشنز قائم کر کے اپنی اولین فلم ''دو بیگھا زمین'' شروع کی جس کے ٹائٹل رول کے لیے بلراج ساہنی کو منتخب کیا جب کہ دیگر اہم کرداروں میں نروپا رائے اور رتن کمار تھے۔ یاد رہے کہ رتن کمار کچھ عرصہ بعد پاکستان آگئے تھے [illegible] چائلڈ اسٹار کے طور پر کام کرتے تھے اور یہاں [illegible] میں چائلڈ اسٹار ہی کی حیثیت سے کام کیا۔

''دو بیگھا زمین'' کا اسکرپٹ ہری کیش مکھرجی نے لکھا تھا۔ یہ فلم ایک غریب کسان شمبھو مہیتا کی مشکلات کی داستان ہے۔ جسے ساہوکار سے اپنی زمین چھڑانے کے لیے شہر جا کر سائیکل رکشا چلانا پڑتا ہے لیکن مصائب جھیلنے کے بعد جب وہ رقم جمع کر کے گاؤں پہنچتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کی گروی رکھی ہوئی زمین پر پلازہ تعمیر کرنے والی کمپنی کے مالکان نے قبضہ جما لیا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ غریب محنت کش کے رول میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے تعلیم یافتہ اور نفیس مزاج کے حامل فنکار بلراج ساہنی کو جب بمل رائے نے موسم گرما میں کلکتہ کی تپتی سڑکوں پر رکشا چلانے کی مشق کرنے کو کہا تو وہ بخوشی مان گئے۔ کئی دنوں کی پریکٹس کے بعد بلراج ساہنی کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے لیکن انہوں نے پروا نہیں کی۔

17 جولائی 1953ء کو ''دو بیگھا زمین'' بمبئی کے میٹرو سینما میں ریلیز ہوئی۔ ابتداء میں اسے کوئی خاص رسپانس نہ مل سکا تاہم عالمی سطح پر اس فلم نے خوب پذیرائی حاصل کی۔ 1954ء میں فرانس کے کنز فلم فیسٹیول میں بمل رائے کو اس فلم پر بہترین ڈائریکٹر کا ایوارڈ ملا۔ انڈین ٹائم میگزین نے پہلا فلمی ایوارڈ ''کلیر'' کے نام سے شروع کیا تھا جو بعد ازاں فلم فیئر ایوارڈ میں بدل گیا۔ بمل رائے جب یہ ایوارڈ وصول کرنے اسٹیج پر آئے تو سیاہ کرتے اور دھوتی میں ملبوس تھے۔ زندگی بھر ان کا یہی لباس رہا۔

موسیقار سلیل چودھری نے ''دو بیگھا زمین'' کی دلکش دھنیں کمپوز کی تھیں۔ منا ڈے اور لتا کے گائے ہوئے گیت ''موسم بیتا جائے'' کی دھن انہوں نے روسی کمیونسٹ پارٹی کے ترانے سے اخذ کی تھی۔ لتا منگیشکر کی گائی ہوئی لوری ''آجا ری نندیا'' اور راگ بھیرویں میں ایک کورس ''جاگو موہن پیارے جاگو'' اس فلم کے ناقابلِ فراموش گیت ہیں۔ کہتے ہیں کہ فلم میں حادثے سے دوچار ہونے والی اداکارہ نروپا رائے کے رول کو بمل دادا نے اپنی بیوی کے اصرار پر موت سے ہمکنار کرنے کی بجائے زندہ رکھا اور ناظرین کو یہ انجام پسند آیا۔

بولی ووڈ کے شومین راج کپور نے دو بیگھا زمین دیکھ کر حسرت سے کہا تھا۔ ''کاش یہ فلم میں نے بنائی ہوتی۔''

1954ء میں بمل رائے نے شرت چندر چٹرجی کے ایک اور ناول پر مبنی فلم ''بیراج بہو'' بنائی جو زیادہ کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کے بعد بمل رائے نے مروج رجحان کے مطابق فلمیں بنانا شروع کیں جن میں مدھومتی، سجاتا اور بندنی نے بے پناہ کامیابیاں حاصل کیں۔ دلیپ کمار اور وجنتی مالا مدھومتی کے مرکزی ستارے تھے۔ سلیل چوہدری کی دھنوں پر لتا کے گائے ہوئے دلکش گیتوں نے دھوم مچا دی۔

☆ گھڑی گھڑی مورا دل دھڑکے
☆ آجا رے پردیسی میں تو کب سے کھڑی
☆ [illegible] سنگ آنکھ لڑی رے
☆ [illegible] اور یہ موسم حسیں (آواز مکیش)
☆ [illegible] بچھوا (لتا اور ساتھی گلوکارائیں کورس)
☆ ٹوٹے ہوئے خوابوں نے ہم کو یہ سکھایا ہے
(آواز محمد رفیع)
اور مبارک بیگم کا گایا ہوا مجرا
☆ ہم حال دل سنائیں گے [illegible]

آج بھی سماعتوں میں رس گھولتے ہیں۔

بمل رائے کی فلم ''سجاتا'' 1959ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کی ہیروئن نوتن اور ہیرو سنیل دت تھے۔ نوتن نے پیار سے محروم یتیم لڑکی کا کردار جذبات میں ڈوب کر ادا کیا تھا۔ سالگرہ کے خوب صورت منظر میں محمد رفیع کے گائے کورس ''تم جیو ہزاروں سال'' کے اختتام پر سجاتا کی محبت میں گرفتار سنیل دت جب نوتن سے پوچھتے ہیں ''تمہاری سالگرہ کا دن کب آتا ہے؟'' تو وہ عجیب بھولپن سے جواب دیتی ہے۔ ''کھو گیا کہیں اندھیرے میں'' یہاں نوتن نے فن کی بلندیوں کو چھو لیا تھا جس پر انہیں فلم فیئر ایوارڈ کا حقدار سمجھا گیا۔ ایس ڈی برمن کے کمپوز کیے ہوئے گیتوں میں طلعت محمود کا گیت

☆ جلتے ہیں جس کے لیے تیری آنکھوں کے دیئے
ڈھونڈ لایا ہوں وہی گیت میں تیرے لیے

طلعت محمود کا مقبول ترین گیت بن گیا دیگر گانوں میں
☆ کالی گھٹا چھائے مورا جیا ترسائے (آواز گیتا دت)
☆ بچپن کے دن بھی کیا دن تھے (آشا اور گیتا دت)

یہ سجاتا کے یادگار نغمات ہیں۔

1960ء میں بمل رائے نے ''پرکھ'' پروڈیوز کی جس کے ایک گیت نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی

بمل رائے

نام: بمل رائے۔
پیدائش: جولائی 1911ء بمقام کلکتہ۔
تعلیم: ایم اے (نباتات)
فلمی کیریئر کا آغاز: بطور کیمرامین، پی سی بروا کی فلم دیوداس کی عکاسی سے کیا۔
بمبئی آمد: نیو تھیٹرز کے بند ہونے کے بعد بمبئی چلے گئے۔ بمبئی میں پہلی فلم بطور ہدایت کار بمبئی ٹاکیز کی فلم ''ماں'' بنائی۔
ذاتی فلم ساز ادارہ: 1953ء میں ذاتی فلم ساز ادارہ بمل رائے پروڈکشن کے نام سے بنائی۔
پہلی ذاتی فلم: دو بیگھا زمین بنائی۔
آخری فلم: بندنی جو 3 مئی 1963ء کو ریلیز ہوئی۔
یادگار فلمیں: ماں (1952ء)، دو بیگھا زمین (1953ء)، پری نیتا (1953ء)، برج بہو (1954ء)، سجاتا (1961ء)، پرکھ (1960ء)، کابلی والا (1961ء)، بندنی (1963ء)
انتقال: 8 جنوری 1965ء کو ہوا۔ گلے کے کینسر میں مبتلا تھے۔

☆او سجنا برکھا بہار آئی

اسے لتا نے گایا تھا اور اس کی موسیقی سلیل چوہدری نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم کو کوئی خاص پذیرائی نہیں ملی۔

1961ء میں بمل رائے نے عام ڈگر سے ہٹ کر ایک فلم ''کابلی والا'' بنائی جس کی کہانی رابندر ناتھ ٹیگور کے ایک افسانے سے ماخوذ تھی۔ افغانستان سے بہ سلسلہ روزگار ہندوستان آنے والے ایک دردمند پٹھان کا مرکزی کردار بلراج ساہنی نے بڑی خوبی سے ادا کیا جسے وطن سے دور رہ کر اپنی بیٹی یاد آتی ہے تو وہ یہاں ایک ننھی بچی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ روایتی رومانوی فارمولے کی بجائے بمل رائے نے لطیف و پاکیزہ انسانی جذبوں کی شاندار عکاسی کر کے ثابت کیا کہ زمین کے باسیوں سے قریب تر فلمیں کلاسک کا مقام حاصل کر سکتی ہیں۔ منا ڈے نے اس فلم میں ایک خوب صورت گیت گایا تھا۔

☆اے میرے پیارے وطن۔ اے میرے بچھڑے چمن۔ تجھ پر دل قربان۔

بمل رائے نے یہ فلم خود ڈائریکٹ کرنے کی بجائے ہیمن گپتا اور گلزار سے مشترکہ طور پر اس کی ہدایت کاری کروائی تھی۔

بمل رائے کی آخری شاہکار فلم ''بندنی'' 3 مئی 1963ء کو بمبئی کے رائل اوپرا سینما میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کی کہانی جے راسندھا کے ایک مقبول عام بنگلہ ناول سے اخذ کی گئی تھی۔ سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورت دیوبانی کا کردار نوتن نے ادا کیا اور دلوں کو چھو لیا۔ قتل کے الزام میں جیل کی کوٹھڑی کے تاریک گوشے میں بیٹھی بندنی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنتی ہے جو اس کے محبوب کو اس سے دور لے جا رہی ہے ایسے میں مکیش کی آواز میں فلم کا تھیم سانگ ''او جانے والے ہو سکے تو لوٹ کے آنا'' فلم کے تاثر میں کئی گنا اضافہ کر دیتا ہے۔ موسیقار ایس ڈی برمن نے خود بھی ''بندنی'' کا ایک گیت گایا تھا۔

میرے ساجن ہیں اس پار
او میرے مانجھی لے چل پار

اس فلم کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ گلزار نے اپنی فلمی نغمہ نگاری کا آغاز اسی فلم کا ایک گیت لکھ کر کیا تھا۔

میرا گورا رنگ لئی لے
موہے شام رنگ دئی دے

اسے لتا نے گایا تھا اور اسی ایک گیت کے بعد وہ نہ صرف نغمہ نگاروں کی صف میں داخل ہو گئے بلکہ وہ انہیں بلندیوں پر لے گیا۔

نوتن نے ''بندنی'' میں اعلیٰ جذبات نگاری پر فلم فیئر ایوارڈ حاصل کیا۔ بمل رائے سوشلسٹ نظریات کے حامل تھے۔ وہ فلموں کے ذریعے سماجی ناہمواریوں اور پسے ہوئے طبقے کے استحصال کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔ ''بندنی'' میں انہوں نے ہندوانہ ذات پات اور سماجی اونچ نیچ پر موثر کن انداز سے تنقید کی تھی۔ رجعت پسند گھرانوں کی [illegible] اور کچلی بے بس عورت کے دکھوں کو بمل رائے نے حقیقت سے قریب تر لا کر پیش کیا۔ اس لحاظ سے وہ حقیقت پسندانہ طرز فکر کے بانی فلم ساز قرار دیئے جاتے ہیں۔ بنگال سے تعلق کی بناء پر بمل رائے کی نگاہوں میں زیادہ تر بنگالی [illegible] رہیں اور فلمی نغمات کے لیے بھی انہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور سنگیت کے نمائندہ موسیقار ایس ڈی برمن اور سلیل چوہدری کے فن سے استفادہ کیا۔

گلزار بتاتے ہیں کہ زندگی کے آخری دور میں بمل رائے نے الہ آباد کے مشہور میلے کے سانحے پر 1960ء میں فلم بنانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ 1952ء کے اس میلے میں بھگدڑ سے کچل کر ایک لاکھ انسان ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ المیہ بمل رائے کے دل و دماغ پر چھایا رہا لیکن گلے کے کینسر میں مبتلا بمل رائے کے متعلق یونٹ کا ہر فرد جان چکا تھا کہ اب وہ زیادہ دن تک جی نہیں سکیں گے مگر انہیں شوٹنگ کی مشقت سے باز رکھنا کسی کے بس میں نہ تھا۔

ایک روز میں نے جسارت کر کے پوچھ ہی لیا۔ ''بمل دا! آپ امرت کنبھ کیوں بنا رہے ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا۔ وہ رائٹر جس کی نظر سے یہ کہانی لکھی گئی ہے اور جو امرت کی کھوج میں کنبھ میلے میں شریک ہونے گیا تھا، مجھے لگتا ہے کہ وہ شخص میں ہوں۔''

دسمبر 1964ء میں بمل رائے نے گلزار سے پوچھا۔ ''میلہ کب شروع اور کب ختم ہو گا؟''

''31 دسمبر سے 8 جنوری تک رہے گا۔'' گلزار نے بتایا۔

گلزار بتاتے ہیں کہ جس روز انہیں بمل دا کی موت کی خبر ملی وہ دن 8 جنوری 1965ء کا دن تھا۔ ادھر کنبھ میلہ ختم ہوا ادھر امرت کا متلاشی بمل رائے امر ہو گیا۔

نمی

نمی پر لکھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں انہیں ٹریبوٹ پیش کر رہا ہوں۔ اپنی اس پسندیدگی کا جب میرے لڑکپن اور پھر نوجوانی کا دور تھا، جب بھی ان کی کوئی فلم نمائش پذیر ہوتی میں اسے ضرور دیکھتا تھا۔ مجھے اس دور میں فلموں اور فنکاروں کی اچھائی برائی کی کوئی خاص جانکاری نہیں تھی۔ مجھے ان کا فیس ایکسپریشن خاص طور پر بڑا اچھا لگتا تھا۔ اس دور میں دو اداکارائیں میری پسندیدہ تھیں۔ ایک مدھو بالا اور دوسری نمی۔ مدھو بالا کا بے مثال حسن میری پسندیدگی کا سبب تھا جب کہ نمی اپنی اداکاری کی وجہ سے مجھے اچھی لگتی تھیں۔

نمی کا شمار برصغیر کی فلمی صنعت کے معماروں میں ہوتا ہے۔ یوں تو نمی نے اپنے فلمی کیریئر میں مختلف قسم کے کردار ادا کیے لیکن جو بات ان سب کرداروں میں مشترک لگتی ہے وہ ان کا مستانہ پن ہے۔ وہ کردار کو اس بے ساختگی کے ساتھ ادا کرتی تھیں کہ حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ نمی نے فلموں میں محض ہیروئن ہی کے کردار ادا نہیں کیے بلکہ وہ ثانوی درجے کے کردار ادا کر کے بھی داد وصول کرتی تھیں۔ ان کی فلموں کے ناظرین ہیروئن سے زیادہ اسکرین پر ان کے نمودار ہونے کا انتظار کرتے تھے۔

نمی نے اپنی پہلی ہی فلم ''برسات'' میں اپنی اہمیت واضح کر دی تھی۔ اس فلم میں نرگس جیسی بڑی اداکارہ ہیروئن تھیں۔ نمی کو ایک معصوم کشمیری لڑکی کا کردار ملا تھا لیکن نمی فلم کے اختتام تک ہیروئن اور کہانی پر چھائی رہیں بلکہ فلم بین فلم کے اختتام پر نمی ہی کا تاثر لے کر سینما گھر سے نکلتا تھا۔ اسی طرح [illegible] کی بہت ہی کامیاب فلم ''آن'' میں ہر چند کہ فلم کی ہیروئن [illegible] نے اعلیٰ اداکاری کی مثال قائم کی لیکن نمی نے اپنے [illegible] کردار میں اپنی برتری واضح کر دی۔ اس فلم کی تاریخ [illegible] اس فلم کا شو ڈسٹری بیوٹرز نے دیکھا تو انہوں نے [illegible] فلم سے نمی کے جلد رخصت ہونے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور مطالبہ کیا کہ نمی کے کردار کو اور بڑھایا جائے۔ اس معقول مطالبے پر فلم کے معروف ہدایت کار محبوب خان نے فلم کی نمائش عارضی طور پر رکوا دی اور فلم میں ایک طویل دورانیے کا خواب شامل کر دیا جو صرف نمی پر فلمایا گیا۔ اس کے بعد جب اسے دوبارہ نمائش کے لیے پیش کی گئی تو پورے برصغیر میں ایک طویل عرصے تک اس فلم کا ڈنکا بجتا رہا۔

نمی

اصل نام: نواب بانو۔
فلمی نام: نمی۔
پیدائش: 18 فروری 1933ء بمقام آگرہ۔
والد: عبدالحکیم۔
والدہ: وحیدن (اپنے وقت کی اداکارہ گلوکارہ)۔
ذاتی فلم: ڈنکا (1954ء)
پہلا ایوارڈ: 24 سال کی عمر میں فلم ''بھائی بھائی'' میں کریٹک ایوارڈ ملا۔
شادی: صحافی اور فلم رائٹر سید علی رضا کے ساتھ دلیپ کمار سے محبت میں ناکامی کے بعد ہوئی تھی۔
اولاد: کوئی اولاد نہیں ہوئی۔
شوہر کا انتقال: سید علی رضا کے انتقال کے بعد کسی اور کو شریک حیات نہیں بنایا۔ تنہا زندگی بسر کی۔

نمی کا اصل نام نواب بانو ہے۔ ان کے والد عبدالحکیم انگریزی فوج کے ٹھیکیدار تھے۔ ان کی والدہ کا نام وحیدن تھا جو اپنے وقت کی جانی پہچانی گلوکارہ تھیں اور فلموں میں کام بھی کر لیتی تھیں۔ نواب بانو 18 فروری 1933ء میں آگرہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد عبدالحکیم ایبٹ آباد (پاکستان) کے رہنے والے تھے۔ وحیدن بمبئی کی فلم انڈسٹری میں خاص اثر و رسوخ رکھتی تھیں خاص طور پر اس خاندان کے تعلقات ہدایت کار اعظم محبوب خان کے ساتھ بہت اچھے تھے۔ نمی اپنے انٹرویوز میں بعض اوقات اپنی بمبئی یاترا کا ذکر کرتی ہیں کہ کیسے ان کی پذیرائی ہوئی۔

نمی ابھی 9 ہی برس کی تھیں کہ ان کی والدہ وحیدن کا انتقال ہو گیا جس کے بعد ان کے والد عبدالحکیم نے انہیں ان کی دادی کے پاس ایبٹ آباد بھیج دیا تھا۔ ایبٹ آباد میں وہ قیام پاکستان (1947ء) تک رہیں اس کے بعد عبدالحکیم اپنی والدہ اور بیٹی کو بمبئی لے گئے جہاں ان کے بھائی یعنی نمی کے چچا مستقل طور پر رہا کرتے تھے۔ نمی کی چچی جیوتی بھی کسی دور میں اداکارہ رہ چکی تھیں۔ نمی کی والدہ وحیدن 1930ء کی دہائی میں محبوب خان کے ساتھ کام کر چکی تھیں اسی تعلق کی بناء پر محبوب صاحب نواب بانو (نمی) کے ساتھ

خصوصی شفقت کرتے تھے۔ 1948ء میں جب وہ اپنی بے مثال تخلیق ''انداز'' پر کام کر رہے تھے تو انہوں نے نمی سے کہا۔ ''نواب بیٹا! گھر پر بیکار بیٹھنے سے بہتر ہے ہمارے پاس اسٹوڈیو چلی آیا کرو۔''

''کیوں! اس کا کیا فائدہ ہوگا چچا جان؟''

''ارے بھئی! تمہیں معلوم ہوگا فلم کیسے بنتی ہے۔ فلم سازی کیا ہوتی ہے۔''

''جی ہاں یہ تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ کچھ جاننے کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔''

''تو پھر آرہی ہو کل سے اسٹوڈیو؟''

''جی ہاں۔''

اور کمسن نمی نے اسٹوڈیو آنا جانا شروع کر دیا۔ وہ نو عمری سے ہی بہت ذہین تھیں اور مشاہدے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتی تھیں۔ ''انداز'' پر ابھی کام جاری ہی تھا کہ معروف اداکار راجکپور اپنی ذاتی فلم ''برسات'' کے لیے اداکاروں اور اداکاراؤں کا انتخاب کر رہے تھے۔ مرکزی نسوانی کردار کے لیے وہ نرگس کو منتخب کر چکے تھے۔ کہانی کی طلب کے مطابق انہیں ثانوی نسوانی کردار کے لیے ایک معصوم صورت شرمیلی سی نوخیز لڑکی کی تلاش تھی۔ نمی انداز کے سیٹ پر محبوب خان کی مہمان ہوا کرتی تھیں اس لیے انہیں خصوصی تکریم دی جاتی تھی۔ اسی سیٹ پر راجکپور کی نظر ان پر پڑی تو انہیں لگا جیسے وہ جس لڑکی کی تلاش میں ہیں وہ یہی لڑکی ہے۔

انہوں نے محبوب خان سے پوچھا۔ ''یہ لڑکی کون ہے؟''

محبوب خان نے راجکپور کو گھور کر دیکھا اور ابھی کچھ بولے نہیں تھے کہ راجکپور گھبرا کر جھٹ بول پڑے۔ ''میرا مطلب ہے کیا یہ آپ کی فلم میں کام کر رہی ہے؟''

''نہیں یہ میری عزیزہ ہے۔ میری مہمان ہے۔ یہاں شوٹنگ دیکھنے آتی ہے مگر تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے خان صاحب کہ مجھے اپنی فلم ''برسات'' کے لیے ایک ایسی ہی معصوم سی، شرمیلی سی، نوخیز لڑکی کی تلاش ہے۔ آپ اس سے بات کیجیے کہ کیا وہ میری فلم میں کام کرے گی؟''

محبوب صاحب مسکرائے۔ ''اس سے اجازت لینے کی بجائے تمہیں مجھ سے اجازت لینی ہوگی۔''

''میرا بھی مطلب ہے اگر آپ ان کے بڑے ہیں، بزرگ ہیں تو آپ ہی فیصلہ کریں گے۔''

''مگر...... میں نے تو سنا ہے تمہاری فلم میں نرگس ہیروئن کا کردار کر رہی ہے۔''

''جی ہاں۔ آپ نے درست سنا ہے۔ کہانی میں ایک چھوٹا سا ثانوی نسوانی کردار ہے، اسی کے لیے اس لڑکی کو کاسٹ کرنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں اس کے باپ سے پوچھ کر تمہیں جواب دوں گا۔''

راجکپور [illegible] چلے گئے تو نواب بانو نے محبوب صاحب سے پوچھا۔ ''راجکپور صاحب آپ سے کیا باتیں کر رہے تھے اور بار بار میری طرف کیوں دیکھ رہے تھے؟''

''وہ ایک فلم بنا رہے ہیں ''برسات''۔ اس کے لیے تمہیں کاسٹ کرنا چاہتے ہیں۔''

''مجھے!'' نواب بانو نے حیرت سے [illegible]

''ہاں تمہیں، ان کی فلم میں کام کروگی؟''

''کیا کام کرنا پڑے گا مجھے۔''

''ان کی فلم کے سیٹ پر جھاڑو لگانا پڑے گا۔''

''چھی...... میں ایسا گندہ کام نہیں کروں گی۔ میں کوئی بھنگن ہوں۔''

''اری پگلی وہ اپنی فلم میں تم سے اداکاری کروانا چاہتے ہیں۔''

''مگر مجھے تو اداکاری کرنی نہیں آتی۔''

''وہ تمہیں سکھا دیں گے۔ وہ جیسا کہیں گے تم ویسا ہی کرنا۔ جس طرح میں یہاں اپنے آرٹسٹوں کو بتاتا ہوں کہ انہیں ایسا ایسا کرنا ہے۔ اسی طرح راجکپور تم کو بتائیں گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے تم جو کروگی وہی اداکاری ہوگی۔''

محبوب صاحب نے نواب بانو کے والد عبدالحکیم سے بات کی، انہیں رضامند کیا اور پھر راجکپور کو گرین سگنل دے دی۔ ''برسات'' کا یہ کردار جو اس نئی نویلی لڑکی سے کروایا گیا ذرا مشکل تھا۔ خاص طور پر ایک ایسی لڑکی کے لیے جس کی اداکاری کے سلسلے میں پہلے سے کوئی تربیت نہیں تھی مگر اس کے مشاہدے کی قوت بہت زبردست تھی۔ اسی صلاحیت کے سہارے اس لڑکی نے کیمرے کی جھجک پر بہت جلد قابو پا لیا۔ اس کے مقابل پریم ناتھ جیسے منجھے ہوئے اداکار تھے لیکن اس لڑکی نے اپنی پہلی ہی فلم میں ایسی بے مثال اور فطری اداکاری کی کہ نقادوں کی اکثریت کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ

''برسات'' راجکپور، نرگس اور پریم ناتھ جیسے فنکاروں کی بجائے نئی اداکارہ نمی کی اداکاری کی وجہ سے باکس آفس پر ہٹ ہوئی ہے۔ اس فلم نے مقبولیت کے منفرد ریکارڈ قائم کیے۔ اس فلم میں نمی کا کردار بھیڑیں چرانے والی ایک پہاڑی لڑکی کا ہے جسے ایک ایسے شہری بابو سے محبت ہو جاتی ہے جسے نازک جذبات و احساسات کی کوئی پروا نہیں۔ وہ واپس شہر جا کر چرواہی کے ساتھ اپنے عہد و پیمان بھول جاتا ہے۔ کہانی کا اختتام نمی کی فلمی موت پر ہوتا ہے۔ 1949ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''برسات'' کو تاریخ ساز قرار دیا جاتا ہے۔ شنکر جے کشن نے اس فلم کے لیے لاجواب دھنیں ترتیب دیں۔

☆ برسات میں ہم سے ملے تم سجن
تم سے ملے ہم برسات میں
☆ جیا بے قرار ہے چھائی بہار ہے
☆ ہوا میں اڑتا جائے میرا لال دوپٹا ململ کا

آج بھی سنیں تو سرشار کر دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس فلم کا یہ گانا

☆ پتلی کمر ہے ترچھی نظر ہے

اپنے وقت میں جدید موسیقی کی بڑی خوب صورت مثال ہے۔ یہ تمام گانے نمی پر فلمائے گئے ہیں۔ اس فلم نے راتوں رات نمی کو فلم بینوں کے دلوں کی دھڑکن بنا دیا۔ ''برسات'' ہی سے نواب بانو کا نام نمی ہوا۔ برسات کیا [illegible] ہوئی کہ نمی پر پیشکشوں کی برسات ہوگئی۔ نمی کی کشادہ [illegible] کی محراب نے ان کی آنکھوں کو بے حد مخمور اور مدھ ماتی بنا رکھا تھا۔ ان آنکھوں نے انہیں اداکاری میں ایک خاص اسلوب [illegible] دیا تھا۔ یقین کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ وہ اپنی ان آنکھوں کے اثر سے آگاہ تھیں یا نہیں کیونکہ ناقدین نے اس حوالے سے کچھ نہیں کہا۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی [illegible] کی وجہ سے اپنے فن کے اظہار میں منفرد رہیں۔

''برسات'' کے بعد انہیں بڑے [illegible] کے اداکاروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ جن میں اشوک کمار کے ساتھ ''بھائی بھائی''، راجکپور کے ساتھ ''باورا''، دیو آنند کے ساتھ ''سزا'' اور ''آندھیاں''، دلیپ کمار کے ساتھ ''دیدار'' (1951ء)، ''داغ'' (1952ء) اور ''آن'' (1952ء) میں کام کیا۔ خواتین آرٹسٹوں میں نرگس کے ساتھ ''امر'' میں، مدھو بالا کے ساتھ ''شمع'' میں ''چار دل چار راہیں'' (1959ء) میں مینا کماری کے ساتھ کام کیا۔ علاوہ ازیں ثریا، اوشا کرن اور گیتا بالی کے ساتھ بھی اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ ان تمام فنکاروں سے اپنی فنی صلاحیت تسلیم کروائی۔

ایک بات جو بہت کم لوگ جانتے ہیں یہ ہے کہ نمی بہت اچھی گلوکارہ بھی تھیں تاہم انہوں نے اپنی اس صلاحیت کو فلم ''بے دردی'' (1951ء) کے ایک گانے کے سوا کبھی اجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ فلم ''بے دردی'' میں ان کا گایا ہوا گانا ان ہی پر فلمایا گیا تھا۔

''آن'' بھارت کی پہلی ٹیکنی کلر فلم تھی اور بہت بھاری بجٹ سے بنائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ بھارت کی پہلی فلم تھی جو دنیا بھر میں ریلیز کی گئی تھی۔ اس فلم کا انگریزی ورژن SAVAGE PRINCESS کے نام سے بنایا گیا تھا۔ لندن میں جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو وہاں نمی کی ملاقاتیں متعدد شہرۂ آفاق فلمی شخصیات سے ہوئیں۔ جن میں ایرل فلن بھی شامل تھے۔ ایک موقع پر جب ایرل نے نمی کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کے ہاتھ پر احترامی بوسا دینا چاہا تو نمی نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور ایرل کو جھاڑ پلائی۔ I am an indian girl you can not do that ان کا یہ جملہ اگلے روز میڈیا میں شہ سرخی کے ساتھ نمودار ہوا اور نمی کو Unrissed girl of india قرار دیا گیا۔ ''آن'' کی ہیروئن ہرچند کہ نادرہ تھیں لیکن ''منگلا'' کے ثانوی رول میں فلم بین طبقہ نمی ہی سے متاثر ہوا اور جب یہ فلم فرانسیسی زبان میں ڈب ہوئی تو ان کے اسی کردار کے گہرے تاثر کی وجہ سے فلم کا نام تبدیل کر کے Mangala fille des india یعنی ''منگلا ہندوستان کی ایک لڑکی'' رکھنا پڑا۔ اس فلم کے تشہیری پوسٹر اور ٹریلرز بھی نئے سرے سے بنانے پڑے جن میں نادرہ کی بجائے نمی کو زیادہ نمایاں کیا گیا تھا۔ لندن میں ''آن'' دیکھنے کے بعد ہالی ووڈ کے بہت بڑے ہدایت کار سیسل بی ڈیمل سمیت بڑے بڑے ہدایت کاروں اور نقادوں نے نمی ہی کو سراہا۔ یہی نہیں انہیں ہالی ووڈ کی متعدد فلموں میں مرکزی کردار ادا کرنے کی پیشکشیں ہوئیں لیکن نمی نے اپنے ہندوستانی فلم بینوں کو زیادہ ترجیح دی۔ اس موقع پر اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا۔ ''امریکی فلموں میں بوسا بازی سے مجھے سخت نفرت ہے۔''

"آن" کی زبردست کامیابی کے بعد محبوب خان نے نمی کو اپنی فلم "امر" میں موقع دیا۔ اس میں دلیپ کمار ہیرو تھے اور مدھوبالا ہیروئن تھیں۔ نمی نے اس فلم میں ایک نوخیز گوالن کا کردار ادا کیا تھا۔ ہیرو (دلیپ کمار) ایک موقع پر گوالن کی بے حرمتی کر دیتا ہے۔ ہیروئن (مدھوبالا) اس کی منگیتر ہے۔ اس فلم میں بے حرمتی (Rape) کا منظر خاصا متنازعہ رہا۔ نقادوں نے کہا۔ "یہ فلم ابھی اپنے عہد سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ بھارتی فلم میں ابھی ایسے سین فلمانے کا وقت نہیں آیا۔"

"امر" ہرچند کہ کمرشل لیول پر ناکام رہی لیکن سنجیدہ ناقدین نے اسے زبردست اور اپنے وقت کا منفرد موضوع قرار دیا اور نمی کی اداکاری پر تبصرے ایک عرصے تک ذرائع ابلاغ میں ہوتے رہے۔ اس فلم میں بھی وہ اپنی بے ساختہ اداکاری کی وجہ سے مدھوبالا جیسی اداکارہ پر بھاری رہیں۔

محبوب خان صاحب سے جب ان کی زندگی کے آخری دنوں میں پوچھا گیا۔ "آپ کو اپنی کون سی فلم سب سے زیادہ پسند ہے؟" تو انہوں نے برملا جواب دیا۔ "امر۔"

نمی نے 1954ء میں "ڈنکا" کے نام سے ایک فلم پروڈیوس بھی کی یہ فلم بہت کامیاب رہی۔ اس میں بھی ان کی پرفارمنس اعلیٰ قرار پائی۔

1955ء میں سہراب مودی نے "کندن" کے نام سے ایک فلم بنائی جو شہرۂ آفاق ناول La miserable پر مبنی تھی۔ اس فلم میں سہراب مودی نے اداکار سنیل دت کو متعارف کرایا۔ اس فلم میں نمی نے دہرا کردار ادا کیا یعنی ماں اور بیٹی کے کردار۔ ان دونوں کرداروں کے حوالے سے "کندن" میں بھی نمی نے اپنی فنی برتری تسلیم کروائی۔

1955ء میں "اڑن کھٹولا" محبوب خان کی ایک اور پروڈکشن تھی جس نے باکس آفس پر وہ کامیابی حاصل کی جس کی اس وقت تک مثال نہیں ملتی اس فلم میں نمی نے اپنے کردار کی باریکیاں جس طرح نبھائیں بہت کم اداکاراؤں کو یہ صلاحیت نصیب ہوتی ہے۔ اس فلم کی موسیقی، موسیقار اعظم نوشاد علی خان صاحب نے ترتیب دی۔ اس فلم کے گانے اپنی تاثیر کی بناء پر آج بھی روز اوّل جیسے ہیں۔ اس فلم کے بعد 1956ء میں نمی کی فلمیں "بسنت بہار" اور "بھائی بھائی" نمائش پذیر ہوئیں۔

1957ء میں جب نمی کی عمر صرف 24 سال تھی، انہیں "بھائی بھائی" میں ان کی کردار نگاری کے لیے کریٹک ایوارڈ پیش کیا گیا۔ نمی ایسی فنکارہ تھیں کہ ہدایت کاروں کو فلموں کے بہترین گانے ان پر پکچرائز کرنا مرغوب رہتا تھا۔ نمی نے ثابت کیا کہ وہ پروڈیوسروں کے لیے چلتا پھرتا چیک ہیں۔

بعد کے برسوں میں نمی بہت محتاط..... ہو گئیں۔ ان کے بعض فیصلے تو درست رہے تاہم بعض فیصلوں نے انہیں [illegible] نقصان بھی پہنچائے۔ مثلاً 1963ء میں ہدایت کار و [illegible] سنگھ راویل نے بہت بڑے بجٹ کے ساتھ فلم "میرے [illegible]" بنانے کا پروگرام بنایا۔ اس فلم کی کاسٹ سے اس کے مہنگا ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس میں اشوک کمار، راجندر کمار [illegible] اپنے وقت کے بھاری بھرکم فلم اسٹار شامل تھے۔ اس فلم میں [illegible] نسوانی کردار کی پیشکش ہوئی لیکن نمی نے اپنے لیے ثانوی کردار طلب کیا۔ ان کے خیال میں وہ اس کردار میں زیادہ اچھی پرفارمنس دے پائیں گی۔ یہ مرکزی کردار بعد میں نسبتاً نئی اداکارہ سادھنا کو دیا گیا اور جس کردار کے لیے سادھنا تجویز کی گئی تھیں وہ نمی نے کیا۔ ان کے خیال کے برعکس ان کا کردار وہ تاثر نہ پیدا کر سکا جس کے لیے نمی فلم بینوں کے دلوں پر راج کر رہی تھیں۔ ہرچند کہ انہیں فلم فیئر ایوارڈ بہترین معاون اداکارہ کا ملا لیکن اس کے بعد 1960ء کی دہائی سادھنا، نندا، آشا پاریکھ، مالا سنہا اور سائرہ بانو کے نام رہی۔ ان اداکاراؤں نے برصغیر کی ہندی فلموں کی ہیروئن کے تصور کو تبدیل کر دیا۔ یہ فلموں میں بے باک ہیروئنوں کے دور کا آغاز تھا۔ اس میں شک نہیں کہ نمی کا دور گزر رہا تھا لیکن عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی اداکاری میں گہرائی اور گیرائی کا عمل جاری رہا۔ انہوں نے 1964ء میں "پوجا کے پھول" میں اندھی لڑکی اور "آکاش دیپ" میں اشوک کمار کی گونگی بیوی کے کردار کو حیرت انگیز حد تک حقیقت کے قریب تر کر دیا تھا۔ وہ ایک ذہین خاتون تھیں۔ وقار کے ساتھ آئی تھیں، وقار کے ساتھ ہی وقت سے بہت پہلے فلم لائن چھوڑ گئیں۔ ان کی آخری فلم اگر بن جاتی تو "لیلیٰ مجنوں" ہوتی۔ جسے کے آصف بنانا چاہتے تھے۔ فلمی زبان میں یہ فلم غالباً چار آنے بن بھی چکی تھی لیکن کے آصف صاحب (مرحوم) کے منصوبے برسوں پر پھیلے ہوتے تھے لہٰذا یہ منصوبہ بھی جو ظاہر ہے ان کی روایت کے مطابق بہت بڑے بجٹ پر مبنی تھا ان کے انتقال پر نامکمل ہی رہ گیا۔

دلیپ کمار کے ساتھ نمی کی قربت رہی۔ فلم انڈسٹری میں یہ افواہیں خاصے عرصے تک گرم رہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن جائیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ نمی نے اپنے ایک انٹرویو میں ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں کہا تھا۔ "دلیپ صاحب مدھوبالا کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے۔ میں نے ان کے درمیان ہڈی بننا پسند نہیں کیا۔" یہ حقیقت بھی ہے کہ دلیپ صاحب اپنے عروج کے دور میں کسی ایک کے ساتھ ٹک کر دل نہیں لگاتے تھے۔ غالباً وہ اس کو دل لگی ہی تصور کرتے تھے۔ نمی حساس جذبات کی مالک تھیں۔ سمجھ گئیں کہ یوسف صاحب کے چاہنے والے بہت ہیں ان سے کسی وفا کی توقع فضول ہے۔

کچھ دنوں کے بعد نمی کا سید علی رضا کے ساتھ رومان چلا اور پھر دونوں نکاح کے بندھن میں بندھ گئے جس کے بعد دلیپ اور نمی دونوں نے اپنے بارے میں پھیلی گرما گرم خبروں کی ہمیشہ کے لیے تردید کر دی۔ سید علی رضا کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ صحافی اور فلم رائٹر تھے۔ ان کی قابل ذکر فلموں میں برسات، آن اور امر تھیں جن کے مکالمے انہوں نے تحریر کیے تھے۔ ان دونوں کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ نمی نے سید علی رضا کے انتقال کے بعد کسی اور کو شریک زندگی نہیں بنایا۔ انہوں نے جوہو کے ساحل پر واقع اپنے فلیٹ میں تنہا زندگی بسر کی۔

پرتھوی راجکپور

بولی ووڈ میں کپور خاندان ایک عرصے سے راج کر رہا ہے اور اس راج [illegible] بیٹھنے والی پہلی شخصیت پرتھوی راجکپور کی تھی جنہیں سب "پاپا جی" کہتے تھے۔ پرتھوی راج کے بعد اس خاندان میں [illegible] راج کپور، شمی کپور، رندھیر کپور سے کرشمہ کپور اور کرینہ [illegible] سب کو بولی ووڈ کے صف اوّل کے فنکار ہونے کا اعزاز حاصل [illegible]۔

پرتھوی راج جب پشاور سے بمبئی [illegible] اسٹیج ڈراموں کے ساتھ ساتھ فلموں میں بھی چھوٹا [illegible] ملنے لگا۔ ان دنوں ان کی روزانہ آمدنی صرف ڈیڑھ آنہ ہوا کرتی تھی۔ اس وقت روپیا سولہ آنے کا ہوتا تھا۔

آیئے اب آپ کو ہم بتاتے ہیں پرتھوی راج چھوٹے چھوٹے اور ثانوی کردار کرتے کرتے فلم کے ہیرو کیسے بنے۔ واقعہ بڑا دلچسپ ہے کہ مولا جب کسی پر مہربان ہوتا

سب سے بڑا ایوارڈ

راجکپور کو ان کی بہترین اداکاری اور ہدایت کاری کے حوالے سے متعدد سرکاری اور غیر سرکاری ایوارڈ ملے لیکن عجیب اتفاق ہے کہ بولی ووڈ کا سب سے بڑا ایوارڈ دادا بھائی پھالکے ایوارڈ جو ان کا آخری ایوارڈ تھا اسے وصول کرتے ہوئے انہیں کھانسی آئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے اور دس دن تک بے ہوش رہے اور اسی بے ہوشی کی حالت میں انتقال کر گئے۔

پرتھوی راج کپور

نام: پرتھوی راج کپور
عرفیت: پاپا جی
پیدائش: 3 نومبر 1906ء بمقام سمندری۔
والد: دیوان بشیشور ناتھ کپور۔
کیریئر کا آغاز: ڈراموں اور چھوٹے موٹے ثانوی فلمی کرداروں سے کیا۔
پہلی فلم بطور ہیرو: مسٹریس وومن۔
یادگار فلم: مغل اعظم۔
حیرت انگیز: 9 سال تک قوتِ گویائی سے محروم رہے۔
اس دوران فلم "تین بھورانیاں" میں اہم کردار ادا کیا۔
اولاد: راج کپور، شمی کپور، ششی کپور۔
وفات: 29 مئی 1971ء۔

راج کپور

نام: راج کپور
پیدائش: 14 دسمبر 1924ء بمقام پشاور۔
والد: پرتھوی راج کپور۔
کیریئر کا آغاز: بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر۔
پہلی فلم بطور اداکار۔ انقلاب (1935ء) ثانوی کردار کیا۔
پہلی فلم بطور ہیرو: نیل کمل (1947ء)
پہلی فلم بطور ہدایت کار: آگ
پہلی سپرہٹ فلم: برسات
ذاتی نگارخانہ: آر کے فلم اسٹوڈیو۔
آخری عمر میں: بڑھتی ہوئی عمر کے باعث اداکاری ترک کر دی اور صرف ہدایت کاری جاری رکھی۔
انتقال: 2 جون 1988ء بمقام نئی دہلی۔

ہے تو اس کی قسمت کے دروازے کیسے کھلتے ہیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ رنجیت موی ٹون کی ایک فلم میں ایک چھوٹا سا کردار کر رہے تھے۔ اس فلم کے ہیرو ماسٹر وٹھل تھے۔ ایک دن اتفاق سے وٹھل وقت پر سیٹ پر نہیں پہنچے۔ ہدایت کار و فلم ساز نے طیش میں آکر کہا۔ ”کسی اور کو پکڑ کر لاؤ۔“

سیٹ پر موجود لوگوں نے فلم کے فائٹرز ڈبلیو ایم خان کو فلم ساز و ہدایت کار کے سامنے پیش کردیا لیکن وہ بہت دبلا پتلا تھا۔ یونٹ کے دیگر افراد کے علاوہ فلم کی ہیروئن کو بھی وہ ہیرو کے لیے مناسب نہیں لگا لہٰذا ہیروئن نے کہا۔ ”سر جی! یہ تو ہیرو کے روپ میں کسی طرح بھی نہیں جچے گا۔“

”تو پھر کیا کروں۔ کسے تمہارا ہیرو بناؤں؟“

ہیروئن نے سیٹ پر اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ ”پرتھوی راج کو آزمائیں۔“

”پرتھوی راج۔“ فلم ساز و ہدایت کار نے پرتھوی راج کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں میرا خیال ہے یہ لڑکا ہیرو کے لیے مناسب رہے گا۔“ ہیروئن نے کہا۔

فلم ساز کو ہیروئن کی بات مناسب معلوم ہوئی۔

”ٹھیک ہے پرتھوی کو ہیرو کا لباس پہناؤ۔“

حکم کی تعمیل کے طور پر پرتھوی راج کو ہیرو کا لباس پہنانے کی کوشش کی گئی۔ تو لباس کسی طرح ان کے جسم پر نہ چڑھا۔ سب پریشان ہوگئے۔ ”اب کیا ہوگا؟“

اس موقع پر مغن لال ڈریس والے (ڈریس ڈیزائنر) نے ترنت دوسرا لباس لا کر دیا جو پرتھوی راج پر فٹ ہوا۔ اسے پہن کر انہوں نے فلم کے ہیرو کا کردار کیا اور اتنی اچھی اداکاری کی کہ فلم ساز ہدایت کار ہیروئن اور یونٹ کے سارے لوگ حیران رہ گئے۔ اس طرح فلم کی کاسٹ سے ماسٹر وٹھل آؤٹ اور پرتھوی راج اِن ہوگئے۔ ثانوی کردار کرنے والا اداکار ایک دم ہیرو بن گیا اور ڈیڑھ آنے روزانہ معاوضہ وصول کرنے والے کو ہیرو کے منصب پر فائز ہونے کے بعد سو روپے ماہانہ معاوضہ ملنے لگا۔ مولا جب دینے پر آتا ہے تو اسی طرح چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

اس فلم کا نام ”مسٹریس ودمن“ تھا اس فلم کے بعد پرتھوی راج باضابطہ فلموں کے ہیرو بن گئے چونکہ قدرت نے انہیں اداکارانہ خوبیوں سے نوازا تھا اس لیے ان کی فلمیں کامیاب ہوتی گئیں اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ بمبئی فلم انڈسٹری کے کامیاب اداکار تسلیم کیے جانے لگے۔

”مغل اعظم“ ان کی کامیاب ترین اور یادگار فلموں میں ایک ہے۔ اسے کون بھول سکتا ہے۔ اس فلم میں وہ شہنشاہ اکبر بنے ہیں۔ اس کردار کو انہوں نے کچھ اس طرح ادا کیا ہے کہ ذہن میں یہی بات بیٹھ گئی کہ اکبر بادشاہ ایسا ہی ہوگا۔ بادشاہ کے کردار میں ایسا جلال اور دبدبہ اسکرین پر کوئی اور اداکار آج تک پیش نہیں کرسکا۔ جب کہ خود پرتھوی راج کہتے تھے کہ میں خود کو اکبر کے کردار کے لیے موزوں نہیں سمجھتا تھا۔ اکبر کا قد پانچ فٹ تھا جب کہ میرا قد چھ فٹ ہے۔ ان کے خیال میں مظہر خان اکبر کے رول کے لیے موزوں انتخاب تھا کیونکہ وہ پہلے بھی یہی کردار کرچکا تھا۔ اداکار مبارک نے بھی بیجو باورا اور انارکلی میں اکبر اعظم کا کردار کیا تھا۔

”مغل اعظم“ میں اکبر کی مونچھیں نہ تو مغلوں جیسی تھیں نہ راجپوتوں جیسی اس کی توجیح خود پرتھوی راج یوں پیش کرتے تھے۔

”مجھے میک اپ کروانے کے بعد پانچ منٹ تک آئینے کے سامنے بیٹھنے کی عادت تھی۔ اس طرح میں خود کو رول میں اتار لیتا تھا تاکہ کیمرے کے سامنے میری چال ڈھال کردار کے عین مطابق ہو۔ ”مغل اعظم“ کی شوٹنگ کے پہلے دن میں جب حسب معمول میک اپ کے بعد آئینے کے سامنے بیٹھا ہوا مونچھوں کو بل دے رہا تھا کچھ دیر بعد کیمرے کے سامنے آیا اور میرا پہلا شاٹ او کے ہوا تو کے آصف نے کہا۔ ”پاپا جی! آپ نے مونچھوں کو کیا کیا تھا؟“ سب کو میری بل چڑھائی ہوئی مونچھیں پسند آئی تھیں۔

پرتھوی راج بولی ووڈ کے پہلے فنکار تھے جنہوں نے ماہانہ تنخواہ کی بجائے طے شدہ معاوضے پر فلم سائن کی تھی۔ انہوں نے ایک ساتھ دو ایسی فلموں میں بھی کام کیا کہ ایک فلم میں وہ رام بنے ہوئے تھے تو دوسری میں راون رام راج میں انہوں نے رام کا کردار کیا تھا اور ”سیتا ہرن“ میں راون کا۔ دونوں فلموں کی زیادہ تر شوٹنگ ایک ہی اسٹوڈیو میں ہوئی تھی۔

ایک بار ایک صحافی نے پوچھا۔ ”آپ رام سے راون اور راون سے رام کیسے بن جاتے ہیں؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”آئینے کے سامنے آنکھیں

بند کر کے بیٹھ جاتا ہوں اور پھر اپنے کردار کے قالب میں ڈھل جاتا ہوں۔“

پرتھوی راج میں خودداری غضب کی تھی۔ جب ان پر برا وقت آیا تو ان کا پرتھوی راج تھیٹر بند ہوگیا۔ وہ پانچ لاکھ روپے کے مقروض ہوگئے لیکن خوددار باپ نے بیٹے راج کپور سے ایک پیسا نہ مانگا۔ راج کپور اس دور میں دولت میں کھیل رہے تھے۔ واضح رہے کہ جب 19 سال کی عمر میں راج کپور نے اپنی پہلی فلم ”آگ“ ڈائریکٹ کی اور اس فلم کے ہیرو وہ خود ہی تھے تو انہوں نے پورا یونٹ پرتھوی راج تھیٹر کا ہی لیا تھا۔ اس زمانے میں حسرت جے پوری اور شیلندر پرتھوی تھیٹر سے وابستہ تھے۔

پاپا جی نے ”برسات“ کی شوٹنگ کے دوران بھی راج کپور کی کافی مدد کی تھی۔ انہوں نے راج کپور کو تاکید کی تھی کہ جو کرنا ہے اپنے بل بوتے پر کرو، پرتھوی راج کا بیٹا ہونے کا فائدہ کبھی مت اٹھاؤ۔ راج کپور بھی پاپا جی جیسا ہی تھا۔ وہ بھی اپنے ہی بل بوتے پر اپنی فلم فروخت کرتا تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ پاپا جی کی قوت گویائی چلی گئی اور سات آٹھ سال تک کچھ نہیں بول پائے۔ وہ کیا کہنا چاہتے تھے کوئی سمجھ نہ پاتا تھا۔ اس دور میں انہوں نے ”تین بہو رانیاں“ فلم 25 ہزار روپے میں سائن کی تھی۔ فلم ساز نے فیصلہ کیا کہ ڈبنگ کسی اور اداکار سے کروالی جائے گی۔ اس نے پاپا جی سے کہا۔ ”ڈبنگ آرٹسٹ جو معاوضہ لے گا وہ رقم آپ کے معاوضے سے منہا کرلی جائے گی۔“

”آج میری مارکیٹ ویلیو 25 لاکھ روپے کی ہے۔ تم ڈبنگ آرٹسٹ کو جو رقم دینا چاہتے ہو میرے 25 لاکھ روپے میں سے دے دو باقی رقم مجھے دے دینا۔“

پاپا جی کے جواب پر فلم ساز کی بولتی بند ہوگئی۔ اس نے خاموشی سے پاپا جی کو 25 ہزار روپے ادا کردیے۔ (دونوں کی گفتگو لکھ کر ہوئی) یہ شان تھی پرتھوی راج کی کہ بولنے کے قابل نہ ہونے کے باوجود پوری فلم میں اداکاری کی اور فلم ساز سے معاوضے کے بارے میں بھی دبے نہیں۔ یہ بے مثال فنکار 29 مئی 1972ء کو بمبئی میں دنیا سے رخصت ہوگئے مگر اپنی بے شمار خوبیوں کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

مدھوبالا

ڈاکٹر عندلیب شادانی کا شعر ہے۔

ہنستی آنکھیں ہنستا چہرہ اک مجبور بہانہ ہے
چاند میں سچ مچ نور کہاں ہے چاند تو اک ویرانہ ہے

بہت حد تک مدھوبالا پر اس شعر کا اطلاق ہوتا ہے۔ مدھوبالا کو قدرت نے جتنا حسن، جتنی کشش عطا کی تھی اور فلم انڈسٹری میں اسے جس طرح عروج حاصل ہوا، اس کے بعد لگتا تو یہی تھا کہ زمانے بھر کی خوشیاں اس کے قدموں پر سجدہ ریز ہوں گی لیکن تقدیر کے معاملات ذرا الگ ہی ہیں۔ قدرت بعض انسانوں کے ایک ہاتھ پر تھوڑی سی خوشیاں رکھتی ہے اور دوسری ہاتھ پر ڈھیر ساری محرومیاں رکھ دیتی ہے۔

مدھوبالا بولی ووڈ کی ایسی اداکارہ تھی جو اپنی تمام ہمعصروں میں سب سے زیادہ پسند کی جاتی تھی، ٹاپ کی فلم اسٹار تھی۔ فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی اوّلین ڈیمانڈ تھی۔ نگاہوں کو خیرہ کرنے والے اپنے حسن و جمال کی وجہ سے فلم بینوں کی پہلی پسند تھی۔ اس کے باوجود اس کی اپنی زندگی بہت سی محرومیوں اور دکھوں سے بھری ہوئی تھی۔

مدھوبالا کے بارے میں قصے، افسانے اور سنی سنائی باتیں تو بہت دہرائی جاسکتی ہیں لیکن دو شخصیات ایسی ہیں

مدھوبالا

اصل نام: ممتاز جہاں دہلوی
قلمی نام: مدھوبالا
ولادت: 14 فروری 1933ء بمقام دہلی
والد: عطاء اللہ خان۔ سات بیٹیاں اور تین بیٹے، مدھوبالا پانچویں نمبر پر تھی۔
پہلی فلم: بسنت، بطور چائلڈ اسٹار اس وقت ان کی عمر سات آٹھ سال تھی اور سال تھا (1942ء) راج کپور ہیرو تھے۔
محبت: دلیپ کمار کو 9 سال تک دل کی گہرائیوں سے چاہا مگر ایک دوسرے کے نہ ہوسکے۔
بیماری: دل میں سوراخ تھا۔ لندن کے ڈاکٹروں نے بھی اسے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔
شادی: کشور کمار سے ہوئی۔
فلمی کیریئر: 20 برسوں پر محیط۔
فلموں کی تعداد: 70
انتقال پُرملال: 23 فروری 1969ء بمقام بمبئی۔

جن کی باتوں پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں کے ساتھ مل کر ماضی کی سنسان وادیوں میں یادوں کے کچھ مرجھائے ہوئے پھول چنے جاسکتے ہیں۔ اس دنیا میں اب دو ہی ہستیاں ایسی رہ گئی ہیں جو مدھو بالا کے بارے میں شگفتہ انداز میں بات کرسکتی ہیں۔ ایک اس کی سب سے چھوٹی بہن مدھر بھوشن اور دوسری اپنے وقت کی ایک اداکارہ اور گلوکارہ سوشیلا رانی، جسے مدھو بالا دیدی کہا کرتی تھی اور جو اس کے دکھ سکھ کی ساتھی تھیں۔

مدھو بالا نے فلمی دنیا میں بیس سال گزارے اور اس دوران تقریباً 70 فلموں میں کام کیا جو بڑی حیران کن بات ہے کیونکہ اس زمانے میں بڑے فنکار سال میں صرف ایک یا دو فلمیں کرتے تھے۔ دلیپ کمار کو پانے کے انتظار میں نو سال گزارنے کے بعد جب مدھو بالا کو کشور کمار سے شادی کرنی پڑی ہوگی اور کشور بھی اس کی بیماری کی وجہ سے اسے اس کے ماں باپ کے گھر چھوڑ گئے ہوں گے تو شاید مدھو بالا کو بھی اس سوال کا زہر اپنی رگ و پے میں پھیلتا محسوس ہوا ہوگا کہ اس کی تمام تر خوب صورتی اور فلمی دنیا میں بے پناہ کامیابیوں نے آخر اسے کیا دیا؟ یہ بھولی بسری مدھو بالا فلمی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو کچھ برسوں پہلے ایک بار پھر اس وقت یاد آگئی جب اخباروں میں جلی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر چھپی۔

”انڈیا کے محکمۂ ڈاک نے مدھو بالا کی یاد میں پانچ روپے والا ٹکٹ جاری کیا ہے۔“

مدھو بالا کا اصل نام ممتاز جہاں تھا اور وہ اس کے ساتھ دہلوی کا لاحقہ بھی استعمال کرتی تھی۔ وہ 1933ء میں ویلنٹائن ڈے پر پیدا ہوئی تھی مگر اس کی زندگی محبت سے خالی رہی۔ وہ عطاء اللہ خان کے دس بچوں میں پانچویں نمبر پر تھی۔ اب اس کی صرف چار بہنیں دنیا میں رہ گئی ہیں۔ وہ بمبئی میں ہیں ایک امریکا میں اور ایک نیوزی لینڈ میں۔ باقی بچے جن میں مدھو بالا کے تین بھائی بھی شامل ہیں۔ جوانی یا کم عمری ہی میں انتقال کر گئے۔ مشہور یہی ہے کہ مدھو بالا کو اس کے والد نے زبردستی فلموں میں دھکیلا لیکن مدھر بھوشن اس کی تردید کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے۔ ”ہمارے والد اصول پسند، قدامت پرست اور ذرا سخت گیر ضرور تھے لیکن ظالم ہرگز نہیں تھے۔ وہ کسی پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے تھے۔ میری والدہ پردہ کرتی تھیں۔ ابا نے انہیں زبردستی پردہ نہیں کرایا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے یا یوں کہیے کہ شرعی حکم سمجھ کر اس کی پابندی کرتی تھیں۔ منجھلی دیدی (مدھو بالا) کی غیر معمولی خوب صورتی کی وجہ سے ابا ان کے بارے میں زیادہ حساس تھے اور فکر مند رہتے تھے کہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ ابا خالص پٹھان تھے۔ وہ اتنے خوب صورت اور گورے چٹے تھے کہ انگریز معلوم ہوتے تھے۔ البتہ والدہ عام سی شکل وصورت کی سیدھی سادی گھریلو خاتون تھیں۔“

مدھو بالا کی خوب صورتی کی تصدیق سوشیلا رانی بھی کرتی ہیں۔ انہوں نے بتایا۔ ”میں نے مدھو بالا کو اس کی نوجوانی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ واقعی افسانوی اور ملکوتی حسن کی مالک تھی۔ اس کے چہرے سے نظر ہٹانا مشکل محسوس ہوتا تھا۔ وہ رنگ و روپ اور خوب صورتی میں باپ پر گئی تھی۔ جو ڈکٹیٹر ٹائپ تھے، اگر وہ اتنے سخت گیر نہ ہوتے تو شاید مدھو بالا کی زندگی کی کہانی کچھ مختلف ہوتی۔ اتنی درد انگیز نہ ہوتی تاہم مدھو بالا بہت صابر تھی۔ وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی تھی۔ ہر بات خاموشی سے برداشت کرتی تھی۔ ایک اداکارہ کے طور پر بھی وہ مزید بلندیوں اور کامیابیوں کی طرف جاتی بشرطیکہ اس کے والد اس سلسلے میں اس پر اور فلم سازوں پر اپنی شرائط اور پابندیاں مسلط نہ کیا کرتے، اگر انہیں اس بات کی اتنی ہی فکر ہوتی کہ مدھو بالا کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے تو وہ اسے فلموں میں کام ہی نہ کرنے دیتے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس لڑکی کے دل میں سوراخ ہے لیکن انہوں نے کبھی اسے دن رات فلموں میں مشقت کرنے اور گھنٹوں ڈانس کی ریہرسل کرنے سے نہیں روکا۔“

اس مسئلے پر مدھر بھوشن ایک بار پھر باپ کا دفاع کرتے ہوئے کہتی ہے۔ ”دراصل ان دنوں ابا کے گرم دماغ کی وجہ سے ان کی ملازمت چلی گئی تھی۔ وہ فیملی کو لے کر دہلی سے بمبئی آگئے لیکن بے روزگاری میں اتنی بڑی فیملی کے ساتھ گزر اوقات کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایسے میں کسی دوست نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو فلموں میں کام دلانے کی کوشش کریں۔ ابا مان گئے کیونکہ منجھلی دیدی (مدھو بالا) کو خود بھی فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ گانے اور رقص میں بہت دلچسپی لیتی تھیں۔ شاعری شوق سے پڑھتی تھیں۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ڈانس کرتی تھیں۔ حالانکہ ڈانس انہیں آتا نہیں تھا۔ ”مغلِ اعظم“ میں ان پر جو ایک گانا پکچرائز ہوا ہے۔ ”جب پیار کیا تو ڈرنا کیا“ اس ڈانس کے لیے انہوں نے دو مہینے پریکٹس اور ریہرسل کی تھی۔“

سوشیلا رانی کہتی ہیں۔ ”میں آج بھی ٹی وی پر یہ گانا دیکھتی ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ مجھے یاد آجاتا ہے کہ جن دنوں وہ دن رات اس گانے پر ڈانس کی پریکٹس کررہی تھی ان دنوں شاید کسی کو ایک لمحہ کے لیے بھی یاد نہیں آیا تھا کہ اس لڑکی کے دل میں سوراخ ہے اور اسے ڈانس آتا بھی نہیں ہے۔ اندر سے اس کی نہ جانے کیا کیفیت تھی کہ اسے ایسے مناظر پکچرائز کرنے کے لیے گلیسرین کی بھی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔“

مدھو بالا کے فلمی کیریئر کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کی بہن مدھر بھوشن بتاتی ہے۔ ”اس نے 1942ء میں ”بسنت“ میں ممتاز شانتی کی بیٹی کا رول کیا تھا۔ یہ اس کی پہلی فلم تھی اور اس وقت وہ سات آٹھ برس کی تھی۔ چند فلموں میں وہ اسی طرح چائلڈ اسٹار کے طور پر کام کرچکی تو کیدار شرما نے پہلی بار اسے ”نیل کمل“ میں راج کپور کے مقابل ہیروئن کے طور پر کاسٹ کیا۔ یہ 1947ء کی بات ہے وہ اس وقت بھی کم عمر ہی تھی لیکن پٹھانوں کا قد کاٹھ چونکہ اچھا ہوتا ہے اس لیے وہ جوان لگ رہی تھی۔ اس کے بعد اسے خود بہ خود فلمیں ملتی چلی گئیں۔ ابا نے اسے فلموں میں ہرگز نہیں دھکیلا۔ البتہ اس کی کمسنی اور نادانی کی وجہ سے وہ ایک محافظ کے طور پر اس کے ساتھ اسٹوڈیو جاتے تھے۔ وہ تو ہم دوسری بہنوں کو بھی اسٹوڈیو لے جاتے تھے اگر کوئی ڈائریکٹر ہم میں سے بھی کسی کو کاسٹ کرتا تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا لیکن فلموں میں صرف منجھلی دیدی (مدھو بالا) ہی کو پسند کیا گیا۔ ابا صرف حفاظت کے خیال سے اس کے ساتھ رہتے تھے۔ اسے چھ بجے کے بعد اسٹوڈیو میں رہنے اور پارٹیاں اٹینڈ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ابا نہیں چاہتے تھے کہ وہ شرابی مردوں کی مہمان جائے، شرابیوں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا کہ کب کس کے ساتھ بدتمیزی کرجائیں۔ ابا سات بیٹوں کے باپ تھے، سبھی کے بارے میں فکر مند رہتے تھے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ دیدی (مدھو بالا) کی وجہ سے پیسا گھر میں آنے لگا اور ابا اس کی نگرانی کرتے رہے تو خود کمانا بھول گئے۔“

مدھر بھوشن اپنے باپ کے خلاف کچھ کہنا پسند نہیں کرتی تھی لیکن یہ اعتراف اسے بھی ہے کہ مدھو بالا اور دلیپ کمار کا ملاپ نہیں ہوسکا تو اس کی وجہ ابا جی تھے۔ وہ یہی کہتی ہے۔ ”حالات اس موڑ پر آگئے تھے کہ منجھلی دیدی کو ابا اور دلیپ کمار میں کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ میری بہن باپ سے بہت محبت کرتی تھی اس لیے دلیپ کمار سے اپنی محبت قربان کردی۔ بی آر چوپڑہ اپنی فلم ”نیا دور“ کی شوٹنگ کے لیے منجھلی دیدی کو ایک ایسے علاقے میں لے جانا چاہتے تھے جہاں ڈاکوؤں کا راج تھا۔ کئی فلمی خواتین کو وہاں ناخوشگوار واقعات پیش آچکے تھے۔ ابا نے منجھلی دیدی کو وہاں جانے کی اجازت نہیں دی۔ چوپڑا صاحب نے کیس کردیا دلیپ صاحب نے ابا کے مقابلے میں چوپڑا کا ساتھ دیا۔ یہ بات منجھلی دیدی کو بہت بری لگی۔ اتنی سی بات پر نو سال کی محبت، رنجش میں بدل گئی۔ ان کی شادی ہونے والی تھی جو نہ ہوسکی۔ المیہ یہ ہے کہ ان کے دلوں سے ایک دوسرے کی محبت کبھی ختم نہ ہوسکی۔“

سوشیلا رانی اس ضمن میں کچھ اور باتیں بھی بتاتی ہیں۔ ”اس میں شک نہیں کہ تعلقات میں دراڑ چوپڑا صاحب والے کیس کے بعد ہی پڑی لیکن بات اس لیے زیادہ بگڑی کہ تعلقات کے درمیان شرطیں رکھی جانے لگیں۔ مثلاً مدھو بالا فلم ساز و ہدایت کار کے آصف کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ دلیپ صاحب اس سے دوستی چھوڑ دیں۔ دلیپ صاحب نے یہ بات نہیں مانی۔ ادھر دلیپ صاحب کہتے تھے۔ مدھو بالا فلموں میں کام کرنا چھوڑ دے۔ مدھو بالا نے یہ بات نہیں مانی۔ وہ چاہتی بھی تو نہیں مان سکتی تھی۔ اسی کی آمدنی پر تو پورے خاندان کی گزر اوقات ہورہی تھی۔ وہ اپنے گھر، اپنی فیملی کی بہت وفادار تھی۔ اسے کبھی منجدھار میں نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس کے دل کی بیماری بھی اتفاقاً دریافت ہوگئی۔ ڈاکٹر تو اس کے والد کو دیکھنے آیا تھا۔ میرے شوہر نے مذاق میں کہا۔ فلم اسٹار کا دل بھی چیک کرلینا چاہیے۔ تب پتا چلا کہ اس کے دل میں سوراخ ہے۔ اسے (مدھو بالا) دل کی تکلیف رہتی تھی لیکن وہ برداشت کرتی رہتی تھی۔ بس کام کیے جاتی تھی۔ کسی سے کچھ کہتی نہیں تھی اس نے اپنی فیملی کے لیے خود کو قربان کردیا۔ فیملی کے جو افراد باقی ہیں، انہیں اس بات کا احساس ہے اور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ آج وہ جو کچھ بھی ہیں منجھلی دیدی (مدھو بالا) کی وجہ سے ہیں جس نے خود اپنی زندگی میں کوئی خوشی نہیں دیکھی۔“

کشور کمار سے شادی کے بعد لندن میں اس کا معائنہ ہوا تو ڈاکٹروں نے کہا۔ ”اس کے دل کا کوئی علاج نہیں۔“ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو سال زندہ

رہے گی مگر وہ نو سال زندہ رہی لیکن یہ نو سال شوہر کے ساتھ نہیں، ماں باپ کے گھر ہی میں گزرے۔ لندن کے ڈاکٹروں کی رائے جاننے کے بعد کشور کمار اسے یہ کہہ کر میکے چھوڑ گئے کہ وہ بہت مصروف ہیں۔ ایک بیمار بیوی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ اہل دل جان سکتے ہیں کہ یہ جاننے کے بعد ایک عورت کے دل پر کیا گزری ہوگی کہ اس کا شوہر اسے ایک بوجھ کی طرح اپنے سر سے اتار کر جا رہا ہے۔ پہلے وہ فون کرتے رہے۔ آتے جاتے بھی رہے لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ مدھو بالا کا کمایا ہوا پیسا زیادہ تر اس کی فیملی کے اخراجات اور اس کے علاج میں کام آگیا، وہ اَن پڑھ تھی۔ پیسے کو صحیح طور پر استعمال نہیں کر سکی۔ کشور صاحب نے بھی تھوڑی بہت مدد کی۔

سوشیلا رانی کہتی ہیں۔ ''اَن پڑھ ہونے کے باوجود جب اس نے مجھ سے انگریزی میں بات چیت کے لیے ٹیوشن لینا شروع کی تو صرف چھ ماہ میں روانی سے انگریزی بولنے لگی۔ وہ اپنی تمام مصروفیات کے باوجود روزانہ دو گھنٹے تک باقاعدگی سے مجھ سے ٹیوشن لیتی رہی۔''

بعض اخبارات و رسائل میں کہا جاتا تھا کہ وہ (مدھو بالا) بڑی رنگین مزاج ہے اور اپنے معاشقوں کی وجہ سے باپ سے مار کھاتی ہے۔ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے مدھر بھوشن دکھ سے کہتی ہے۔

''ایک طرف اخبار و رسالے یہ بھی لکھتے تھے کہ مدھو بالا کے گھر کا ماحول بہت پابندیوں والا ہے۔ باپ کی مرضی کے بغیر وہ کسی سے مل بھی نہیں سکتی دوسری طرف اس کے ان گنت معاشقوں کے بارے میں لکھا جاتا تھا۔ اخبارات و رسائل خود ہی اپنے لکھے کی تردید کرتے رہتے تھے اگر مدھو بالا پر اتنی پابندیاں تھیں کہ اس کی حیثیت گھر میں قیدی جیسی تھی تو اس کے عاشق کیا پائپ کے ذریعے چڑھ کر اس کے پاس آتے تھے۔''

اس معاملے میں سوشیلا رانی بھی اس کی تائید کرتے ہوئے جذباتی انداز میں کہتی ہیں۔ اگر مدھو بالا ایک اداکارہ تھی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا کوئی کردار نہیں تھا۔ وہ بڑے مضبوط کردار کی عورت تھی۔ اس زمانے میں حسن کو مصنوعی سہارے میسر نہیں تھے۔ اس کا فطری حسن اکثر مردوں پر جادو کر دیتا تھا۔ اس کے طلب گاروں کی کمی نہیں تھی لیکن اس کے دل کو دلیپ صاحب کے سوا کوئی نہیں بھایا۔ وہ مرتے دم تک خوب صورت رہی۔ چھ سال تک میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی پھر ایک روز اس کا فون آیا۔ ''دیدی! میں مر رہی ہوں ایک بار آ کر مجھ سے مل جاؤ۔'' میں دوڑی دوڑی گئی اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ دوسرے روز وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلی گئی۔ آخری لمحوں میں اس کے ہونٹوں پر ایک افسردہ مسکراہٹ تھی جو ان دنوں اس کی پہچان بن کر رہ گئی تھی۔''

پچھلے دنوں مدھو بالا کا ذکر ایک بار پھر اخبارات میں آیا۔ وہ سانتا کروز میں جس قبرستان میں دفن تھی اسے دہابیوں کا قبرستان کہا جاتا ہے۔ خبر آئی تھی کہ اس کی (مدھو بالا کی) محمد رفیع صاحب کی اور پری چہرہ نسیم بانو کی قبروں کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ شکستہ ہو چکی ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ کچھ عرصے کے بعد ان میں دوسرے مردوں کو دفن کر دیا جائے۔

مدھو بالا پر جو بھی گزری اور اس کی قبر پر بھی نہ جانے کیا گزری مگر ان گنت دلوں میں وہ زندہ رہے گی۔

راج کپور

راج کپور کا بولی ووڈ میں پہلے شومین کی حیثیت سے منفرد مقام ہے۔ جو لوگ فلمی دنیا کے معاملات میں غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں انہیں بخوبی اندازہ ہے کہ شومین کیا ہوتا ہے اور راج کپور کس درجے کے شومین تھے۔

راج کپور ایک منجھے ہوئے اداکار ہی نہیں بلکہ ایک کہنہ مشق اور انتہائی پُرعزم ہدایت کار بھی تھے ان کی تخلیق کردہ فلمیں بولی ووڈ میں لینڈ مارک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیا یہ ممکن تھا کہ پرتھوی راج کپور جیسے عظیم اداکار کا بڑا بیٹا فلمی دنیا میں قدم نہ رکھتا؟ یقیناً یہ کسی طور ممکن نہ تھا۔ راج کپور نے ہوش سنبھالا تو گھر میں فلمی ماحول دیکھا۔ بالی ووڈ ان دنوں جوبن پر نہیں تھا۔ کسی مقام تک پہنچنے کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی تھی۔ لاہور اور کلکتہ میں بھی فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ ایسے میں بھلا یہ کس طور ممکن تھا کہ بالی ووڈ میں کوئی پہنچ جائے اور اسے مقابلے کا سامنا نہ ہو؟ راج کپور کے لیے بھی فلمی دنیا میں قدم جمانا آسان نہ تھا۔ پرتھوی راج کپور سیلف میڈ انسان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی اولاد بھی محنت کرے اور اپنے بل پر کسی مقام تک پہنچے۔ جب راج کپور نے فلمی دنیا میں کیریئر شروع کرنے کی بات کی تو پرتھوی راج نے مشورہ دیا کہ فلمی نگار خانوں میں نچلی سطح سے کام شروع کرو۔ اس طرح انسان کو فلمی دنیا کے کام کرنے کا ڈھنگ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا

راج کپور نے کچھ مدت تک اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کیا پھر اداکاری کی طرف آئے۔

1947ء میں فلم ''نیل کمل'' کے ذریعے راج کپور نے فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ اس فلم کی ہیروئن مدھو بالا تھی۔ دونوں کے لیے یہ منفرد تجربہ تھا کیونکہ انہیں پہلی بار ہیرو اور ہیروئن بننے کا موقع مل رہا تھا۔ مدھو بالا کا حسن اس فلم میں نقطۂ عروج پر نہیں تھا۔ نہ ہی راج کپور میں لوگوں کو کوئی خاص بات دکھائی دی۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ فلم فلاپ ہوگئی۔

بولی ووڈ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ کسی فلم کے فلاپ ہونے کو فلمی پنڈت اور کرتا دھرتا خاطر میں نہیں لاتے اور فنکاروں کی کارکردگی کا جائزہ لیے بغیر نہیں رہتے۔ راج کپور اور مدھو بالا کے سلسلے میں بھی یہی ہوا۔ راج کپور میں یہ خوبی تھی کہ وہ ڈائیلاگ خاصے پُرسکون انداز سے اور دھیمے لہجے میں ادا کرتے تھے۔ پرتھوی راج تھیٹر کی دنیا کے آدمی تھے۔ ان کی اداکاری پر تھیٹر کی ڈائیلاگ ڈلیوری کا اثر بہت نمایاں تھا۔ ''مغل اعظم'' میں یہ بات بہت نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ راج کپور نے اس معاملے میں والد کے نقش قدم پر چلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ ان کے اثر سے نکلنے کی بھرپور کوشش کی اور کامیاب رہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ایک اور پرتھوی راج کپور میں تبدیل ہو جاتے اور شاید ان کے کیریئر کی بساط بھی لپیٹ دی جاتی۔

راج کپور میں خاص نرمی اور نزاکت تھی۔ وہ ابتداء ہی سے فلم میکر بننے کے خواہش مند تھے۔ فلمی دنیا میں قدم رکھتے ہی انہوں نے فلم بنانے کی پلاننگ بھی شروع کر دی تھی اور پھر جلد ہی انہوں نے حالات کو اپنے موافق کر لیا اور اپنی اوّلین فلم ''آگ'' بنائی۔ اس فلم نے فلمی دنیا کے پنڈتوں کو چونکا دیا۔ اب تک تو یہ سوچا جا رہا تھا کہ راج کپور کی شکل میں ایک اچھا اداکار فلم انڈسٹری کو ملا ہے مگر اب فلمی پنڈتوں کو یقین ہو گیا کہ راج کپور میں ایک اچھے اداکار اور ذہین ڈائریکٹر کا حسین سنگم پیدا ہو چلا ہے۔ ''آگ'' نے گویا فلم انڈسٹری میں آگ لگا دی۔ فلم کی کہانی بھی اچھی تھی اور اداکاری کا معیار بھی بہت بلند تھا۔ موسیقی لاجواب تھی۔ راج کپور نے ثابت کر دیا کہ وہ موسیقی کا غیر معمولی شعور رکھتے ہیں۔ مکیش کا گایا ہوا گیت ''زندہ ہوں اس طرح کہ غم زندگی نہیں'' سپرہٹ ہوا۔ راج کپور نے اس فلم کے ذریعے گویا بگل بجا کر اعلان کر دیا کہ ایک شومین وارد ہو چکا ہے۔

راج کپور کی ذاتی فلمیں

آگ، برسات، آوارہ، آہ، بوٹ پالش، شری 420، اب دلی دور نہیں، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، سنگم، میرا نام جوکر، بوبی، دھرم کرم، ستیم شیوم سندرم، پریم روگ، رام تیری گنگا میلی۔

دوستو! یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ راج کپور نے ''نیل کمل'' کے بعد ایک ہی چھلانگ لگا کر یہ مقام حاصل کر لیا۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے میں آپ کو تھوڑی دیر کے لیے پیچھے لے جاؤں گا اور بتاؤں گا کہ کامیابی و کامرانی مسلسل محنت اور جدوجہد کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

راج کپور نے اداکاری کا آغاز 1935ء میں فلم ''انقلاب'' سے کیا مگر راج کپور اس وقت بہت کم عمر تھے۔ اس کے باوجود وہ 1943ء تک مسلسل اداکاری کرتے رہے۔ اسی سال فلم ''گوری'' میں انہوں نے ایک اہم کردار ادا کیا اور پھر اسی برس ان کی ایک اور فلم ''ہماری بات'' ریلیز ہوئی مگر وہ دونوں فلموں میں کامیاب نہ ہو سکے اس لیے ان کا نام کچھ زیادہ ابھر کر سامنے نہ آسکا۔ اس کے بعد ان کی اداکارانہ زندگی میں دو سال کا وقفہ آگیا اور پھر 1946ء ان کی ''والمیکی'' نامی فلم ریلیز ہوئی مگر یہ بھی ناکام رہی لیکن اس فلم کے بعد یہ ہوا کہ ان کو اور فلموں میں کام ملنا شروع ہوگیا۔ چنانچہ 1947ء جیسے پُرآشوب سال میں راج کپور کی چار فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔ ان میں نیل کمل، جیل یاترا، چتوڑ وجے اور دل کی رانی شامل تھیں مگر یہ تمام فلمیں فلاپ ہوگئیں۔ گویا 1935ء سے 1947ء تک کے عرصے میں ان کی آٹھ فلمیں نمائش کے لیے پیش ہوئیں اور یہ سب ناکام ہو کر ان کے حق میں بے سود ثابت ہوئیں مگر انہیں فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے فلمی دنیا میں اتنے دنوں رہ کر بہت کچھ سیکھ لیا تھا اور ہدایت کاری کی تربیت بھی حاصل کر لی تھی۔ اس سلسلے میں ان کے استاد اور محسن مشہور ہدایت کار کیدار شرما تھے کیونکہ راج کپور نے کیدار شرما کی فلم سے اسٹارٹ لیا تھا اس لیے راج کپور ان کو اپنا استاد اور محسن تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کیدار شرما نے اپنی ساری ریٹائرڈ زندگی راج کپور کے اسٹوڈیو آر کے اسٹوڈیو میں ایک چھوٹے سے گھر میں گزاری۔

قارئین! آپ کو اندازہ ہوا کہ بولی ووڈ کے شومین

نے اپنے آپ کو اس مقام تک پہنچانے میں کس قدر جدوجہد کی۔ بار بار ٹھوکر کھائی، بار بار گرے، بار بار سنبھلے مگر حوصلہ نہیں ہارے اور اپنی محنت، اپنی کوشش جاری رکھی، نیک نیتی سے کی جانے والی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی، اس کا پھل ضرور ملتا ہے اور اس کا پھل، میٹھا اور رسیلا پھل انہیں ان کی ذاتی فلم ''آگ'' کی سپرہٹ کامیابی کی صورت میں ملا جس میں انہوں نے نہ صرف زبردست اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا بلکہ بطور ہدایت کار بھی اپنی فنی خوبیوں کا لوہا منوایا۔ انہوں نے اپنی اس پہلی ذاتی فلم میں اپنے مقابل میں اس وقت کی تین نامور ہیروئنوں کو کاسٹ کیا تھا جن میں نرگس، کامنی کوشل اور نگار سلطانہ شامل تھیں۔ ''آگ'' کے موسیقار رام گنگولی اور نغمہ نگار بہزاد لکھنوی تھے۔ اس فلم کے گیت بے حد مقبول ہوئے۔ خاص کر یہ غزل تو بہت زیادہ ہٹ ہوئی تھی جو آج بھی سننے والوں کو اچھی لگتی ہے جس کے بول تھے۔

زندہ ہوں اس طرح کہ غم زندگی نہیں
جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں

یہ غزل مکیش کی مدبھری آواز میں تھی۔ اس غزل کی کامیابی سے مکیش کی کامیابی اور مقبولیت میں اضافہ ہوا اور ''آگ'' کی کامیابی سے راج کپور کا شمار بھی کامیاب اداکاروں اور ہدایت کاروں میں ہونے لگا۔

1949ء میں راج کپور کو مزید کامیابیاں ملیں کیونکہ اس سال ان کی دوسری فلم ''برسات'' اور ہدایت کار محبوب خان کی فلم ''انداز'' ریلیز ہوئیں۔ بطور اداکار راج کپور نے ان دونوں فلموں میں زبردست کردار نگاری کی اور ان کی شہرت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ ''انداز'' ان کی ایک لاجواب فلم تھی۔ ہدایت کار محبوب خان نے اپنی زندگی کی یادگار فلم بنائی تھی جو ہر لحاظ سے ایک شاندار فلم تھی۔ اسی سال راج کپور کی ذاتی فلم ''برسات'' بھی ریلیز ہوئی۔ یہ ایک میوزیکل فلم تھی جس نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ فلم ''برسات'' نے راج کپور پر دولت کی برسات کردی۔ اس فلم کی شاندار کامیابی سے راج کپور کی مالی حالت بڑی مستحکم ہو گئی جس کی آمدنی سے انہوں نے اپنا ذاتی نگار خانہ، آر کے فلم اسٹوڈیو بھی تعمیر کروالیا۔ اپنی پہلی فلم ''آگ'' سے انہوں نے جو کچھ سیکھا تھا اس سے اپنی دوسری فلم ''برسات'' کو فائدہ پہنچایا۔ برسات کی موسیقی شنکر جے کشن نے دی تھی۔ اس موسیقار جوڑی نے پہلی بار بڑی شارپ موسیقی دی تھی جس نے موسیقی کا رخ موڑ دیا اور موسیقی کو اتنا عروج ملا کہ پچھلے 18 برسوں میں نہ ملا تھا۔ راج کپور نے اپنی اس فلم کے ذریعے اس موسیقار جوڑی کو شنکر جے کشن کے نام سے متعارف کرایا اس کے علاوہ اس فلم میں پہلی بار نغمہ نگار شیلندر حسرت جے پوری اور اداکارہ نمی کو بھی متعارف کرایا اور اسی فلم سے نرگس کی فنکارانہ زندگی میں انقلاب آیا۔ بعد میں نرگس کے ساتھ ان کی جوڑی بہت مقبول ہوئی۔

برسات سے متعلق کچھ پس پردہ باتیں بہت سے لوگوں کے علم میں نہیں مثلاً اس فلم کے پہلے دو گیت

☆ ہوا میں اڑتا جائے میرا لال دوپٹا ململ کا
☆ ہو ہو جی مجھے کسی سے پیار ہو گیا، دل بے قرار ہو گیا

کے نغمہ نگار شیلندر نہیں، پہلے گیت کے نغمہ نگار رمیش شاستری اور دوسرے گیت کے شاعر [illegible] فتح آبادی تھے۔ ان دونوں نغمہ نگاروں سے راج کپور ناراض ہو گئے جس کے نتیجے میں انہیں الگ کر دیا اور باقی دو گیت شیلندر سے لکھوائے جن کے بول تھے۔

☆ پتلی کمر ہے، ترچھی نظر ہے
☆ برسات میں ہم سے ملے تم سجن تم سے ملے ہم

اس کے علاوہ باقی گانے گیت نگار حسرت جے پوری نے تحریر کیے جن کے بول ہیں۔

☆ جیا بے قرار ہے چھائی بہار ہے
☆ میری آنکھوں میں بس گیا کوئی رے
☆ بچھڑے ہوئے پردیسی ایک بار تو آ جا

ان سپرہٹ گیتوں کو لتا نے اپنی مدبھری آواز میں گایا تھا۔ ایک اور سپرہٹ گیت جو لتا اور مکیش نے گایا یہ تھا

☆ چھوڑ گئے بالم مجھے ہائے اکیلا چھوڑ گئے

ان تمام گیتوں کی مقبولیت نے فلم کی پسندیدگی میں بھی اضافہ کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ موسیقاروں کی جوڑی اور نغمہ نگاروں کی جوڑی بھی پہلی بار اس فلم میں نمودار ہوئی تھیں پھر ایک ایسا وقت آیا کہ یہ جوڑیاں راج کپور کی ہر فلم میں شامل ہوئیں۔

1950ء میں راج کپور نے باورے نین، داستان، سرگم، امبر، جان پہچان اور پیار میں، جیسی فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ جن میں داستان، سرگم اور امبر کامیاب رہیں۔ باقی فلمیں فلاپ ہو گئی تھیں۔ فلم ''امبر'' اپنے گیتوں کی وجہ سے ماضی کی ایک یادرہ جانے والی فلم تھی۔ اس کے گیت شکیل بدایونی نے تحریر کیے تھے جب کہ

موسیقار غلام محمد تھے۔ اس فلم کے یہ گیت بہت مقبول ہوئے تھے۔

☆ رم جھم کی پھوار دیکھو رنگ لایا پیار
برسات کے مہینے میں
☆ دنیا میں نہیں کوئی وفادار
زمانہ سچ کہتا ہے
☆ ٹوٹے گی نہ پیار کی ڈور
دنیا چاہے لگالے زور

اس فلم میں راج کپور نے نرگس کے ساتھ بڑا شاندار کردار ادا کیا تھا۔ سرگم میں ریحانہ نے ان کے مقابلے میں ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا جب کہ داستان میں ان کی ہیروئن ثریا تھیں۔ فلم سرگم کے یہ دو گیت جن کی موسیقی سی رام چندر کی تھی اور نغمہ نگار پی ایل سنتوش تھے۔ دونوں اپنے دور کے بہت ہی مقبول گیت تھے۔

محفل میں جل اٹھی شمع پروانے کے لیے
پریت بنی ہے دنیا میں جل جانے کے لیے

☆......☆......☆

ایسی محبت سے ہم باز آئے
جو دل کو جلائے ستائے رلائے

1951ء میں راج کپور کی صرف ایک فلم ''آوارہ'' ریلیز ہوئی جو ہر لحاظ سے ایک مکمل فلم تھی۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ اس کی کہانی نامور ادیب خواجہ احمد عباس نے تحریر کی تھی جس کے بعد وہ ان کے مستقل کہانی نویس بن گئے اور یہ تعلق دوستی میں بدل گیا جو مرتے دم تک قائم رہا۔ ''آوارہ'' جرم و سزا کے موضوع پر بننے والی منفرد فلم تھی۔ اس میں نرگس کی بے ساختہ اداکاری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ راج کپور کی اداکاری اور ہدایت کاری بھی لاجواب تھی۔ موسیقار شنکر جے کشن نے اس فلم کے گیتوں کی دھنیں بڑی زبردست بنائی تھیں۔ گیت شیلندر اور حسرت جے پوری نے تحریر کیے تھے جو آج بھی پسند کیے جاتے ہیں۔ ''آوارہ'' اس لحاظ سے ایک اہم فلم تھی کہ اس میں راج کپور نے تین نسلوں کو یکجا کیا تھا۔ راج کپور کے دادا دیوان بشیشور ناتھ کپور نے ایک جج کا کردار ادا کیا تھا جب کہ ان کے والد پرتھوی راج نے وکیل کا کردار ادا کیا تھا۔ راج کپور کے بچپن کا کردار ان کے چھوٹے بھائی ششی کپور نے کیا تھا۔ اس طرح پوری فیملی کے مرد ممبر اس فلم میں جمع ہو گئے تھے۔ گویا ان کی تین نسلیں یکجا ہو گئی تھیں۔ ''آوارہ'' پہلی فلم تھی جو روس میں بے پناہ مقبول ہوئی تھی اور اس کے کئی گیت روسیوں کو بہت پسند تھے۔ جن میں سے خاص کر یہ گیت

آوارہ ہوں یا گردش میں
آسمان کا تارا ہوں آوارہ ہوں

روس میں ''آوارہ'' کی کامیابی کی وجہ سے راج کپور خود بھی روس میں بے حد مقبول ہو گئے اور ان کی فلمیں روس میں بہت پسند کی جانے لگیں۔ ''آوارہ'' ان کے کیریئر کی سب سے شاندار فلم تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس نغمے کی دھن ایک ترکی گانے سے لی گئی تھی۔ اس جرم گیت نے تمام ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔

1952ء میں راج کپور کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں، ان میں بے وفا، انہونی اور آشیانہ تھیں۔ اس برس ان کی کوئی ذاتی فلم ریلیز نہیں ہوئی۔ 1953ء کا سال بھی ان کے

یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ہم پاکستان میں پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور ہماری مادری زبان اردو کہلاتی ہے مگر پھر بھی ہم اپنی اس اردو زبان سے ناآشنا ہوتے جارہے ہیں اور دن بدن ہم کو یہ احساس مارے ڈال رہا ہے کہ ہم کو ابھی اردو زبان سیکھنے کی اشد ضرورت ہے، نیز یہ انکشاف بھی ہوتا جارہا ہے کہ ہم اپنی زبان میں اگر بالکل نہیں تو بھی کافی حد تک کورے واقع ہوئے ہیں۔۔۔ کیونکہ بعض الفاظ کا الٹ پھیر ہماری باتوں کو نہ صرف مضحکہ خیز بنا دیتا ہے بلکہ بعض اوقات نوبت لڑائی جھگڑے تک بھی جا پہنچتی ہے اور ہم اپنی اس ٹوٹی پھوٹی اردو میں نادانی کے باعث کئی دفعہ ایسی سنگین غلطیاں کر بیٹھتے ہیں کہ سامنے والا شخص ہمارے جملے سن کر آگ بگولہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس آج کل کی اردو سے ہم کو کما حقہ واقفیت کا ہونا لازمی عنصر بن چکا ہے۔ مثلاً حال ہی میں ایک صاحب نے دوران ملاقات کچھ اس طرح کی گفتگو کی جو نہ صرف ہمارے چھوٹے سے ذہن کے اوپر سے گزر گئی بلکہ ہم کو سچ مچ اپنی زبان دانی پر شرمندگی محسوس ہونے لگی کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ یار آج کل میں نے بڑی کھٹ راکیں پال رکھی ہیں اور پھر اوپر سے لوگ مجھے الگ مفت کی پھینکیں دے جاتے ہیں۔ تو ہم کو اپنی اس اردو دانی پر ماتم کرنے کو جی چاہا۔

مرسلہ: رؤف اسلم آرائیں۔ ڈگری (سندھ)

لیے کوئی خاص نہ تھا۔ اس سال ان کی ذاتی فلم ''آہ'' کے
علاوہ فلم ''دھن'' اور فلم ''پاپی'' ریلیز ہوئیں مگر یہ دونوں
فلمیں فلاپ ہوگئیں جب کہ ''آہ'' نے بھی کوئی زیادہ اچھا
بزنس نہیں کیا اگرچہ اس کے گیت مقبول بھی ہوئے تھے۔
اس فلم میں بھی نرگس نے ان کی ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔
1954ء میں بوٹ پالش اور 1955ء میں شری 420
نمائش پذیر ہوئیں۔ یہ دونوں ان کی ذاتی فلمیں تھیں دونوں
ہی بے حد کامیاب رہیں۔ ان دونوں فلموں کے موسیقار شنکر
جے کشن اور نغمہ نگار حسرت جے پوری اور شیلندر تھے۔ شری
420 ایک میوزیکل فلم تھی جو اپنے مقبول گیتوں کی وجہ سے
بہت پسند کی گئی۔ ان فلموں میں بھی ہیروئن نرگس تھیں جب
کہ ہدایت کاری راج کپور کی تھی۔ دونوں فلموں کی کہانیاں
خواجہ احمد عباس نے تحریر کی تھی۔ ''بوٹ پالش'' میں راج
کپور کے بچپن کا کردار رتن کمار نے ادا کیا تھا۔ اس فلم کا یہ
کورس اپنے دور میں بڑا مقبول ہوا تھا۔

☆ ننھے منے بچے تیری مٹھی میں کیا ہے
مٹھی میں ہے تقدیر ہماری

یہ کورس محمد رفیع اور ساتھیوں نے گایا تھا۔
1956ء میں ان کی ذاتی فلم ''جاگتے رہو'' نمائش
پذیر ہوئی جو خواجہ احمد عباس کی بہترین کہانی اور راج کپور کی
بہترین اداکاری کی وجہ سے بڑی پسند کی گئی۔ نرگس نے بھی
بطور ہیروئن لاجواب اداکاری کی تھی۔ اس فلم کے موسیقار
بھی شنکر جے کشن تھے۔ یہ ایک آرٹ اور ڈرامائی فلم تھی جو
راج کپور کے کیریئر کی بہترین فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔
اسی سال ان کی فلم ''چوری چوری'' بھی ریلیز ہوئی جو ان کی
ذاتی فلم نہیں تھی۔ یہ میوزیکل فلم تھی اس کا ہر گیت لاجواب
تھا۔ اس کی موسیقی بھی شنکر جے کشن نے ترتیب دی تھی۔
1957ء میں راج کپور کی ذاتی فلم ''اب دلی دور
نہیں'' ریلیز ہوئی۔ یہ فلم راج کپور اور نرگس کی آخری فلم
ثابت ہوئی کیونکہ اسی سال محبوب خان کی فلم ''مدر انڈیا'' بن
رہی تھی۔ جس کی شوٹنگ کے دوران سنیل دت اور نرگس کا
رومان شروع ہوگیا اور ''مدر انڈیا'' کی نمائش کے بعد ان کی
شادی ہوگئی۔ جس کے بعد نرگس کسی فلم میں راج کپور کے
ساتھ ہیروئن نہ آسکیں۔
1958ء میں راج کپور کی کوئی ذاتی فلم ریلیز نہیں
ہوئی۔ البتہ دوسرے فلم سازوں کی بنائی ہوئی تین فلموں
شاردا، پرورش اور پھر صبح ہوگی نمائش پذیر ہوئیں اور

کامیاب ثابت ہوئیں۔ شاردا میں راج کپور کی ہیروئن مینا
کماری تھی، پھر صبح ہوگی میں مالا سنہا تھیں۔ شاردا اور
پرورش کے موسیقار شنکر جے کشن اور پھر صبح ہوگی کے موسیقار
خیام تھے۔
1959ء میں راج کپور کی فلم چار دل چار راہیں،
آنچل اور استاد ریلیز ہوکر ناکام رہیں۔ فلم ''کنہیا'' اور
''میں نشے میں ہوں'' دونوں فلمیں بے حد کامیاب ہوئیں۔
فلم ''کنہیا'' میں ان کی ہیروئن نوتن تھیں جب کہ ''میں نشے
میں ہوں'' میں [illegible] مالا سنہا تھیں۔
1960ء [illegible] راج کپور کے لیے اچھا ثابت ہوا جس
میں ان کی ذاتی فلم ''جس [illegible] میں گنگا بہتی ہے'' بھی ریلیز
ہوئی مگر اس فلم میں ان کی ہیروئن نرگس نہیں تھی، پدمنی ان کی
ہیروئن تھی جب کہ دوسرے ہیرو [illegible] ہونے والی فلمیں
''چھلیا'' اور ''اناڑی'' میں ان [illegible] نے بڑی
جذباتی اور بے تکلف اداکاری کی تھی۔ یہ [illegible] فلمیں بے حد
کامیاب ثابت ہوئی تھیں۔ ''اناڑی'' اور ''جس دیش میں
گنگا بہتی ہے'' کے موسیقار شنکر جے کشن جب کہ ''چھلیا''
کے میوزک ڈائریکٹر کلیان جی آنند جی تھے۔ ان تینوں فلموں
کے گیت سپرہٹ ہوئے۔
1961ء میں ''نذرانہ'' 1962ء میں ''عاشق'' اور
1963ء میں ''دل ہی تو ہے'' نامی فلمیں اسکرین کی زینت
بنیں۔ یہ تینوں دوسرے فلم سازوں کی فلمیں تھیں جو ناکام
رہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ راج کپور کی بڑھتی ہوئی عمر تھی
اس لیے ان کی مانگ میں روز بروز کمی ہوتی جا رہی تھی۔
1964ء میں ان کی ذاتی فلم ''سنگم'' ریلیز ہوکر کامیاب
ثابت ہوئی۔ اس کی ہیروئن وجنتی مالا تھیں جب کہ راجندر
کمار نے بھی اس فلم میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ راج
کپور نے پہلے اس رول کے لیے دلیپ کمار کو دعوت دی تھی
مگر دلیپ صاحب نے انکار کردیا تو راجندر کمار کو کاسٹ
کیا۔ اس فلم کے موسیقار اور نغمہ نگار راج کپور کے پرانے
یار تھے۔ ''سنگم'' کے گیت مقبول ہوئے، محمد رفیع کی آواز
میں یہ گیت

یہ میرا پریم پتر پڑھ کر تم ناراض نہ ہونا
کہ تم میری زندگی ہو کہ تم میری بندگی ہو

خاص طور پر بہت پسند کیا گیا۔ اس فلم میں راج کپور
کی اداکاری میں وہی تروتازگی تھی جو کبھی نرگس کے ساتھ
ہوتی تھی۔ راج نے وجنتی مالا کے ساتھ ویسی ہی اداکاری

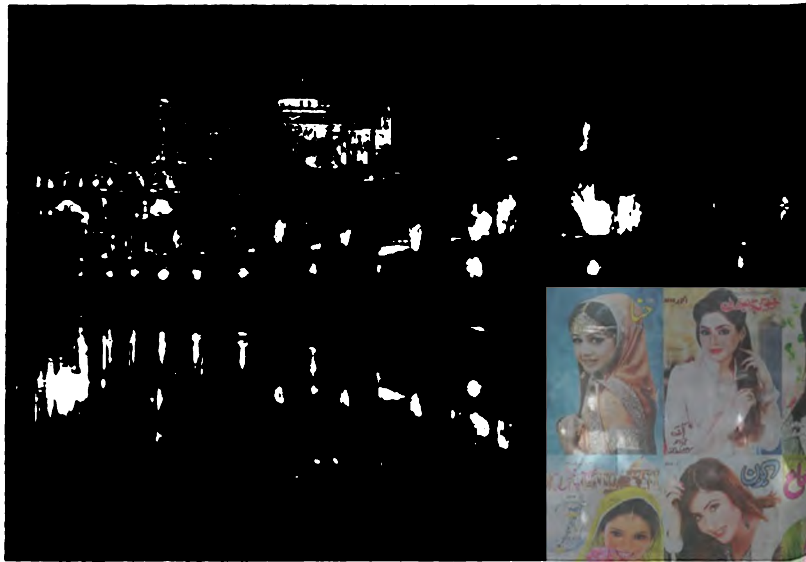
کی۔ واضح رہے کہ راج کپور کی اداکاری کا لازمی عنصر
ہیروئن سے لپٹنا چمٹنا اور دبوچنا تھا۔ مگر اس فلم کے اس گانے
نے یہ بتادیا کہ اب میں ہیرو کے قابل نہیں ہوں۔

میں کا کروں رام مجھے بڈھا مل گیا

راج کپور کی اب وہ عمر نہیں تھی اس لیے بطور ہیرو یہ
ان کی آخری فلم تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد ان کی
جو فلمیں ریلیز ہوئیں وہ ناکام ہی ہوئیں۔ انجام کار انہوں
نے فلموں میں اداکاری ترک کردی اور اپنی ساری توجہ
ہدایت کاری کی طرف مرکوز کردی۔ 1965ء میں ان کی
کوئی فلم نہ لگی۔ 1966ء میں ''تیسری قسم'' 1967ء میں
''دیوانہ'' اور 1968ء میں ''سپنوں کا سوداگر'' ریلیز
ہوئیں اور بری طرح فلاپ ہوگئیں۔ 1969ء میں ان کی
کوئی فلم نہ لگی۔ 1970ء میں راج کپور نے بڑی محنت سے
اپنی ذاتی فلم ''میرا نام جوکر'' بنائی مگر صد افسوس کہ اس فلم کو
بھی عوامی پذیرائی نصیب نہ ہوسکی۔ یہ فلم بھی سپر فلاپ ثابت
ہوئی۔ اس فلم میں راج کپور کے بچپن کا کردار ان کے
چھوٹے بیٹے رشی کپور نے ادا کیا تھا۔ اس فلم کی ناکامی سے
ان کو زبردست مالی خسارہ ہوا اس کے بعد انہوں نے سنجیدگی
سے سوچا۔ ''اب مجھے اداکاری کے بارے میں سوچنا بھی
نہیں چاہیے۔ میرے لیے اب اداکاری کے سارے
دروازے بند ہوگئے ہیں۔ اب مجھے اپنے آپ کو زندہ رکھنے
کے لیے صرف ہدایت کاری کرنی چاہیے۔''
1971ء میں ان کی کوئی فلم نہیں آئی۔ 1972ء میں
کل آج اور کل راج کپور نے بطور فلم ساز و ہدایت کار فلم
''بوبی'' بنانی شروع کی جس میں اپنے چھوٹے بیٹے رشی کپور
کو ہیرو بنایا۔ جب کہ ہیروئن کے لیے ایک نئی لڑکی ڈمپل
کپاڈیہ کو کاسٹ کیا۔ یہ فلم 1973ء میں نمائش پذیر ہوئی
اور بے حد کامیاب ہوئی۔ اس نئی رومانوی جوڑی کو بھی فلم
بینوں کی بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔
راج کپور کو ''بوبی'' کی کامیابی سے جہاں خوشی ہوئی
وہاں اندر سے وہ کچھ دکھی بھی ہوئے اور یہ دکھ اس بات کا تھا
کہ شائقین فلم بڑے خودغرض، بے درد اور بے وفا ہوتے
ہیں۔ وہ جنہیں آج پسند کرتے ہیں انہیں کل بھلا دیتے ہیں،
اپنی پسندیدگی کے قابل نہیں سمجھتے۔
راج کپور نے بدلتے ہوئے حالات کے تحت اس فلم
میں کچھ اور تبدیلیاں بھی کی تھیں۔ اس کی موسیقی کا شعبہ
موسیقار لکشمی کانت پیارے لال کو سونپا تھا جب کہ گیت
آنند بخشی سے لکھوائے تھے۔ اس فلم کی یہ پوری نئی ٹیم بڑی
کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ اس فلم بوبی کی زبردست کامیابی
سے راج کپور کا سارا خسارہ پورا ہوگیا تھا اس فلم کی کامیابی کا
ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان کا اپنا بیٹا رشی کپور بطور ہیرو پسند کیا
گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بولی ووڈ کا معروف ترین اداکار بن
گیا۔ گھر کا ہیرو ہونے کی وجہ سے راج کپور نے خوب فائدہ
اٹھایا۔
کچھ فلمیں ایسی تھیں جو دوسرے فلم سازوں اور
ہدایت کاروں کی بنائی ہوئی تھیں، جن میں راج کپور ہیرو
تھے۔ ان میں 1975ء میں ''دو جاسوس'' 1976ء میں
''خان دوست'' 1977ء میں ''چاندی سونا'' 1980ء
میں ''عبداللہ'' اور 1982ء میں ''گوپی چند جاسوس''
ریلیز ہوئیں مگر تماشائیوں نے انہیں بھی مسترد کردیا اور
اس کی بڑی وجہ راج کپور ہی کو سمجھا گیا۔ ڈھلتی ہوئی اور بڑی
عمر کے ہیرو کو اور اس کی فلموں کو پسندیدگی کی سند عطا نہیں
کی۔
''بوبی'' کی کامیابی کے بعد راج کپور نے اپنے فلم
ساز ادارے سے 1976ء میں ''دھرم کرم'' اور 1975ء
میں ''ستیم شیوم سندرم'' بنائیں۔ ان فلموں نے زبردست
بزنس کیا۔ ان دونوں فلموں کی کہانیاں خواجہ احمد عباس کی تحریر
کردہ تھیں۔ دونوں فلمیں راج کی یادگار فلموں میں شمار ہوتی
ہیں۔ 1982ء میں راج کپور نے ایک بار پھر ایک عظیم فلم
''پریم روگ'' کی صورت میں پیش کی۔ اس لاجواب فلم کی
کہانی اور ہدایت کاری ناقابل فراموش تھیں۔ اس فلم سے
راج کپور کے فلمی کیریئر کو زبردست استحکام حاصل ہوا۔
1984ء میں انہوں نے ''رام تیری گنگا میلی'' بنائی۔ اس فلم
نے کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ اس فلم کے بعد ہر
شخص کی زبان پر راج کپور کا نام تھا۔
''ارے یار! کیا فلم بنائی ہے راج کپور نے۔''
''ایسی شاہکار فلم راج کپور جیسا ہدایت کار ہی بنا سکتا
ہے۔''
''راج کپور نے آرٹسٹوں سے جو کام لیا ہے، اس کی
جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔''
یہ اور اس قسم کی رائے، تبصرے اور اظہار خیال اس فلم
کے بارے میں کیے گئے اور یہ باتیں غلط بھی نہیں تھیں۔ اس
فلم پر راج کپور کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس کی ہدایات
انہوں نے کچھ اس طرح دی تھیں کہ یہ فلم شہ پارہ بن گئی

تھی۔ اس فلم میں انہوں نے ایک نئی لڑکی مندا کنی کو بطور ہیروئن متعارف کرایا تھا۔ اس نئی اداکارہ سے جو کام انہوں نے لیا کوئی دوسرا ہدایت کار نہ لے سکا کیونکہ اس کے بعد یہ اداکارہ جلد ہی زوال پذیر ہوگئی۔

راج کپور نے اپنے آخری دور میں چھ فلموں کی ہدایت کاری کے فرائض انجام دیے۔ جن میں پانچ سپرہٹ ہوئیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی فلموں کی کہانیاں اس دور کے نامور ادیب خواجہ احمد عباس سے لکھوائیں۔ فلم ''حنا'' کو راج کپور بڑے پیمانے پر بنانا چاہتے تھے مگر قدرت نے ان کو مہلت نہ دی۔ چنانچہ ان کے بعد یہ کام ان کے ہونہار فرزند رندھیر کپور نے انجام دیا۔ اسے مکمل کرکے باپ کے خوابوں کو تعبیر عطا کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اگر راج کپور خود ''حنا'' کی ہدایات دیتے تو یہ فلم اور بھی بہتر ہوتی۔ یہ راج کپور کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی فلموں کے گیت بے انتہا مقبول ہوئے اور لوگوں کو ان پر پکچرائز ہونے والے گیت بہت پسند آئے جس کا کریڈٹ موسیقار شنکر جے کشن اور نغمہ نگار شیلندر اور حسرت جے پوری کو جاتا ہے۔ راج کپور کو خود بھی اچھی موسیقی کی پہچان تھی۔ جب تک وہ خود مطمئن نہ ہو جاتے اس وقت تک گیت نگار اور موسیقار کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ نہ ہی گیت ریکارڈ کرواتے تھے۔ ان کی بعض فلمیں تو زبردست میوزیکل شمار ہوتی ہیں جیسے برسات، آوارہ، شری 420۔ یوں تو لتا کی شہرت فلم ''محل'' کے گیت سے ہو چکی تھی مگر لوگ لتا کے نام سے بخوبی واقف نہ تھے۔ یہ راج کپور ہی تھے جنہوں نے پہلی بار بطور گلوکارہ لتا کا نام اپنی فلم ''برسات'' کے ٹائٹل پر دیا ورنہ اس سے پہلے فلموں میں گانے والوں کے نام اسکرین کی زینت نہیں بنتے تھے۔ راج کپور نے ایسے ہی کئی کلاکاروں کو متعارف کر کے فلمی صنعت کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ ایسوں میں شنکر جے کشن، مکیش، شیلندر، حسرت جے پوری اور اداکارہ نمی کے نام قابل ذکر ہیں۔ راج کپور اپنی فلموں اور اپنی اداکاری سے روس میں اس قدر مقبول ہوئے کہ عوام سے خواص تک نے انہیں عزت و تکریم دی۔ انہیں اکثر روس میں ہونے والے تاشقند فلم فیسٹیول کی جیوری کا ممبر منتخب کیا گیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی ہدایت کارانہ صلاحیتوں کی پوری دنیا قائل ہے۔ وہ ایک فطری اداکار، کامیاب فلم ساز اور بہت باصلاحیت ہدایت کار تھے۔ قدرت نے انہیں بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ اپنی ذات میں ایک اکیڈمی تھے۔ انہیں ان کی زندگی میں [illegible] سرکاری فلمی و غیر فلمی ایوارڈز ملے۔ ان کی فنی صلاحیتوں [illegible] سرکاری سطح پر بھی اعتراف کیا گیا۔ انہیں فلمی دنیا کا [illegible] سے بڑا ایوارڈ ''دادا بھائی پھالکے'' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ راج کپور جب ایوارڈ کی تقریب میں یہ ایوارڈ وصول کررہے تھے تو انہیں خطرناک قسم کی کھانسی اٹھی اور وہ ایوارڈ وصول کرتے ہوئے زمین پر گر پڑے اور بے ہوش ہوگئے ان کو فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا جہاں وہ دس روز [illegible] بے [illegible] کے بعد 2 جون 1988ء کو دنیا سے کوچ کر گئے اور اپنے [illegible] مداحوں کو سوگوار کر گئے۔ راج کپور کے نہ صرف باپ [illegible] تھے بلکہ انہوں نے اپنے پیچھے فنکاروں کا ایک طویل [illegible] چھوڑا۔ راج کپور کے دادا دیوان بشیشور ناتھ کپور نے فلم [illegible] میں جج کا کردار ادا کیا تھا۔ راج کپور کے والد پرتھوی راج [illegible] تھے (جن کی تفصیلی داستان آپ اسی تحریر میں پڑھ چکے ہیں) پرتھوی راج کے باپ، بھائی، بیٹوں، پوتے پوتیوں کے علاوہ پڑپوتی اور پڑپوتے نے بھی بولی ووڈ کی خدمت کی۔ ان کا گھرانا فلمی گھرانا تھا۔ پرتھوی راج کپور کے تینوں بیٹے راج کپور، شمی کپور اور ششی کپور اپنے زمانے کے مقبول ہیرو تھے۔ ان کی بہو گیتا بالی جو ششی کپور کی بیوی تھیں، فلموں میں کام کیا اور نام کمایا۔ ان کے پوتوں کی بیویاں نیتو سنگھ اور ببیتا نے بھی جو اپنے زمانے کی مقبول اداکارائیں تھیں فلموں میں مرکزی کردار کیے اور اب ان کی پڑپوتی کرشمہ کپور اور کرینہ کپور اور پڑپوتے رنبیر کپور بھی بھارتی فلم انڈسٹری میں کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ گویا اداکاری کا فن ان کے گھرانے میں پانچویں پشت میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا سالا پریم ناتھ بھی اپنے زمانے میں کامیاب اداکار رہ چکا ہے۔ جب اتنے سارے خاندان کے افراد فلم انڈسٹری سے وابستہ ہوں جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں خوب نام بھی کمایا ہو تو کیوں نہ ان کا سر فخر سے بلند ہو۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بڑی عزت کی زندگی گزاری۔ وہ اپنے اسٹائل کے منفرد اداکار تھے۔ انہوں نے ایک طویل دور فلم انڈسٹری میں گزارا۔ بھارتی فلم انڈسٹری پر راج کپور کے گھرانے کا بڑا احسان ہے جب تک بولی ووڈ قائم ہے ان کی آنے والی نسلیں اس چراغ کی روشنی میں اضافہ کرتی رہیں گی۔



نیل بہتا رہا

نشاط یاسمین خان

سفر وسیلہ ظفر ہے۔ سفر انسان کو تجربے کی دولت سے مالا مال [illegible] ہے اور کبھی کبھی دورانِ سفر ایسے واقعات کا سامنا بھی کرنا پڑ جاتا ہے جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہوتا ہے۔ حبیب [illegible] ایک معروف نام۔ ان کے واقعات نے کس طرح ایک دلچسپ [illegible] کی شکل اختیار کرلی۔

[illegible] کی ایک تلخ سچائی بطور داستان

[illegible] کے انتظار میں ہوٹل کی لابی میں آکر بیٹھ گیا۔ دونوں کی ملاقات کا وقت ساڑھے سات بجے طے ہوا تھا اور ابھی [illegible] بجے تھے۔ جہاز کے پہیوں نے دس بجے صبح قاہرہ کی زمین کو چھوا تھا۔ ہوٹل میں کمرا ایک تھا اس لیے اس نئے شہر میں اسے ہوٹل ڈھونڈنے کی بھی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ صبح سے وہ اپنے [illegible] میں آرام کررہا تھا اس لیے خود کو اتنا ہی تازہ دم محسوس کررہا تھا جیسا کہ وہ اپنے گھر میں ہو۔

حالانکہ اس کی منزل قاہرہ نہیں تھی۔ اسے آگے اسکندریہ جانا تھا جو اس کا اصل پڑاؤ تھا مگر قاہرہ آکر اہرام

مصر نہ دیکھنا کفرانِ نعمت تھا جب کہ وہ خود بھی تاریخ میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد آج کل انگلینڈ کی ایک یونیورسٹی سے منسلک تھا اور اپنے ایک مقالے پر کام کر رہا تھا۔

وہ بے زاری سے لابی میں رکھے صوفوں سے اٹھا اور ہوٹل میں رکھے مصری تہذیب و آثار کو دیکھنے لگا، اس کے لیے ان ممیوں اور تصویروں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بارہا دیکھ چکا تھا اس لیے دوبارہ صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ وقت تھا کہ گویا تھم چکا تھا۔ اس نے جیب سے لفافہ نکالا اور کئی بار کا لکھا خط پھر سے پڑھنے لگا۔ یہ خط اسے لندن کے پتے پر موصول ہوا تھا اور حبیب سعاد کی طرف سے تھا۔

حبیب سعاد اس وقت مصری تاریخ پر سب سے بڑی اتھارٹی سمجھا جاتا تھا۔ علی عبداللہ کے لیے تو اس کا خط لکھنا ہی اعزاز کی بات تھی مگر اس نے نہ صرف اسے اسکندریہ آکر اپنا کتب خانہ اور عجائب خانہ دیکھنے کی دعوت دی تھی بلکہ مقالہ لکھنے میں اس کی مدد کی درخواست بھی قبول کرلی تھی۔ خط پڑھ کر اس نے اپنی اندرونی جیب میں رکھ لیا اور کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر بیرونی دروازے کی سمت نظریں دوڑائیں۔

آٹھ بج رہے تھے اور وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اسے اندازہ تھا یہ لوگ نہ وعدے کے پابند ہوتے ہیں نہ وقت کے، ہوسکتا ہے اسے کوئی گروپ مل گیا ہو اور وہ ان سے معاملات طے کر رہا ہوگا۔ ایک اکیلے بندے سے اسے کیا ملنا تھا۔ حالانکہ اپنی چرب زبانی سے وہ اس سے بھی خاصی رقم اینٹھ لیتا۔

اسے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ڈنر اپنے کمرے میں کرے یا ڈائننگ ہال کے کسی پُرسکون گوشے میں بیٹھ کر گائیڈ کی وعدہ خلافی کا غم غلط کرے کہ ہال کے آخری سرے پر ہلکی ہلکی موسیقی اور ہلچل کا احساس ہوا۔

ابھی کچھ دیر پہلے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اب ریڈ کارپٹ بچھایا جاچکا تھا اور سازندوں کا گروپ موسیقی سیٹ کر رہا تھا۔ اس بوریت کے وقت میں اس سے بہتر مشغلہ کوئی ہو نہیں سکتا۔ وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا اور جاری سرگرمیوں کو دیکھنے میں مشغول ہوگیا۔

مصری دف اور موسیقی کی آواز پر رقاصوں کا گروپ نیم دائرے کی شکل میں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے رقص کا آغاز کرچکے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک لڑکا دائرے سے نکلتا اور سامنے کھڑی لڑکی کو رقص کی پیش کش کرتا۔ لڑکی بھی ان ہی کے گروپ کی ہوتی تھی۔ وہ دونوں تھوڑی دیر رقص کرتے اور پھر اپنی جگہ واپس چلے جاتے تھے۔ علی عبداللہ کے لیے یہ منظر خاصا دلکشی لیے ہوئے تھا۔ لابی میں موجود سیاح بھی اس رقص سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کچھ تو صرف تال دے رہے تھے اور کچھ تالیاں بجا رہے تھے اور کچھ ناچ بھی رہے تھے۔ اس سارے منظر سے گزر کر علی عبداللہ کی نظریں ایک لڑکی پر جا کر ٹک [illegible] میکسی پر سفید موتی لگا لباس پہن رکھا تھا۔ عام مصری لڑ[illegible] طرح نہ اس نے میک اپ کیا ہوا تھا نہ قلوپطرہ کی طرح [illegible] سے آنکھیں بنائی ہوئی تھیں۔ [illegible] سے منفرد بنا رہی تھی۔

یہی چیز اسے دیگر لڑکیوں [illegible] میں منظر بدل گیا اور دو[illegible] کارپٹ پر چلتے ہوئے ہال کی طرف جاتے نظر آئے۔ [illegible] لائٹ کے چمکنے [illegible] سارے منظر کو ہی دھندلا دیا اور تھوڑی [illegible] ہی دولہا دلہن [illegible] رقاصاؤں، موسیقی اور مہمانوں سمیت ہال کے اندر غائب ہوچکا تھا لیکن وہ ابھی بھی کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

یکدم کوئی اس سے پوری قوت سے آکر ٹکرا گیا تھا۔ علی عبداللہ جو بے دھیانی میں کھڑا تھا گرتے گرتے بچا تھا۔ کوئی شخص اس سے عربی اور انگریزی کے ملے جلے [illegible] میں معذرت کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی لڑکی سے مہمانوں کی لسٹ چیک کرنے کے لیے بھی کہہ رہا تھا۔ یقیناً اسے شادی میں آنے میں دیر ہوچکی تھی۔

"موسیٰ انوار آپ کا نام لسٹ میں موجود ہے۔" لڑکی نے کہا تو اس نے پہلے اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر دوبارہ علی عبداللہ سے معذرت کرنے لگا۔

علی عبداللہ کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اسے غیر ملکی سمجھتے ہوئے خاصی مشکل سے انگریزی بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے موسیٰ انوار سے مصر میں بولی جانے والی عربی میں کہا۔ "اتنی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ میں ہی بے دھیانی میں کھڑا تھا۔ مجھے کاؤنٹر چھوڑ کر کھڑا ہونا چاہیے تھا۔"

موسیٰ انوار نے ایک بار پھر اللہ کا شکر ادا کیا۔ "شکر الحمدللہ تم غیر ملکی نہیں ہو۔" اور ہاتھ ملانے کو بڑھا دیا۔

علی عبداللہ نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "میرا نام علی عبداللہ ہے اور میں پاکستانی ہوں۔"

موسیٰ نے ہاتھ کو تھام کر چوم لیا اور پھر تھوڑا پیچھے ہٹ کر آدھے قدرے جھکتے ہوئے بولا۔ "السلام علیکم برادر! مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی تم پاکستانی ہو اور ہماری زبان اسی روانی سے بول رہے ہو۔ ابھی میں بہت جلدی میں ہوں، اگر تم اس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہو تو پھر میں ایک گھنٹے میں فارغ ہو کر تم سے ملاقات کرسکتا ہوں۔"

علی عبداللہ کے لیے تو جیسے یہ غیبی امداد تھی۔ وہ گائیڈ کے نہ آنے کی وجہ سے خاصا پریشان بھی تھا اگر اسے قاہرہ میں رہنے والا کوئی شخص مل جائے جو اس کی رہنمائی کرسکے تو یہ بہت بہتر تھا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے مجھے بھی بہت بھوک لگ رہی ہے۔ میں بھی ڈنر سے ایک گھنٹے میں فارغ ہوجاؤں گا۔"

"ہاں ہم دونوں ایک گھنٹے بعد لابی میں مل رہے ہیں۔" موسیٰ انوار نے بے تکلفی سے کہا اور ہاتھ ہلاتا ہوا ہال کی طرف مڑ گیا۔

علی عبداللہ کے دل پر گائیڈ کے نہ آنے اور پروگرام چوپٹ ہوجانے کی وجہ سے جو بے زاری طاری تھی وہ موسیٰ انوار سے ملنے سے خاصی حد تک دور ہوچکی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ریسیپشن پر جا کر گائیڈ کے متعلق معلوم کیا۔ وہ نہیں آیا تھا۔ اب اسے یقین ہوگیا کہ وہ نہیں آئے گا۔ اسے [illegible] کوئی اور انتظام کرنا پڑے گا یا پھر جو ٹورسٹ بس ہوٹل کی طرف سے جائے گی اس میں سوار ہوکر ان کی مرضی کے مقامات [illegible] پڑے گا۔

لیکن ابھی اس نے [illegible] نہیں سوچا تھا سوائے ڈنر اور موسیٰ انوار سے ملاقات کرنے کے۔ اس نے ڈائننگ ہال میں جا کر پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور [illegible] لابی میں آکر بیٹھ گیا۔ لابی میں اس وقت خاصا رش تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے سیاحوں کے گروپ سارے دن کے تجربات ایک دوسرے سے شیئر کر رہے تھے۔ کچھ آنے والے دنوں کے پروگرام مرتب کر رہے تھے۔

یہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا۔ یہاں زیادہ تر آسودہ حال یورپی ٹورسٹ ہی آکر ٹھہرتے تھے جو اپنے ٹورسٹ کمپنیوں کے ذریعے پیکیج کروا کر آتے تھے۔ ان کے خوشی سے تمتماتے چہروں سے ان کی آسودہ حالی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی بھنبھناہٹوں اور چھوٹے چھوٹے قہقہوں کے شور سے لابی زندگی سے بھرپور دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے بھی خاصا عرصہ یورپ میں گزارا تھا۔ اس نے سفر بھی بہت کیے تھے مگر زیادہ تر اپنے تعلیمی سلسلے کی وجہ سے سیاحتی سفر تو نہ ہونے کے برابر تھے۔

لیکن پینتیس سالہ زندگی میں بہت لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک سے ایک طرہ دار خوب صورت دولت مند عورتیں، نوجوان خوب صورت لڑکیاں، اس کے قریب آئیں کچھ تو اس سے شادی کی خواہش مند بھی تھیں مگر وہ کسی سے متاثر نہ ہوسکا لیکن ابھی ابھی اس نے جو چہرہ دیکھا تھا اس نے اسے مسحور کردیا تھا۔ اس چہرے کی ایک جھلک نے ہی اس کے دل و دماغ کو منجمد کردیا تھا اسی لیے "وہ ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے" کے مصداق بیٹھنے کے لیے بھی اس نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں سے ہال کا دروازہ بالکل سامنے تھا۔ اسے امید تھی کہ جب شادی ختم ہوگی تو وہ بھی باہر آئے گی اور شاید اسے پھر اس کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جائے۔

ایک گھنٹے سے اوپر ہوچکا تھا۔ لوگ آہستہ آہستہ باہر آنا شروع ہوگئے تھے۔ ہال سے نکل کر وہ لوگ بیرونی دروازے کی جانب بڑھ جاتے تھے۔ تبھی وہ بھی ایک چھوٹے سے گروپ کے ساتھ آگئی۔ سیاہ میکسی پر سفید موتی جڑے ہوئے دور سے چمک رہے تھے۔

وہ اس چہرے کو ہزاروں میں پہچان سکتا تھا اسی لیے بے اختیاری میں وہ بھی صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی نظریں ان لوگوں پر ٹکی تھیں جو ہال کے باہر کھڑے تھے جیسے کسی کا انتظار ہو۔

تبھی اسے موسیٰ انوار نظر آیا جو ہال سے باہر آکر ان کے ساتھ کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی موسیٰ نے ہاتھ ہلایا اور تیزی سے چلتا ہوا اس کی طرف آگیا۔ ان تینوں لڑکیوں اور ایک لڑکے کا گروپ بھی اس کے ہم قدم تھا۔

کیا دعائیں اتنی جلدی قبول ہوتی ہیں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ موسیٰ انوار نے تعارف کروایا۔ "یہ حنا ہیں۔"

علی عبداللہ نے دل ہی دل میں اس کا نام دہرایا۔ باقی لڑکے لڑکیوں کے نام اس کے ذہن سے محو ہوچکے تھے۔ غور طلب بات یہ تھی کہ جب موسیٰ تعارف کروا رہا تھا تو حنا کا تعارف کرواتے ہوئے اس کا پورا نام لیتے ہوئے وہ ذرا سا جھجکا تھا۔ حنا نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ علی عبداللہ بھی منتظر تھا کہ وہ اس کا پورا نام لے لیکن موسیٰ انوار نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہم سب یونیورسٹی

میں ساتھ پڑھتے تھے اور یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد ابھی تک بے روزگار ہیں اور گزارے کے لیے چھوٹی موٹی نوکریاں کررہے ہیں لیکن ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا ہے مجھے چینل فور کو جوائن کیے ہوئے آج بھی مجھے اپنی ڈیوٹی ختم کرکے آتے ہوئے دیر ہوگئی تھی لیکن اب میں فارغ ہوں۔

دوسرے لڑکے نے خدا حافظ کہنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میری ابھی رات کو کال سینٹر میں ڈیوٹی ہے اور پھر مجھے ان لڑکیوں کو ان کے گھر پہنچانے کی ڈیوٹی بھی دینی ہے۔“

موسیٰ اور علی عبداللہ کافی شاپ میں آکر بیٹھ گئے۔

موسیٰ کی بھی عادات اپنے ہم وطنوں جیسی ہی تھیں جب تک وہ آخری حد تک جاکر اس کی مدد نہیں کردیتا اسے چین نہیں آتا اور مصری تو سیاحوں کی بہت مدد کرتے تھے کیونکہ انہیں اپنی تہذیب اور ثقافت پر بہت فخر ہوتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ سیاح اطمینان اور سکون سے ان کے ملک آئیں۔

اس نے کافی شاپ میں بیٹھتے ہی پوچھا کہ کیا وہ اس کی سیاحت کے سلسلے میں کچھ مدد کرسکتا ہے؟

جب علی عبداللہ نے اسے گائیڈ کے متعلق بتایا تو اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات آگئے پھر اس نے سیل فون سے ایک دو جگہ فون کیے۔ کچھ میسج بھی کیے۔ اس دوران اس کی کافی ٹھنڈی ہوتی رہی حالانکہ علی عبداللہ نے کئی بار اس کو متوجہ کرنے کی کوششیں بھی کیں مگر وہ کام میں لگا رہا۔

آخر اس نے تقریباً ٹھنڈی ہو جانے والی کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”برادر مجھے اپنے ہم وطنوں کی وعدہ خلافی پر افسوس ہوتا ہے مگر آج کل سیاحت کا موسم ہے کچھ گائیڈ زیادہ پیسوں کے لالچ میں ایسی حرکتیں کرجاتے ہیں۔“

اس دوران دونوں کا مکمل تعارف ہو چکا تھا۔ علی عبداللہ نے دوبارہ کافی کا آرڈر دے دیا تھا۔

موسیٰ ابھی بھی صرف یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ صرف سیاحت کے لیے مصر آیا ہے۔ تھوڑی دیر میں ہی اس کے جوابی فون آنا شروع ہوگئے پھر صبح کے لیے ایک گائیڈ اور ٹیکسی ڈرائیور سے معاملات طے پاگئے۔ موسیٰ نے چلتے وقت اس کو اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا اگر تمہیں کسی بھی وقت میری ضرورت پڑے تو میں حاضر ہوسکتا ہوں لیکن سیاحت میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتا کیونکہ اگلے دو دن اس کی

ڈیوٹی ہے، چلتے وقت علی نے بھی اس کا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ ملاقات کی یقین دہانی کروائی۔

ٹیکسی ڈرائیور اور گائیڈ دونوں ہی بہترین تھے۔ گائیڈ نے اس کی رہنمائی کا فریضہ بہت ایمانداری سے انجام دیا تھا۔ مصری اپنی قدیم ترین تہذیب پر ناز کرنے والی قوم ہے۔ انہیں اس بات کا بہت غرور ہے کہ وہ لوگ اس قدیم ترین تہذیب کے امین ہیں۔ قاہرہ میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کسی نہ کسی شکل میں تاریخ کے آثار موجود نہ ہوں … لے کر برتنوں، لباس سے لے کر فرنیچر تک میں یہ آثار … علی عبداللہ نے جو کچھ پڑھا تھا، دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا … یہ سب کچھ اس سے بڑھ کر پُراسرار اور قدیم ہے۔ شاید قدیم مصری تہذیب کو دیکھنے کے لیے یہ دن بہت کم تھے۔

وہ اپنے قاہرہ آنے کی … سعاد کو دے … تھا۔ اب اس کو جلد ہی … وہاں … تا کہ اس … ساتھ مل کر کام شروع کیا جائے۔ آج اس نے … ڈرائیور کو فارغ کردیا تھا۔ اس کا ارادہ … out کرنے کا تھا۔ اس کا سامان جس میں زیادہ … تھیں وہ اس نے رات پیک بھی نہیں کیا تھا۔ سوائے کپڑوں کے جو وہ ان دنوں استعمال کررہا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کرکے وہ لابی میں آکر بیٹھ گیا۔ یہاں آکر بیٹھنے کا مقصد صرف تھکن اتارنا تھا ورنہ یہاں ہونے والی ہلچل سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اسے کئی بار خیال آیا کہ وہ موسیٰ کو فون کرے پھر ارادہ ملتوی کردیا یکدم اس کی نظر موسیٰ پر پڑی۔ وہ ریسپشن پر موجود تھا۔ شاید اسی کے متعلق پوچھ رہا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں موجود ہیں کہ نہیں۔ ریسپشنسٹ کمپیوٹر پر معلومات تلاش کررہی تھی کہ علی نے پیچھے سے جاکر موسیٰ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس دوران موسیٰ نے پلٹ کر اسے گلے سے لگا لیا پھر روایتی انداز میں ہاتھ تھام کر چومتے ہوئے کہا۔ ”برادر عبداللہ! میں تم سے ملاقات پر بہت خوش ہوں۔“

”موسیٰ میرے بھائی میں بھی بہت خوش ہوں آؤ کافی شاپ میں چل کر ٹرکش کافی پیتے ہیں۔“ علی نے محبت سے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”نہیں برادر علی عبداللہ، ٹرکش کافی بہت مہنگی ہے اور میری جیب اس بات کی اجازت نہیں دیتی“

نے گھبرائے ہوئے انداز میں جیب پر ہاتھ رکھا۔

”لیکن میری جیب اجازت دیتی ہے۔“ علی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کافی شاپ کی طرف لے جانا چاہا۔

”بے شک بے شک برادر مگر آج میں میزبان ہوں۔ جتنی قیمت ایک کافی کی ہوگی اس میں ہم رات کا ڈنر کرلیں گے وہ بھی ایسی جگہ جہاں جاکر تمہاری طبیعت شاد ہو جائے گی۔“

موسیٰ نہایت خوش مزاج تھا اور بہت اچھا میزبان بھی تھا۔ ایسے شخص کو انکار کرنا ممکن نہ تھا۔

وہ دونوں ہوٹل سے باہر آگئے۔ موسیٰ نے پارکنگ کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ ”برادر کیا تم میری مرسڈیز میں سفر کرنا پسند کرو گے؟“

علی نے اس کے ہی انداز میں جواب دیا۔ ”بے شک بے شک تو آجاؤ میرے بھائی۔“ اس نے اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ علی کے لیے یہ بھی ایک نیا تجربہ تھا۔

موسیٰ نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور پھر وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اس وقت وہ ہیلمٹ کی پابندی سے آزاد تھا۔ رات بھی کافی گزر چکی تھی مگر قاہرہ جاگ رہا تھا۔ ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ ایک دو چھوٹی سڑکوں پر تو موسیٰ نے رکنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔

موسم بھی … اچھا جیسا تھا سارا دن آگ برساتا سورج شام کو ٹھنڈی … ہیں۔ وہ اسکوٹر پر بہت انجوائے کررہا تھا۔ موسیٰ نے موٹر سائیکل ایک اسٹینڈ پر پارک کردی۔ پانی کی خوشبو اور ٹھنڈی ہوا سے اندازہ ہورہا تھا کہ نیل بہت قریب بہہ رہا ہے۔ وہ … پلے فرش پر چلتے ہوئے ایک ایسی جگہ آگئے جہاں پتھر کی سیڑھیاں اوپر کی جانب جارہی تھیں۔ علی عبداللہ نے نظر … سڑک بغیر مڑے دور تک جارہی تھی جس کے کنارے … کے دو رویہ درخت تھے جن کے درمیان برقی لیمپ رات میں بھی دن کا سماں پیش کررہے تھے۔

وہ دو دنوں سے قدیم مصری آثار کی کھوج میں تھا تو رات کو نیل کے اسرار میں گم ہو چکا تھا۔ وہ کسی طلسم کے زیر اثر موسیٰ کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتا پلیٹ فارم تک پہنچ چکا تھا۔ علی نے جیسے ہی پلیٹ فارم پر قدم رکھا تاحد نظر نیل کا پھیلا ہوا دریا تھا۔ ان دو دنوں میں وہ کئی بار نیل پر بنے پلوں سے گزرا تھا مگر نیل کا اتنا چوڑا پاٹ جیسے دریا نہ ہو کوئی سمندر ہو۔

یہ پلیٹ فارم بھی دریا کے کنارے دور تک چلا گیا تھا۔

جہاں لائن میں کافی شاپ اور ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے۔ پورے پلیٹ فارم پر رنگین کرسیاں اور میز لگے ہوئے تھے جن پر زیادہ تر یورپی سیاح براجمان تھے۔ کچھ ریلنگ سے ٹیک لگائے دریا کے نظارے میں محو تھے۔ گہرے نیلے دریا کے اوپر صاف شفاف آسمان جس پر لاتعداد ستارے چمک رہے تھے، دریا کے کنارے دور تک پھیلی ہوئی بلڈنگوں اور ہوٹلوں کا جھلملاتا ہوا عکس کسی فیری بوٹ یا اسٹیمر کی وجہ سے ٹوٹ جاتا پھر دوبارہ جڑ کر جھلملانے لگتا تھا۔ ایسا طلسماتی نظارہ تھا کہ عبداللہ کھو کر رہ گیا۔ وہ ریلنگ پر جھکا محو حیرت تھا جس طرح لاتعداد سیاح ریلنگ سے دریا کے نظارے میں گم تھے۔ موسیٰ نے اس کا بازو ہلاتے ہوئے کہا۔ ”برادر عبداللہ اور آگے چلتے ہیں۔ ادھر بہت رش ہے۔“

وہ کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ ہولیا آگے دور تک صرف یہی نظارہ تھا۔

فیری بوٹ کے پلیٹ فارم پر بھی اتنا ہی رش تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ موسیٰ نے کہا۔ ”برادر ٹکٹ ملنے میں کافی دیر ہوجائے گی کیا خیال ہے؟“

”ہاں میرا خیال ہے پھر کبھی سہی، میں ادھر ہی انجوائے کررہا ہوں۔“ عبداللہ نے دریا کے وسیع پانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جہاں سے ایک بادبانی کشتی مسافروں سے لدی پھندی گزر رہی تھی۔

سامنے ہی ایک میوزیکل گروپ دف اور دوسرے مشرقی ساز بجارہا تھا اور کچھ لڑکے گانا گارہے تھے۔

میں نے دیکھا سیاہ آنکھوں والا ایک فرشتہ
میرے ساتھ دریا کے پانیوں پر تیرتا ہوا

عبداللہ نے دریا کے پانی پر نظریں گاڑ دیں، جیسے وہاں اس فرشتے کے نقوش اُبھر رہے ہوں۔ یہ عشق تھا یا کچھ اور کہ ذہن سے اس چہرے کا نقش اتر ہی نہیں رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر یہ سوال آکر ٹھہر گیا کہ وہ موسیٰ سے پوچھ ہی لیتا کہ آخر وہ کون تھی وہ اسے جانی پہچانی سی کیوں لگ رہی تھی۔

مگر اس کا اپنا ذہن یہ جواب دینے سے قاصر تھا کہ اس نے حنا کو پہلی بار کہاں دیکھا تھا لیکن اس نے خواب میں تو نہیں دیکھا شاید ایسا ہو، ہو بھی سکتا ہے۔

موسیٰ کہہ رہا تھا۔ "برادر میرا ارادہ تھا کہ آج تم کو ساتھ لے کر اس بادبانی کشتی کی سیر کرتے اور وہاں تک جاتے جہاں یہ عظیم نیل بحیرہ روم کی گود میں سما جاتا ہے۔ جہاں سکندر اعظم نے مصر کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اور اسکندریہ آباد کیا تھا۔ یہ شہر مصری اور یونانی تہذیب کا حسین امتزاج ہے جس کے ایک طرف بحر قلزم کے حسین ساحل ہیں تو دوسری طرف بحیرۂ روم کا کنارہ۔"

"اور میں کل اسکندریہ جا رہا ہوں۔ وہیں میرے استاد رہتے ہیں۔" عبداللہ نے بتایا تو موسیٰ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"برادر تم نے پہلے نہیں بتایا کہ تمہیں اسکندریہ جانا ہے۔ میں تمہیں اور معلومات فراہم کر دیتا۔" موسیٰ کو قریب ہی ایک میز نظر آ گئی تو وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

عبداللہ نے اسے بتایا۔ "میری بکنگ ہوٹل میں ہو چکی ہے اور استاد سے ملاقات بھی طے ہو چکی ہے۔ میں تقریباً دو مہینے تو اُدھر رہوں گا، کچھ ریسرچ کا کام ہے۔" عبداللہ اسے کام کے متعلق بتا رہا تھا اور موسیٰ کافی متاثر نظر آ رہا تھا۔ بہت خوب صورت وقت گزارنے کے بعد دونوں نے رابطے میں رہنے کا وعدہ کیا اور رات گئے موسیٰ اسے ہوٹل چھوڑ گیا۔

ہوٹل کے کمرے میں داخل ہی ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، اس نے لپک کر فون اٹھایا۔ جاتے وقت وہ اپنا موبائل کمرے میں ہی بھول گیا تھا اسکرین پر مسٹر احسن عبداللہ کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے اماں نے یہ ڈیوٹی اب بابا کے سپرد کر دی ہے۔ یقیناً کافی دیر سے فون کر رہی ہوں گی۔

"جی بابا، سوری میں باہر تھا اور حسبِ عادت فون کمرے میں بھول گیا تھا۔" اسی میں عافیت تھی کہ جلدی اپنی غلطی مان لی جائے۔

"تمہاری ماں بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہیں۔ کتنی دیر سے فون کر رہی تھیں۔ اب تھک کر مجھے فون کرنے کا کہہ دیا تھا اور حیرت کی بات ہے کہ میں نے پہلی بار فون کیا اور تم نے اٹھا لیا، چلو پھر ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے اماں سے بات کر لو۔" احسن عبداللہ نے فون اپنی بیگم زینب عبداللہ کو پکڑا دیا۔

علی عبداللہ کو معلوم تھا ابھی آدھ گھنٹے تک اماں کی محبت بھری ڈانٹ، شکایتیں سننی پڑیں گی۔ اتنی دیر بابا سامنے بیٹھے خاموشی سے ساری باتیں سنتے ہوئے مسکراتے رہیں گے۔

آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے مطلب کے موضوع یعنی علی کی شادی اور لڑکیوں پر آ جائیں گی۔ ایک سے ایک امیر اور حسین لڑکی کی شان میں قصیدے سننے کو ملیں گے پھر نصیحتوں کا سلسلہ شروع ہوگا جس میں لیزا کا ذکر بار بار آئے گا اور آئندہ کے لیے غیر ملکی عورتوں سے دور رہنے کے مشورے دیئے جائیں گے اور کرید کرید کر پوچھا جائے گا کہ کہیں تمہارے ساتھ لندن سے کوئی گوری میم تو نہیں آئی ہے۔

[illegible] زینب عبداللہ یہاں پہنچ گئیں اور علی نے سوائے ہاں ہوں [illegible] نہیں بولا تو بابا نے یہ کہہ کر فون لے لیا کہ "اب آپ [illegible] کے لیے دعائیں کیجیے مجھے بھی اس سے بات کرنی ہے۔"

"ہاں بیٹا! تم کافی تھک گئے ہو گے اب کچھ دیر آرام کرو، خدا حافظ۔" احسن عبداللہ [illegible] اندازہ تھا کہ علی اتنی لمبی بات چیت کے بعد تھک گیا ہوگا [illegible] اب سونے کا وقت تھا مگر ماں اور باپ کی محبت [illegible] ہوتے ہیں حالانکہ دونوں ہی علی سے بے تحاشا محبت کرتے [illegible] ماں باپ سے بات چیت کرنے کے بعد علی خاصا فریش ہو چکا تھا۔

اسکندریہ جانے کے لیے علی عبداللہ نے اسی ٹیکسی والے کو کہہ دیا تھا جو اسے قاہرہ کی سیاحت کروا کر لایا تھا۔ بڑا معقول سا شخص تھا۔ انگریزی بڑی روانی سے بولتا تھا اور عام مصریوں کی طرح باتونی اور خوش مزاج تھا۔

حالانکہ قاہرہ سے اسکندریہ کا فاصلہ صرف ایک سو چالیس میل تھا مگر اسکندریہ کی تہذیب میں روم کی تہذیب کے آثار زیادہ تھے۔ لوگ بھی خاصے ماڈرن تھے۔ اس شہر میں رومن تہذیب کے آثار زیادہ ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ 334 B.C میں جب سکندر نے اسے فتح کر کے آباد کیا تو اسے مصر کا دارالحکومت قرار دیا تھا۔ بعد میں مسلمانوں نے 648 A.D میں دوبارہ آباد کیا تھا تو اسکندریہ کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا۔ راستے میں مصری تہذیب کے آثار بکھرے ہوئے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور جب بھی کسی موٹل پر اپنی ٹیکسی روکتا تو وہ اسے اس علاقے کے متعلق تھوڑی بہت معلومات ضرور دیتا جو علی عبداللہ اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا جاتا تھا۔ اسکندریہ پہنچنے سے پہلے ہی وہ اس علاقے کے متعلق بہت کچھ جان چکا تھا جو اس کے آئندہ کے مقالے میں آنے والی معلومات کے لیے بھی بہت کارآمد تھے۔

وہ رات کے وقت ہوٹل پہنچے تھے۔ علی عبداللہ خاصا

تھکا ہوا تھا اسی لیے سونا چاہتا تھا۔ اپنے کپڑے اور جوتے روم سروس کے حوالے کرنے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گیا۔ جب صبح آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے اور دروازے پر ہلکی سی دستک سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

"اوہو!" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے بستر سے چھلانگ لگائی۔ روم سروس سے اس کے کپڑے استری ہو کر آئے تھے۔ ناشتے کا کہہ کر وہ واش روم چلا گیا۔ اب اسے صرف یہ گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ نہ جانے وہ دس بجے تک حبیب سعاد کے دفتر پہنچ سکے گا یا نہیں لیکن جب تک ناشتا آیا وہ تیار ہو چکا تھا۔

گرم گرم کافی پی کر وہ خاصا فریش ہو چکا تھا۔

حبیب سعاد کا دفتر اسکندرہ کے پوش ترین علاقے میں تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے پندرہ منٹ میں اسے وہاں پہنچا دیا۔ قاہرہ کے مقابلے میں یہ شہر خاصا مہنگا تھا۔ اسے ٹیکسی کے کرائے سے اندازہ ہو رہا تھا۔ بحرہ قلزم اور بحرہ روم کے ساحلوں کے کنارے آباد یہ شہر سیاحوں کی جنت کہلاتا تھا۔ اسے صاف ستھری سڑکوں اور ٹریفک دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ سیاح یہاں آ کر بہت لطف اندوز ہوتے ہوں گے۔

جس وقت وہ ٹیکسی سے اتر کر حبیب سعاد کے گھر کی [illegible] جا رہا تھا اس وقت دس بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ گیٹ [illegible] اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ وسیع لان میں جابجا پھیلے ہوئے پھولوں کے [illegible] تختے نمایاں تھے۔ دیواروں پر جابجا رنگین پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں، سامنے ہی بے حد چوڑی سیڑھیاں تھیں [illegible] سے ایک مراکشی اپنے مخصوص لباس اور سرخ ٹوپی پہنے [illegible] نظر آیا۔ گیٹ پر کوئی چوکیدار نہ تھا۔ شاید گھنٹی بھی اندر [illegible] بجتی تھی اور یہ مراکشی گھنٹی کی آواز سن کر ہی آیا تھا۔

مراکش فرانس کی نو آبادی رہا تھا [illegible] مراکشی انگریزی سے نابلد تھا۔ اس نے گیٹ کی چھوٹی [illegible] کھول کر اس کا نام پوچھا۔

"موسیو" علی عبداللہ۔ اس نے نام سنتے ہی گیٹ کھول دیا اور سلام کرنے کے بعد احتراماً کئی بار جھکا اور اندر آتے ہی گیٹ بند کرنے کے بعد دو قدم پیچھے ہٹ کر سیڑھیوں کی طرف چلنے کا اشارہ اور اس کے پیچھے چلنے لگا۔ یقیناً اسے علی عبداللہ کی آمد کا پہلے سے علم تھا۔

باہر سے تو اندازہ نہیں ہو رہا تھا مگر اندر آ کر لگا کہ کسی عظیم ولا میں آ گیا ہے جو فرانسیسی، اٹالین طرز تعمیر پر بنایا گیا تھا۔ سامنے دبیز سبزے سے ڈھکا لان تھا جہاں پھولوں کے تختے بہار دکھا رہے تھے۔ ایک طرف نیلے رنگ کا سوئمنگ پول تھا جو پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا اور صبح سویرے کی سنہری کرنوں سے جگمگا رہا تھا۔ علی عبداللہ سفید سنگ مرمر کے فرش پر چلتا ہوا عمارت تک آ گیا، جہاں سے سوئمنگ پول صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں بھی ایک مراکشی کام کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے جھک کر السلام علیکم کہا اور اپنے کام میں معروف ہو گیا۔ اس کے ساتھ آنے والے شخص نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا جس پر Office لکھا ہوا تھا اور خود پیچھے ہٹ کر علی عبداللہ کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

علی عبداللہ اس وقت ایک وسیع کمرے میں موجود تھا جس میں دروازے کے سامنے والی آفس ٹیبل خالی تھی۔ وہ روشنی سے کمرے میں آیا تھا اس لیے کچھ لمحے بعد اس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اسے اپنے سامنے حبیب سعاد کھڑا نظر آیا جو ابھی صوفے سے اٹھ کر اس کے استقبال کے لیے آیا تھا۔ اپنی قابل رشک صحت کی وجہ سے وہ بوڑھا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اس سے بے انتہا گرم جوشی سے ملا اور اس کے سفر کے مطابق پوچھتا رہا لیکن علی عبداللہ کے لیے جو چیز چونکا دینے والی تھی وہ اس کا چہرہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے یہ چہرہ کہاں دیکھا ہے لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا تھا۔

دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک پر وہ چونک گیا، وہی مراکشی تھا جو اسے اندر لے کر آیا تھا اب وہ ان کے لیے کافی لایا تھا۔ حبیب سعاد کہہ رہا تھا میں اپنی ریسرچ کے زمانے میں کافی عرصے مراکش رہا ہوں پھر میں اپنے مراکشی ملازم اپنے ساتھ لے آیا۔ یہ بہت پیار دینے والے لوگ ہیں۔ اب یہ مجھے چھوڑ کر جانے والے نہیں ہیں بلکہ وقت پڑنے پر جان دینے والے ہیں۔

کافی دینے کے بعد وہ رکا نہیں بلکہ تیزی سے واپس چلا گیا تاکہ آقا کی بات چیت میں خلل نہ ہو۔

حبیب سعاد نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم چاہو تو میری لائبریری کے ساتھ ہی مہمان خانہ ہے تم وہاں منتقل ہو سکتے ہو۔ ہوٹل تمہیں خاصا مہنگا پڑے گا۔"

علی عبداللہ کے لیے یہ آپشن قابل قبول نہ تھا۔ ابھی وہ حبیب سعاد کو اچھی طرح نہیں جانتا تھا مگر حبیب سعاد کے پاس کیونکہ دنیا بھر سے اسٹوڈنٹ آتے رہتے تھے، اس لیے یہ معمول کی بات تھی اگلے دن کی نشست کا وقت طے کرنے

کے بعد وہ واپس آ گیا مگر حبیب سعاد کا چہرہ اس کی نظر میں کافی دیر تک محفوظ رہا تھا۔

دوسرے دن کا شیڈول دس بجے سے شروع ہوا۔ حبیب سعاد نے اس کا اہتمام اپنی لائبریری میں کیا تھا، ایک میز پر وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور میز پر کتابوں کا ڈھیر تھا اور دونوں نے اپنے لیپ ٹاپ بھی ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

کام کے آغاز سے پہلے حبیب سعاد نے اسے بتایا کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں کئی بار پاکستان بھی جا چکا ہے۔ اس نے قدیم مصریوں اور موہنجوداڑو کے درمیان تجارتی روابط پر بھی ریسرچ کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ماضی میں ان کے درمیان تجارتی روابط موجود تھے۔ حبیب سعاد کو تاریخ، جغرافیہ اور تاریخ عالم کے علوم پر خاصی دسترس تھی اور پاکستان تو اسے مسلم ورلڈ کا ایک اہم ملک ہونے کے ناطے خاصا عزیز تھا۔ اس تمام دورانیے میں وہ اسے بیٹا کہہ کر مخاطب کرتا رہا تھا۔

اس دوران کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ آج حبیب سعاد نے اسے کھانے پر روک لیا تھا۔ وہ کل بھی دوپہر کے کھانے تک موجود رہا تھا تو کل اس نے اسے کیوں نہیں روکا لیکن فوری طور پر اس کو جواب بھی مل گیا۔

”تم سوچ رہے ہوگے کہ کل میں نے تم کو کھانے پر کیوں نہیں روکا تو میرے بیٹے میں مجبور تھا، وہ گھر میں موجود تھی اور ہر کھانے پر ہمارا جھگڑا ہونا ضروری تھا۔ اسے یہ لحاظ بھی نہیں ہوتا ہے کہ گھر میں کوئی اجنبی موجود ہے مگر آج وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکنک پر گئی ہوئی ہے۔ خدا کا شکر ہے آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ڈائننگ ہال تک لے آیا۔ وسیع ہال میں قیمتی آبنوسی میز کے گرد بارہ کرسیاں لگی تھیں۔ میز پر کھانے کے ڈھکے ہوئے قیمتی تھال سجے تھے لیکن لنچ ٹیبل صرف دو لوگوں کے لیے لگائی گئی تھی۔

کھانا بہت لذیز تھا۔ اتنے دنوں تک ہوٹل کے بد مزہ کھانے کھانے کے بعد یہ لنچ لطف دے رہا تھا۔ پورے گھر میں پھیلے ہوئے سناٹے سے احساس ہو رہا تھا حبیب سعاد کی فیملی کے لوگ گھر میں موجود نہیں ہیں۔ صرف وہی دو مراکشی نوکر تھے جو ننگے پاؤں سنگ مرمر کے فرش پر بے آواز قدموں سے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔

کھانے کے دوران ہی حبیب سعاد نے بتایا کہ وہ حکومت کا لائسنس یافتہ انڈینٹر بھی ہے آج کچھ جاپانی خریداری کے لیے آ رہے ہیں اگر ہمارے درمیان ڈیل ہو گئی تو جو رقم مجھے حاصل ہوگی وہ زرتاش کو دے دوں گا تاکہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ یورپ کے ٹرپ پر چلی جائے اور میں سکون کے چند دن تمہارے ساتھ کام کر کے گزار دوں۔ اگر تم چاہو تو رک سکتے ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن علی عبداللہ کو ڈیل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے کچھ لیٹر اپنی یونیورسٹی [illegible] نے تھے۔ آج کے کام کو کمپیوٹر پر منتقل کرنا تھا۔ یہ کام وہ [illegible] گاڑی میں بیٹھ کر آرام سے کر سکتا تھا۔ صبح سے وہ کام کر [illegible] تھک جاتا تھا اب وہ آرام بھی کرنا چاہتا تھا اس لیے کھانے کے بعد حبیب سعاد سے اجازت لے کر ہوٹل آ گیا۔

ٹیکسی اسٹینڈ حبیب سعاد کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر تھا اکثر وہ اپنا لیپ ٹاپ اٹھا کر پیدل [illegible] تک آ جاتا تھا۔ راستہ ڈھلوانی تھا اور سیدھی سڑک دور [illegible] میں گھری ہوئی تھی۔ اکثر سورج تیز تمازت کے باوجود [illegible] ہوتا تھا۔ سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی جو گاڑیاں بھی گزرتی تھیں وہ بہت پرتعیش اور شاندار ہوتی تھیں۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ اس نے اتنی شاندار گاڑیاں تو انگلینڈ میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ انگلینڈ میں زیادہ تر میٹرو یا بس میں سفر کرتا تھا اگر شہر سے باہر جاتا تو ریل یا پھر بس میں جاتا تھا۔ البتہ اپنے ملک میں وہ گاڑی استعمال کرتا تھا مگر اتنی لگژری گاڑیاں اس نے کبھی استعمال نہیں کی تھیں۔ حبیب سعاد کے پورچ میں اس نے ایک بی ایم ڈبلیو کنورٹیبل کھڑی دیکھی تھی۔ باقی دو گاڑیاں عام سی تھیں۔ کنورٹیبل کبھی موجود ہوتی کبھی نہیں ہوتی تھی مگر اس نے کبھی کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔

دوسرے ہی دن حبیب سعاد نے اسے بتایا کہ جاپانیوں سے ڈیل فائنل ہو گئی ہے اور اگلے ہفتے تک رقم بینک میں منتقل ہو جائے گی کیونکہ آج کل زرتاش کا دماغ بہت خراب رہتا ہے تو یہ رقم اس کے دماغ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی ہوگی اور اس کو زرتاش کی بد دماغی کو کچھ دن سہنے پڑیں گے۔ وہ اکثر باتوں باتوں میں زرتاش اور رقم کا ذکر کرتا رہتا تھا جس سے علی عبداللہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ زرتاش اس کی دوسری بیوی ہے جو بے انتہا شاہ خرچ ہے گھومنے پھرنے اور پارٹیوں کی شوقین ہے۔ قیمتی زیورات اور جواہر اس کی کمزوری ہیں، اور اس کا اٹھنا بیٹھنا شہر کی اعلیٰ

سوسائٹی میں تھا لیکن آج تک اس کا سامنا زرتاش سے نہیں ہوا تھا۔ حبیب سعاد نے اسے بتایا تھا کہ ان کی شادی کو تقریباً دس برس ہونے کو آئے تھے اس طرح اندازاً وہ چالیس پینتالیس سال کی عورت ہوگی لیکن علی عبداللہ کو اس کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی کیونکہ اس کے معاملات بھی اس طرح الجھے ہوئے تھے کہ سلجھائے نہیں سلجھ رہے تھے۔

اس نے اپنا پندرہ دن کا ابتدائی کام مکمل کر لیا تھا۔ وہ آج اپنے والدین سے بات کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ جلدی حبیب سعاد کے یہاں سے اٹھ کر آ گیا تھا۔ ابھی وہ گیٹ کراس کر کے تھوڑا فاصلہ ہی طے کر پایا تھا کہ وہی کنورٹیبل بی ایم ڈبلیو تیز رفتاری سے اس کے پاس سے گزر کر چلی گئی جس کو ایک عورت چلا رہی تھی اس نے اپنے سنہری بالوں کو اسکارف سے باندھا ہوا تھا اور آنکھوں پر گہرا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ علی عبداللہ کو اندازہ ہو گیا کہ یہی زرتاش ہے۔ حبیب سعاد کی بیگم صاحبہ مگر گاڑی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ نہ تو شکل دیکھ سکا نہ عمر کا اندازہ لگا پایا۔

ہوٹل پہنچ کر اس نے شاور لیا، نماز پڑھی اور پھر روم سروس کو لنچ کا کہنے کے بعد احسن عبداللہ کو فون ملایا۔ دو چار ابتدائی باتوں کے بعد احسن عبداللہ نے کہا کہ بیٹے تمہاری امی تو سو رہی ہیں اگر تم کہتے ہو تو اٹھا دیتا ہوں۔

”نہیں بابا رہنے دیں۔ مجھے آج آپ سے بات کرنی ہے۔ بتائیے کہ آپ پھپھو کی طرف گئے ان لوگوں کے کیا حال ہیں؟“

”ہاں گیا تھا بیٹا۔ بھائی صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ان کا بلڈ پریشر بہت ہائی تھا۔ پھپھو ٹھیک ہیں۔ مہر نے پھر ایک اور بہترین رشتے سے انکار کر دیا ہے۔ تمہاری پھپھو کو اس رشتے سے انکار کا بہت دکھ ہے وہ کہہ رہی تھیں میری اور بھائی کی رسہ کشی میں میری بچی کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ تم بھی چار سال ہو گئے پاکستان نہیں آئے ہو۔ آخر کیا بنے گا تم دونوں کا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک خوشخبری بھی ہے۔ مہر کو ایم بی اے کے بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب مل گئی ہے۔ بھائی صاحب کی ریٹائرمنٹ کے بعد صرف پنشن میں گزارا کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ میری بہن ضدی بھی تو بہت ہے۔ میرا یا تمہارا کوئی احسان لینے پر تیار ہی نہیں ہوتی، بیٹی بھی اس پر گئی ہے۔“

”بابا پھپھو اور مہر ضدی نہیں ہیں وہ بہت خوددار ہیں انہیں اندازہ ہے کہ اگر اماں کو معلوم ہو گیا کہ آپ سے انہوں نے کچھ مدد لی ہے تو وہ انہیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہنے دیں گی۔“

”ہاں بیٹا میں تمہاری ماں کو اچھی طرح جانتا ہوں، وہ تمہاری پھپھو کے ہاں جانے کی بجائے اس بات پر تیار ہو گئی تھیں کہ بے شک تم لیزا کو مسلمان کر کے شادی کر لو۔“

”بابا مجھے معلوم تھا کہ ویٹیکن سٹی جا کر پوپ کا دیدار کر کے زار زار رونے والی لیزا مسلمان کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ تو میں نے اماں کو راضی کرنے کے لیے لیزا کے متعلق بتایا تھا ورنہ مجھے معلوم تھا۔ لیزا جیسی عورتوں کے لیے محبت نام کی کسی شے کا وجود نہیں ہے۔“

”مگر یہاں تو تمہاری اماں نے عقلمندی کی تھی جو تمہاری جان لیزا سے چھوٹ گئی۔“

”لیکن بابا میں مہر کے علاوہ کسی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے بیٹا وہ بھی تمہارے علاوہ کسی کے متعلق نہیں سوچ سکتی۔ وہ کافی دنوں سے نوکری کی تلاش میں تھی۔ اب اسے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب مل گئی ہے کہہ رہی تھی کہ ماموں جان وہ بہت اچھی تنخواہ دے رہے ہیں اور ساتھ مراعات بھی ہیں۔ میڈیکل فری ہے تو ان کا علاج بھی ہو جائے گا۔ بیٹے مجھے تو بہت اطمینان ہوا ہے تم بھی بے فکر ہو جاؤ۔“

”جی بابا!“ علی عبداللہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر فون بند کر دیا۔

زرتاش نے اسکارف کھول کر صوفے پر ڈال دیا اور اپنے پیروں کو جوتوں سے آزاد کرتے ہوئے اس نے ماں کو آواز دی۔

”ماں مجھے موبائل دینا یحییٰ ابھی تک کیوں نہیں آیا؟“

ماں اسے موبائل پکڑاتے ہوئے بڑبڑائی۔ ”ابھی پچھلے ہفتے تو وہ آیا تھا، تم بہت جلدی اس سے ملنے لگی ہو زرتاش یہ سب صحیح نہیں ہے۔ یحییٰ سے شادی نہ کرنا اور حبیب سعاد سے بیاہ رچا لینا تمہارا فیصلہ تھا۔ بے چاری مریم اور اس کی بیٹی تمہاری وجہ سے گھر سے بے گھر ہو گئیں۔“

زرتاش جھنجلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تم زیادہ ہی بولنے لگی ہو ماں۔ تمہیں معلوم ہے مجھے زیادہ بحث و مباحثہ پسند نہیں ہے۔“

ماں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”میں تمہاری ماں ہوں نوکرانی نہیں ہوں جو تم مجھ پر حکم چلا رہی ہو۔“

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے کیوں حبیب سعاد سے شادی کی تھی۔ مجھے ایک شاندار زندگی گزارنے کے لیے دولت کی ضرورت تھی جو یحییٰ کے پاس نہیں تھی۔ یحییٰ میری محبت ہے اور میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی مگر صرف محبت سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔ تم کو معلوم ہے کہ کس کسمپرسی کی زندگی ہم گزار چکے ہیں، زرتاش ماں کی بات سن کر جھنجلا گئی۔

”مگر یہ گناہ کی زندگی جو تم یحییٰ کے ساتھ گزار رہی ہو۔ وہ بھی صحیح نہیں ہے، دیکھو زرتاش وہ تم سے محبت نہیں کرتا ہے۔ اسے تمہاری دولت سے محبت ہے جو تم اس پر لٹا رہی ہو۔ اگر اس کو تم سے محبت ہوتی تو جب تمہاری شادی حبیب سے ہوئی تھی تو شور مچا دیتا، ہنگامہ کرتا مگر اس نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔“

”ہاں اس نے ہنگامہ نہیں کیا شور نہیں مچایا کیونکہ میں نے اسے سمجھایا تھا کہ حبیب سعاد سے شادی ہم دونوں کی ضرورت ہے۔ کچھ عرصہ بعد میں اس سے طلاق لے کر یحییٰ سے شادی کرلوں گی۔ طلاق کی صورت میں مجھے ایک بڑی رقم مل جائے گی پھر میں اور یحییٰ شادی کرلیں گے مگر افسوس حبیب سعاد اتنے لڑائی جھگڑوں کے باوجود مجھے طلاق دینے پر تیار نہیں ہے۔ وہ اس لیے طلاق نہیں دے رہا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے بلکہ اس لیے طلاق نہیں دے رہا کہ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ شدید نفرت جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“

”تم اسی قابل ہو زرتاش، تم نے اس کا بھرا پُرا گھر تباہ کیا ہے مگر میں نے تو کبھی اس کو تم سے اونچی آواز میں بات کرتے بھی نہیں سنا ہے۔ تم اس کی دولت لٹاتی ہو، وہ کچھ بھی نہیں کہتا ہے۔“ ماں نے حبیب کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

”یہی تو اس کی نفرت کی انتہا ہے، اب جاؤ مجھے تنگ مت کرو۔“ اس نے ہذیانی انداز میں چلاتے ہوئے کہا۔

”تم پاگل ہو چکی ہو زرتاش۔“ ماں نے فون اس کی طرف اچھالتے ہوئے کہا اور خود کچن میں چلی گئی۔

اس نے یحییٰ سے فون پر بات کی تو اس نے دس پندرہ منٹ میں پہنچنے کا کہا۔

”سنو اے بوڑھی عورت! ادھر آؤ، اب کچن کا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے تمہارے لذیذ پکوانوں کی ضرورت نہیں ہے۔“

ماں نے غصے سے کچن سے باہر آکر پوچھا۔ ”ہاں بولو کیا بات ہے؟“

زرتاش نے پرس میں سے کچھ نوٹ نکال کر ماں کو دیتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ کچھ دیر کے لیے اپنی شکل گم کرلو، وہ آنے والا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ جب وہ آئے تو تم اس کو [illegible] بری شکلیں بناؤ اور اس کو باتیں سناؤ۔“

”[illegible] مجھے تمہاری رقم نہیں چاہیے میں تو خود اس کی شکل دیکھنا [illegible] اور تمہاری بھی شکل دیکھ کر مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ میں تمہاری دی ہوئی رقم کے بغیر بھی اپنی کسی سہیلی کے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پی سکتی ہوں۔“

”تمہاری مرضی ہے۔“ اور [illegible] بیگ میں رکھ لی۔

ماں نے کمرے میں جا کر کپڑے بدلے اور اسکارف پہن کر اپنا پرس اٹھا کر باہر جاتے ہوئے کہا۔ ”میں [illegible] بعد واپس آؤں گی اس وقت تک تم یہاں سے منہ گم کر چکی ہو گی اور یحییٰ سے کہنا رات میرے گھر میں گزارنے کی ضرورت نہیں ہے نہ تو میں اس کو رات کو کھانا دوں گی نہ صبح کا ناشتا اور جاتے وقت چابی گملے کے نیچے رکھنا مت بھولنا۔“

ماں کے جاتے ہی زرتاش نے پاؤں پھیلائے اور آرام سے صوفے پر لیٹ گئی۔ ایک دم اسے علی عبداللہ کا خیال آگیا۔ حبیب سعاد کو اس سے اتنا لگاؤ کیوں ہے۔ اس سے پہلے تو اس نے کبھی کسی کو اتنی توجہ اور محنت سے نہیں بڑھایا۔

پھر ایک خیال آتے ہی وہ چونک گئی جو پروگرام وہ کافی دنوں سے بنا رہی تھی اس کو تکمیل تک پہنچانے کا وقت آگیا ہے۔ اب تو ان لوگوں کی آمد کو یہاں بھی ناپسند کرنے لگی تھی۔ یہ تو علی عبداللہ کی خام خیالی تھی کہ زرتاش کی گاڑی بہت تیزی سے اس کے قریب سے گزری ہے اور زرتاش کی اس پر نظر بھی نہیں پڑی ہے مگر ایسا نہیں تھا زرتاش کی نظر میں وہ مکمل طور پر آچکا تھا۔

اسے یہ تو معلوم تھا کہ حبیب سعاد کے پاس کوئی نیا روزانہ آرہا ہے۔ ایک دو بار اسے حبیب سعاد نے.... پر بھی گھر میں روکا تھا۔ جب وہ گھر میں موجود نہیں تھی اسے یہ خبر صفائی کے لیے آنے والی عورت پہلے ہی دے چکی تھی مگر

زرتاش کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی کیونکہ اکثر حبیب سعاد اپنے مہمانوں کو لنچ ڈنر پر انوائیٹ کرتا رہتا تھا مگر وہ قریبی لوگ ہوتے تھے۔

☆......☆

آج علی عبداللہ کے جلدی ہوٹل چلے جانے کے بعد حبیب سعاد کے لیے شام کا پہر بالکل فرصت کا تھا۔ گرم دوپہر کی جھلسا دینے والی دھوپ کے بعد بحیرۂ روم سے آنے والی ہواؤں نے موسم کو خوشگوار کر دیا تھا۔ وہ شام کے منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے سوئمنگ پول کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے مراکشی نوکر احمد نے چائے میز پر لا کر رکھ دی۔ وہ چائے پیتے ہوئے نیچے سڑک پر سے آنے جانے والی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ تو یہاں سے گزر کر ساحل کی طرف جا رہے تھے، کچھ گاڑیاں سامان سے لدی پھندی واپس آرہی تھیں۔ آج کل زرتاش نے رات دیر سے گھر آنے کو معمول بنا لیا تھا۔ شام ہونے سے پہلے ہی وہ گھر سے چلی جاتی تھی۔ حبیب سعاد کو اب اس کی زیادہ پرواہ بھی نہیں تھی کیونکہ وہ اب اپنے میں اتنی ہمت نہیں پاتا تھا کہ اس سے سوال پوچھ کر کوئی جھگڑا مول لیتا اسی لیے اس نے خود کو کام میں زیادہ مصروف کر لیا تھا مگر شام کے وقت کی تنہائی اسے وقت سے پہلے ختم کیے دے رہی تھی۔

وہ اتنا مگن تھا اس وقت اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ احمد کب سے اس کے پیچھے کھڑا ہے۔ [illegible] پر اس نے مڑ کر دیکھا اور پوچھا۔ ”ہاں بولو احمد کیا بات ہے؟“ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ احمد کبھی بھی اس کے کام یا تنہائی میں [illegible] نہیں ہوتا ہے۔ کوئی بے انتہا ضروری بات کرنی ہو تو بات [illegible]۔

”جی آقا میں معافی چاہتا ہوں... مگر یہ بات کرنا بہت ضروری ہے۔“

”ہاں بولو احمد۔“ حبیب [illegible]۔ ”آقا صفائی کے لیے آنے والی عورت کو تو ٹوہ لینے کی [illegible] عادت ہے۔ اب وہ صفائی میں بھی ڈنڈی مارتی ہے۔“

”احمد تم کو اختیار ہے تم اس کو کام سے نکال سکتے ہو۔ اتنی چھوٹی بات کے لیے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“

”آقا!“ میں نے اسے تنبیہ کی تھی تو اس نے مادام سے میری شکایت کردی۔ پھر مادام نے مجھے بہت بے عزت کیا۔ ساتھ میری بیوی اور میرے بیٹے کو بھی بے عزت کیا اور ہمیں آپ کا جاسوس کہا۔“ آقا! یہ بے عزتی میری برداشت سے باہر بھی ہے مگر آپ کے میرے خاندان پر اتنے احسانات ہیں کہ ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ ہمیں آپ کی تنہائی دیکھ کر آپ پر افسوس ہوتا ہے۔ مادام نہ تو آپ کا خیال رکھتی ہیں نہ ہی گھر کا خیال رکھتی ہیں۔ جب ہماری مادام یہاں ہوتی تھیں تو یہ گھر کتنا اچھا لگتا تھا۔ آپ مجھے معافی دیں آقا مگر آپ نے بھی ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں نے کبھی اپنی زبان نہیں کھولی مگر اب سب برداشت سے باہر ہو رہا ہے۔“ احمد زمین پر اس کے قدموں میں آکر بیٹھ گیا۔

”احمد تم میرے نوکر نہیں ہو بلکہ میرے بھائی ہو۔ زرتاش سے شادی میرا غلط فیصلہ تھا۔ ہم مصری دوسری شادی کرنے کو غلط نہیں سمجھتے مگر زرتاش اچھی عورت ثابت نہیں ہو سکی اور تمہاری مادام نے بھی شاید پہلے محسوس کرلیا تھا کہ زرتاش ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گی اس لیے وہ پہلے ہی اس گھر سے چلی گئیں۔ اچھا کیا انہوں نے میری غلط حرکت کی سزا بھگتنے کو مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔“ حبیب سعاد سے آج پہلی بار احمد نے ایسی بات کی تھی۔ اس وقت اس کا دل غم سے بھر گیا تھا جو اسے غم گسار ملا تو آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔

احمد نے اس کے پاؤں چھوتے ہوئے کہا۔ ”آقا! چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر آپ کو اگر مادام کے جانے کا غم تھا تو آپ ان کو منا کر واپس لے آتے اور زرتاش مادام کو طلاق دے سکتے تھے۔“

حبیب سعاد نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”احمد میرے بھائی میں نے اپنے ذرائع سے مریم کو بہت تلاش کروایا مگر سب بے سود رہا اور اگر میں زرتاش کو طلاق دیتا تو وہ یہ گھر بکوا سکتی تھی۔ عدالت میرے تمام اثاثے اپنی تحویل میں لے کر اونے پونے فروخت کر کے رقم زرتاش کو ادا کر دیتی اور میرے بینک اکاؤنٹ میں بھی اسے حصہ مل جاتا۔ وہ مجھے دھمکی بھی دے چکی ہے اس لیے شاید میں ہمت نہیں کر پاتا۔ اگر مریم کا کچھ پتا نشان مل جاتا تو شاید میں یہ رسک بھی لے لیتا۔“

احمد نے کہا۔ ”آقا! ایک بات اور کرنی ہے۔ مادام اس نئے آنے والے شاگرد کے مطابق بھی کئی بار پوچھ چکی ہیں۔ نہ جانے ان کو اتنی کھوج کیوں ہے، پہلے تو کبھی انہوں نے کسی شاگرد کے متعلق نہیں پوچھا۔ انہوں نے صفائی والی عورت کو بھی شاید اسی کام پر لگایا ہوا ہے۔“

حبیب سعاد نے چونک کر احمد کو دیکھا۔ "میرے پاس آنے والے لوگوں سے زرتاش کا کیا مطلب ہے۔ میں نے اسے منع کیا ہوا تھا کہ میرے کام سے لاتعلق رہے تو بہتر ہے۔" وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ یکدم اس کی نظر سڑک پر پڑی۔ سامنے سے زرتاش کی کنورٹیبل آتی نظر آگئی۔

"زرتاش!" اس نے منہ ہی منہ میں اس کا نام دہرایا۔ "یہ اتنی جلدی کیوں آگئی۔ یہ وقت تو اس کے گھر آنے کا نہیں تھا۔"

وہ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے سیدھی حبیب سعاد کی طرف آگئی۔ "ہیلو ڈارلنگ کیسے ہو، آج اِدھر کیسے۔ آج تمہارا وہ پاکستانی مہمان نظر نہیں آرہا ہے۔" اس نے اپنا بیگ لاپروائی سے لان چیئر پر پھینکا اور اپنے بالوں کو کیچر سے آزاد کرتے ہوئے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ حالانکہ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔

احمد جو حبیب سعاد سے بات کر رہا تھا اس نے جھک کر برتن اٹھانے کی کوشش کی تو زرتاش نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔ "رہنے دو برتن بعد میں اٹھا لینا بوڑھے حبشی غلام، جاؤ میری گاڑی میں سے شاپنگ بیگ نکال کر لاؤ۔"

زرتاش کے اس طرح احمد سے مخاطب ہونے پر حبیب سعاد نے اسے غصے سے دیکھا۔ احمد "جی مادام" کہتا ہوا پلٹ گیا۔ اس کے جاتے ہی حبیب سعاد نے کہا۔ "میں نے تم کو کئی بار منع کیا ہے اس طرح احمد سے بات مت کیا کرو۔"

"میری مرضی حبیب سعاد میں جس طرح بھی بات کرتی ہوں اب کیا اس گھر کے نوکر اتنے معزز ہو گئے کہ میں انہیں کچھ نہیں کہہ سکتی؟"

"معزز ہونے کے لیے امیر کبیر ہونا ضروری نہیں ہے، نہ کسی معزز شخص کی بیگم ہونا ضروری ہے، کسی شخص کا لباس اس کی گفتگو اس کا رہن سہن کا طریقہ اسے معزز بناتا ہے اور احمد ایک معزز شخص ہے۔" حبیب سعاد نے زرتاش کے لباس پر نظر ڈالی۔ زرتاش نے چھوٹی سی کیپری کے اوپر کھلے گلے اور بغیر آستین کا بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ حبیب سعاد کو ایسا لباس ہمیشہ سے ناپسند تھا اور وہ اکثر ایسا لباس پہننے پر زرتاش کو تنبیہ بھی کر چکا تھا مگر وہ باز نہیں آتی تھی۔

زرتاش نے بے پروائی سے کاندھے اچکائے۔ "اب تم مان لو حبیب کہ تم بوڑھے ہو چکے ہو۔ اس کے ساتھ تمہارے خیالات اور نظریات بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اے بوڑھے جن تم اس پری کو اپنی قید سے آزاد کیوں نہیں کر دیتے۔ دس سال جو میں نے تمہاری قید میں گزارے ہیں۔ وہ اتنے کرب ناک اور اذیت ناک تھے کہ اگر مجھ میں اپنی زندگی جینے اور حالات سے بہادری سے لڑنے کا حوصلہ نہ ہوتا تو میں ..... کب کی تڑپ تڑپ کر جان دے دی ہوتی۔"

اس وقت حبیب سعاد کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ چہرے پر بے انتہا تناؤ کے آثار تھے۔ لگ رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون سمٹ کر چہرے پر آگیا ہو۔ اسے لگ رہا تھا کہ بلڈ پریشر بہت بڑھ رہا ہے۔ اس نے احمد کی طرف دیکھا جو گاڑی میں سے بیگ نکال کر زمین پر رکھ رہا تھا۔ اب اکثر ایسا ہونے لگا تھا کہ زرتاش احمد کو اس کے رنگ کا طعنہ دینے لگی تھی اور یہ بات حبیب کی برداشت سے باہر ہو جاتی تھی لیکن اب زرتاش کی منہ زوری اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ سب کا بھی لحاظ چھوڑ چکی تھی۔

زرتاش نے اپنا بیگ اٹھایا [illegible] بولی۔ "مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اب ہم بالکل ساتھ نہیں رہ سکتے مگر ایک شرط پر میں تمہارے ساتھ رہنے پر تیار ہوں کہ یہ ولا میرے نام کر دو، کیونکہ مجھے ابھی بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ تم مریم کو نہیں بھول پائے ہو۔ اب اگر تم مر گئے تو میرے ہاتھ کیا آئے گا۔"

حبیب، زرتاش کے منہ لگنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تھکن سے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔ اس کی باتوں کا حبیب کے پاس کوئی جواب نہ تھا اور وہ حساب بے باق کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ حبیب نے آہستہ سے کہا۔ "میری زندگی میں تو واقعی کچھ نہیں آئے گا۔ ہاں البتہ میرے مرنے کے بعد تمہیں یہ ولا مل سکتا ہے۔"

زرتاش نے سنگدلی سے کہا۔ "تو مر جاؤ میری طرف سے اجازت ہے۔" اور پیر پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔

حبیب نے شکر ادا کیا کہ احمد سامان اٹھا کر اندر جا چکا تھا مگر اس کا دل ابھی بھی قابو میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے اپنی بے ترتیب سانسوں کو ترتیب میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ مغرب کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ احمد نے لان میں لگے لیمپ پوسٹ جلانے کے لیے بٹن دبایا تو روشنی کے ہالے میں کرسی پر نیم دراز حبیب پر نظر پڑی اس نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو سر ایک طرف لڑھک گیا۔

"آقا، آقا، آقا۔" اس نے کئی آوازیں دے ڈالیں

مگر بے سود حبیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آواز اتنی تیز تھی کہ اندر سے اس کا بیٹا بھاگ کر آگیا۔ احمد کو اندازہ ہو رہا تھا کہ حبیب صرف بے ہوش ہے۔ دونوں نے مل کر اسے اٹھایا اور آفس کے اندر لے آئے۔ احمد نے ڈاکٹر کو فون کر دیا۔

ڈاکٹر نے اس کو انجکشن، دوائیں دیں کیونکہ اس کا بلڈ پریشر بہت بڑھ چکا تھا۔ اگر ڈاکٹر تھوڑی دیر نہ آتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ حبیب نے ہوش آنے پر احمد کو منع کر دیا کہ وہ اندر نہیں جانا چاہتا۔ اسے آفس میں ہی رہنے دیا جائے وہ اندر بیڈ روم تک نہیں جانا چاہتا۔ احمد بھی وہیں زمین پر اس کے آفس میں ہی پڑ کر سو گیا تھا۔

صبح تک اس کی طبیعت خاصی سنبھل چکی تھی۔ جب علی عبداللہ، حبیب کے پاس آیا تو وہ آفس میں ہی موجود تھا مگر ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے آیا ہوا تھا۔ احمد نے اسے انتظار کرنے کے لیے کہا اور کل اس کی طبیعت خراب ہونے کے متعلق بتا دیا تھا۔

وہ اس کے سامنے لان میں رکھی ہوئی میز پر بیٹھ گیا۔ اور دنوں کے مقابلے پر آج موسم بہت خوشگوار تھا۔ مغربی سمت سے آنے والے بادل پانی سے بھرے ہوئے تھے اور [illegible] نیچے جھک آئے تھے۔ بہت ہی ٹھنڈی بھیگی ہوئی ہلکی ہلکی خوشگوار ہوا سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کہیں قریب ہی بارش ہو رہی ہے۔ [illegible] سے لان میں لگے پھول بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ مہندی کی جھاڑیوں کو خوب صورتی سے کانٹ چھانٹ کر [illegible] کی طرح چاروں طرف لگایا ہوا تھا۔ عشق پیچاں کی بیلیں دیواروں پر چڑھی ہوئی تھیں اور درمیان میں سے سرخ پھولوں کے گچھے جھانک رہے تھے۔ موسمی پھولوں اور مہندی کی ملی جلی خوشبو برآمدے تک آرہی تھی۔

علی عبداللہ نے آنکھیں بند کر کے [illegible] اور اس خوشبو کو اپنے اندر اتارنے کی کوشش کی تھی [illegible] آہٹ پر آنکھیں کھول دیں۔ ساتھ اسے لیونڈر کی بھینی بھینی خوشبو اپنے قریب محسوس ہوئی تھی۔

وہ اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور اپنے ہاتھ سے گاؤن کی ڈوریاں باندھنے کی کوششیں کر رہی تھی۔ شاید وہ سوئمنگ پول سے نہا کر نکلی تھی اور بارش کی پھوار کی وجہ سے برآمدے تک آگئی تھی۔

علی عبداللہ کو دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے ہیلو کہا۔

علی عبداللہ نے بھی اس کے سراپے سے نظریں چراتے ہوئے ہیلو کہا اور اپنی نظریں لان میں برستی ہوئی بارش پر مرکوز کر دیں۔

زرتاش نے ہلکی سی جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "آج کی بارش بہت ٹھنڈی ہے۔ تم بھیگے تو نہیں ہو۔ اگر بھیگ گئے ہو تو اندر ہیٹر کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ۔"

"نہیں میم میں بھیگا تو نہیں ہوں اور مجھے سردی بھی نہیں لگ رہی ہے۔ میں نے جیکٹ پہن رکھی ہے۔"

زرتاش اس کے پاس چلی آئی۔ "تم پاکستانی ہو؟"

"جی مادام۔" علی عبداللہ نے مختصر جواب دیا۔

"تمہارے استاد نے مجھے بتایا تھا کہ پاکستان بہت خوب صورت ملک ہے اور لوگ بھی بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر اس کی بات پر یقین کرنے کو دل چاہنے لگا ہے۔"

"شکریہ!" علی نے پھر مختصر جواب دیا۔

اس نے اپنے بالوں کو جھٹکا دیا جس سے پانی کے قطرے ابھی بھی ٹپک رہے تھے۔ "حالانکہ تمہارا استاد یہ پسند نہیں کرتا کہ میں اس کے پاس آنے والوں سے بات چیت کروں لیکن اب مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے کیونکہ میں جلد ہی یورپ کے ٹور پر نکلنے والی ہوں کیونکہ حبیب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس نے کوئی ڈیل جاپانی لوگوں کے ساتھ کی تھی۔ ابھی صبح بینک سے فون آگیا ہے کہ رقم بینک میں پہنچ چکی ہے۔ اصل میں وہ کچھ رقم خیرات کے طور پر نکالتا ہے جو وہ مجھے دے دیتا ہے تاکہ میں اس سے کچھ دنوں کے لیے دور ہو جاؤں۔" اس نے اپنے گلے میں پڑے Pandent سے کھیلتے ہوئے کہا۔

علی عبداللہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ یہ باتیں کیوں کر رہی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اس سے اجازت لے کر لائبریری چلا جائے اور موسم انجوائے کرنے کو خیر باد کہہ دے کہ آفس کا دروازہ کھلا اور احمد ڈاکٹر کا بیگ اٹھائے باہر آیا۔

ڈاکٹر، احمد کو کچھ سمجھا رہا تھا اور دونوں آپس میں بات کرتے ہوئے ڈرائیو وے تک چلے گئے۔ زرتاش نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"اب مزہ آئے گا۔ یہ بوڑھا حبشی چغل خور اپنے آقا

کے کان بھرے گا کہ میں اس کے مہمان کو پھسلانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کا آقا مجھے فوری طور پر رقم دے دے گا۔" اور تیزی سے مڑ کر رہائشی حصے کی طرف چلی گئی۔

علی عبداللہ سمجھ گیا کہ زرتاش نے اسے چارے کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے سوچا وہ حبیب کو وضاحت دے دے گا مگر اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ احمد اسے بلانے آ گیا۔

خیر خیریت پوچھنے کے بعد علی عبداللہ نے اجازت لے کر کہا۔ "سر مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے میرے بیٹے تم کو وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اکثر ایسی اوچھی حرکتیں کرتی رہتی ہے۔ مجھے احمد نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ اب ایسا ہے میرے بیٹے کہ میں کچھ دن آرام کروں گا، پھر ہم دوبارہ کام شروع کر دیں گے۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ تمہاری ایک بڑی رقم ہوٹل کے بل کی نذر ہو جاتی ہے، اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ زرتاش کے یورپ کے ٹور پر جاتے ہی تم میرے مہمان خانے میں منتقل ہو جانا، پھر ہم جلدی اپنا کام مکمل کر لیں گے اس کے واپس آنے سے پہلے۔"

علی عبداللہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی کیونکہ وہ حبیب سعاد کی نظروں میں شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ نہ زرتاش کا دوبارہ سامنا کرنا چاہتا تھا مگر انسان جو سوچتا ہے وہ کہاں پورا ہوتا ہے مگر اسی دن جب وہ حبیب سعاد کے گیٹ سے نکل کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جا رہا تھا۔ بارش رک چکی تھی اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ زرتاش کی کنورٹیبل اس کے پاس سے تیزی سے گزری مگر تھوڑی دور چل کر اس کے بریک چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ آج کنورٹیبل پر ہڈ لگا ہوا تھا اور اندر سے زرتاش نظر نہیں آ رہی تھی۔

شاید وہ بہت جلدی میں تھی۔ اس نے گاڑی میں ریورس گیئر لگایا اور گاڑی آہستہ آہستہ پیچھے آنے لگی... کیونکہ کچھ چڑھائی اور سڑک گیلی ہونے کے باوجود گاڑی بڑی روانی سے اس کے پاس آ کر رک گئی۔ زرتاش نے گاڑی کا ہڈ اتار دیا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ہیلو پاکستانی میں تمہارا بیچ جا رہی ہوں۔ آج موسم بہت خوشگوار ہے میرے ساتھ چلو انجوائے کریں گے۔" اس کے ساتھ ہی بہت قیمتی پرفیوم کی خوشبو باہر آئی۔ زرتاش نے موسم کی مناسبت سے بڑے بڑے سبز اور پیلے پھولوں والا لباس پہنا ہوا تھا اور بالوں کو باندھنے والا سبز اسکارف باندھا ہوا تھا جو اس کی گوری رنگت اور سنہری بالوں کے ساتھ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو یہ پیشکش کبھی نہ ٹھکراتا مگر اتنے دنوں میں وہ زرتاش کی فطرت جان چکا تھا۔

اس نے تھوڑا خم ہو کر کہا۔ "معافی چاہتا ہوں مادام میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔" اور اپنے قدم آگے کی سمت بڑھا دیے۔

زرتاش نے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ "یہ لڑکا اپنے آپ کو کیا [illegible] حبیب سعاد کا غلام۔"

مگر ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ سیل پر اس کی ماں کا نام آنے لگا۔ [illegible] گاڑی کنارے پر روکی اور جھنجلاتے ہوئے کہا۔ "ماما تم کو کتنی بار منع کیا ہے مجھے وقت بے وقت ڈسٹرب مت کیا کرو۔ میں [illegible] فرصت میں ہوتی ہوں خود تم کو فون کر لیتی ہوں۔"

لیکن دوسری طرف سے جو اس کی ماں نے کہا اس نے ساری کوفت دور کر دی تھی۔

اس نے فون بند کر کے گاڑی رہائشی علاقے کی جانب موڑ دی۔

☆......☆

وہ جتنی جلدی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی فلیٹ پر پہنچی تھی اتنی جلدی دروازہ بھی کھل گیا تھا مگر دروازہ کھولنے والی اس کی ماں نہیں، یحییٰ تھا اس کا خالہ زاد اور دوست۔ دونوں اس طرح گلے لگے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے ہوں۔

"یحییٰ تم کتنے دن گزار کر آئے ہو۔ تم کو معلوم ہے میں تمہارے بغیر کتنی اکیلی ہو جاتی ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے میری جان! جب میں تم سے ملنے آتا ہوں تو کتنی چھٹیاں ہو جاتی ہیں یا نوکری سے جواب مل جاتا ہے یا نوٹس۔ ابھی بھی مالک چھٹی نہیں دے رہا تھا تو میں نوکری چھوڑ کر آ گیا ہوں۔ اب یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ تم بلاؤ اور میں نہ آؤں۔"

زرتاش نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تم نے یہاں آنے کا کسی کو بتایا تو نہیں۔ اپنی ماں کو بھی نہیں؟" پھر چونکتے ہوئے بولی۔ "میری ماں کہاں ہے؟"

یحییٰ نے اس کو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ "اسے میں نے تھوڑی رقم دے کر بازار روانہ کر دیا ہے تاکہ وہ سودا سلف لے آئے۔"

زرتاش نے اپنے سنہری بال اسکارف سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تم نے اچھا کیا اب ہم کچھ دیر کے لیے بالکل آزاد ہیں ورنہ بوڑھی عورت بہت چڑ چڑ کرتی ہے۔ مجھے گناہ ثواب یاد دلاتی رہتی ہے۔"

یحییٰ نے زرتاش کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہاں میری بوڑھی بھی یہی کہتی رہتی ہے کہ میں زرتاش کا خیال دل سے نکال دوں اور کسی اور سے شادی کر لوں۔ اب اسے کون سمجھائے کہ کوئی دوسری زرتاش جیسی خوب صورت نہیں ہو سکتی لیکن میری جان ایسے کب تک چلے گا۔ نہ میں ٹھیک سے نوکری کر سکتا ہوں نہ تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں۔ دس سال ہو گئے تم نے تو کہا تھا میں ایک دو سال میں سب کچھ اپنے نام کروا کر حبیب سے طلاق لے لوں گی۔"

زرتاش کہنے لگی۔ "دیکھو یحییٰ میری جان! میں بھی اب عاجز آ چکی ہوں، اس طرح ہم کب تک مل سکتے ہیں مگر حبیب میری توقع سے بڑھ کر چالاک ثابت ہوا ہے۔ میرا خیال ہے اسے ہمارے متعلق معلوم بھی ہے مگر وہ جان بوجھ کر آنکھیں پھیرے ہوئے ہے۔ خیر میں نے اب اس کا علاج سوچ لیا ہے۔ اب ہمیں وہی تیسرا راستہ اپنانا ہوگا جو مجھے ہمیشہ سے دکھاتے آئے ہو۔"

یحییٰ نے چونکتے ہوئے کہا۔ "تو پھر تم راضی ہو؟"

زرتاش نے پرس اٹھا کر اس میں سے چابیاں نکال کر یحییٰ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "میں اسی ہفتے میں یورپ کے ٹور پر نکل رہی ہوں۔ تم آج ہی واپس چلے جاؤ تاکہ ہر وقت وہاں اپنی موجودگی ظاہر کرتے رہو۔ میں اب تم سے رابطہ بھی نہیں کروں گی۔ صرف واپس آنے سے دو تین دن پہلے [illegible] لوں گی۔"

یحییٰ نے چابیاں مٹھی میں دباتے ہوئے اطمینان کی سانس لی۔ زرتاش نے اپنے سنہری بالوں والا سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "اب سب کچھ [illegible] ہوگا۔ ولا، گاڑیاں، کیش، بینک بیلنس سب کچھ اور یحییٰ بھی۔"

☆......☆

علی عبداللہ نے اپنا جتنا بھی ریسرچ کا کام بھجوایا تھا وہ کام وہاں بہت پسند کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ حبیب جیسا [illegible] کی قابلیت بھی تھی تو اس نے بھی بہت محنت اور لگن سے کام کیا تھا، اب اس کی یونیورسٹی چاہتی تھی کہ وہ جلد سے جلد واپس آ جائے۔

ادھر احسن عبداللہ اور زینب کے بھی کئی فون آ چکے تھے کہ وہ کم از کم ایک دو دن پاکستان میں گزار جائے۔ دو دن پہلے موسیٰ کا بھی فون آیا تھا کہ وہ منگنی کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اس کی منگنی کی تقریب میں شرکت کرے۔ علی عبداللہ نے بھی اب اپنا شیڈول اس طرح ترتیب دیا کہ وہ پہلے دو تین دن قاہرہ رکے گا۔ موسیٰ کی تقریب میں شرکت کر کے پاکستان روانہ ہو جائے گا۔ وہاں دو دن رک کر لندن چلا جائے گا۔

روانگی سے ایک رات پہلے حبیب سعاد نے اپنے گھر پر ایک ڈنر پارٹی کا اہتمام کیا تھا جس میں اس کے کئی ایک قریبی دوست شریک ہوئے تھے۔ پارٹی کے بعد حبیب اسے لے کر اپنے آفس آ گیا۔ وہ اس کے جانے کی وجہ سے بہت اداس ہو رہا تھا۔ حبیب نے بہت اداسی سے کہا۔ "میرے بیٹے! میرا دل تمہارے جانے کی وجہ سے بہت اداس ہے، اگر میرا بس چلتا تو میں تمہیں جانے ہی نہ دیتا۔"

علی عبداللہ کہنے لگا۔ "انشاء اللہ میں آپ کے ساتھ رابطے میں رہوں گا مگر میری مجبوری یہ ہے کہ میرا ویزا ختم ہو رہا ہے۔ پھر میں قاہرہ اپنے دوست کی منگنی میں بھی شرکت کرنا چاہتا ہوں۔"

حبیب نے احمد کو بلا کر کچھ تصویریں لانے کو کہا۔ احمد

اصلاح قرآن وسنت میں سحر (جادو) ایسے امر عجیب کو کہا جاتا ہے جس میں شیاطین کو خوش کر کے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو، پھر شیاطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، کبھی ایسے منتر اختیار کیے جاتے ہیں جن میں کفر و شرک کے کلمات ہوں اور شیاطین کی مدح کی گئی ہو یا کواکب و نجوم (ستاروں) کی عبادت اختیار کی گئی ہو یا کوئی بھی ایسے اعمال اختیار کیے جاتے ہیں جو شیطان کو پسند ہوتے ہیں، مثلاً کسی کو ناحق قتل کر کے اس کا خون استعمال کرنا یا جنابت اور نجاست کی حالت میں رہنا۔ طہارت سے دور رہنا، وغیرہ۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کو ان اقوال و افعال سے خوش کیا جاتا ہے جن کو فرشتے پسند کرتے ہیں، مثلاً تقویٰ، طہارت اور پاکیزگی، بدبو اور نجاست سے اجتناب، ذکر اللہ اور اعمال خیر، اسی طرح شیاطین کو خوشی ایسے اقوال و افعال سے حاصل ہوتی ہے جو شیاطین کو پسند ہوں، اسی لیے سحر (جادو) عموماً ایسے ہی لوگوں کا کامیاب ہوتا ہے جو گندے اور نجاست میں رہتے ہیں، پاکی اور اللہ تعالیٰ کے نام سے دور رہتے ہیں۔ خبیث کاموں کے عادی ہوتے ہیں، مباتی شعبدے اور ٹوٹکے یا ہاتھ کی چالاکی کے کام یا مسمریزم وغیرہ کو مجازاً سحر کہا جاتا ہے۔ (روح المعانی)

فریم میں جڑی کچھ تصویریں لے کر آگیا۔ حبیب سعاد نے وہ تصویریں اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ ”زرتاش نے ساری تصویریں اتار دی تھیں۔ وہ انہیں پھینکنا چاہتی تھی مگر احمد نے کچھ تصویریں چھپا کر اپنے کوارٹر میں رکھ لی تھیں۔ جب زرتاش چلی جاتی ہے تو پھر میں اپنی یادوں کو تازہ کر لیتا ہوں۔“

تصویروں کو دیکھ کر ایک بار پھر علی عبداللہ کی نظروں کے سامنے لڑکی آگئی جس کی سیاہ میکسی پر سفید موتی لگے ہوئے تھے جس کے چہرے کا عکس اس نے نیل کے بہتے پانی پر دیکھا تھا مگر اس تصویر میں اس کے ساتھ حبیب سعاد بھی موجود تھا، جوان خوب صورت و رعنا۔ شاید یہ ان کی شادی کی تصویر تھی۔ علی خاموشی سے تصویر کو تکے جا رہا تھا۔

حبیب سعاد نے اس کی محویت کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے میرے بیٹے تم خاموش کیوں ہو گئے۔“

علی نے مریم کی تصویر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”استاد یہ کون ہیں؟“

”یہ مریم ہے میرے بیٹے، میری بیوی۔“ حبیب سعاد نے خوش دلی سے تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر حنا کون ہے؟ بالکل وہی شکل وصورت ناک نقشہ صرف عمر کا فرق ہے۔ اب مادام کی عمر پچاس سال سے اوپر ہو گئی مگر حنا بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے زیر لب کہہ رہا تھا۔

”میری بیٹی حنا، تم حنا کو جانتے ہو۔ تم نے اسے دیکھا ہے۔ یہ دیکھو تصویر جب وہ دس برس سے کچھ اوپر کی تھی۔ ہمارے درمیان موجود ہے، حبیب سعاد نے ایک تصویر اس کے سامنے کر دی۔

مریم اور حبیب سعاد کے درمیان ایک چھوٹی بچی بیٹھی ہوئی تھی جس کی شکل بالکل اپنی ماں پر گئی تھی مگر ہلکی سی جھلک حبیب سعاد کی بھی آ رہی تھی۔ اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ حبیب سعاد کو دیکھ کر کیوں چونک گیا تھا۔

”جی جی استاد میں ایک بار قاہرہ میں حنا سے مل چکا ہوں۔“ علی عبداللہ کے حلق سے ہلکی سی آواز نکلی۔

”کیسی ہے میری بیٹی، تم کب ملے، کیا تم مریم سے بھی ملے تھے وہ کیسی ہے۔ مجھے ان کے پاس لے چلو، کیا تم کو معلوم ہے وہ کہاں رہتی ہیں۔“ حبیب سعاد بے صبری سے پوچھ رہا تھا۔

آہستہ آہستہ علی عبداللہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ کب کہاں اور کس کے ساتھ حنا سے مل چکا ہے۔

”تم ابھی موسیٰ کو فون کرو کہ وہ حنا اور مریم سے رابطہ کرے۔ اس کو تمام احوال بتاؤ۔ وہ ہماری ضرور مدد کرے گا۔“ حبیب سعاد بے صبرا ہو رہا تھا۔

”لیکن استاد یہ ٹھیک نہیں رہے گا کیونکہ جب میں حنا سے ملا تھا تو اس نے اشارے سے موسیٰ کو پورا نام بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ اب اگر اسے پہلے سے خبر ہو گئی تو کہیں وہ آپ سے ملنے سے انکار کر دے۔“ علی کے دل میں جو خدشات تھے اس نے ان کا اظہار کرنا مناسب سمجھا۔

”ہاں میں نے اس کے ساتھ کچھ اچھا تو نہیں کیا کہ وہ میرا نام بھی اپنے ساتھ لگانا پسند نہیں کرتی۔ آہ میری پیاری بیٹی، کیا گزری ہو گی ان دنوں میں جو وہ میرا نام بھی نہیں لینا چاہتی۔ میں نے بھی تو کچھ ایسا ہی کیا۔ ایک معمولی ڈانس ٹیچر زرتاش سے شادی کر لی جو کبھی کبھار ٹیوشن دینے گھر آ جاتی تھی اور پھر اس نے میری تباہی اور اس گھر پر قبضہ کے خواب دیکھنا شروع کر دیے اور ایسی چال چلی کہ میں اس کے جال میں پھنسی مچھلی کی طرح آج تک تڑپ رہا ہوں۔ میں مریم کو کبھی بھی قصوروار نہیں گردانتا، اس کا جانا صحیح تھا۔ میں نے اپنے مقام سے گری ہوئی ایک عورت کو اس کے مقابل لا کھڑا کیا تھا۔ وہ خاموش رہی اس نے احتجاج بھی نہیں کیا۔ نہ شور مچایا نہ روئی چلائی بلکہ خاموشی سے اپنی بیٹی کو لے کر میری زندگی سے نکل گئی۔“

”عظیم عورت۔“ علی عبداللہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”ہاں وہ ایک عظیم عورت ہے اور مجھ سے بے تحاشا محبت کرتی تھی اور شاید مجھے ستانا نہیں چاہتی تھی اس لیے میری زندگی سے خاموشی سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ زرتاش کو مجھ سے محبت نہ تھی۔ جب میں نے اس سے شادی کی تھی تو وہ اپنی ماں کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہتی تھی۔ شادی کے بعد بھی وہیں رہتی رہی۔ پھر جب اسے خبر ہوئی کہ مریم اور حنا جا چکی ہیں تو وہ بھی یہاں آگئی۔ مریم بہت عرصہ تک میری شادی کو جھیلتی رہی۔ شاید دو برس تک وہ میری اس کی طرف سے بے پروائی برداشت کرتی رہی پھر شاید اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو اس نے اپنے باپ کو سب کچھ بتا دیا اور وہ اسے آ کر لے گیا۔ میں اس کے پیچھے قاہرہ گیا مگر وہ لوگ اپنا آبائی گھر بیچ کر کہیں اور منتقل ہو گئے تو مجھے مایوس آنا پڑا۔ پھر باوجود

کوشش کے وہ نہ ملی ان کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں بہت بڑی غلطی کر چکا ہوں۔“ سعاد نے رک کر ایک طویل سانس لی پھر سلسلہ کلام جوڑا۔ ”اب ایک عرصہ بعد مجھے یہ خوشی ملی ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا کہ میرے پر لگ جائیں اور میں اڑ کر قاہرہ پہنچ جاؤں۔ اب تم کیا کہتے ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ ہم وہاں قاہرہ کے ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے اور منگنی کے دن کا انتظار کریں جب وہ میرے سامنے ہو گی۔“

”جی ہاں استاد ہم کسی کو کچھ نہیں بتاتے ہیں اور خود ہی وہاں موجود ہوں گے تو سارے مسائل فوری طور پر حل ہو جائیں گے۔“

حبیب سعاد نے انٹر کام کر کے احمد کو آفس میں بلا لیا۔ وہ اسے اپنے راز میں شریک کرنا چاہتا تھا کیونکہ کل وہ حبیب سعاد کی گاڑی میں اسے قاہرہ چھوڑنے جا رہا تھا۔

حبیب سعاد بہت خوش تھا لیکن اب پروگرام بدل چکا تھا۔ اب احمد اس کے ساتھ نہیں جا رہا تھا۔ اس نے احمد کو اگلے دن کی تمام تفصیلات بتا دی تھیں۔

احمد نے ساری بات سن کر کہا۔ ”آقا کتنا اچھا ہوتا کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا۔“

”نہیں احمد میرے بھائی! ایک دو دن بعد زرتاش واپس آ رہی ہے اور میری غیر موجودگی میں تمہیں یہاں رہنا بہت ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے ہمیں وہاں ہفتہ سے زیادہ رکنا پڑ جائے۔“

احمد نے [illegible] پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آقا میں آپ کا غلام ہوں [illegible] کا حکم۔“

رات زیادہ ہو گئی تھی۔ علی عبداللہ کو بہت نیند آ رہی تھی۔ وہ اجازت لے کر مہمان خانے آ گیا۔ حبیب سعاد بھی بہت دنوں سے رات میں نیند کی دوا کھا کر سوتا تھا مگر آج سارا دن کی بھاگ دوڑ اور پھر اتنی بڑی خوشخبری کے بعد اس کا دل اطمینان سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اب [illegible] سونا چاہتا تھا۔ جب سے اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی احمد اس کے کمرے میں اپنا بستر ڈال کر سوتا تھا۔

جب احمد اپنا بستر لے کر اس کے کمرے میں آیا تو اس نے احمد کو منع کرتے ہوئے کہا۔ ”احمد میرے بھائی! آج رات میں اکیلا آرام سے سونا چاہتا ہوں اور تمہارے خراٹے مجھے سونے نہیں دیں گے اور کئی دنوں سے تو میں نیند کی دوا کھا کر سوتا تھا آج مجھے بغیر دوا لیے نیند آ رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے آقا اگر آپ کو میری ضرورت پڑے تو بے جھجک مجھے بلا لیجیے گا کیونکہ میں راہداری میں دروازے کے باہر اپنا بستر ڈال لوں گا۔“ اس نے گھنٹی اس کی سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا اور اپنا بستر لے کر باہر راہداری میں آ گیا۔

رات بہت گہری اور ٹھنڈی تھی۔ پورا شہر خاموشی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا اور یہ علاقہ تو ویسے بھی شہری علاقے سے فاصلے پر تھا اور بڑے ولاز ہونے کی وجہ سے دن میں بھی خاموشی اور تنہا محسوس ہوتا تھا۔ اس خاموشی میں صرف ہوا کی ہلکی ہلکی سرسراہٹوں کے علاوہ کوئی اور آواز نہ تھی اس لیے دور سے آنے والی کوئی بھی آواز صاف سنائی دے سکتی تھی۔ یہ آواز صبح کے وقت اندھیرے کو چیرتی ہوئی اذان کی آواز کے علاوہ اور کوئی بھی آواز نہیں ہوتی تھی جو مصری قانون کے مطابق تمام مساجد سے بیک وقت نشر ہوتی تھی مگر احمد بڑی چوکنا نیند سوتا تھا۔ ذرا سی بھی آہٹ اسے جگا دیتی تھی مگر آج کی طویل رات میں بڑی خاموشی تھی۔ اس نے اپنے فرض کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہیں کی تھی۔ آج رات بھی راہداری میں سونے کے باوجود اس نے اٹھ کر آقا کے بیڈ روم کا دروازہ آہستہ سے کھول کر دیکھا۔ ہلکے نیلے بلب کی روشنی میں اسے حبیب سعاد بستر پر آرام دہ حالت میں سوتا نظر آیا۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹے کمرے میں گونج رہے تھے۔

”خدا کا شکر ہے۔“ احمد نے دل ہی دل میں کہا اور اطمینان سے اپنے بستر پر آرام سے آ کر لیٹ گیا۔

حبیب سعاد کو آج بڑی اطمینان بھری نیند آئی تھی۔ نیند کے غلبے میں اسے احساس ہوا کہ جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو سینے پر اسے بوجھ محسوس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوششیں کیں اس کی آنکھ بھی نہیں کھل پا رہی تھی کہ جیسے وہ کسی اندھیرے کنویں میں ہو۔

”احمد، احمد۔“ اس نے آواز نکالنے کی کوشش کی تو اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ ابھی اس کے حواس منجمد نہیں ہوئے تھے، اندازہ نہ لگا سکے کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔

اسے احساس ہو گیا کہ کوئی اس کے سینے پر موجود ہے اور اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر پوری قوت سے دبا رہا ہے۔ حبیب سعاد نے اپنے پیروں کی طاقت سے اٹھنے کی کوشش کی اپنے ہاتھوں اس جسم کو پکڑنے کی جو اس کے جسم پر موجود

تھا۔

ابھی حبیب سعاد اتنا کمزور نہیں ہوا تھا کہ اس کی مزاحمت کارگر نہ ہوتی۔ جدوجہد کی وجہ سے وہ اس شخص کی تکیے پر گرفت کمزور کرنے میں کامیاب ہوگیا جب تکیہ منہ سے ہٹا تو حبیب سعاد کی سانس بحال ہوئی اس نے خود پر موجود شخص کو ہٹانے کی کوشش کی۔ وہ شخص خاصا تندرمند اور طاقت ور لگ رہا تھا اور اس کی کوششیں تھیں کہ حبیب کا گلا اس کے ہاتھوں کی گرفت میں آجائے۔ اسی جدوجہد میں حبیب نے ایک دھکے سے اسے دھکیل دیا اور ایک ساتھ کئی آوازیں احمد کو دے ڈالیں مگر وہ شخص بہت پھرتیلا تھا۔

شاید اس کا مقصد صرف حبیب سعاد کو جان سے مارنا تھا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے پلٹ کر قریب پڑا ہوا بھاری پیتل کا گلدان اس کے سر پردے مارا، یہ حملہ کارگر ثابت ہوا اور حبیب سعاد سر پکڑ کر ڈھیر ہوا۔ اس نے دوسرا وار کرنے کے لیے گلدان اٹھایا۔

احمد کو پہلے تو احساس ہوا کہ کوئی دھم سے حبیب سعاد کے کمرے میں کودا ہے پھر حبیب سعاد کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے آواز دے رہا تھا۔ احمد نے بغیر سوچے سمجھے بستر سے چھلانگ لگائی اور راہداری میں لگا بلب جلا دیا۔ اندھیری راہداری ایک دم سے روشن ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی احمد کے حواس بھی بیدار ہوگئے تھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ حبیب سعاد کے کمرے کا دروازہ کھول کر داخل ہوا مگر یکدم ٹھٹک کر رک گیا۔ روشن راہداری کی روشنی کھلے دروازے سے اندر آرہی تھی اور پیتل کا بھاری گلدان جو اس نے کل ہی پالش کیا تھا کسی کے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔ یقیناً وہ شخص جس نے گلدان اٹھایا ہوا تھا وہ حبیب سعاد نہ تھا۔ وہ جو بھی تھا اس کا ہاتھ فضا میں دوسرے وار کے لیے بلند ہورہا تھا۔ وہیں ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی پیٹھ احمد کی طرف تھی وہ اس کی شکل تو نہیں دیکھ سکا۔

”کون ہو؟ کون ہو تم؟“ احمد پوری قوت سے چلایا۔

اس شخص کو اندازہ نہیں تھا کہ حبیب سعاد کے لیے اتنی جلدی مدد پہنچ جائے گی۔ اس نے گھبرا کر وار کرنے کی بجائے گلدان پوری قوت سے زمین پر دے مارا لیکن اس نے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور تیزی سے زمین پر پڑے حبیب سعاد پر سے چھلانگ لگائی اور بیڈ پر پاؤں رکھ کر دوسری طرف کود گیا اور دوسرے کمرے کا دروازہ جس کو کھول کر وہ حبیب سعاد کے بیڈروم میں داخل ہوا تھا، احمد نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش کی مگر زمین پر پڑے بے حس وحرکت...... وجود سے ٹکرا کر رک گیا۔ اس کے ننگے پیروں میں چپ چپے خون کا احساس ہوا تو اس کی سمجھ میں ساری بات آگئی۔ اس نے جھک کر بے حس وحرکت پڑے حبیب سعاد کو سیدھا کرنے کی کوشش کی جو بھاری گلدان کے وار کے بعد اوندھے منہ پڑا تھا۔

”آقا آقا۔“ وہ پوری قوت سے چلا رہا تھا اور اسے جھنجوڑ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔

”احمد، ایمر [illegible]......!“ حبیب سعاد کے منہ سے نکلا۔

جھنجوڑنے پر حبیب سعاد کو لگا جیسے احمد کی آواز کسی گہرے کنویں سے آرہی ہے لیکن جو [illegible] تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن سر میں سخت ترین ٹیس [illegible] ہوا جو گلدان کی فوری چوٹ کی وجہ سے زائل ہوگیا تھا۔

احمد ان نوکروں میں سے تھا جن کو اپنے مالک کے علاوہ دنیا میں کوئی اور نظر نہیں آتا تھا۔ وہ دنیاوی رشتوں کو اپنے آقا کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ جن سے نفرت کرتا تھا وہ اسے نفرت کرتا جن سے محبت کرتا وہ ان پر بھی جان نچھاور کرتا۔ آقا کی آواز سن کر اس کی جان میں جان آگئی تھی۔ اس نے کمرے میں لگے روشنی کے سوئچ کو دبایا اور ساتھ ایمرجنسی کا بٹن بھی دبادیا۔

اندر ہونے والی گڑبڑ کا اندازہ احمد کے بیٹے اور بیوی کو بھی ہوگیا تھا۔ وہ دونوں بھی اندر کی سمت ہونے والی روشنی اور آوازیں سن کر آگئے تھے۔ مہمان خانہ رہائشی حصے سے خاصا دور تھا۔ رات کی خاموشی اور سناٹے میں تو دور کی آوازیں بھی قریب سنائی دیتی ہیں۔ پھر تو یہ آوازیں بھی علی کو رہائشی حصے کی طرف سے آرہی تھیں۔ وہ جس وقت اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر کی سمت آرہا تھا اس نے احمد کے بیٹے کو بھاگ کر گیٹ کی سمت جاتے دیکھا۔

اس نے بھاگتے ہوئے لڑکے سے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

لڑکے نے ڈرائیوے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”آقا......!“ اور بھاگتا چلا گیا۔

وہ سمجھ گیا کہ حبیب سعاد کی طبیعت خراب ہوئی ہے۔ وہ بے دھڑک بیڈروم کی طرف چلا گیا۔ راہداری اور بیڈروم ہر جگہ کی بتیاں روشن تھیں۔ وہ جس وقت بیڈروم میں داخل

ہوا تو کمرے کی ابتر حالت دیکھ کر اس کی سمجھ ہی نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے۔ احمد زمین پر گرے حبیب سعاد کو اٹھانے کی کوششیں کررہا تھا۔ زمین پر خون پھیلا ہوا تھا۔

”رک جاؤ احمد۔“ اس نے آواز دے کر اسے روکتے ہوئے پوچھا۔ ”احمد کیا ہوا ہے؟“

اس وقت وہ ملی جلی زبان میں جو کچھ اسے بتا سکتا تھا اس سے علی کو یہ اندازہ تو ہوگیا کہ کسی نے حبیب سعاد کو مارنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اب بے ہوش ہے۔

”سر مت ہلاؤ احمد، ہوسکتا ہے گردن پر بھی ضرب لگی ہو۔“ احمد کی سمجھ میں بھی علی کی بات آگئی تھی۔ اس نے آہستگی سے حبیب سعاد کو زمین پر لٹا دیا۔

”ڈاکٹر کو بلاؤ احمد۔“

”میں نے ایمرجنسی بٹن دبا دیا ہے وہ چند لمحوں میں پہنچ جائیں گے۔“ واقعی اسے ڈرائیو وے میں کسی بھاری گاڑی کی آمد کی خبر ہوگئی۔

وہ جب ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جاتا تھا تو راستے میں اسے ایمبولینس کا اسٹینڈ بھی ملتا تھا۔ اسے حبیب سعاد نے بتایا تھا کیونکہ اس علاقے میں سفارت کار اور بڑے بڑے صنعت کار رہتے ہیں اس لیے یہاں ایمبولینس اور پولیس فوری طور پر دستیاب ہوجاتے ہیں۔ ہر گھر میں ایمرجنسی بٹن موجود ہیں جس کے دباتے ہی فوری طور پر پولیس اور ڈاکٹر سمیت ایمبولینس آجاتی ہے۔ ایمبولینس کے ساتھ ہی پولیس کی دو موبائل [illegible] بھی ولا میں داخل ہوئیں۔ جتنی دیر ڈاکٹر اور موبائل میں [illegible] نرسنگ اسٹاف نے حبیب سعاد کو فوری اقدامات کرکے [illegible] ایمبولینس میں منتقل کیا۔ پولیس کا انسپکٹر اپنے عملے [illegible] موجود رہا۔ احمد کو انہوں نے بیڈ روم تک رسائی...... کی اجازت دی تھی۔ اس کے بعد احمد کو باہر انتظار کرنے کو کہا۔ دو پولیس [illegible] ہی باہر موجود رہے تھے تاکہ گھر سے کوئی باہر نہ جاسکے۔

ایمبولینس کے ساتھ احمد اور علی بھی جانا چاہتے تھے مگر باہر سپاہیوں نے منع کردیا تھا۔ ”کوئی [illegible] سے باہر نہیں جاسکتا ہے۔ میڈیکل سروس والے اپنا کام کرنا جانتے ہیں۔ انہیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔“ انہوں نے احمد کو سختی سے منع کرتے ہوئے کہا۔

اس وقت علی کو لگ رہا تھا کہ کہیں احمد ہی کو کچھ نہ ہو جائے جس طرح وہ تڑپ رہا تھا اور بچوں کی طرح آقا، آقا کر کے رو رہا تھا اگر اس کا بیٹا اور علی اس کو سہارا دے کر بٹھا نہ دیتے تو شاید وہ بے ہوش ہوجاتا یا کھڑے کھڑے گر جاتا لیکن پولیس والوں کو اس سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔

علی نے مصری پولیس کے مطابق سن رکھا تھا کہ وہ مجرموں کے ساتھ بہت برا سلوک کرتی ہے اور اسکندریہ کی پولیس تو اور بھی سختی کا برتاؤ کرتی ہے۔ اسکندریہ میں شاید اسی لیے جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں اور اس علاقے میں تو بالکل بھی نہیں ہوتے ہیں۔

علی نے پچھلے دو مہینوں میں ایک بار بھی پولیس سائرن کی آواز نہیں سنی تھی اور مصری جیلوں کے متعلق تو سن رکھا تھا کہ وہ عقوبت خانے ہیں جہاں سے فرار بھی ناممکن بات ہے لیکن یہ بھی سنا تھا کہ وہ لوگ جب تک جرم ثابت نہ ہوجائے کسی کو سزا نہیں دیتے ہیں۔ علی کی تو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ حبیب سعاد کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ احمد سے تو کچھ پوچھنا بے کار تھا۔

احمد زمین پر سر پکڑے بیٹھا تھا۔ علی بھی اس کے برابر ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ احمد کا بیٹا اس کے لیے پانی لانا چاہتا تھا مگر پولیس نے اسے روک دیا۔ اس وقت علی ان کے پاس گیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی اور انگریزی میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ احمد کو اس وقت فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔

پولیس کے سپاہی نے بات کو سمجھتے ہوئے اندر اپنے انچارج سے بات کی۔ فون بند کرکے اس نے کسی سے فون پر دوبارہ بات کی۔ اس کے بات ختم کرتے ہی ایک پولیس وین ولا میں داخل ہوئی۔

جب وین کا دروازہ کھلا تو اس کے ساتھ دو نجیم شحیم پولیس والے اپنے کتوں کے ساتھ اترے۔ شاید ان کو اپنے انچارج سے ہدایات مل چکی تھیں اس لیے وہ اپنے کتے لے کر اِدھر اُدھر ہوگئے۔

لیکن دو منٹ کے وقفے سے دوسری ایمبولینس اندر داخل ہوئی۔ ڈاکٹر اور اسٹاف نرس نے احمد کا معائنہ کیا اور احمد کے بیٹے سے پوچھا۔ ”قریب کوئی کمرا ہے تو بتاؤ۔“

احمد کے بیٹے بلال نے آفس کی طرف اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ علی نے ساتھ آنے کی کوشش کی تو انہوں نے بلال اور علی دونوں کو روک دیا اور احمد کو سہارا دے کر آفس میں لے گئے۔

کسی قریب کی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔

بلال نے اٹھنے کی کوشش کی تو سپاہیوں نے ہاتھ کے اشارے

سے روک دیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہی صبح کے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے لیکن بلال اور علی عبداللہ ٹھنڈے فرش پر بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کے ذہن بالکل خالی تھے۔ احمد جس کی وجہ سے بہت ڈھارس بندھی ہوئی تھی اس کی بھی حالت خراب ہو گئی تھی۔

دونوں کتے اور سپاہی واپس آ گئے تھے۔ انہوں نے اب اپنے کتوں کے ساتھ لان اور سوئمنگ پول کا ایک بڑا چکر لیا اور دو کتوں کو واپس وین میں بند کرنے کے بعد لان میں بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ البتہ وہ دونوں سپاہی اپنی جگہ مستعد کھڑے تھے۔

میڈیکل اسٹاف آفس سے نکلا اور اس نے سپاہیوں سے کچھ کہا اور خود جا کر ایمبولینس میں بیٹھ گئے۔ ایک سپاہی نے علی عبداللہ اور بلال کو اندر جانے کا اشارہ کیا اور صوفے پر احمد آنکھیں بند کیے لیٹا تھا اور ایک ڈاکٹر ابھی موجود تھا۔ اس نے ایک گہری نظر علی پر ڈالی پھر بلال کو کچھ ہدایات دے کر تیزی سے باہر چلا گیا۔

ان کے جاتے ہی وہ دونوں کتے والے سپاہی پھر اندر آ گئے۔ انہوں نے پہلے کمرے کا چکر لگایا...... پہلے احمد کو سونگھا پھر علی عبداللہ اور بلال کو سونگھا۔ علی یورپ میں رہ کر آیا تھا۔ وہ کتوں سے اتنا پریشان نہیں ہوتا ہے مگر بلال ناپاک، ناپاک کہہ کر پیچھے ہٹ گیا۔

مگر بلال کی ترکیب کارگر نہ ہو سکی۔ کتے نے اسے آگے بڑھ کر سونگھا بلکہ اس کے کپڑوں تک پر منہ لگایا۔ بلال بڑی حقارت سے اسے دیکھتا رہا۔

ان کے جاتے ہی بلال نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "آج کی نماز بھی چلی گئی۔ اب یہ نجس جانور مجھے مکمل ناپاک کر چکا ہے۔ آج کی رات کتنی منحوس تھی۔ نہ جانے آقا پر کیا گزری ہے۔ ابھی تک معلوم نہیں ہے۔ میرا باپ بھی بیمار ہو گیا ہے۔ ہم دونوں اکیلے لڑکے ان حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دعا کرو اسے جلدی ہوش آ جائے۔ ورنہ ہم کیا کریں گے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم دونوں غیر ملکی ہیں، ہمارا یہاں سوائے خدا اور آقا کے کوئی بھی نہیں ہے۔" وہ رو ہنسا ہو رہا تھا۔

علی عبداللہ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بلال تسلی رکھو احمد ابھی کچھ دیر میں آنکھیں کھول دے گا اور پھر گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس تمام معاملے میں ہم بے قصور ہیں اب دعا یہ کرو کہ حبیب سعاد کو کچھ نہ ہو۔"

"آقا! میں نے اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کمرے میں بہت خون تھا۔ پورے کمرے میں پھیلا ہوا خون خدا کرے آقا بچ جائیں۔" بلال نے جھرجھری لی۔

"ہاں، بہت خون تھا۔ میں نے بھی دیکھا تھا لیکن گولی چلنے کی آواز تو میں نے نہیں سنی۔" علی عبداللہ بہت آہستہ بول رہا تھا تا کہ احمد ڈسٹرب نہ ہو۔

بلال نے علی عبداللہ کے کان کے پاس منہ لا کر کہا۔ "آقا کو [illegible] ہے مگر ہوا کیا مجھے معلوم نہیں ہے مگر میں نے پچھلے دروازے سے کسی کو بھاگتے دیکھا تھا لیکن وہ یکدم نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ بہت پھرتیلا تھا۔"

علی عبداللہ نے کہا۔ "بلال [illegible] بات پولیس کو ضرور بتانا۔"

"جی آقا! میں پولیس کو ضرور بتاؤں گا اگر مجھ سے پوچھیں گے تو، ابھی تو وہ اندر موجود ہیں۔ نہ جانے میری ماں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ میں نے اسے باہر آنے سے [illegible] وہ بالکل معصوم عورت ہے۔ اسے کھانا پکانے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ کوئی اس کی زبان بھی نہیں سمجھ پائے گا۔" بلال کو شاید پہلی بار ماں کا خیال آیا تھا۔

علی عبداللہ نے اس کے کاندھے پر تھپکی دی۔ اسی وقت دروازہ کھول کر پولیس انسپکٹر اندر آیا۔ احمد ابھی تک دوا کے زیر اثر بے خبر سو رہا تھا۔ پولیس کو دیکھ کر بلال اور علی عبداللہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ انسپکٹر نے دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کرسی لے کر بیٹھ گیا۔

دوسرا افسر بھی بیٹھ گیا اور ہاتھ میں پکڑے فائل پر کچھ نوٹس لکھنے لگا۔ افسر نے بلال سے پوچھا۔ "اس گھر میں اور کون کون موجود ہے۔"

بلال نے کہا۔ "پچھلے کوارٹرز میں میری ماں موجود ہے۔"

"کیا تم اس کو لا سکتے ہو۔ ہمیں کچھ سوالات کرنے ہیں۔"

بلال نے اس سے کہا۔ "وہ آپ کی زبان نہیں سمجھ سکتی ہے۔"

انسپکٹر نے نرمی سے کہا۔ "کوئی بات نہیں ہے جو وہ بولے تم ہمیں بتا دینا۔"

بلال سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی انسپکٹر نے علی عبداللہ سے سوالات کرنے شروع کر دیے مگر اس کا

لہجہ نہایت نرم تھا لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ وہ حبیب سعاد کا اسسٹنٹ ہے اور پاکستانی ہے، آج وہ اور حبیب سعاد قاہرہ روانہ ہونے والے تھے تو انسپکٹر نے حیرت سے پوچھا۔ "تم تو پاکستان واپس جانے والے تھے مگر حبیب سعاد کے قاہرہ جانے کا مقصد کیا تھا۔"

علی عبداللہ نے کہا۔ "وہ مجھے قاہرہ سے خدا حافظ کہنا چاہتا تھا وہاں ہمیں ایک منگنی کی تقریب میں شرکت کرنی تھی۔" علی عبداللہ نے جان بوجھ کر ذاتی وجوہات کو بیان کرنے سے گریز کیا تھا۔

اس دوران دوسرا افسر برابر نوٹس لیتا رہا تھا۔

انسپکٹر نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اب جب تک معاملات کلیئر نہیں ہو جاتے اور ہم حملہ آور تک پہنچ نہیں جاتے آپ اسکندریہ نہیں چھوڑ سکتے۔"

علی نے کہا۔ "یقیناً میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اصل فکر مجھے استاد کی ہے۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے۔ یقیناً اچھا نہیں ہوا ہے۔ آپ اگر مجھے ان کے متعلق کوئی خبر دے سکیں تو اچھا ہوگا۔" علی عبداللہ کا اعتماد انسپکٹر کے اچھے رویے سے واپس آ گیا تھا۔

"ہاں کیوں نہیں، یہ تمہارا حق ہے۔ حبیب سعاد زندہ ہیں اور ابتدائی طبی امداد دی جا چکی ہے۔ اب ڈاکٹر آپریشن کی تیاری کر رہے ہیں مگر وہ ہوش میں ابھی بھی نہیں ہیں لیکن میں ایک بات جاننا چاہتا ہوں کہ مادام زرتاش اور تمہارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔"

علی عبداللہ انسپکٹر کے سوال کا مطلب سمجھ گیا۔ علی عبداللہ نے [illegible] اعتماد سے اسے بتایا کہ جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں [illegible] استاد کی بیوی کی حیثیت ایک ماں جیسی ہوتی ہے۔ بے شک وہ کتنی جوان و حسین ہو، دوسری بات یہ ہے کہ میری مادام سے ملاقات بس سرسری سی ہے جس میں، میں نے احترام کو ذہن میں رکھا تھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ استاد نے مادام [illegible] جانے کے بعد مجھے اپنے مہمان خانے میں ٹھہرایا تھا۔ [illegible] اجنبی ملک کے اجنبی شخص کو کون اپنے گھر میں جگہ دیتا ہے۔ [illegible] اس سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔ بیان ختم ہونے کے بعد اس نے علی کے ہاتھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "تم ہمارے برادر ملک کے رہنے والے ہو، ہم نہیں چاہتے کہ تم پریشان ہو لیکن ہماری کچھ قانونی مجبوریاں ہیں۔"

علی کہنے لگا۔ "انسپکٹر صاحب مجھے معلوم ہے مگر میرا ویزا ختم ہو رہا ہے۔ اگر میں یہاں رکتا ہوں تو یہ غیر قانونی ہو گا۔"

انسپکٹر نے بے پروائی سے کہا۔ "یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم اپنا پاسپورٹ مجھے دے دینا میں ہوم آفس سے اجازت دلا دوں گا۔"

گفتگو کے دوران بلال اور اس کی ماں اندر آ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔ عورت بہت سراسیمہ اور پریشان لگ رہی تھی اور مسلسل رو رہی تھی اور روتے ہوئے بار بار احمد کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ بلال اسے کاندھے سے تھامے کھڑا تھا۔ اسی دوران احمد کی آنکھ بھی کھل گئی تھی۔ اب اس کی کیفیت پہلے جیسی نہ تھی۔ انسپکٹر نے عورت سے بلال اور اس کی ماں سے کچھ سوالات کیے پھر دونوں کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مادام کچن میں جا کر اپنے لوگوں کے لیے ناشتا تیار کرو۔ دیکھ نہیں رہی ہو کہ دن کتنا چڑھ آیا ہے اور یہ لوگ تھکے ہوئے اور بھوکے ہیں، اب یہ رونا دھونا بند کرو۔ تمہاری یہ خوب صورت آنکھیں رونے کے لیے نہیں بنائی گئیں۔"

عورت نے اپنے سر پر پہنے اسکارف سے آنکھیں صاف کیں اور مسکراتے ہوئے سب کو خدا حافظ کہا اور اپنے بیٹے کے ساتھ باہر نکل گئی۔ ان کے جاتے ہی انسپکٹر نے احمد سے سوالات شروع کر دیے۔ احمد کی کیفیت پہلے جیسی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

علی عبداللہ سوچ رہا تھا کہ اس نے ابھی تک مادام زرتاش کے متعلق نہیں پوچھا ہے کہ وہ کہاں ہیں لیکن جلدی اس کو جواب مل گیا۔ جب احمد اسے بیڈ روم تک لے کر گیا تھا۔ اسی وقت انسپکٹر اس سے پوچھ چکا تھا کہ حبیب سعاد پر جب حملہ ہوا تھا وہ کمرے میں اکیلا تھا تو ان کی بیگم اس وقت کہاں تھیں تو احمد نے بتایا تھا کہ مادام بیرون ملک گئی ہوئی ہیں۔ اب احمد سے انسپکٹر سارے سوالات اسی روشنی میں کر رہا تھا کیونکہ احمد سارے واقعے کا چشم دید گواہ تھا۔ اس لیے اس سے سوالات کی نوعیت مختلف تھی۔

علی عبداللہ نے انسپکٹر سے اجازت چاہی کہ وہ ابھی تک رات کے کپڑوں میں ہے وہ نہا دھو کر فریش ہو کر آنا چاہتا ہے اور ناشتا کرنے کے بعد اسپتال جانا چاہتا ہے۔

انسپکٹر نے کہا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے مگر تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹا ہے۔ اتنی دیر میں احمد تم بھی فریش ہو کر آ جاؤ۔ میری ڈیوٹی بھی ختم ہونے والی ہے۔ میں اور میرا

اسسٹنٹ اتنی دیر میں رپورٹ تیار کر لیتے ہیں۔ پھر ہمیں اسپتال سے بھی رپورٹ لینی ہے۔ تم دونوں میرے ساتھ ہی چلے چلنا۔"

لیکن جب علی عبداللہ کمرے میں آیا تو آتے ہی اندازہ ہو گیا کہ کمرے کی تلاشی لی گئی ہے مگر صرف اس کے کاغذات وغیرہ کو الٹ پلٹ کیا گیا تھا۔ باقی تلاشی کتوں کے ذریعے کی گئی تھی اب اسے اندازہ ہوا کہ اسے آفس میں کیوں روک کر رکھا گیا تھا۔

علی عبداللہ نے نہا دھو کر کپڑے بدلے اور دوبارہ آفس میں آ گیا۔ احمد اور بلال وہاں پہلے سے موجود تھے اور ناشتے کے لیے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ناشتے میں سوائے ڈبل روٹی اور چائے کے کچھ نہیں تھا۔ احمد نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ناشتا میرے گھر کے کچن کا ہے کیونکہ آقا کے کچن کو بند کر دیا گیا ہے۔ اب وہاں کوئی بھی داخل نہیں ہو سکتا.... اور جو مجھے میسر تھا وہ ہم نے پیش کر دیا ہے۔"

اتنی بات سننے کے بعد بھی انسپکٹر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مستقل اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ کام میں معروف رہا۔ احمد کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ خوف دامن گیر تھا کہ اب کیا ہوگا۔ یقیناً اسے یہ خیال آ رہا تھا کہ آقا نے تو کہا تھا کہ مہمان کی خاطر داری میں کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے۔ وہ خاصا شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔

علی نے ناشتا کرنے سے پہلے احمد سے پوچھا۔ "احمد تم نے ناشتا کیا؟"

"جی آقا! میں کر کے آیا ہوں۔" لیکن علی کو معلوم تھا کہ احمد کے اصولوں میں یہ بھی شامل ہے کہ پہلے گھر کے افراد کھا لیں پھر باقی بچے کھچے پر اس کی فیملی اور اس کا حق ہے۔ علی نے بامشکل تمام ایک سوکھا توس چائے کے ساتھ حلق سے اتارا اور باقی ناشتا احمد کو واپس کر دیا۔ علی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کے پاس بس یہی کچھ تھا جو انہوں نے پیش کر دیا تھا۔

وقت بڑی آہستگی سے گزر رہا تھا۔ گزر کیا رہا تھا کہ رینگ رہا تھا۔ اس حادثے کو گزرے ہوئے بھی چار سے پانچ گھنٹے ہو چکے تھے۔ علی عبداللہ نے پولیس وین میں بیٹھنے سے پہلے پوچھا۔ "انسپکٹر کیا میں اور احمد پولیس کی کسٹڈی میں ہیں؟"

"کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔ یہ سب تمہاری حفاظت کے لیے ہے۔ کچھ تحقیقات کا حصہ ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر بلال اور اس کی ماں کا کیا قصور ہے۔ غریب لوگوں کے گھر میں تو پکانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہو گا۔ کیا آپ بلال کو اتنی اجازت دیں گے کہ وہ بازار سے جا کر کھانے پینے کے لیے کچھ لے کر آ جائے۔"

"ہاں کیوں نہیں مگر صرف کھانے پینے کے سامان کو لانے باہر جا سکتا ہے۔"

علی عبداللہ نے کچھ رقم نکال کر احمد کے ہاتھ پر رکھی تاکہ وہ بلال کو [illegible] دے۔ احمد نے تشکر بھری نظروں سے علی کو دیکھا اور [illegible] بلال کو بلا کر رقم ادا کی اور اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ علی نے انسپکٹر کو بھی اپنا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات دے دیے تھے لیکن جب وہ لوگ اسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو [illegible] ایک ہجوم موجود تھا۔ میڈیا کے نمائندے ہاتھوں میں [illegible] اپنے کیمرے اٹھائے ان کی طرف دوڑ پڑے۔ [illegible] مشکل سے وہ اس ہجوم سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ [illegible] کے جوابات دینے کے لیے رک گیا پھر جلدی میں وہ ان کے ساتھ آ ملا تھا۔

ان دونوں کو ایک سپاہی کے ساتھ ویٹنگ روم میں چھوڑ کر خود Update لینے کے لیے آفس کے اندر چلا گیا لیکن جلدی واپس آ گیا۔ "آپریشن ابھی جاری ہے۔ ہو سکتا ہے ایک گھنٹا اور لگے لیکن میں بہت تھک چکا ہوں۔ میری ڈیوٹی ٹائم بھی ختم ہو رہا ہے لیکن میری مجبوری یہ ہے۔ مجھے میڈیا کو بھی جواب دینا ہے۔ حبیب سعاد ہمارے ملک کی ایک بڑی شخصیت ہیں۔ ان کا بہت نام ہے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اسکندریہ کے لوگوں کو جواب چاہیے کہ ایسا ان کے ساتھ کیوں ہوا ہے۔ ڈاکٹرز بھی پوری کوششیں کر رہے ہیں کہ ان کی جان بچ جائے لیکن ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا ہے۔"

علی نے مڑ کر احمد کی طرف دیکھا۔ وہ ایک طرف آنکھیں بند کیے دنیا سے بے خبر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی جس پر وہ آہستہ آواز میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ انسپکٹر واپس جا چکا تھا۔ اب ویٹنگ روم میں احمد وہ اور ایک سپاہی موجود تھا۔ احمد تو عبادت میں لگا ہوا تھا لیکن علی عبداللہ کے لیے وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا موبائل بھی پولیس کی تحویل میں تھا۔

(جاری ہے)



قیامت صغریٰ

صائمہ اقبال

آفات و بلیات کا سامنا کرنا زندگی کا حصّہ ہے کیونکہ راہِ زیست میں ایسے حادثے رونما ہوتے رہتے ہیں مگر کچھ حادثات ایسے ہوتے ہیں جو برسوں ٹیس دیتے ہیں۔ امریکا کے اس شہر میں بھی ایک قیامت کا سماں تھا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ہنستا بستا شہر تباہی کی زد میں آکر اپنی پہچان کھو دے گا۔ لاشوں کا اس قدر اونچا مینار بن جائے گا لیکن ہونی کو کون روک سکا ہے؟

امریکا میں اس دن موت کا رقص ہوا تھا

شام خنک تھی۔ کچھ دیر پہلے بارش ہوئی تھی۔

بوڑھی عورت نے چادر اپنے گرد لپیٹ لی اور ہاتھ رگڑے۔ اس نے آسمان کی سمت دیکھا جہاں بادل چھائے تھے۔ آسمان میں پرواز کرتے پرندوں میں وہ بوڑھا پرندہ بھی تھا جس سے [illegible] ہو گئی تھی۔ پرندہ جس کی بولی وہ سمجھنے لگی تھی۔

وہ ایک بے گھر بوڑھی عورت تھی۔ گزشتہ ڈھائی برس سے اس کا مسکن سان فرانسسکو کے وسط میں بہتے دریا کے کنارے ایک ٹوٹی ہوئی بینچ تھی۔ اس کا گزر بسر ان سکوں پر ہوتا تھا جو آس پاس سے گزرتے افراد اس کے برتن میں ڈال

جاتے۔ اس نے کبھی بھیک نہیں مانگی، بس یونہی خاموش بیٹھی رہتی۔ اس کے جھریوں زدہ چہرے کے پیچھے ایک پُروقار ماضی تھا، کبھی وہ ایک ڈاکٹر تھی۔ اس کا ایک خاندان تھا۔ محبت کرنے والا شوہر، ایک پیارا سا بیٹا پھر ایک پُراسرار شام ایک ٹریفک حادثے نے اُسے اپنوں سے محروم کر دیا۔

حادثے میں شوہر اور بیٹے کو موت نے آن لیا۔ صرف وہی زندہ بچ سکی۔ سانحے کے بعد وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ ملازمت اور گھر سب خاک ہوا اور پھر اس سڑک کے نزدیک جہاں وہ اپنوں سے محروم ہوئی تھی، اس نے ایک بینچ کو اپنا ٹھکانا بنا لیا جس کے پیچھے دریا بہتا تھا۔

بوڑھی عورت نے گہرا سانس لیا اور تھیلی سے ڈبل روٹی نکالی۔ اس کے سامنے گرم سوپ کا پیالا دھرا تھا، جس کا انتظام والسن نے کیا تھا۔ والسن ایک دراز قد، خوبرو نوجوان تھا، جس نے کبھی اپنی بے روزگاری کو بوڑھی عورت کی مدد کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔

اسے والسن میں اپنا بیٹا نظر آتا تھا مگر وہ اپنی والہانہ محبت کو ہمیشہ چھپاتی۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر قدرت کو خبر ہو گئی کہ وہ والسن کے لیے ایک ماں کے سے احساسات رکھتی ہے تو کہیں وہ اُسے بھی نہ چھین لے۔

عورت نے روٹی کے ٹکڑے کیے۔ اوپر تیرتے بوڑھے پرندے نے اسے دیکھ لیا اور پھڑپھڑاتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ عورت نے روٹی کے چند ٹکڑے زمین پر بکھیر دیے۔ پرندے نے پر پھیلا دیے۔ وہ اترنے کو تھا۔ عورت آگے کو جھکی۔ اس نے سہارا لینے کے لیے ایک ہاتھ زمین پر رکھا، ٹھیک اسی لمحے پرندے نے زمین کو چھوا۔ وہ دونوں ایک ساتھ زمین کے رابطے میں آئے۔

اور تب ایک انوکھا واقعہ رونما ہوا۔ یکدم دونوں میں خوف دوڑ گیا۔

دونوں نے نظریں اٹھا کر ایک دوسرے کی سمت دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں اندیشوں کا بھنور تھا۔ وہ ایک دوسرے کی بولی سمجھتے تھے۔ عورت اور پرندے... دونوں ہی کی بھوک مر گئی تھی۔ زمین نے انہیں ایک پیغام دیا تھا، ایک ہولناک پیغام۔ سان فرانسسکو برباد ہونے والا تھا۔ سب نیست و نابود ہونے کو تھا۔

عورت نے بے بسی سے پرندے کی سمت دیکھا جو ابھی اڑان کی ترکیب بھول چکا تھا اور غم زدہ ہو کر ایک جانب مڑ گیا تھا۔ عورت کی نظر شوربے کے پیالے پر پڑی اور اسے والسن کا خیال آیا۔

نوجوان ابھی چار منٹ پہلے ہی اسے یہ پیالہ سونپ کر گیا تھا، جاتے ہوئے وہ حسب عادت مسکرایا تھا اور اس نے شب بخیر کہا تھا۔

بوڑھی عورت کھڑی ہو گئی اور چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ وہ والسن کی تلاش میں تھی تا کہ اسے مطلع کر سکے کہ قیامت برپا ہونے والی ہے۔

وہ ایک اور بیٹا نہیں کھونا چاہتی تھی۔

☆......☆

ان کے دل [illegible] ساتھ دھڑک رہے تھے، امیدیں ان میں موجزن تھیں۔

جینی کا سر والسن [illegible] کاندھے پر ٹکا تھا۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھے ساحل پر ٹوٹتی لہروں کو دیکھ [illegible] تھے۔ آج وہ مطمئن و مسرور تھے کہ ہر شے نے صحیح سمت اختیار [illegible] تھی۔ والسن کی بے روزگاری کا زمانہ تمام ہوا، اسے بینک [illegible] امریکا میں اسسٹنٹ منیجر کی ملازمت مل گئی تھی۔ بینک کے مالک اے پی گیانینی نے خود اس کا کاندھا تھپکا تھا اور اس کا [illegible] درخشاں قرار دیا تھا۔

والسن کو یقین تھا کہ اب اڑیل، خود پسند انتھونی کے پاس بھی اس کا کاندھا تھپکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

انتھونی فربہی کی جانب مائل، گھنی مونچھوں والا ایک ریٹائرڈ ڈسپیچر تھا، جو ہر وقت پائپ پیتا رہتا اور بڑی رعونت سے بات کرتا مگر والسن اسے برداشت کرنے پر مجبور تھا کیوں کہ یہ شخص جینی کا باپ تھا۔

والسن مطمئن تھا۔ اس نے بوڑھے شخص کی ضد پوری کر دی تھی۔ اب وہ ایک بڑے بینک میں ملازم لگ گیا تھا۔ تنخواہ بھی اچھی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے والسن نے حساب لگایا، آج 17 اپریل 1906 ہے۔ اگلے ہفتے وہ اپنی ماں ایمیلی کے ساتھ لڑکی کے باپ سے ملے گا اور شادی کے لیے اگلے برس اپریل کی تاریخ مقرر کر لے گا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ جینی اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

والسن نے اپنی محبوبہ کو اس ارادے سے آگاہ کیا۔ لڑکی کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ بھی ایسے ہی منصوبے بنائے بیٹھی تھی۔ انہوں نے دو محبت کرنے والے نوجوانوں کے مانند ایک دوسرے کو بوسہ دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

والسن جینی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جینی نے پلٹ کر

اُسے الوداع کہا اور بھیڑ میں غائب ہو گئی۔ لڑکا اپنے گھر کی سمت چل پڑا، جو مضافاتی علاقے میں تھا۔

وہ جیب میں ہاتھ ڈالے اپنی دھن میں مگن، سیٹی بجاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ زیر زمین کوئی شے حرکت کر رہی ہے۔ کہیں گہرائی میں کچھ رونما ہو رہا ہے۔ وہ حساب کتاب کر رہا تھا کہ اسے کتنے دن بعد بوڑھے انتھونی سے ملنا چاہیے؟ اور جب وہ اس سے ملے گا، تو کیا کہے گا؟

اچانک اُسے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ اس نے سر اٹھایا۔ وہ ایک پرندہ تھا۔ وہ مضطرب تھا۔ لگتا تھا، ابھی تھک کر گر پڑے گا۔

لڑکے نے اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر پرندے نے اس کا تعاقب جاری رکھا، اس نے سر جھٹکا مگر پرندہ اس کے سر پر منڈلاتا رہا۔

وہ الجھن کا شکار ہو گیا۔ ابھی وہ اسے بھگانے کا کوئی طریقہ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ اسے اپنی ماں ایمیلی کے کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے۔ ”ہر پرندہ ایک پیغام کا حامل ہوتا ہے، اس پیغام کو سمجھنا چاہتے ہو تو اپنے دل وا کر لو۔“

والسن نے گہرا سانس لیا اور پنچھی پر توجہ مرکوز کی۔ اسے احساس ہوا جیسے وہ اسے کہیں دیکھ چکا ہے۔ شاید وہ اجنبی نہیں۔ شاید وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

زیر زمین حرکت کرتے موت کے اژدہا نے جب دیکھا کہ [illegible] نے پرندے کو پہچان لیا ہے تو وہ زور سے دہاڑا۔ والسن [illegible] چرانے کی آواز سنائی دی۔ اس نے اپنے دائیں سمت دیکھا۔

ایک حادثہ رونما ہوا تھا۔ ایک کار نے بے دھیانی میں سڑک پار کرتی بوڑھی عورت کو [illegible]نڈ ڈالا تھا۔

وہ عورت، جو اب سڑک پر [illegible] رہی تھی، کوئی اور نہیں وہی بوڑھی گداگر تھی، جو والسن کو اپنا بیٹا خیال کرتی تھی۔ وہ لڑکے کو دیکھ کر تیزی سے دوڑی اور کار [illegible]

عورت کو اس حال میں دیکھ کر پرندے [illegible] باریک سی چیخ برآمد ہوئی، وہ اُس ہجوم کی سمت چلا گیا بوڑھی عورت کے گرد اکٹھا ہو گیا تھا۔

والسن بھی بھاگا بھاگا پہنچا۔ عورت کی حالت بہت نازک تھی۔ اس نے عورت کا زخمی سر اپنی گود میں لے لیا۔ عورت کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی اس افتاد سے آگاہ کرنا چاہتی تھی، جو اس شہر پر ٹوٹنے والی تھی، خبردار کرنا چاہتی تھی مگر اس کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ چند لمحوں بعد اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور والسن کو یوں لگا، جیسے اس نے اپنی ماں کو کھو دیا ہو۔

اس نے عورت کی لاش کو ایک بینچ پر لٹا کر اس پر کپڑا ڈال دیا۔ والسن نے فون بوتھ سے ڈاؤن ٹاؤن پولیس اسٹیشن فون کیا اور انہیں واقعے سے آگاہ کیا۔

یہ اس رات پولیس کو موصول ہونے والی آخری معمول کی کال تھی۔ 18 اپریل کو قیامت برپا ہونے والی تھی۔

والسن نے ایک نظر بوڑھی عورت پر ڈالی جو بے روح ہو چکی تھی مگر لگتا تھا کہ اب بھی وہ بے چین ہے۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔

”کیا یہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی یہاں آئی تھی؟“ اس نے خود سے سوال کیا، پھر یہ خیال جھٹک دیا۔ اسے سائرن کی آواز سنائی دی۔ پولیس وین قریب آ رہی تھی۔ وہ اپنی راہ ہو لیا۔ اس کے جانے کے بعد بوڑھا پرندہ کچھ دیر عورت کی لاش پر منڈلاتا رہا اور پھر آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گیا۔

زیر زمین موت کا اژدہا پھنکارا اور پورے سان فرانسسکو میں خنکی کی لہر دوڑ گئی۔

☆......☆

سان فرانسسکو شہر شمالی کیلی فورنیا کا دل ہے۔ کاروبار، آرٹ اور فیشن کا مرکز۔ امریکا کا تیرہواں بڑا شہر۔ ساحلی پٹی پر واقع ایک خوب صورت شہر، جو خوابوں کا جزیرہ کہلاتا ہے۔

البتہ اسی سان فرانسسکو کی زمین میں۔ کہیں گہرائی میں ایک آسیب کا بسیرا ہے، جو انسان کا دشمن ہے اور تباہی سے قوت حاصل کرتا ہے۔

سان فرانسسکو لگ بھگ چھ سو میل لمبی سان اینڈریاس فالٹ پر واقع ہے۔ براعظم شمالی امریکا کے مغربی تہائی حصے کے نیچے موجود ٹیکٹونک پلیٹوں میں ایک خلا ہے جو اندازوں کے مطابق شمالی مغربی کیلی فورنیا سے خلیج کیلی فورنیا تک پھیلا ہوا ہے۔

یہ ٹیکٹونک پلیٹیں مستقل حرکت میں رہتی ہیں، البتہ اگر یہ ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں تو زمین پر موجود انسان دہل جاتا ہے اور عمارتیں لرز جاتی ہیں۔

سان فرانسسکو کی بنیاد رکھنے والے، اسے تعمیر کرنے والے، وہاں بسنے والے اس جغرافیائی خطرے سے واقف تھے۔ سو انہوں نے حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے، زلزلے کا دلیری سے مقابلہ کرنے والی جدید عمارتیں، کرائسس سے نمٹنے کا معقول انتظام، ترتیب یافتہ ریسکیو اہل کار، باشعور شہری مگر

18 اپریل 1906 کی صبح کچھ مختلف تھی۔
پو پھٹنے سے قبل بہت سی تتلیاں خلیج سان فرانسسکو اور بحر الکاہل کے پانیوں پر مردہ پائی گئیں۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں برسوں بعد عظیم الشان گولڈن گیٹ برج تعمیر ہونا تھا۔
مینڈک زمین سے باہر نکل آئے، مچھلیوں نے اپنے متعین راستے تبدیل کیے اور دُور دیسوں سے آئے پرندوں نے سان فرانسسکو کے پُرسکون پیڑوں کو پیچھے چھوڑ دیا، ان سب کو اس المیے کی خبر مل گئی تھی جو رونما ہونے کو تھا۔
مؤرخین متفق ہیں کہ گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں کئی بڑے سانحے پیش آئے۔ طوفان، آتش زدگی، زلزلے، خانہ جنگی مگر کوئی جدید شہر کسی بھی افتاد سے مکمل تباہ نہیں ہوا۔ اسے جزوی نقصان ضرور پہنچا مگر کوئی آفت اسے کھنڈر نہ کر سکی۔
بڑے شہر کسی نہ کسی طرح افتاد کا مقابلہ کر ہی لیتے ہیں مگر 18 اپریل 1906 کی ہولناک صبح انسانی تاریخ ایک جدید ترقی یافتہ شہر کو کھنڈر میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھنے والی تھی۔

☆......☆

جب والسن گھر پہنچا، رات کے نو بج چکے تھے اور اس کی ماں ایملی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔
"کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک ہے ناں؟" عورت کے لہجے میں اضطراب تھا۔ والسن چونکا اور نظریں چرانے لگا۔
لڑکا جانتا تھا کہ ماں کو حادثات کی پہلے ہی خبر ہو جاتی ہے اور پھر وہ پریشان ہو ہو کر خود کو ہلکان کر لیتی ہے، اسی لیے گھر میں داخل ہونے سے قبل اس نے بوڑھی گداگر کے ایکسیڈنٹ کا معاملہ چھپانے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر ایملی کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا۔
"کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ کھانا تیار ہے؟" لڑکے نے نارمل رہنے کی کوشش کی مگر عورت کا اضطراب کم نہیں ہوا۔
"کچھ تو ہوا ہے۔ میرا جی بہت گھبرا رہا ہے۔ سوچ رہی ہوں، بیسی کی طرف جانے کا ارادہ ملتوی کر دوں۔" اس نے دانت ناخن سے کترتے ہوئے کہا۔
والسن نے گہرا سانس لیا اور خود کو کرسی کے حوالے کر دیا۔ بیسی اس کی خالہ تھی جو سان فرانسسکو کے مضافات میں مقیم تھی۔ طبیعت کی خرابی کے باعث اس نے اپنی بہن ایملی کو بلا بھیجا تھا۔ والسن کو خدشہ لاحق ہو گیا کہ اگر اس نے خود کو ذرا بھی پریشان ظاہر کیا، تو ماں خالہ کے پاس جانے کا ارادہ ملتوی کر دے گی۔ اس نے اپنے لہجے کو خوش گوار بناتے ہوئے کہا۔ "جینی بہت خوش تھی۔ اگر سب ٹھیک رہا تو میں اگلے ہفتے اس کا ہاتھ مانگ لوں گا۔"
"اچھا، یہ تو اچھی خبر ہے۔" عورت نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔
"ہاں، اور اگلے برس ہم شادی کر لیں گے۔" لڑکا ہنسا۔ "آپ خالہ بیسی کو یہ خبر سنا دیجیے گا اور میری ملازمت کی خوش خبری بھی۔"
"او ہاں...... ضرور......" عورت نے یوں جواب دیا جیسے اس کا [illegible] اور ہو۔
والسن نے [illegible] نظروں سے اپنی ماں کا جائزہ لیا اور ٹھوس لہجے میں کہا۔ "ٹرین کے جانے میں ڈیڑھ گھنٹا ہے، آپ نے سامان پیک کر لیا ہے، میرے ساتھ ڈنر کر لیں، پھر ہم چلے چلیں گے۔"
عورت جانا نہیں چاہتی تھی، یہ بات اس کے چہرے سے عیاں تھی مگر اس نے بحث نہیں کی اور بڑبڑاتے ہوئے کام میں لگ گئی۔ والسن اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ایک گھنٹے بعد وہ ٹیکسی کر کے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔
والسن نے اپنی ماں کو گاڑی میں سوار کروایا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ ایک دوسرے کو الوداع کہتے ہوئے ماں بیٹے کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ انہیں دوبارہ ملنے کے لیے کتنا تڑپنا پڑے گا۔
جب والسن اسٹیشن سے باہر نکلا تو بری طرح تھک چکا تھا۔ اسی تھکن کے باعث اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے چھائی دھند کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی اور کالر کھڑے کر کے ہاتھ جیب میں ڈال لیے۔ اُس نے اپنی محبوبہ جینی کی بابت سوچا اور دھیرے سے مسکرایا۔
شہر سان فرانسسکو پر رات اتر چکی تھی۔ ایک قیامت خیز صبح دھیرے دھیرے شہر کی سمت بڑھ رہی تھی۔

☆......☆

آسمان پر سرخ کہر چھا گیا، ایک قوی الجثہ پرندہ آسمان سے اترا۔ اس کی آنکھوں میں خون تیر رہا تھا۔
پرندہ ایک عمارت سے ٹکرایا، تو عمارت زمین بوس ہو گئی۔ بجلی کے تار ٹوٹ گئے۔ اگلے ہی پل زمین نے آگ اگلنا شروع کر دی۔
آگ بھڑک اٹھی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور جینی اڑ کر دُور جا گری۔
جھٹکے سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ لڑکی نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ وہ پسینے میں شرابور تھی اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ وہ دوڑی دوڑی اپنے باپ کے کمرے میں گئی۔ انتھونی بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ جینی نے گھڑی دیکھی، تو رات کے تین بج رہے تھے۔ اسے یکدم شدید پیاس محسوس ہوئی۔ اس نے نل کے نیچے گلاس رکھا اور پانی بھرنے لگی۔
پانی پیتے ہوئے اسے ذائقہ اجنبی لگا۔ اس نے پانی کو غور سے دیکھا، اس کی رنگت سرخی مائل تھی۔ اس نے والسن کے بارے میں سوچا۔ لڑکی کے دل میں اُس سے فوری ملنے کی خواہش جاگی۔ وہ الجھن کا شکار ہو گئی اور گھر سے باہر نکل آئی۔ باہر خنکی اور دھند اس کی منتظر تھی۔ آسمان مکمل طور پر تاریک تھا۔ کوئی قوی الجثہ پرندہ نہیں تھا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ سونے کی کوشش کی، مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ لڑکی نے چارلس ڈکنز کا ایک ناول اٹھا لیا۔ اس نے سوچا، آج صبح جلدی اسکول چلی جائے گی۔
جینی سے دس میل دور...... مضافاتی علاقے کے ایک سادہ سے گھر کی پہلی منزل پر موجود والسن بھی بے خوابی کا شکار تھا۔ اس نے ہر جتن کر لیا، مگر نیند نہیں آئی۔ ذرا دیر کو غنودگی طاری ہوئی تو اس نے ایک اژدہا دیکھا جس نے شہر کو جکڑ رکھا [illegible]
وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کافی تیار کی اور ایک کتاب پڑھنے لگا۔ وہ کتاب چودھویں اور پندرھویں صدی میں برطانیہ میں پھیلنے والی پراسرار [illegible] اور بیماری سے متعلق تھی، جس میں تیس لاکھ افراد اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ شاہی خاندان کے بچے بھی اس کی لپیٹ [illegible] اور پورے خطے میں سنسنی پھیل گئی۔
ساڑھے چار بجے اس نے کتاب بند کر دی۔ شاور لینے کے بعد اس نے ناشتا تیار کیا اور خاموشی [illegible] پر بیٹھ کر کھاتا رہا۔ ساڑھے پانچ بجے وہ تیار ہوا اور گھر سے نکل آیا۔
اس نے اندازہ لگایا کہ چہل قدمی کرتے ہوئے وہ آدھے گھنٹے میں بینک آف امریکا کی اس برانچ تک پہنچ جائے گا، جہاں وہ تازہ تازہ ملازم ہوا ہے۔ کچھ دیر وہ پارک میں ہوا خوری کرے گا، قریبی لائبریری میں اخبار پڑھے گا، کبوتروں کو دانا ڈالے گا اور ساڑھے سات تک بینک میں داخل ہو جائے گا۔
سورج نکل آیا تھا۔ زندگی کے ابتدائی آثار ظاہر ہونے لگے۔ والسن جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلا جا رہا تھا۔ سامنے سے ایک شخص اپنے کتے کو لیے آرہا تھا۔
خلاف توقع کتا ایک جگہ ٹھہر گیا اور دیوانوں کی طرح زمین کو سونگھنے لگا۔ آدمی نے بڑا زور لگایا مگر کتا اس جگہ سے نہیں ہلا اور زمین سونگھتا رہا۔ والسن نے اس منظر کو تو نظر انداز کر دیا مگر چند قدم آگے بڑھنے کے بعد اُس نے ایک بلی کی لاش دیکھی جسے کسی گاڑی نے کچل دیا تھا۔
اس کا ذہن اس بوڑھی گداگر کی سمت چلا گیا جس کا کل ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ والسن نے سر جھٹک دیا۔ وہ پارک کے پاس پہنچ گیا تھا۔ یہ نسبتاً کھلا علاقہ تھا۔ اس نے پائپ نکال کر بھرا اور منہ سے لگا لیا۔ اس نے دو کش لیے۔ تمباکو ترش اور تیز تھا۔
اس نے پول سے سر ٹکا لیا۔ ایک اور کش لیا اور ٹھیک تب، زیر زمین کچھ ہولناک رونما ہوا۔ موت کے عفریت نے انگڑائی لی اور پوری قوت سے دہاڑا۔
والسن کی آنکھوں کے سامنے منظر دھندلا گیا اور اسے متلی محسوس ہوئی۔ اس کا سر چکرایا۔ وہ سمجھا کہ یہ تمباکو کا اثر ہے مگر اس کی غلط فہمی جلد زائل ہو گئی۔ اس نے سڑکوں کو یوں تھرکتے دیکھا، جیسے پانی میں لہریں اٹھتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سیلاب نے شہر کو آلیا ہے مگر وہاں پانی کہاں تھا، وہاں تو موت تھی۔
آس پاس کی عمارتیں یوں لرزنے لگیں، جیسے کاغذ کی بنی ہوں۔ کہیں دور دھماکے سنائی دیے۔ اچانک ڈھول اٹھنے لگی۔
دھرتی تیس سیکنڈز تک بری طرح کانپتی رہی۔ صدمے سے وہ زمین پر گر گیا۔
والسن نے دیکھا، سامنے والی چار منزلہ عمارت چند سیکنڈز میں زمین بوس ہو گئی۔ وہ اتنی قریب تھی کہ اس کی گرد نے والسن کو اندھا کر دیا۔
تیس سیکنڈز بعد چند پلوں کا وقفہ آیا۔ والسن نے کھڑا ہونے کی کوشش کی مگر یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ یکدم زمین پھر تھرکنے لگی۔ اس بار جھٹکے پچیس سیکنڈ جاری رہے اور یوں صرف ایک منٹ میں سان فرانسسکو نیست و نابود ہو گیا۔
زمین پر گرے گرے والسن کو زوردار دھماکے سنائی دیے۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ یہ بارود پھٹنے کی آواز ہے یا کچھ اور۔ اس نے دائیں جانب فٹ پاتھ پر دھماکے سے شگاف پڑتے دیکھا۔ ایک اور عمارت زمین بوس ہو گئی۔ اس نے آنکھیں ملیں۔ سامنے ایک لاش پڑی تھی۔ وہ ایک جوان عورت تھی،

جس کا منہ حیرت اور صدمے سے کھلا ہوا تھا۔ شاید وہ یوں پلوں میں مرجانے پر حیرت زدہ تھی۔

چوک کے پاس ایک آٹھ منزلہ عمارت تھی، جس میں زلزلے سے دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ جھٹکے تھم گئے تھے، بحران کا وار گہرا اور گھاتک تھا۔ مخدوش عمارت تیزی سے بکھرنے لگی۔ اس کی اوپری منزل سے لاشیں یوں گر رہی تھیں جیسے چھلکتے ہوئے گلاس سے پانی کے قطرے گرتے ہیں۔

ہر طرف چیخ و پکار اور گریہ تھا۔ گرد مٹی نے انسان کو انسان سے کاٹ دیا۔ ہر طرف دھماکے سنائی دے رہے تھے۔ زلزلے سے شہر کی گیس پائپ لائنز پھٹ گئی تھیں۔ انہوں نے عمارتوں اور سڑکوں میں شگاف ڈال دیے۔

گیس نے چند ہی لمحوں بعد شعلہ پکڑ لیا اور سان فرانسسکو میں پچاس سے زائد مقامات پر ہولناک آگ بھڑک اٹھی۔

اس سے قبل کہ شہر سمجھ پاتا کہ کیا سانحہ رونما ہوا ہے، موت نے اُسے پوری طرح گھیر لیا تھا۔

☆......☆

جینی نے پھر وہی منظر دیکھا جس نے اُس کی رات غارت کی تھی۔

آسمان سے ایک قوی الجثہ پرندہ اترا جس کے پروں سے ٹکرا کر عمارتیں ڈھتی گئیں۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارے سی تھیں اور اس کے منہ سے شعلے نکلتے تھے۔ پرندے نے ایک جھپٹا مارا اور اس کے باپ انتھونی کو دبوچ لیا۔

جینی زور سے چلائی مگر آواز گھٹ گئی۔ وہ تخیل سے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی۔ نہ تو کوئی پرندہ تھا، نہ ہی اس کا باپ انتھونی... بس ہر طرف دھول تھی اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب زلزلے نے سان فرانسسکو پر حملہ کیا، جینی اسکول کے میدان میں کھڑی تھی۔

زمین تھرکی، تو جینی کئی فٹ اوپر اچھل کر سڑک پر آن گری۔ اس کے حواس کھونے لگے اور تب اس نے جاگتی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا جو گزشتہ رات اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ اسے اپنے باپ کی فکر ستانے لگی۔

وہ اٹھی، تو احساس ہوا کہ اس کا دایاں پیر شدید زخمی ہے۔ سر سے بھی خون بہہ رہا تھا اور آنکھیں بے طرح جل رہی تھیں۔

اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اسکول کی ایک دیوار گر گئی تھی۔ لیبارٹری والی بلڈنگ کی چھت اڑ گئی اور ایک جانب سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

اس نے اپنے حواس بحال کیے۔ مرکزی عمارت سے اسے چیخیں سنائی دیں۔ اس نے سوچا، بچے تو ابھی اسکول پہنچے نہیں، ضرور اسٹاف کے ارکان ہوں گے۔

اس نے ان کی مدد کے ارادے سے اٹھنا چاہا مگر تکلیف نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس ... ادا کیا۔

اُدھر ... میلوں دور اس قصبے میں بھی خفیف سے جھٹکے محسوس کیے گئے، جہاں واٹسن کی ماں ایمیلی ٹھہری ہوئی تھی۔ گو زمین بس چند سیکنڈ کو دھیرے سے لرزی تھی اور قصبہ کی معمول کی زندگی متاثر نہیں ہوئی، مگر ایمیلی پر اندیشوں نے حملہ کر دیا۔ اسے شدید گھبراہٹ ... اور وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ اس کی بہن بیسی نے بے چینی کا سبب پوچھا، تو کہنے لگی کہ اسے واٹسن کی فکر لاحق ہو گئی ہے۔ بیسی نے بہت سمجھایا مگر اس کی پریشانی کم نہیں ہوئی۔

"پڑوس میں ٹیلی فون ہے، ہم اس کے دفتر فون کر لیتے ہیں۔" آخر بیسی نے تجویز دی۔

ایمیلی نے سر ہلا دیا۔ کچھ دیر بعد دونوں عورتیں مسز جوزف کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں۔ مسز جوزف نے آنکھوں میں نیند لیے دروازہ کھولا اور ناپسندیدگی سے انہیں دیکھا۔

فون کرنے کی اجازت لینے کے لیے بیسی کو باقاعدہ درخواست کرنی پڑی۔ بالآخر اس نے اجازت دے دی مگر متعدد کوششوں کے باوجود سان فرانسسکو سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ یوں لگتا تھا، جیسے ٹیلی فون لائنز کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

آخر میں بیسی نے قصبے کے فون ڈیپارٹمنٹ کا نمبر ملایا۔ وہاں سے اُسے جو اطلاع ملی، اسے سن کر اس کا رنگ اڑ گیا اور ریسیور ہاتھ سے گر گیا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" مسز جوزف جھنجلا کے ریسیور اٹھانے بڑھی مگر اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ بیسی بھی اپنی توانائی کھو چکی ہے۔ صدمے سے وہ زمین پر آرہی تھی۔ ایمیلی اسے سنبھالنے آگے بڑھی۔

"کیا ہوا بیسی؟ بتاؤ مجھے کیا ہوا؟" اس کے لہجے میں خدشات تھے۔

"زلزلہ......" وہ بہ مشکل کہہ سکی۔ "شدید زلزلہ......"

مسز جوزف نے سنا تو فوراً ریڈیو آن کر دیا۔ براڈ کاسٹر ... بتا رہا تھا۔ سان فرانسسکو میں 8.8 شدت کا ہولناک زلزلہ آیا تھا۔ کئی عمارتیں تباہ ہو چکی تھیں اور شہر میں متعدد جگہوں پر آگ بھڑک اٹھی تھی۔

"شہر میں بجلی کا نظام معطل ہو گیا ہے۔" نیوز کاسٹر نے بتایا۔ "ٹیلی فون لائنز بھی ڈیڈ ہو گئیں۔ انتظامیہ نے ایمرجنسی نافذ کر دی ہے۔"

"خدایا۔" ایمیلی نے لرزتے ہوئے آسمان کی سمت دیکھا۔ "میرے بیٹے کی حفاظت کرنا۔"

☆......☆

واٹسن جانے کب سے دوڑ رہا تھا۔

اس کا سانس پھول گیا، حواس کھونے لگے مگر اس نے دوڑنا جاری رکھا۔ وہ جینی کی تلاش میں تھا۔ وہ اس کے گھر کی سمت جا رہا تھا مگر دوڑتے دوڑتے اسے ادراک ہوا کہ وہ اپنی سمت کھو بیٹھا ہے۔ وہ رک گیا۔ اس نے ایک بار پھر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لاکھوں افراد عمارتوں میں پھنس گئے تھے۔ مکانات سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ دور کہیں دھواں اٹھ رہا تھا۔

وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ اس نے سامنے موجود دکان کے ملبے تلے چند لاشیں دیکھیں، جنہیں شہریوں نے اپنی مدد آپ کے تحت نکالا تھا۔ جلد ہی سائرن چنگھاڑنے لگے۔ چند اہل کار اس کے نزدیک سے گزرے۔ ایک شخص نے رک کر اُس کا احوال پوچھا۔

"... میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ "کیا میں ... لوگوں کی مدد کر سکتا ہوں؟"

ریسکیو اہل کار نے ... بات نہیں سنی۔ وہ شخص ہجوم کی سمت چلا گیا، جس نے اُس کے دیگر ساتھیوں کو گھیر رکھا تھا۔ لوگ ریسکیو اہل کاروں پر برے طرح برس رہے تھے۔ انہیں شکایت تھی کہ وہ بہت دیر سے پہنچے، ان کا مطالبہ تھا کہ فوری طور پر فائر فائٹرز کو بلایا جائے، عمارتوں میں پھنسے ہوئے افراد کو نکالا جائے اور آگ بجھائی جائے۔

"پورے شہر میں آگ لگی ہوئی ہے۔" آخر سینئر اہل کار نے جھنجلا کر کہا۔ "اگر پورے کیلی فورنیا سے بھی ریسکیو ٹیمیں آجائیں، تب بھی ناکافی ہوں گی۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو...... کام چوری کی انتہا ہو گئی...... ہمارے بچے مر رہے ہیں اور تم ہڈ حرامی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔" مجمعے سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔

"خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔" سینئر اہل کار کی آواز میں اتنا کرب تھا کہ شور تھم گیا۔ اہل کار نے گہرا سانس لیا۔ "میرے اپنے بچے جانے کس حال میں ہوں گے، جانے وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں، مگر میں یہاں موجود ہوں۔ آپ لوگوں کی مدد کرنے کے لیے۔ براہ مہربانی تعاون کریں۔"

آخری الفاظ کہتے ہوئے اُس کی آواز رندھ گئی۔ سب نے اس کا درد محسوس کیا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ "بدقسمتی سے زلزلہ اتنا شدید تھا کہ پانی کی لائنیں پھٹ گئی ہیں۔ فائر ٹینڈرز پانی کے بنا ناکارہ ہیں۔"

"تو پھر...... یہ ہولناک آگ کیسے بجھے گی؟" یہ واٹسن کے الفاظ تھے، جو سامنے موجود ایک کثیر المنزلہ عمارت کی سمت اشارہ کر رہا تھا۔ سب نے بے بسی سے عمارت کی طرف دیکھا، جس سے سیاہ دھواں اٹھ رہا تھا۔

اگلے ہی لمحے ان کی بے بسی خوف میں بدل گئی کیوں کہ عمارت کی اوپری منزل میں زوردار دھماکا ہوا تھا۔ گیس لائن میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔

انہوں نے بالکونی میں ایک عورت کو دیکھا، جس کے ہاتھ میں ایک بچہ تھا۔ ریسکیو اہل کار عمارت کی سمت دوڑے۔ انہوں نے جال اٹھا لیا۔ لوگ حیرت اور خوف سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ اوپر کھڑی عورت بری طرح لرز رہی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے روتے ہوئے بچے کو نیچے پھینک دیا۔

یوں لگتا تھا، جیسے وہ چند سیکنڈز صدیوں پر محیط ہوں۔ سب دم سادھے اس معصوم روتے ہوئے بچے کو آسمان سے گرتے دیکھتے رہے۔ وہ سیدھا ریسکیو جال میں آن گرا۔ ایک اہل کار نے بچے کو سنبھال لیا۔

اب لوگ اس عورت کی حوصلہ افزائی کرنے لگے کہ وہ بھی بالکونی سے کود جائے۔ عورت کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے پیچھے دھواں کے بادل تھے۔ اس کا خوب صورت چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا۔

آخر اس نے چھلانگ لگا دی، مگر گھبراہٹ میں صحیح اندازہ نہیں کر سکی۔ وہ ریسکیو جال تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک بالکونی کی ریلنگ سے ٹکرا گئی۔ اس کا سر پاش پاش ہو گیا۔

لوگ غم اور صدمے سے اس خوب رو عورت کی لاش کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ انہیں سانپ سونگھ گیا تھا۔ منظر میں فقط اس کے معصوم بچے کی دل دوز چیخیں تھیں۔

واٹسن کچھ دیر روتا رہا۔ یا شاید وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ جب کچھ سنبھلا، جب اس کی نظر ایک سائن بورڈ پر پڑی، جس پر مارٹن اسکول کی سمت جانے والی سڑک کی نشان دہی کی

گئی تھی۔ اسے جینی کا خیال ہوا۔ وہ اسی اسکول سے وابستہ تھی۔

"وہ ضرور اسکول میں ہوگی۔" اس نے آستین سے آنسو پونچھے۔ اس نے اسکول کی سمت جاتے راستے پر نظر ڈالی۔ کئی جگہ سے سڑک ادھڑ گئی تھی، کئی جگہ ملبا پڑا تھا جس کے نیچے لاشیں تھیں، منظر دھویں سے بھرا ہوا تھا اور اسے یہ آگ کا دریا عبور کرنا تھا تاکہ جینی تک پہنچ سکے۔

☆......☆

بلڈنگ میں داخل ہوتے ہی جینی کی نظر سوزین اور ونسیلٹ پر پڑی۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ عمارت کے نسبتاً کھلے حصے میں چند اور اساتذہ موجود تھے، ان میں سے کچھ زخمی تھے۔ کچھ بہ ظاہر بھلے چنگے تھے مگر اس کی ذہنی حالت سانحے کی خبر دیتی تھی۔

"سب موجود ہیں؟" جینی نے سوال کیا۔

"سب کون؟" سوزین یوں چونکی، جیسے اب تک اس نے اس بابت سوچا ہی نہ ہو۔ "وہ مس لیورین اور...... وہ کیمسٹری کی ٹیچر...... مس مولر دکھائی نہیں دے رہیں۔"

"میں نے...... زلزلے سے پہلے مولر کو لیب کی سمت جاتے دیکھا تھا۔" جینی نے کہا۔ بنا کچھ کہے تینوں عورتیں لیب کی طرف چل دیں۔ لیب کی حالت بہت خستہ تھی۔ ریک گر چکے تھے، میزیں الٹ گئی تھیں۔ مرتبان زمین پر گر کر ٹوٹ گئے تھے۔ ایک کونے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

انھیں مس مولر ایک کونے میں پڑی دکھائی دی۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش تھی۔ وہ تینوں بمشکل اسے کھینچ کر لیب سے باہر لائے۔ اسے دیگر ٹیچرز کو سونپ کر وہ مس لیورین کی تلاش میں نکلیں۔

مس لیورین کالج کی ہر دل عزیز ٹیچر تھی۔ وہ بے اولاد تھی مگر اس غم کو اس نے اپنی طاقت بنا لیا۔ وہ سب سے خلوص اور محبت سے پیش آتی اور ہر ایک کے لیے دعا کرتی۔ یہی سبب ہے کہ نہ صرف طلبا بلکہ دیگر اساتذہ بھی اُسے بہت چاہتے تھے۔ وہ انتہائی شفیق اور ملنسار عورت تھی۔

"وہ لائبریری کی سمت گئی تھیں۔" کسی نے جینی کو بتایا۔

لائبریری اوپری منزل پر تھی۔ جینی زینے کی سمت بڑھی تو سوزین نے اسے روک لیا۔

"زینے میں شگاف پڑ گیا ہے۔" اس کے لہجے میں خوف تھا۔ "اور اوپر سے دھواں بھی اٹھ رہا ہے شاید آگ لگ گئی ہے۔"

جینی نے سر اٹھایا۔ اوپری منزل سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس نے زینے کا جائزہ لیا۔ وہ درمیان سے چٹخ گیا تھا۔ اس نے دو تین مرتبہ مس لیورین کو پکارا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔

"شاید وہ...... مر چکی ہوں۔" سوزین نے بہ مشکل کہا۔

جینی اندیشوں میں گھری تھی، وہ تذبذب کا شکار تھی اور فیصلہ کرنے کی قوت کھوتی جا رہی تھی۔ مایوسی کی سیاہی یلغار کرنے لگی مگر تب روشنی ہوئی۔ اسے اپنے گرجے کے پادری کی ایک بات یاد آئی۔

"جب ہم الجھن کا شکار ہوتے ہیں تو ہم شیطان کا آسان ہدف بن جاتے ہیں، فقط مستحکم فیصلہ ہی ہمیں خدا تک لے جا سکتا ہے۔"

"مجھے کیا کرنا چاہیے؟" جینی نے آنکھیں بند کر کے اپنے دل سے پوچھا۔ جواب فوراً آیا۔ اسے لیورین کو ہر صورت بچانا تھا۔

اس نے بال باندھ لیے۔ ایک چادر لی اور قریبی تالاب سے بھگو کر اپنے گرد لپیٹ لیا تاکہ آگ سے حتی الامکان محفوظ رہے۔

"یہ...... یہ کیا کر رہی ہو؟" سوزین کے لہجے میں خوف بھی تھا اور حیرت بھی۔

"میں مس لیورین کو لینے جا رہی ہوں۔" جینی نے اس اعتماد سے کہا جو پہاڑ کو بھی ہلا سکتا تھا۔

☆......☆

ایک پھنکار سنائی دی۔

والسن نے چونک کر دائیں بائیں دیکھا مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا مگر پھر پھنکار سنائی دی۔ اسے لگا، زیر زمین، عین اس کے قدموں کے نیچے کوئی سانپ موجود ہے، جو منتظر ہے کہ جونہی وہ تھکن کا شکار ہو، اسے دبوچ لے۔

عجیب سا رنگین دھواں اس کے سامنے دیوار بن گیا۔ دھواں سامنے والی بلڈنگ سے اٹھ رہا تھا۔ اسے غنودگی سی محسوس ہوئی۔ وہ ناک ڈھانپ کر ایک جانب ہو گیا۔ اس نے دیکھا، بلڈنگ کے پاس کچھ لوگ غم کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

سان فرانسسکو کے اس علاقے میں اطالوی آباد تھے۔ وہ بیئر کا کاروبار کرتے تھے۔ والسن نے غور کیا تو سمجھ گیا کہ اس رنگین دھویں میں بیئر کے بخارات تھے۔

"بے چارے بیئر سے آگ بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" ایک شخص نے بے چارگی سے کہا۔ "شہر میں کہیں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں۔"

والسن نے بے بسی سے عمارت کی سمت دیکھا۔ اس کی مختلف منزلوں پر آگ لگی ہوئی تھی۔ لوگ نیچے موجود دکانوں سے بیئر کے ڈرم لے جا کر اس پر الٹ رہے تھے مگر یہ کوشش لاحاصل تھی۔ آگ کی شدت میں کوئی کمی نہیں آ رہی تھی۔ نشے آور بخارات نے علاقے کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔

والسن کا جی کٹ گیا مگر وہ رک نہیں سکتا تھا۔ اس سڑک کو عبور کرتے ہی دھواں چھٹ گیا اور اس کا سانس بحال ہونے لگا۔

اس نے اندازہ لگایا کہ وہ اسکول سے لگ بھگ ایک میل دور ہے۔ اس کے دل میں جینی کا خیال آیا۔

"کیا وہ زندہ ہوگی؟" اندیشوں نے زور مارا، مگر اس نے سر جھٹک دیا پھر اسے اپنی ماں کی یاد آئی۔ خدشات پھر کان میں سرگوشی کرنے لگے۔ زیر زمین ایک عفریت پھنکارنے لگا۔ اس نے یہ کہہ کر خود کو دلاسا دیا کہ ماں یہاں سے بہت دور ہے، زلزلے کے جھٹکے وہاں نہیں پہنچے ہوں گے۔

"شاید وہاں بھی زلزلہ آیا ہو۔" خدشات نے مزید سرگوشیاں کیں۔ اس نے ہمت اکٹھی کی، خدا کا نام لیا اور آگے بڑھ گیا۔

اب اس نے رفتار بڑھا دی تھی۔ دور کہیں دھماکے کی آواز سنائی دی۔ ڈاؤن ٹاؤن کا علاقہ زیادہ متاثر ہوا تھا۔ ادھر کثیر المنزلہ عمارتیں اور تجارتی علاقے تھے۔ زیادہ تر عمارتوں میں آگ لگ گئی تھی۔ چند ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی تھیں۔

ایک فائر بریگیڈ کی گاڑی اس کے سامنے آ کر رکی۔ اس سے فائر فائٹرز اترے اور سامنے والی عمارت پر پائپ سے پانی برسانے لگے۔

والسن کے لیے وہ منظر حیران کن تھا، کیونکہ پائپ سے پانی نہیں، گدلا دبیز کیچڑ نکل رہا تھا جو کچھ ہی دور جا کر گر جاتا۔ انجن کی پوری قوت بھی اس کیچڑ کو اوپر کی جانب پھینکنے سے قاصر تھی۔

"یہ تو...... کیچڑ ہے۔" کسی نے چلا کر ایک ریسکیو اہل کار سے کہا۔

"تو ان حالات میں تم اور کیا توقع کرتے ہو؟" اس آدمی کے چہرے پر غصہ تھا۔ "پانی کہیں دست یاب نہیں جو ملا، لے آئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ ایک ایسا کام جو لاحاصل تھا، جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہونا تھا۔

فائر ٹینڈر میں رکھے ریڈیو سے شہر کی صورت حال نشر ہو رہی تھی۔ وہ ایک ہولناک تصویر تھی۔ جرائم پیشہ افراد سرگرم ہو گئے تھے۔ بہت سے علاقوں میں چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں ہوئی تھیں۔ لالچ نے انسانیت کو اندھا کر دیا۔ لٹیرے خواتین کی لاشوں سے زیورات اتار رہے تھے۔ انگوٹھیوں کے لیے بہت سوں کی انگلیاں کاٹ لی گئیں۔ پولیس کے ہاتھ ایک ایسا شخص لگا تھا جس کی جیب سے بارہ کٹی ہوئی انگلیاں برآمد ہوئی تھیں۔ مرنے والے مردوں کی جیبوں سے پرس غائب تھے، جس کی وجہ سے ریسکیو اہل کاروں کو ان کی شناخت کرنے میں شدید دشواری ہو رہی تھی۔ انتظامیہ نے ایمرجینسی نافذ کرتے ہوئے فوج سے مدد مانگ لی تھی۔ وہ آگ بجھانے کے لیے کسی جدید طریقہ کو برتنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

والسن نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے دس بج گئے تھے۔ زلزلے کو آئے چار گھنٹے گزر گئے تھے۔ انتظامیہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ تباہی توقع سے کئی گنا زیادہ ہے۔ بڑے پیمانے پر ہلاکتیں ہوئی ہیں، گیس اور پانی کی لائنیں پھٹ گئیں، فون منجمد ہوئے اور بجلی منقطع ہو گئی۔

ان ہولناک خبروں نے والسن کو مغموم کر دیا۔ اُسے ناامیدی نے گھیر لیا۔ وہ دھیرے دھیرے جینی کے اسکول کی سمت بڑھنے لگا۔

چند سیکنڈز بعد وہ اسکول کی عمارت سامنے تھا، جہاں موت سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

☆......☆

وہ مسز جوزف جو چند گھنٹے پہلے صبح صبح جگائے جانے پر ایملی اور میسی کو صلواتیں سنا رہی تھیں، اب ان کی فکر میں ہلکان ہوئے جا رہی تھیں۔ اس نے دونوں عورتوں کو اپنے آرام دہ صوفے پر بیٹھا دیا، ان کے لیے کافی بنا کر لائی۔ اس نے ریڈیو بند تو نہیں کیا مگر اس کی آواز دھیمی کر دی اور انھیں دلاسے دینے لگی۔

"خدا پر یقین رکھیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ بڑا کارساز ہے اور میسی بہن، آپ کو تو ایملی صاحبہ کو سنبھالنا چاہیے، الٹا وہ آپ کو سنبھال رہی ہیں۔ بہن ایملی، آپ اندر لیٹ جائیں۔"

"نہیں شکریہ۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔" عورت کی حوصلہ افزا باتوں سے ایمیلی کی تھوڑی ڈھارس بندھی۔ کچھ دیر کو ڈرائنگ روم میں خاموشی چھائی رہی۔ صرف آتش داں میں پڑی لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔

"میں کتاب مقدس لے آتی ہوں، ہم دعا کرتے ہیں۔" آخر مسز جوزف نے کہا۔ عیسی نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔ کچھ دیر بعد عورت دعا کی کتاب لیے لوٹی۔ اس نے چند صفحے پلٹے اور پڑھنا شروع کردیا۔

خدا کی بڑائی بیان کرتے لفظوں میں عزم وحوصلہ تھا، اُمید تھی، روشنی تھی۔ تینوں عورتوں کے دل سنبھلنے لگے اور آنکھیں نمی سے بھیگ گئیں۔

ٹھیک اس لمحے اس منظر سے میلوں دُور گیلی چادر میں لپٹی جینی نے اپنا دل سنبھالا اور مخدوش زینے پر قدم رکھ دیا۔

اس کے پاؤں رکھتے ہی عجیب سی آواز ہوئی۔ کچھ مٹی جھڑی۔ اس نے دل کڑا کیا اور آگے بڑھ گئی۔ اوپری منزل پر اندھیرا تھا۔ بجلی منقطع ہوچکی تھی۔ اسے کچن کی جانب سے دھواں اٹھتا نظر آیا۔ لائبریری کا دروازہ اس کے پار تھا۔ اس نے گیلا کپڑا چہرے کے آگے کرلیا اور مس لیورین کو پکارا۔ ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

وہ تھوڑا آگے بڑھی۔ یکدم تپش میں اضافہ ہوگیا۔ شعلے بلند ہوئے۔ اس کا عزم ڈگمگانے لگے۔ ایک لمحے کو سوچا کہ واپس لوٹ جائے مگر پھر مس لیورین کا شفیق چہرہ نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اس نے گہری سانس لی اور شعلوں کے نزدیک سے گزرتے ہوئے لائبریری میں داخل ہوگئی۔

لائبریری میں دھواں بھرا ہوا تھا اور کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور اندازاً کھڑکی تک پہنچ گئی۔ اس نے زور لگا کر کھڑکی کا پٹ کھولا، تو روشنی اندر داخل ہوئی۔ اس نے دوسرا پٹ بھی کھول دیا۔

دھواں چھٹنے لگا اور کچھ منظر صاف ہوگیا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دور ایک کونے میں ایک کتابوں کے ریک کے نیچے انسانی ہیولا دکھائی دیا۔ اس نے آنکھیں میچ کر دیکھا۔ وہ مس لیورین ہی تھی، جو ذرا بھی حرکت نہیں کر رہی تھی۔ اندیشوں نے لڑکی کے دل میں ہل چل مچائی۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتی ہوئی لیورین تک پہنچی۔ بوڑھی عورت کے سر پر چوٹ لگی تھی۔ اس نے نبض چیک کی۔ عورت زندہ تھی مگر اس کی دھڑکن کمزور پڑ رہی تھی۔

جینی نے اس کا کاندھا ہلایا، اُسے آوازیں دیں۔ پھر گیلی چادر سے چہرہ صاف کیا۔ عورت نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ کچھ پلوں تک ان آنکھوں میں اجنبیت تھی پھر شناسائی چمکی۔ وہ کچھ کہہ تو نہیں پائی مگر ان آنکھیں میں تشکر تھا۔

"چلیں میڈم، ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔" جینی نے کہا۔

عورت نے بے بسی سے نفی میں سر ہلا۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بتایا کہ اس کے جسم کا نچلا حصہ حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا۔ جینی نے کچھ سوچا پھر اُسے اٹھانے کی سعی کی [illegible] مس لیورین کو اکیلے یہاں سے نکالنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

ابھی وہ اسی [illegible] و پنج میں تھی کہ اسے ایک پھنکار سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا [illegible] کتابوں کے درمیان دھوئیں کا اژدہا دکھائی دیا۔ اس کا دم [illegible]

☆......☆

سارے چہرے تو شناسا نہیں [illegible] وہ ان میں ایک کو جانتا تھا۔

واٹسن کو دیکھ کر سوزین دوڑی اس کی سمت آئی۔

"اوہ، اچھا ہوا آپ آگئے۔ خدایا۔ آپ تو بری طرح [illegible] ہیں۔"

"میں...... نہیں تو۔ میں ٹھیک ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور اس کمزوری کو دبانے کی کوشش کی جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس پر غالب آتی جارہی تھی۔

"وہ...... جینی کہاں ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے؟" اس نے اپنے اندیشے چھپاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ وہ ٹھیک ہے مگر......" سوزین چپ ہوگئی۔ اس چپ نے واٹسن کو کاٹ ڈالا۔ اسے لگا جیسے پھر کہیں دھماکا ہوا ہے پھر کہیں آگ لگ گئی ہے۔

"مگر کیا؟" وہ چلایا۔

سوزین نے اسے پوری روداد سنا دی۔ وہ دوڑا دوڑا زینے کی سمت گیا۔ واٹسن تیزی سے عبور کرنا چاہتا تھا مگر اس کی مخدوش حالت دیکھ کر سنبھل گیا۔ وہ بڑی احتیاط سے شگاف پھلانگ کر اوپر پہنچا۔ اس پورے عمل کے دوران نیچے کھڑی سوزین سانس روکے اُسے دیکھتی رہی۔

واٹسن کو اوپر پہنچتے ہی اپنے عقب میں ایک ہولناک چنگھاڑ سنائی دی۔ وہ پلٹا، تو زینہ زمین بوس ہوچکا تھا۔ اب سریا اور ٹوٹی پھوٹی اینٹیں دیوار سے لٹکی ہوئی تھیں۔ اب [illegible] آگے بڑھا۔

"جینی...... جینی کہاں ہو تم؟" وہ بے طرح چلا رہا تھا۔

لائبریری میں مس لیورین کے نزدیک بیٹھی جینی نے جب واٹسن کی آواز سنی تو پہلے تو اسے یوں لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہو مگر جب دھوئیں کے درمیان اس نے واٹسن کا من موہنا چہرہ دیکھا تو فرط جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ دنیا تھم گئی اور ہر غم جیسے معدوم ہوگیا۔

شاید وہ بہت دیر تک یونہی ایک دوسرے کو تھامے کھڑے رہتے کہ زمین پھر لرزی۔ جینی کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا۔ "وہ...... مس لیورین۔"

واٹسن اب زخمی عورت کی سمت متوجہ ہوا۔ گو وہ پہلے بھی مس لیورین کو دیکھ چکا تھا مگر پہلی بار اسے احساس ہوا کہ مس لیورین کی شکل اس بے گھر عورت سے بہت ملتی ہے جس کے لیے وہ ہر شام گرم شوربے کا انتظام کیا کرتا تھا، جو ماں کی طرح اسے چاہتی تھی اور جسے کل رات اس نے کھو دیا تھا۔

"اب میں مزید کسی کو کھونے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔" اس نے تیزی سے کہا اور آگے بڑھ کر پوری قوت سے ریک کو [illegible] جینی بھی مدد کو آئی۔ کچھ دیر بعد مس لیورین اس بوجھ سے [illegible] دیا۔ وہ [illegible] اس نے اپنا مفلر عورت کی زخمی ٹانگ پر باندھ کر اسے اٹھانے کے جتن کر ہی رہا تھا کہ یکدم اسے یاد آیا کہ زینہ تو زمین بوس ہوچکا ہے۔ واپسی کے لیے وہ راستہ اختیار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

واٹسن کو کھڑکی کا خیال آیا۔ وہ دوڑا دوڑا ادھر گیا مگر کھڑکی کو دیکھتے ہی اس کی روح میں دراڑیں ابھر آئیں۔ کھڑکی میں سلاخیں لگی تھیں۔

زخمی عورت بے طرح کھانس رہی تھی۔ دھوئیں کے باعث جینی کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ واٹسن کا سر چکرانے لگا۔ اس نے لائبریری کا چکر لگایا، مگر باہر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ موت نے گھیرا تنگ کردیا تھا۔

وہ مایوسی کی حالت میں واپس لوٹا تو دیکھا کہ جینی مس لیورین کی ہمت بڑھا رہی ہے۔ کمرے میں اب پوری طرح دھواں بھر گیا تھا۔ کچن میں لگنے والی آگ نے گمبھیر شکل اختیار کرلی تھی۔ کسی بھی وقت دھماکا ہوسکتا تھا۔

اس نے نا امیدی کی حالت میں خدا کو یاد کرتے ہوئے لرزتے دل کے ساتھ پھر لائبریری کا جائزہ لیا اور تب...توقع کے برخلاف ایک تاریک گوشے میں اُسے مطالعے کی میز پر ایک شخص بیٹھا دکھائی دیا۔

اسکردو پاکستان کے پانچویں صوبہ گلگت بلتستان کا ایک اہم شہر اور ضلع ہے۔ یہ سلسلہ قراقرم کے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ گلگت بلتستان کا دارالخلافہ بھی ہے۔ یہاں کے خوب صورت مقامات میں شنگریلا، سدپارہ جھیل اور کت پناہ جھیل وغیرہ شامل ہیں۔ ہر سال لاکھوں ملکی و غیر ملکی سیاح اسکردو کا رخ کرتے ہیں۔ یہاں لوگ بلتی زبان بولتے ہیں جو تبتی زبان کی ایک شاخ ہے۔ اسکردو کے لوگ انتہائی ملنسار، خوش مزاج، پُرامن اور مہمان نواز ہیں۔ اسکردو جانے کا آسان ترین راستہ ہوائی جہاز ہے جو کہ اسلام آباد سے اسکردو اور واپسی اسلام آباد کا ہے۔ اس کے علاوہ سڑک کے راستے اسکردو جانے کا اپنا الگ ہی مزہ ہے۔ دنیا کے خطرناک ترین دشوار راستوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ راستے میں بہت خطرناک اور دشوار موڑ آتے ہیں جس کے لیے ڈرائیور کا ان راستوں سے واقف اور ماہر ہونا ضروری ہے۔ عام گاڑی یا پرانی گاڑی میں جانے سے مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ ان علاقوں میں فور وہیل گاڑیاں ہی چلائی جاتی ہیں۔

مرسلہ: علی شاہ۔ نگر گلگت

واٹسن اُسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ آخری شخص تھا، جسے نوجوان وہاں، اس دھوئیں اور وحشت سے بھری لائبریری میں دیکھنے کی توقع کرسکتا تھا، مگر وہ وہیں تھا، اس کے عین سامنے اور اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی۔

یہ زلزلے کے بعد رونما ہونے والا سب سے عجیب واقعہ تھا۔

☆......☆

"مسٹر انتھونی...... آپ اور یہاں؟" جینی کے باپ کو یہاں، اس لائبریری میں دیکھ کر واٹسن کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"کیسے ہو پیارے واٹسن؟" آدمی نے پائپ سلگایا۔

"تو اس میں حیرت کیسی؟" آدمی نے اطمینان سے کش لیا۔ "بھول گئے، میں یہیں سے بطور معلم ریٹائر ہوا تھا۔"

"مگر آپ کی یہاں موجودگی...... میرا مطلب ہے......!" واٹسن چپ ہوگیا۔ اسے لگا جیسے یہ ایک خواب ہے، جیسے جھوٹ ہے، جیسے وہ سحر کے زیر اثر ہے۔

"ان باتوں کے لیے ابھی وقت نہیں نوجوان۔ مجھے تم



لوگوں کو یہاں سے نکالنا ہے۔" انتھونی نے اطمینان سے کہا اور ایک سمت چل دیا۔

الجھن کا شکار ولسن اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ انتھونی اپنی بیٹی جینی اور زخمی مس لیورین کے پاس سے گزرا تب ولسن پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ نہ تو جینی نے انتھونی کو دیکھا، نہ ہی مس لیورین نے اُس کی موجودگی کا نوٹس لیا۔ ولسن فربہی کی جانب مائل، گھنی مونچھوں والے شخص کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا دونوں عورتیں کے نزدیک سے گزر گیا۔

"کیا...... جینی نے آپ کو نہیں دیکھا؟" اس نے تھوک نگلتے ہوئے آدمی سے پوچھا، جو ایک دیوار کے پاس آن کر رک گیا تھا اور اب اُسے بجا کر دیکھ رہا تھا۔

"یہاں ایک خفیہ دروازہ ہے۔" آدمی نے یوں کہا، جیسے اس نے ولسن کا سوال سنا ہی نہ ہو۔ "کوشش کرتا ہوں کہ یہ کھل جائے۔"

کچھ دیر تک وہ دیوار بجاتا رہا۔ اچانک آواز کچھ بدلی بدلی سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے قریبی ریک کے اندر کی طرف ہاتھ ڈال کر کسی شے کو حرکت دی، جیسے کسی لٹو کو گھما رہا ہو۔ لکڑی کی دیوار سامنے سے کھسک گئی اور ایک چھوٹا سا خلا ظاہر ہوا۔

"لیجیے جناب ہوگیا۔" بوڑھے نے تالی بجائی پھر ولسن کی حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "حیران بعد میں ہونا، ابھی جاؤ، ان دونوں کو لے آؤ، عمارت میں آگ لگ چکی ہے۔"

ولسن چونکا اور سر ہلاتے ہوا لائبریری کی دوسرے سمت چل دیا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا مگر یہ غور کرنے کے لیے مناسب وقت نہیں تھا۔

"اور ہاں...... ملازمت کی مبارک باد۔ اُمید ہے اگلے برس تک تم دونوں شادی کے بندھن میں بندھ جاؤ گے۔" بوڑھے نے خوش دلی سے کہا۔

ان الفاظ نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس نے سوچا، انتھونی کو اِس منصوبے کی خبر کیسے ہوگئی؟ وہ تیزی سے پلٹا۔ ایک اور جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں۔

البتہ وہ خلا بدستور موجود تھا۔ ایک خفیہ راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ دوڑا دوڑا گیا اور سہارے سے مس لیورین کو کھڑا کیا۔ کمرے میں تپش بڑھ گئی تھی۔ کچن میں لگی آگ دروازے تک آگئی۔ اس نے پہلے جینی کو خلا میں داخل کیا، پھر مس لیورین لڑکھڑاتے ہوئے اندر گئی۔ آخر میں ولسن اس میں داخل ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بہت سی کتابوں نے آگ پکڑلی تھی اور ان جلتی ہوئی کتابوں کے درمیان وہ شخص کھڑا تھا، جس نے یکدم اُس کے لیے دنیا کے پُراسرار ترین شخص کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

انتھونی کے ایک ہاتھ میں پائپ تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی مگر اس کے ماتھے پر گہرا زخم تھا اور اس کی قمیص پر خون کے دھبے تھے۔

زوردار چنگھاڑ سنائی دی۔ کچن کا سلنڈر پھٹ گیا تھا۔ شعلوں نے تینوں کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ولسن جست لگا کر آگے بڑھا۔

آگ کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔ اُن تینوں کے سامنے ایک تنگ سا زینہ تھا، جسے عبور کرنے کے بعد انہوں نے روشنی کی ایک لکیر دیکھی تھی۔ وہ لکیر کا تعاقب کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ باغیچے میں تھے۔

ولسن نے پلٹ کر اوپر کی سمت دیکھا۔ لائبریری سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ اس نے انتھونی کی پُراسرار وجود کے بارے میں سوچا۔ اسے لگا جیسے وہ قدرت کے کسی گہرے راز میں شریک ہوگیا ہو۔

ایمبولینس کے سائرن سنائی دیے۔ ریسکیو اہل کاروں کا ایک دستہ اسکول پہنچ گیا تھا۔ ان میں سے چند کی نظر ان تینوں پر پڑی، تو وہ دوڑے دوڑے باغیچے میں آگئے۔

"آپ یہاں سے ہٹ جائیں، عمارت کسی بھی وقت زمین بوس ہوسکتی ہے۔" ایک اہل کار نے کہا۔

وہ انہیں کھینچتے ہوئے عمارت سے دور لے گئے۔ چند پلوں بعد وہ عمارت سے کچھ دور کھڑے تھے۔ مس لیورین کو طبی امداد دی جارہی تھی۔ اس نے تشکر آمیز لہجے میں ولسن سے کہا۔ "بیٹا، اگر تم مدد کو نہ آتے تو شاید اب تک میں دم توڑ چکی ہوتی۔"

ولسن مسکرا دیا۔ اب وہ بھلا کیسے بتاتا کہ نہ صرف مس لیورین، بلکہ خود اس کی جینی کی زندگی بھی کسی اور ہستی کی مرہونِ منت کی دین ہے، ایک ایسی ہستی، جسے وہاں بھیجنے کا انتظام شاید خود قدرت نے کیا تھا۔

جینی اس کے قریب آئی۔ دکھ اور تھکن کے بعد ایک اُمید اس کی آنکھوں میں تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تھام لیا۔ دونوں کے آنسو ایک دوسرے میں جذب ہونے لگے۔

"فائر فائٹرز کہہ رہے تھے کہ پورا سان فرانسسکو

ہوگیا۔" جینی نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں، مگر ہم ابھی زندہ ہیں۔ ہم اسے دوبارہ آباد کر لیں گے۔" اس نے بازو اس کے گرد حمائل کر دیے۔

"جانے..... پاپا کیسے ہوں گے؟" جینی کے لہجے کے پیچھے لاکھوں اندیشے تھے۔ اس لہجے کے پیچھے وہ ڈراؤنا خواب تھا جو اس نے کل رات دیکھا تھا۔ "جب میں نکلی تھی تو وہ سو رہے تھے۔"

واٹسن نے گہرا سانس لیا۔ اس نے آسمان کی سمت دیکھا۔ بادلوں میں اسے ایک شفیق چہرہ دکھائی دیا۔ فربہی کی جانب مائل ایک شخص کا چہرہ، جس کی گھنی مونچھیں تھیں اور جس کے ہاتھ میں ایک پائپ تھا۔

"وہ بہت اچھی جگہ پر ہیں جینی۔ بہت اچھی جگہ پر۔" واٹسن نے دھیرے سے کہا۔

جینی کے دل نے گواہی دی کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ آنسو پھر لڑکی کی آنکھوں سے رواں ہوگئے۔ وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

وہاں سے میلوں دور ایک پُرسکون قصبے میں تین عورتیں بیٹھی دعا مانگ رہی تھیں۔ اچانک ان میں سے ایک عورت کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

مسز جوزف اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ "ایملی بہن، خود کو سنبھالیں، خدا سب ٹھیک کرے گا۔"

"بے شک، بے شک۔" اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ اب وہ کیسے بتاتی کہ یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ خدا اس کی دادرسی کر چکا ہے۔

☆......☆

18 اپریل 1906 کو سان فرانسسکو پر حملہ آور ہونے والے زلزلے نے وحشت و بربریت کی ہولناک داستان رقم کی۔

شہر کھنڈر بن گیا۔ تین روز تک آگ نہ بجھائی جا سکی۔ پچاس کروڑ ڈالر کا بھاری نقصان ہوا اور تین ہزار سے زائد افراد زندگی کی بازی ہار گئے۔

19 اپریل کی سہ پہر تک آگ بجھانے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئی تھیں۔ کچھ بھی کسی کام نہیں آیا۔ بیزر سے آگ مزید بھڑک اٹھی۔ آخر فوج نے جنگل کی آگ بجھانے کے نسخے کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے آگ کا پھیلاؤ روکنے کے لیے کئی عمارتیں گرا دیں، تاکہ وہ آگ کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں، مگر خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آئے۔

ادھر شہر میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوگیا۔ دکانیں لوٹ لی گئیں، شہریوں سے نقدی اور قیمتی اشیاء چھین لی گئیں۔ یہاں تک کہ لاشوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ حالات اتنے سنگین ہوگئے کہ سان فرانسسکو کے ناظم یوجن شمز نے لوٹ مار میں ملوث افراد کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا انتہائی حکم دے دیا۔

شہر لاشوں سے اٹ گیا تھا۔ کٹی پٹی لاشیں۔ جلی ہوئی لاشیں۔ ہڈیاں، کھوپڑیاں۔ ادھر ریسکیو ٹیمیں تھکن اور مسائل کے باوجود کام میں مصروف تھیں۔ چوبیس گھنٹے بعد دوسرے ... کو بھی کمک پہنچ گئی۔ البتہ اصل کردار واٹسن اور جینی جیسے ... نے ادا کیا، جو اپنا غم بھول کر زخمیوں کی عیادت میں جٹ ... رضاکار تھے جنہوں نے بغیر سوئے اگلے 72 گھنٹے کام کیا۔

کام اتنا زیادہ تھا کہ ... اور واٹسن دو روز تک ایک دوسرے سے مل ہی نہیں سکے ... کیمپس، اسپتالوں اور ... میں زخمیوں کی دیکھ ریکھ کرتے رہے۔

جینی کے باپ انتھونی کی لاش ... تلے ملی۔ اس کے چہرے پر زخم ضرور تھے، مگر ... زخموں کی شدت پر غالب تھی۔ جینی بہت روئی۔ واٹسن ... میں خیال آیا کہ جینی کو اس روز لائبریری میں رونما ہونے والے عجیب و غریب واقعے کی بابت بتا دے، مگر ... سوچ کر خاموش ہوگیا کہ جو شے اسرار کے پردے میں زندہ ہے، اسے وہیں رہنے دیا جائے تاکہ وہ اپنا حسن برقرار رکھے۔

واٹسن کی ماں ایملی لوٹ آئی تھی۔ اسے واپسی سے ... ہی اعتقاد کی قوت نے یہ خبر پہنچا دی تھی کہ اس کا بیٹا خیریت سے ہے۔ جس لمحے وہ شہر پہنچی، واٹسن اور جینی ساتھ تھے۔ اس نے دونوں کو یوں گلے لگا لیا جیسے دونوں اس ہی کی اولاد ہوں۔

یہ شفیق، پُرخلوص محبت دراصل مرہم تھی۔ جینی کا اپنے باپ کو کھونے کا صدمہ کچھ کم ہوگیا۔ اس کے زخمی دل کو کچھ راحت ملی۔

نقصانات کے ازالے کا صحیح طریقہ نقصانات کا اندازہ لگانا تھا۔ اس ایک منٹ کے زلزلے میں سان فرانسسکو کی اٹھائیس ہزار عمارتیں منہدم ہوئی تھیں۔ بے شمار فائیو اسٹار ہوٹل، سینما، جدید اپارٹمنٹس، اسکول، چرچ، کارخانے ... زمین بوس ہوئے۔

سان فرانسسکو میں پچاس لاکھ ڈالر کی مالیت سے ... ہال تعمیر کیا گیا تھا جس کی بابت دعویٰ کیا جاتا تھا کہ زلزلہ ...

... محفوظ ہے مگر موت اسے بھی اپنے ساتھ لے گئی ... جھول چھوڑ گئی۔

... واقعے نے سان فرانسسکو کے انسان اور حیوان ... پر اثر ڈالا۔ واقعے کے بعد شہر سے بلیاں جیسے ... بہت بعد میں ریسکیو ٹیموں کو ایک بڑی عمارت ... سے بہت سی بلیوں کی لاشیں ملیں۔ وہ وہاں کیسے ... نہیں جانا جا سکا تھا۔

... بھی ایک عرصے تک شہر کی سڑکوں پر دکھائی نہیں دیے۔ اس زمانے کی ایک تصویر میں بہت سے گھوڑوں کو مردہ حالت میں دیکھا جا سکتا ہے، جن پر اصطبل کی چھت آن گری ... گر مرنے والوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔

اس زلزلے کے اثرات نیواڈا کے علاقے تک محسوس کیے گئے۔ ... ٹیلی فون کی لائنیں تین ہفتے بعد بحال ہو سکیں۔ بجلی کی ... جگہ جگہ لگی آگ کی وجہ سے کچھ روز معطل رکھا گیا۔ واقعے میں لگ بھگ تین لاکھ افراد بے گھر ہوئے۔ شہر کے مضافات میں بڑی بڑی خیمہ بستیاں لگ گئیں۔

گویا یہ شہر جینے کا آرزومند تھا، مگر جلد ہی ایک نئی مشکل ... کھڑی ہوئی۔

☆......☆

... کے اندیشے کے باعث انتظامیہ نے شہریوں کو ... کی ہدایت کی تھی۔

... وہ جو ... منظر دیکھ چکے تھے، ان کے دلوں ... بیٹھ گیا تھا اور ... بچھ گئے تھے۔ تو انہوں نے ... کی آواز پر لبیک کہا ... سونے کے بجائے ... سونے لگے۔ پھر ان کے ساتھ عجیب واقعات رونما ہونے لگے۔ رات سوتے سوتے انہیں جلن کا احساس ہوتا، یوں لگتا، جیسے کسی جانور نے انہیں کاٹ لیا ہو ... پاس نہیں ہوتا۔

ابتدا میں تو اسے کسی پُراسرار مخلوق کی کارستانی ... مگر جلد ہی شعبہ صحت اس جانب متوجہ ہوا، عقدہ کھلنے لگا۔ انتظامیہ نے لاشوں کو بروقت ٹھکانے لگانے کے لیے خاصے اقدامات کیے تھے، مگر کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوئیں۔ بہت سی لاشیں کئی کئی روز تک نہیں اٹھائی جا سکیں۔ بہت سے جلتے ہوئے افراد پولیس والوں سے یہ التجا کرتے دکھائی دیے کہ انہیں گولی مار دی جائے، کیوں کہ ان کے جسموں پر لگی آگ ان کی روح تک کو گھائل کر چکی ہے۔

تو ایسے میں، جب لاشوں کے انبار لگے تھے، چوہے اپنے بلوں سے نکل آئے۔ ان چوہوں میں طاعون کے جراثیم تھے۔ انہوں نے پہلے پہلے لاشوں کو کترنا شروع کیا مگر جب لاشیں اٹھالی گئیں تو یہ بے خوف ہو کر انسانوں کو کاٹنے لگے۔

آخری انتظامیہ کو ایک بار پھر ایمرجنسی نافذ کرنی پڑی اور اس بار میئر نے حکم دیا کہ غلیظ مخلوق جہاں دکھائی دے، اسے ختم کر دیا جائے۔

اگلے سال کوئی زلزلہ تو نہیں آیا مگر شہریوں کو زلزلے سے زیادہ شدید خوف نے آن پکڑا تھا۔ شہر میں طاعون کے دو سو کیس سامنے آئے تھے۔ شہری بلیک ڈیتھ کے خوف سے لرزتے ہوئے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے اور شہر کے معمولات ٹھپ ہوگئے۔

انہیں دوبارہ سنبھلنے میں مزید ایک سال لگا۔

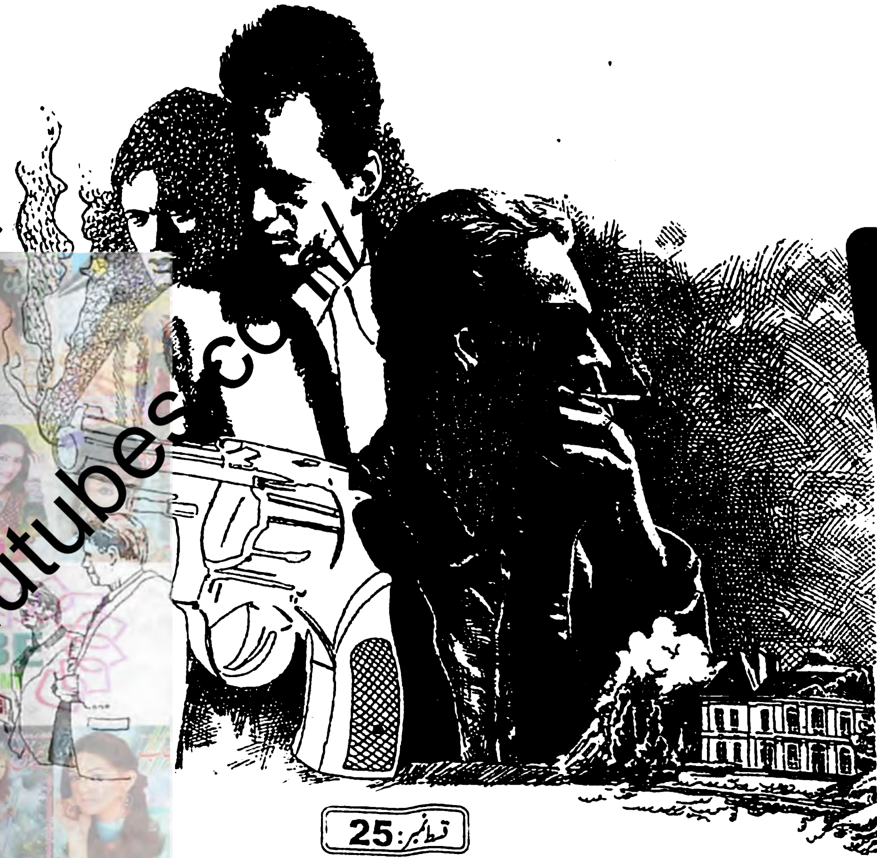
☆......☆

18 اپریل 1907 کو ... واقعات رونما ہوئے ... اے پی گیانینی ان خوش قسمت افراد میں سے تھا، جنہوں نے ہولناک زلزلے اور بعد ازاں آتش زدگی کے باوجود اپنے تمام اثاثے بچا لیے تھے۔ گرچہ وہ ایک دولت مند آدمی تھا۔ اس نے شہریوں کو ان کی زندگی بحال کرنے کے لیے آسان اقساط پر قرضوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ مشورہ اسے ایک نوجوان اسسٹنٹ ... نے دیا تھا، جس نے خود بھی زلزلہ متاثرین کی امداد اور بحالی کے کام میں عزم و حوصلہ کی مثال قائم کی تھی۔

اس نوجوان کا نام واٹسن ایچ تھا، جو جینی انتھونی سے رشتہ ازدواج میں بندھ گیا تھا اور بینک آف امریکا کا صدر اے پی گیانینی شادی کی تقریب میں مہمان خصوصی تھا۔

شہر کو پوری طرح بحال ہونے میں تین سال لگے اور یہ اسی محبت کے وسیلے ممکن ہوا جو جینی اور واٹسن جیسے لاکھوں نوجوان اس شہر سے رکھتے تھے۔

کئی برس بعد 1989 میں سان فرانسسکو میں پھر ایک زلزلے کی چنگھاڑ سنائی دی۔ پھر زیر زمین پلیٹوں نے حرکت کی اور پھر ایک ہولناک زلزلہ آیا۔ اس بار 16 ارب ڈالر کا نقصان ہوا مگر ... زلزلے کی شدت 7.1 تھی ... یہ شہر ماضی کی طرح ایک بار پھر اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا اور اب بھی سان فرانسسکو پوری طرح تیار ہے، ایک اور زلزلے کا مقابلہ کرنے کے لیے۔



قسط نمبر: 25

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تیزی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان [illegible] الٹ دیتا۔ ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی نعیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ نعیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا میسج آ گیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹو مل گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں [illegible] گیا تو ڈائری کے واقعات نے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آ گئے۔ ان میں عزیز خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیز خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی [illegible] کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنر بیس پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد [illegible] جا رہا تھا کہ کالیا کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ عارف چھندر جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ [illegible] شروع ہو گئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ [illegible] اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او دلاور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور [illegible] پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً [illegible] دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آ کر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان [illegible] اٹھا۔ فہیم کے تھپڑ نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ وہ تھپڑ مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے قتل میں ملوث عزیز نظر آ گیا۔ میں اس [illegible] دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبیہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے اٹھ آیا رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گلوخلاصی کرا دی جس کے ٹرک نے زنیرہ کی کار کو ہٹ کیا تھا۔ گھر آیا تو کاشف ملنے آ گیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی اغوا کا سن کر پریشان ہو گیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آ جائے۔ تبھی روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو گلشن حدید میں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سیٹھ ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کہا سچ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے بھی زخمی کر دیا۔ ساتھیوں سے نمٹ کر میں نے سیٹھ سے اگلوا لیا کہ عاصمہ کو کہاں رکھا ہے اسے باحفاظت نکال لایا پھر روزی کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ یہ اس کی سہیلی کا فلیٹ تھا۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی پھر باہر سے آواز آئی۔ ”کیبل والا، بل لے کر آیا ہوں۔“ روزی نے دروازہ کھولا تو کیبل والے کو دھکا دے کر دو مسلح شخص اندر آ گئے۔ اس سے نمٹ کر میں نے انسپکٹر کامران کو فون کر کہا کہ روزی کی حفاظت کے لیے دو پولیس والے بھیج دو۔ پھر میں کالیا کے ساتھ باہر آ گیا۔ انسپکٹر کامران کی معرفت کئی ایک کو گرفتار کرایا پھر زنیرہ کے گھر پہنچا۔ کچھ ضروری باتیں کر کے میں باہر نکلا تھا کہ ایک ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اسے نظر انداز کرتا کہ اس ٹیکسی میں بیٹھا ایک شخص اتر کر زنیرہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں ہوشیار ہو گیا اور بھاگتا ہوا زنیرہ کے پڑوس والے گھر میں داخل ہو گیا اور چھت کے ذریعے زنیرہ کے گھر میں اتر گیا۔ ٹھیک اسی وقت نیچے سے گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ تب تک میں سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اندر سے زنیرہ پستول تھامے دھمکی دیتی ہوئی نکلی۔ اس کے پیچھے خالہ نجو کھڑی چیخ رہی تھیں۔ میں نے زخمی پر قابو پا کر خالہ سے رسی لانے کو کہا۔ تبھی باہر سے دروازہ دھڑدھڑایا گیا۔ محلے کے لوگ آ گئے تھے کچھ دیر بعد پولیس بھی پہنچ گئی۔ اسے پولیس کے حوالے کیا اور وہاں سے چل پڑا۔ ابھی گھر آیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اسپتال سے بتایا گیا کہ فہیم مل گیا ہے۔ میں اسپتال پہنچا فہیم نے بتایا کہ کچھ لوگ اس پر بے پناہ تشدد کرتے تھے۔ اس کی ٹانگیں بھی کاٹ دی گئی تھیں۔ سیٹھ ستار الگ کالیا کو قتل کرنے پر تلا ہوا تھا کیونکہ وہ مجو کے قتل کا بدلہ لینا چاہ رہا تھا۔ استاد بھابھا نے مشورہ دیا کہ خود کو چھپا کر رکھوں کیونکہ لیاری کا بچہ بچہ ٹی ٹی لے کر ہمیں ڈھونڈ رہا ہو گا ہم نے میک اپ کیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو اندر دشمن موجود تھے۔ ہم نے ان پر قابو پایا پھر اگلے روز جب اڈے پر پہنچا تو انور شاہ نے بتایا کہ حاجی عمران آیا تھا اور دھمکیاں دے کر گیا ہے۔ میں اپنے دوست فرقان کے دفتر میں جو بندرگاہ میں واقع ہے وہاں پہنچا تو بن رائد سے سامنا ہو گیا۔ ابن رائد [illegible] پیچھا کرتا ہوا میں کنٹینروں کے درمیان پہنچا تو کسی نے مجھے مارنے کے لیے کنٹینر گرایا۔ میں تو بچ گیا مگر ایک دوسرا شخص دب کر ہلاک ہو گیا۔

[illegible] اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں کئی پارٹیاں ہیں جو ایک دوسرے سے الجھ رہی ہے۔ میں بن رائد کے جہاز کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر سائیں داد کے ساتھ ساحل پر آ گیا تھا کہ وہ مجھے نظر آ گیا۔ میں اس کے تعاقب میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے احساس ہو گیا۔ اس نے پستول نکالنا چاہا تھا کہ میں نے [illegible] جست لگا دی۔ مگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ میں اور کالیا رانا بشیر کے ہاں پہنچے تو اسے شاہ میر کے آدمیوں نے کور کر رکھا تھا۔ ہم نے ان آدمیوں پر قابو پایا۔ رانا بشیر نے پولیس بلوائی۔ پولیس کے سامنے شاہ میر کے آدمیوں نے بیان دیا کہ وہ لوگ شاہ میر کو نہیں جانتے۔ ہم [illegible] نکلے تو فوزیہ کا فون آ گیا کہ کچھ کرو۔ میں نے چاچا انور سے بات کی۔ انہوں نے فکرمندی کا انداز اختیار کیا اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ انور شاہ ایسی کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ مجھے ساتھ لے کر نکل پڑے راستے میں بولے کہ عطا محمد انکار کر سکتا ہے کیونکہ یہ لوگ برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے ہیں گھر پہنچ کر میں نے عاصمہ کو بتایا اسی وقت دستک ہوئی۔ باہر پولیس والے تھے۔ وہ بولے کہ تمہیں ثمیر کے اغوا کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ مجھے تھانے لایا گیا۔ وہاں انسپکٹر رجب علی تھا۔ زنیرہ نے ضمانت کرائی کالیا کے ساتھ آ رہا تھا کہ راکا سے ڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے ہم کو [illegible]نے کی کوشش، فائرنگ کی آواز پر بھیڑ جمع ہو گئی ہم کسی نہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ عاصمہ کی ضد پر اگلے دن رشتہ مانگنے عطا محمد کے گھر گئے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ہم گھر آئے۔ اگلے دن کالیا پہنچا ہی تھا کہ جمی کا فون آ گیا۔ اسے ہم نے ثمیر کی حفاظت کے لیے رکھا تھا۔ جب وہاں پہنچے تو جمی نے بتایا ثمیر مر چکا ہے۔ شاہ میر کے بیٹے ثمیر کو اغوا کر کے کالیا نے جہاں رکھا تھا وہاں اس کی نگرانی کے لیے جمی کو بٹھایا گیا تھا اس نے فرار کی کوشش کرنے کی وجہ سے ثمیر کو گولی مار دی۔ اس حادثے پر ہم سب پریشان ہو اٹھے تھے لیکن لاش کو چھپانا بھی ضروری تھا۔ اسے لے جا کر میں نے ہاکس بے پر پھینکا۔ ادھر رانا بشیر اپنی بیٹی کے لیے پریشان تھا کیونکہ وہ شاہ میر کے قبضے میں تھی۔ تھانے سے انسپکٹر دلشاد کا فون آیا کہ فوراً آ کر مجھ سے ملو۔ اس سے ملاقات ہوئی تو احساس ہوا کہ وہ بھی میرے دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ لاری اڈے کی نوکری ختم ہو چکی تھی۔ رانا بشیر نے مجھے اپنی کمپنی میں عہدہ دے کر بحرین بھیجنے کا کہا۔ بحرین پہنچتے ہی میرا ٹکراؤ راکا سے ہو گیا۔ وہاں سے نکلا تو بحرین میں میرا اگلا ہدف [illegible] بھی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ اب میری مددگار صرف شہزادی نیلم ہو سکتی تھی۔ شہزادی نیلم کی وادی کا پانی اس کے مخالفین نے بند کر دیا تھا۔ کالیا بھی مجھ تک پہنچ چکا تھا۔ ہم صرائفہ کی شہزادی کی خاطر دشمنوں سے ٹکرائے۔ پانی کا پہرہ توڑ دیا تو صرائفہ میں پانی آ گیا۔ صرائفہ سے نکلے پہاڑی سلسلے کو عبور کر رہے تھے کہ ایک مسلح دستے نے ہمیں گھیر لیا، ان میں راکا بھی تھا مگر ہم نے راستہ نکال لیا۔ شاہ میر کے آدمیوں نے راکا کو گولی مار دی۔ ہم نے بن رائد کو اغوا کر لیا۔ ہم گلنارا کے گھر میں بیٹھے تھے کہ گیٹ کے چوکیدار نے انٹرکام کیا۔ چوکیدار نے بتایا کہ پولیس آئی ہے۔ ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ گلنارا نے انہیں خود ہی مطمئن کر دیا۔ ہم وہاں سے نکلے اور ربع الخالی کی طرف چل پڑے۔ ہمارے گرانٹ کے تہہ خانے والے مکان میں پہنچے۔ تہہ خانے میں شاہ میر اور گرانٹ سے باتیں ہو رہی تھیں کہ اوپر ہلچل محسوس ہوئی۔ اوپر والوں نے تہہ خانے میں [illegible] جس کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو بن رائد کے محل میں قید تھا۔ اس سے بات ہو رہی تھی کہ شاہ میر پستول تانے داخل ہوا [illegible] گیا۔ میں [illegible] جا لی مگر کالیا نے دھکا دے کر مجھے جالیا بن رائد کے آدمی اسے کھینچ لے گئے۔ پھر مجھے کوزے کے ہولوگرام کے سامنے پیش کیا [illegible] اسے مطمئن کر دیا۔ مجھے جس کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا اس کے تین کمرے بعد شاہ میر کا کمرا تھا میں دبے قدموں اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ [illegible] اسے زہر دیا گیا تھا اس نے پرسنل کیبنٹ کا نمبر بتایا جہاں ایک اہم فائل تھی۔ بن رائد نے مجھ پر ذمے داری ڈالی کہ میں شہزادی نیلم کے پاس اس کا پیغام لے کر جاؤں۔ راستے میں گرانٹ بھی ساتھ ہو لیا۔ ہم شاہ میر کی بیوی سے ملنے پہنچے۔ گیٹ پر کھڑا دربان تیزی سے گاڑی تک آیا اور بتایا کہ بیگم صاحبہ نہیں ہیں۔ گرانٹ نے اسے جکڑ لیا اور اسی طرح ہم اندر داخل ہوئے۔ شاہ میر کی بیوی سے ملاقات کر کے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں طوفان آ گیا پھر بھی ہم بچ بچا کر اسپتال پہنچے پھر وہاں سے ہم دوبارہ شاہ میر کی بیوی بیٹی نے شاہ میر کے کیبنٹ تک پہنچایا فائل مل گئی مگر اس پر ”قلعہ الموت“ لکھا تھا۔

اب آگے پڑھیں

اس عنوان میں کچھ ایسا ہی تھا کہ [illegible] کیفیات کا شکار ہو گیا تھا۔ میری یک ٹک سی نظریں [illegible] ڈیسک ٹاپ کے مانیٹر اسکرین پر ثبت ہو کے رہ گئی تھیں۔ اپنے وجود میں، مجھے ایک نامعلوم سی پھریری کا احساس ہونے لگا تھا۔ صرف ایک لفظ ”قلعہ الموت“ نے مجھے سرتاپا جیسے گنگ سا کر دیا تھا۔

بہرکیف، میری مطلوبہ فائل۔ ”RM-7“ میرے سامنے تھی۔

”ابے لے جگری! یہ کیا لکھا ہے۔ قلعہ الموت۔“ کالیا کے منہ سے بھی متحیرانہ برآمد ہوا۔ گرانٹ کی کیفیات ہم سے مختلف رہیں۔ وہ خاصا جوش میں نظر آ رہا تھا۔ اس کی کھنچی ہوئی کونوں والی آنکھوں سے ایک الگ ہی دلچسپی اور جوشیلی سی سرخی ہویدا ہونے لگی تھی۔ اگرچہ فائل کا یہ عجیب وغریب عنوان پڑھنے سے پہلے خود میری بھی یہی حالت ہوئی تھی۔

”نومی! فوراً اس کا پرنٹ نکالو اور نمی سی ڈی میں

ڈپلی کیٹ کاپی محفوظ کردو بلکہ ایک کام اور کرو اگر تمہارے پاس ایک سے زائد ای میل آئی ڈیز ہیں تو ایک پر اس اہم فائل کو سینڈ بھی کردو۔" او برائے گرانٹ جوش تلے کہتا ہی چلا گیا۔

"پہلے آپ اس فائل کا تسلی سے مطالعہ کرلیں، آیا یہی آپ کی مطلوبہ فائل ہے؟ اس کے بعد ہی یہ سب کیجیے گا۔" ساتھ کھڑی کاشفہ نے ہلکی آواز میں مشورہ دیا۔

"فائل اوپن کرتے جاؤ نومی! ذرا اس کا جائزہ تو لیا جائے، آخر اس سے برآمد کیا ہوتا ہے؟" گرانٹ نے دوبارہ کہا۔

اب وہ اور کالیا دو کرسیاں کھینچ کر میرے ساتھ ہی دائیں بائیں بیٹھ گئے تھے اور ان کی بھی نظریں اسکرین پر جم گئی تھیں۔ کاشفہ بھی ایک طرف کو بیٹھ گئی تھی۔

اچانک نیچے ایک تیز چیخ کی آواز ابھری۔ ہم سب بری طرح چونکے۔

"مما!" کاشفہ اپنی ماں کی آواز کو پہچان کر چلائی اور اٹھ کر دروازے کی جانب لپکی...، او برائے گرانٹ کی کرسی اس کے قریب تھی، اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی اور اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑتی ہوئی کاشفہ کو بازو سے دبوچ لیا۔

"بے وقوف لڑکی! اس طرح مت جاؤ نیچے۔ ٹھہرو ذرا......" گرانٹ نے اسے سمجھایا۔

"یہ چیخ میری مما کی ہے، چھوڑو مجھے۔" وہ پھر چلائی۔ میں اور کالیا بھی اپنی کرسیاں چھوڑ چکے تھے۔ گرانٹ نے کاشفہ کو نیچے جانے سے روک کر عقل مندی کی تھی۔ میرا اپنا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا اور اعصاب یک دم تن گئے تھے۔

"نیچے ضرور کوئی گڑبڑ ہے، حوصلہ کرو اور پہلے ہمیں صورت حال کا جائزہ لینے دو پلیز، ریلیکس۔" میں نے بھی گھبرائی ہوئی کاشفہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

ہمارے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہ تھا، ایک تو ہم مناوا جیسے شہر میں کوئی غیر قانونی ہتھیار رکھنے کے یوں بھی روادار نہ تھے دوسرے ہم نہیں سمجھتے تھے کہ اس کی کوئی خاص ضرورت پڑتی، محمود الحسن کی یہی نصیحت تھی کہ اس معاملے میں بالخصوص جب شہر کا رخ کیا جائے تو محتاط رہا جائے۔ کیونکہ بہ قول اس کے غیر قانونی یا قانونی ہتھیار کی نمائش کے سلسلے میں یہاں کے قوانین سخت تھے۔ پھر ہم تو تھے بھی غیر ملکی۔ مضافاتی علاقوں جیسے اوالی، صرائفہ اور ربع الخالی کی اور بات تھی۔

لیکن میں نے دیکھا کہ کالیا نے اپنی پشت میں پینٹ کی بیلٹ میں اڑسے ہوئے خنجر کو نکال لیا تھا، یہ دو دھار خنجر تھا۔

ابھی ہم تینوں اسٹڈی روم کے دروازے کی طرف لپکے ہی تھے کہ اچانک زینے پر بھاری قدموں کی دھمک سنائی دی۔

ہم [illegible] دائیں بائیں گھات کی تاک میں بکھرے اور اسی وقت [illegible] نقاب پوش افراد نمودار ہوئے، ان کے ہاتھوں میں عجیب [illegible] ہتھیار تھے، درحقیقت وہ جدید طرز تیر کمان تھے جنہیں [illegible] کراس بو کہتے تھے، ان کے دستے کسی رائفل کی طرح تھے [illegible] ٹریگر تھا جسے دباتے ہی طاقت ور ایئر وا اسپرنگ کے [illegible] اٹکا ہوا تیر فائر ہوجاتا تھا۔

ایک نے تاک کر مجھ پر ایئر وداغا [illegible] ان کی جھلک بھانپتے ہی ایک بڑے سے ڈیونڈ [illegible] جانب جست بھر چکا تھا جبکہ گرانٹ ابھی بیچ راہ میں [illegible] کالیا کی سمت شاید اور رہی تھی۔

مجھ پر کراس بو سے فائر کیا ہوا ایئر وڈیونڈر میں کھب گیا۔

یہی وہ وقت تھا جب کالیا نے اپنا خنجر نوک سے پکڑ کر ایک نقاب پوش کی طرف اچھال دیا جو اس کے سینے پر [illegible] عین دل کے مقام پر لگا۔ اس کے حلق سے ابلتی "اوغ" کی اذیت ناک کراہ آمیز چیخ میں نے بھی سنی تھی۔

دوسرے نے اپنے کراس بو سے کالیا کا نشانہ لیا اور اس نے "خاموش" مگر مہلک تیر اگلا۔ سنسناتی ہوئی مگر بے حد لحاتی سی سرگوشی نما سی آواز اس کی خارج ہوئی تھی اور تیر کالیا کی بجائے اسٹڈی روم کی چوکھٹ میں "ژٹ" کی آواز سے پیوست ہوگیا۔

اسی وقت جب آخر الذکر حملہ آور نے اس بار گرانٹ کو اپنے ہتھیار سے نشانہ بنانا چاہا لیکن جب تک مقابلتاً مجھے سنبھلنے کا موقع مل چکا تھا، بلا دیر میں نے اپنی جگہ سے اچھل کر اسے رگیدڈالا، میں اسے لیتا ہوا زینے پر جا پڑا مگر بد قسمتی سے میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اسی سمیت زینے میں لڑھکتا ہوا نیچے جا پڑا، تاہم میں نے اپنے حواس قابو میں رکھے تھے اور اپنے ساتھ حملہ آور کی بجائے میں نے ابھی

تک کراس بو پر نگاہ رکھی تھی جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اسی کے جسم کے زور تلے فرش تک تو نہیں البتہ زینے کے آخری سے تیسرے قدمچے پر پڑا رہ گیا تھا، کراس بو مجھے چلانا نہیں آتا تھا، اگرچہ مشکل تو نہیں ہوسکتا تھا چلانا مگر پھر بھی اس کا تھوڑا بہت میکنزم سمجھنے میں وقت ہی صرف ہوتا۔

تاہم میں نے کراس بو کو ایک لات رسید کر کے پرے اچھال دیا۔ زینے سے تیزی کے ساتھ نیچے اترتے ہوئے کالیا اور گرانٹ کو میں نے دیکھ لیا۔

تب ہی میں نے اس جانب سے توجہ ہٹا کر بس ایک لمحے کے لیے سامنے دیکھا جہاں مجھے مزید ایک اور لحیم شحیم اور کسرتی بدن والے نقاب پوش کی جھلک دکھائی دے گئی تھی، جس نے لیلیٰ صماد کو ایک عجیب ساختہ خنجر کی دھار پر بے بس کر رکھا تھا اگرچہ اس کے کندھے سے بھی ایک عدد کراس بو اسٹریپ کے سہارے جھول رہا تھا مگر ہماری جانب نگاہ پڑتے ہی اس نے خنجر کو نوک سے پکڑا اور تیزی سے میری جانب اچھال دیا۔

خنجر سنسناتا ہوا میری جانب لپکا اور میں نے حواس بحال رکھتے ہوئے کھڑے کھڑے ایک طرف کو جھکائی دی۔ وہ "شائیں" کی سرسراتی ہوئی سرگوشی اجل دیتا ہوا میرے دائیں کان کے اس قدر قریب سے گزرا تھا کہ اس کی جھپک مجھے اپنے چہرے پر صاف محسوس ہوئی تھی۔

[illegible] صماد اس کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی سراسیمہ سی آواز [illegible] خارج کرتی ہوئی ایک طرف کو جا کھڑی ہوئی۔

میں اس کی جانب [illegible] بے خبر نہیں تھا، آخر الذکر حملہ آور نے اپنے خنجر کا وار خالی جاتے دیکھ کر بہ سرعت اپنے کندھے سے کراس بو اتارنے کی کوشش چاہی تھی مگر میں اب اسے اتنی مہلت کہاں دینے والا تھا! [illegible] سنبھالا لیتے ہی بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ایک اور زقند [illegible] نے جب تک کراس بو کا رخ میری جانب کرنا چاہا میں [illegible] پڑا اور اسے اپنے بدن کے زور پر رگیدتا لے گیا۔

کراس بو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پرے جا گرا مگر وہ بھی غافل نہ تھا، وہ مجھ سمیت گرتے ہی وسیع لاؤنج کے چکنے فرش پر مچھلی کی طرح تڑپا اور جب تک میں اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لیتا وہ ماہی بے آب کی طرح میری دسترس سے نکلتا چلا گیا مگر میری رگوں میں بھی جیسے بل کے بل پارا دوڑ پڑا تھا، میں نے بھی کھڑے ہونے کی کوشش میں وقت ضائع کیے بغیر اپنی کہنیوں اور گھٹنوں کے بل پر تیزی سے اس کی جانب رینگنے کی کوشش چاہی تھی کہ مجھے ایک کراہ نما چیخ سنائی دی۔

میری توقع کے عین مطابق گرانٹ اور کالیا نے حملہ آور کے اس ساتھی کو دبوچ لیا تھا جو زینے کی طرف لڑھکا تھا۔

وہ شاید اپنا کراس بو اٹھانے کی کوشش میں تھا یا اٹھا چکا تھا کہ انہوں نے اسے چھاپ لیا تھا۔

میرا شکار یک دم مجھ پر پل پڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر اسی وقت اس کے سینے میں کراس بو کا مہیب ایئرو پیوست ہوگیا اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو گرانٹ زینے پر موجود تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں کراس بو تھما ہوا تھا۔ اسی نے ہی میرے مد مقابل پر تیر چلایا تھا۔

گویا جس تیزی سے ان تینوں حملہ آوروں نے اپنے عجیب و غریب ہتھیاروں سے یہاں ہلہ بولا تھا اسی سرعت الحرکات سے ہم نے انہیں بچھاڑ بھی دیا تھا۔

دو حملہ آور مارے جا چکے تھے، ایک کو قابو کر لیا گیا تھا جسے گرانٹ یا کالیا نے کوئی وار کر کے بے بس کر دیا تھا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔

اب کاشفہ بھی اوپر سے نیچے اتر آئی تھی اور اب دونوں ماں بیٹی خوف زدہ سی حالت میں ایک دوسرے کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔

بیرونی دروازہ بند تھا اور میں نے ان دونوں کو تسلی دینے کے بعد صوفوں پر آرام سے بیٹھ جانے کی تلقین کر ڈالی۔

"ک......کون تھے یہ لوگ؟" کاشفہ نے سراسیمہ سی آواز میں کہا۔

"ہم دیکھ لیتے ہیں آپ لوگ تسلی رکھیں۔" میں نے ان سے کہا اور کالیا سے کہا کہ وہ اوپر جا کر دوسرے حملہ آور کی لاش نیچے اتار لائے۔

وہ پلٹ گیا اور میں نے پہلے والے حملہ آور کا جائزہ لیا۔ جب تک کالیا حملہ آور کی لاش اپنے کاندھوں پر اٹھائے نیچے آ گیا گرانٹ کے اشارے پر اسے اسی کے قریب ڈال دیا جہاں اس کے ساتھی کی لاش پڑی تھی۔

گرانٹ نے آگے بڑھ کر ان کے چہروں سے نقاب اتار پھینکے تھے جو "فل فیس" تھے۔

میں نے دیکھا ان کے چہرے گول اور رنگت قدرے سرخی مائل سپید تھی۔ ناک تھوڑی چپٹی اور آنکھوں کے کونے کھنچے ہوئے تھے بھنویں باریک تھیں۔ ہونٹ پتلے تھے۔

”اوہو..... یہ تو مجھے غیر ملکی لگتے ہیں۔“ میں نے ان کے چہروں کی رنگت اور نقوش دیکھتے ہوئے بے اختیار کہا۔

”ہاں! غیر ملکی، مگر ایشین ہیں۔“ گرانٹ نے بھی رائے دی۔

پھر میرے کہنے پر ان کی تلاشی لی گئی۔ چند مختصر سے روایتی جیبی سامان کے اور کچھ برآمد نہ ہوا۔ کچھ فاضل تیر برآمد ہوئے تھے جو انہوں نے اپنے چست سیاہ لباس کے اندر ایک بیلٹ کے ساتھ جسم سے چپکا رکھے تھے۔

میں اور کالیا تو الجھے ہوئے ہی تھے لیکن گرانٹ کے چہرے پر کچھ زیادہ ہی سوچ کے آثار نمایاں تھے اور اس کی فراخ پیشانی پر نمودار ہوتی کئی سلوٹیں بھی بتا دیتی تھیں کہ وہ کسی اہم جزو پر غور کر رہا تھا۔

”کیا تمہیں ان کے بارے میں کچھ اندازہ ہو رہا ہے گرانٹ؟“ میں نے بالآخر اس سے سوال کیا۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھا اور ملک ملکوں گھوما ہوا تھا۔ قسم قسم کے لوگوں میں اٹھا بیٹھا تھا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کے چہرے پر میں ایسی ہی سنجیدگی کو کھنڈے ہوئے دیکھ سکتا تھا جو میں نے پہلی بار پاکستان سے بحرین آتے ہوئے طیارے میں اس سے پہلی ملاقات کے وقت محسوس کی تھی اور پہلا تاثر اس وقت اوبمائے گرانٹ کے سلسلے میں میرا یہی تھا کہ وہ اپنے کام میں سنجیدہ اور کبھی نہ مسکرانے والا آدمی تھا۔

وہ جھکا، میں اور کالیا اسے تکتے رہے۔ کاشفہ بھی اپنی ماں سے الگ ہو کر صوفے سے اٹھ کے ہمارے قریب چلی آئی تھی۔

گرانٹ نے جھکتے ہی ایک حملہ آور کے کالر کا بٹن کھولا اور اس کی گدی کے قریب کچھ دیکھا پھر اسی طرح دوسرے اور تیسرے کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا پھر سیدھا کھڑے ہو کر گہری سانس لی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا جہاں مجھے دنیا جہاں کی تشویش دکھائی دیتی تھی۔

”میرا خیال ہے یہ ساگاتی کے باشندے ہیں۔“ گرانٹ نے اپنے تجربے اور مشاہدہ کے مطابق خیال ظاہر کیا۔

”ساگاتی...... ابے لے..... کیا یہ لوگ صرف ساگ کھاتے ہیں۔“ کالیا اپنے مطابق خیال آراء ہوا۔ مجھے اس کی بات پر ہنسی آئی مگر گرانٹ سنجیدگی سے بولا۔

”ان لوگوں کا ایسا کوئی دھندا نہیں ہے۔ ساؤتھ افریقا میں واقع ایک وادی کا نام ہے، جسے ڈیڈ کیپسل قلعہ الموت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہی عنوان ہے مسٹر نعمان! جو تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اوپر کمپیوٹر میں فائل ”RM-7“ میں پڑھا تھا۔“

مجھے گرانٹ کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ ان سے متعلق بہت کچھ جانتا تھا۔ گرانٹ بھی خاصا پُرجوش دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ بتاتا رہا۔

”میں چند سال پہلے ایک مشترکہ ایرانی اور ترکی میگا آئل پروجیکٹ میں کام کرتا رہا ہوں [illegible] نے کا اتفاق ہوا تھا میرا۔ دشت لوط میں ان کا پروجیکٹ [illegible] مشرقی کرمان میں واقع ہے۔ وہاں کسی کنوئیں میں [illegible] اٹھی تھی۔ میں ان دنوں آذربائیجان کے شہر باکو [illegible] پروجیکٹ میں تھا، ایک ہیلی کاپٹر مجھے لینے ایران سے وہاں پہنچا تھا۔

وہیں میں نے ریاست ساگارتی کے بارے میں سنا تھا جو خودمختیاری کی دعوے دار تو تھی مگر وہاں امن نہ تھا۔ میلوں دور تک پھیلے صحراؤں اور خشک بنجر علاقہ تھا جس کے دامن میں وادی حشاشین واقع ہے۔

امن کی بحالی کے سلسلے میں ایرانی حکومت ساگارتی والوں کی مدد میں شامل تھی۔ تاہم وہاں کچھ مشکوک اور پُراسرار سرگرمیوں کی افواہیں میرے کانوں میں بھی پڑتی رہی تھیں۔ اب میرا خیال ہے کہ اس فائل کا آرام سے بیٹھ کر مطالعہ کرلیا جائے تو مزید حقائق سمجھنے میں آسانی بھی ہوگی اور رہنمائی بھی میسر آسکتی ہے۔“ اس نے بات ختم کی۔

دو حملہ آوروں کی لاشیں ٹھکانے لگانے کا معاملہ خاصا گھمبیر تھا۔ تیسرے کو جو زندہ تھا، کالیا نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تھے۔ اس سے بھی بہت کچھ اگلوانے کی اُمید تھی تاکہ حقائق واضح ہوسکیں۔

لیکن میں نے دیکھا کہ لیلیٰ صماد جو خود بھی قلعہ الموت اور حشاشین وغیرہ سے متعلق باتیں غور سے سن رہی تھی، اس کے چہرے پر خوف اور تشویش و ہراسگی کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔

لیلیٰ صماد کی ان کیفیات کو شاید میں ہی بھانپ سکا

تھا۔ جس وقت ہم ان دو حملہ آوروں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں غور کر رہے تھے، میں اپنے تجسس کو نہ روک سکا اور بالآخر لیلیٰ صماد سے اس کی تشویش اور بے چینی کا سبب پوچھ ہی بیٹھا۔

میرے استفسار پر نجانے اس خاتون کو کیا ہوا کہ وہ رو پڑی۔ اس قدر جیسے اس پر دکھوں کا کوئی پہاڑ آن گرا ہو، بلاشبہ اس میں کیا شک تھا کہ وہ بہت دکھی عورت تھی۔ جوان بیٹے کی موت پھر شوہر کی اچانک دائمی جدائی اور اب اس قسم کے خطرناک حالات نے اس بے چاری کو ادھ موا کر ڈالا تھا۔

میں نے گھر میں اس کی اپنے شوہر شاہ میر کے ساتھ دیوار اور کارنس پر لگی تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ بلاشبہ ایک حسین خاتون تھیں۔ ماں بیٹی تو لگتی ہی نہیں تھیں دونوں پر بہنوں کا ہی شبہ ابھرتا تھا مگر اب تو وہ جیسے غموں اور دکھوں کی تصویر نظر آنے لگی تھی۔

گلنار سا چہرہ پژمردہ ہو کر رہ گیا تھا، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ اس میں کیا شک تھا کہ یہ سب اس کے اپنے ہی شوہر شاہ میر کے کرتوتوں کا کیا دھرا تھا جو گمنامی میں [illegible] ہونے کے بعد بھی بیوی اور بیٹی کے لیے کتنی بڑی مصیبتوں کا سبب بنا تھا۔

لیلیٰ صماد کو یوں ایک دم روتا دیکھ کر میں خفیف سا ہو گیا، گرانٹ اور کالیا بھی تھوڑا گڑبڑا سے گئے۔ کاشفہ سسکتی ہوئی ماں کو سنبھالنے [illegible] لگی۔ اسے شاید اپنی ماں کے دکھوں کا اندازہ تھا جبکہ وہ [illegible] غم بحرِ رواں میں غوطہ زن تھی۔

میرا اندازہ درست ثابت [illegible] کیونکہ جیسے ہی کاشفہ نے ماں کو سنبھالنے اور دلاسے کی [illegible] ابھی چند ہی الفاظ کہے تھے کہ لیلیٰ صماد صدمے [illegible] سے پھٹ پڑی۔

”کیا ہو کر رہ گئی ہے ہماری زندگی۔ ایک جہنم کا نمونہ۔ کتنا سمجھاتی تھی میں تمہارے باپ کو کہ وہ جن خطرناک لوگوں کے ساتھ مل کر جو دھن دولت جمع کر رہا ہے ایک دن وہ اس گھر کو لے ڈوبے گا آخر وہی ہوا نا۔ پہلے ان دشمنیوں میں میرا جوان بیٹا مارا گیا اور قاتل ہماری نظروں کے سامنے کھڑا ہے اور ہم بے بس ہیں۔“ کہتے ہوئے اس نے اشکوں بھری نگاہوں سے میری جانب سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ میرے دل کو جیسے گھونسا لگا۔

”اور ہم ماں بیٹی کتنی مجبور ہیں کہ ان سے روابط کیے بیٹھی ہیں کہ یہ نجانے ہمارے کن نامعلوم دشمنوں سے ہمیں محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے، پھر تمہارا باپ مارا گیا۔ میں نے یہ زہر بھی پی لیا اور سینہ کوبی بھی نہ کرسکی کہ شاید اب ہم دونوں کی زندگیوں سے بھونچال ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا لیکن..... لیکن کیا ہوا؟ تم دیکھ رہی ہو نا یہ سب کاشفہ! تمہارے باپ کو مارنے کے بعد دشمن اب ہمارا بھی صفایا کرنا چاہتے ہیں۔“

لیلیٰ صماد پر جیسے ہسٹریائی دورہ پڑا تھا وہ اپنی بیٹی کو آہستگی کے ساتھ خود سے پرے ہٹاتی ہوئی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر ہماری جانب بڑھی۔ اس نے روتے ہوئے ہمارے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

”خدا کے لیے..... ہمیں معاف کردو اور آپ اور [illegible] خون کا یہ کھیل بند کردو۔ اب..... اب..... مجھ میں اپنی بیٹی کھونے کا حوصلہ نہیں رہا ہے۔ ہم ماں بیٹی اس دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی ہیں۔ ہم نے اب کس کا کیا بگاڑا ہے۔ چھوڑ دو ہمیں..... بائی گاڈ..... ہم کسی کا برا نہیں سوچتیں، بچا بھی کیا ہے ہمارے پاس..... فار گاڈ سیک..... فار گاڈ سیک.....“

کہتے کہتے وہ غم و اندوہ تلے کپکپانے لگی اور اس پر شدت غم و درد تلے غش طاری ہونے لگا۔ کاشفہ ”ممّا“ کہتی ہوئی اس کی جانب لپکی اور میں نے آگے بڑھ کر لیلیٰ صماد کو گرنے سے بچایا، پھر جب کاشفہ نے اسے سنبھال لیا تو اسی کی مدد سے نہایت احتیاط کے ساتھ لیلیٰ کو صوفے پر لٹا دیا۔

”ہم..... میرا خیال ہے ڈاکٹر کو فوراً فون کرنا چاہیے۔“ کاشفہ پریشانی سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

بڑی عجیب صورت حال تھی۔ ہم اس وقت کسی کو یہاں نہیں بلا سکتے تھے۔ کالیا اور گرانٹ میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے آگے بڑھ کر لیلیٰ صماد کی کلائی تھامی اور نبض دیکھی، وہ کچھ تیز تھی۔ پھر کاشفہ سے کہا۔ ”تم ٹھنڈا پانی لاؤ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تمہاری مما شوگر یا بلڈ پریشر کی مریض تو نہیں ہیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تب میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”پھر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تم پانی لاؤ، یہ صدمے کا دورہ ہے۔ پے در پے پیش آنے والے منفی حالات اس کا سبب ہوتے ہیں لہٰذا ایسی کیفیات عموماً عارضی ہوتی ہیں۔“

کاشفہ پانی لینے چلی گئی۔ وہ جلدی لوٹ آئی۔ میں نے پانی کے چھینٹے لیلیٰ صمد کے ستے پڑے چہرے پر ڈالے اور کاشفہ کو گلاس بھر کر دیا کہ وہ انہیں پلانے کی کوشش کرے۔

وہ خود بھی صوفے پر بیٹھ گئی اور ماں کا سر اپنے زانوں پر رکھ کر پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا، وہ ہوش میں آنے لگی تھی۔ اس نے کپکپاتے ہونٹوں سے چند گھونٹ پانی پیا اور پھر سکون سے آنکھیں موند لیں۔

میں بھنویں سکوڑے اس کی کیفیات دیکھتا رہا۔ وہ سو گئی تھی۔ میں نے کاشفہ کو تسلی دی اور اسے اپنے ساتھ آنے کا کہا۔ وہ آہستگی سے ماں کے پاس سے اٹھ کر چھوٹے چھوٹے قدم چلتی میرے قریب آگئی۔ میں نے ایک جانب خاموش کھڑے کالیا اور گرانٹ کو بھی اشارہ کیا اور ایک کمرے میں آگیا۔

میرے چہرے پر انتہا درجے کی سنجیدگی طاری تھی۔ کالیا اور گرانٹ بدستور یک ٹک میرے چہرے کی طرف تکے جا رہے تھے۔ کاشفہ بھی جھجکتی ہوئی ہمارے ہمراہ دوسرے کمرے میں آگئی۔

"دیکھو کاشفہ! میں تمہیں مختصر ترین الفاظ میں چند باتیں اور کچھ حقائق سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں، جن کا سہارا لے کر تم اپنی ماں کو اور کچھ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق بھی انہیں سمجھانے کی کوشش کر سکتی ہو۔ تم ایک سمجھدار لڑکی ہو۔ اب تک کے سارے حالات تمہاری نظروں میں بھی رہے ہوں گے۔

تم لوگوں کے ساتھ جو کچھ ہوا مجھے بھی اس کا دکھ ہے۔ کبھی کبھی تقدیر الٹی چال چلتی ہے لیکن یہ ہم سمجھتے ہیں جبکہ اس میں خدا ہی کی کوئی مصلحت چھپی ہوتی ہے۔ میری مراد تمہارے باپ شاہ میر سے ہے۔ وہ میرا دشمن تھا لیکن معاف کرنا وہ میرا ایک ظالم دشمن تھا۔ اس نے میرے باپ کو قتل کر کے ایک جھوٹے الزام میں پھنسوایا اور وہ بے گناہ تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ تمہارے باپ کو پھر بھی چین نہیں ملا اور اس نے میرے جوان اور گبرو بھائی فہیم کی دونوں ٹانگیں نہایت سفاکی کے ساتھ کاٹ ڈالیں۔ دشمن تو میں بھی اس کا تھا مگر میں نے کبھی اس کے ساتھ آج تک کوئی ظالمانہ حرکت یا خونریز جنگ نہیں کی، کیونکہ میں تمہارے باپ کی طرح کوئی گینگسٹر یا عادی مجرم نہیں تھا نہ ہی میں کوئی اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ میں ایک نہایت سادہ طبیعت اور متوسط گھرانے سے

تعلق رکھنے والا آدمی ہوں لیکن...... جب مجھ پر اس قدر ظالمانہ فضا مسلط کر دی گئی تو مجبوراً مجھے بھی بقا کی جنگ میں کودنا پڑا لیکن تب بھی میری جنگ قانون کے دائرے تک ہی محدود رہی۔ میں نے کوئی گینگ نہیں بنایا نہ ہی کسی عالمی مافیا کا آلۂ کار بنا، کیونکہ میں خون خرابے اور بے گناہ لوگوں کی جان لینا سخت گناہ سمجھتا ہوں۔ حتیٰ کہ... دشمنوں کے معاملے میں بھی میں نے کبھی بربریت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ الگ بات [illegible] اور مکافات عمل حرکت میں آتے رہے اور دشمن میرے [illegible] ہوتے چلے گئے۔ مجھے بھی جواب دینا تھا کیونکہ میں اب [illegible] ان [illegible] بہن کا بھائی بھی تھا۔ تمہارے باپ کے ہاتھ وہاں تک پہنچنے لگے۔ میرے ایک بہی خواہ رانا بشیر کی جوان بیٹی کو [illegible] نے اغوا کر کے پاکستان سے یہاں پہنچا دیا۔ میں نے [illegible] جھکانے کے لیے وہی داؤ کھیلا۔

تمہارے بھائی ثمیر کو میں نے ہی یرغمال بنا [illegible] گواہ ہے کہ میرا اسے ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ حالانکہ میرے ہاتھ میں اس وقت تیز دھار بغدا تھا اور تمہارا بھائی میرے سامنے بندھا ہوا بے بس پڑا تھا۔ اس کی دونوں سالم ٹانگیں میری انتقام سے جلتی ہوئی آنکھوں کے سامنے تھیں اور وہ منظر بھی میری نظروں کے سامنے تھا جب میں نے اپنے معصوم جوان بھائی کی دونوں ٹانگوں کو رانوں سے کٹا ہوا دیکھا تھا لیکن میں نے بغدا تمہارے بھائی کی ٹانگوں پر چلانے کی بجائے فرش پر دے مارا تھا اس لیے کہ جو بربریت اور بے رحمی کا کھیل تمہارے باپ نے میرے بھائی کے ساتھ کھیلا تھا وہ میں ثمیر کے ساتھ نہیں کھیل سکتا تھا کیونکہ یہ میری فطرت ہی نہیں تھی۔ میں تو تمہارے باپ کو قانون کے کٹہرے تک لانا چاہتا تھا لیکن افسوس کہ وہ جن سیاہ کار لوگوں کا آلۂ کار تھا، انہوں نے ہی بعض ذاتی مفادات کی خاطر شاہ میر کو بے رحمی سے قتل کر ڈالا اور پھر دیکھو کہ شاہ میر نے مرتے مرتے مجھ پر کس قدر اعتماد کیا، صرف اس لیے کہ وہ بھی اب تک میری خدا ترس فطرت سے واقف ہو چکا تھا۔ اس نے آخری سانسوں میں مجھ سے معافی مانگی اور مجھے کچھ ایسے راز بتائے کہ میں ان دشمنوں کو نابود کر سکوں جو بڑے پیمانے پر تباہی لانے والے ہیں۔ فائل "RM-7" کا بتانا کیا میری بات کا ثبوت نہیں؟"

"لل...... لیکن مما کا خیال ہے کہ بھائی ثمیر آپ ہی کی کسٹڈی میں مارے گئے تھے۔" کاشفہ نے اچانک

درمیان میں کہا۔ "وہ سمجھتی ہیں کہ نہ آپ بھائی کو اغوا کرتے نہ بھائی جان کی ہلاکت ہوتی۔"

"وہ کسی حد تک ان کی بات ٹھیک بھی ہے۔" میں نے دیانت دارانہ صاف گوئی سے کہا۔ "لیکن اگر ایسا وہ سوچتی ہیں تو پھر یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ اگر شاہ میر فرحانہ کو اغوا نہیں کرتا تو ثمیر بھی نہیں مارا جاتا۔ ابتداء تو شاہ میر کی طرف سے ہوئی تھی نا۔"

"بہرکیف...... میں نے جس تقدیر کی الٹی چال کا ذکر ابھی کیا تھا وہ یہی ہے کہ دیکھو جو دشمن تھے اب انہی کا تحفظ میری ذمے داری بن گیا ہے۔ سمجھو تو یہی حقیقت ہے۔ اگرچہ میں پہلے بھی تمہاری ماں کو یہ سب باتیں سمجھا چکا ہوں لیکن شاید وہ نہیں سمجھ پائی۔ تمہاری مما کو ان خطرات کا اندازہ ہو چلا ہے اور شاید تمہیں بھی، ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں، تمہیں دشمنوں سے بچانا چاہتے ہیں، کیونکہ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ شاہ میر جن کا آلہ کار تھا کسی وجہ سے وہی تمہارے دشمن بن چکے ہیں اور فائل "RM-7" کے پیچھے دیدہ ہی نہیں بلکہ نادیدہ دشمن بھی لگ چکے ہیں، اسی لیے ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن بدگمانی کی اس فضا میں [illegible] لیے یہ مشکل ہو جائے گا۔

[illegible] یہ آخری بار سمجھا رہا ہوں، میرے پاس اب بار بار اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے تمہیدیں باندھنے کا نہ وقت رہا ہے نہ ہی اب میں آئندہ کبھی اس کی ضرورت سمجھتا ہوں، [illegible] آتی ہے تو ٹھیک ورنہ پھر تمہارا الگ راستہ ہمارا الگ [illegible] کوئی لالچ نہیں ہے۔ تمہاری مما ہوش میں آجائے تو انہیں یہ ساری باتیں سمجھا دینا، ابھی تم لوگ آرام کرو اور ہمیں [illegible] نمٹانے دو۔"

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ [illegible] باتیں کاشفہ چپ چاپ مگر غور سے سنتی رہی تھی، [illegible] کی بولتی سی آنکھوں سے آنسو بھی بہتے رہے تھے۔ [illegible] تروتازہ اور خوب صورت بیضوی چہرے سے میری باتوں کی اثر پذیری بھی اندرونی جوش تلے ایک خفیف سی سرخی کی صورت جھلکتی بھی رہی تھی۔ میں اسے اسی طرح چھوڑ کر دوبارہ لاؤنج میں آگیا۔ کالیا اور گرانٹ بھی میرے پیچھے چلے آئے۔

"لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا کیا سوچا ہے تا کہ فائل کا معاملہ فائنل کیا جائے؟" میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کالیا کا خیال ہے کہ پولیس کو انفارم کر دیا جائے، باقی سر درد ان کا ہوگا۔" اوبرائے گرانٹ نے قریب کھڑے کالیا کی طرف اشارتاً دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"تمہارا کیا مشورہ ہے گرانٹ؟" میں نے سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔

"ان دونوں کی لاشوں کو ہمیں ہی خفیہ طریقے سے ٹھکانے لگانا چاہیے، پولیس ہمارا سر درد دور کرنے کی بجائے تفتیش کے جال پھیلا دے گی۔ اس فائل کا تفصیلی مطالعہ اور اس کی کاپی ضروری ہے۔ آخر میں ان کے تیسرے زندہ بچ جانے والے اس نامعلوم حملہ آور سے کچھ اگلوانا چاہیے۔"

"میرا خیال ہے تمہاری تجویز مناسب ہے۔" میں نے گرانٹ کے چہرے پر غور کرنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا اور کالیا پر بھی ایک نظر ڈالی۔ اس نے کندھے اچکا دیے۔

دونوں لاشوں کو کینوس کی دو بوریوں میں ڈال دیا گیا۔ انہیں ٹھکانے لگانے کی اسکیم یہی تھی کہ رات کے درمیانی پہر میں کار کی ڈگی میں ڈال کر کسی ویرانے میں پھینک دی جائے۔ کیونکہ یہ گولیوں سے نہیں خنجروں سے مرے تھے۔ پولیس کو ہم پر شبہ ہونا مشکل تھا۔

یہ طے کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر کمپیوٹر ٹیبل پر آ بیٹھے۔ فائل اوپن تھی۔ پرنٹر پر پیپر موجود تھے۔ اس کی ہارڈ کاپی نکالنے کے بعد ہی ہمارا ارادہ اسے آرام اور غور سے پڑھنے کا تھا۔

جب فائل پرنٹ کی جانے لگی تو پتا چلا کارٹریج خالی تھا۔ ہم پریشان ہو گئے۔ فائل ایسی تھی کہ اسے یو ایس بی میں سیو کر کے باہر کسی اور جگہ سے بھی پرنٹ نہیں کروایا جا سکتا تھا۔ یہ سیکریٹ ایشو کا معاملہ تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر کالیا سے کہا کہ وہ نیچے جا کر کاشفہ کو بلا لائے۔

ذرا ہی دیر بعد وہ کاشفہ کو بلا لایا بلکہ عقل سلیم سے کام لیتے ہوئے لگے ہاتھوں اس نے کاشفہ سے مسئلہ بھی گوش گزار کر ڈالا، اسی سبب کاشفہ نے اوپر آتے ہی کوئی بات کیے بغیر کونے میں دھری پڑی ایک الماری سے نیا کارٹریج نکال کر پرنٹر میں فٹ کر دیا۔

میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ فائل کے چند صفحات ہی تھے۔ میں نے حفظ ماتقدم کے تحت فائل کی تین کاپیاں پرنٹ کر ڈالیں۔ پھر احتیاط کے پیش نظر میں نے بھی اپنے ایک الٹرنیٹ ای میل ایڈریس سے دوسرے ای میل

ایڈریس پر بھی سینڈ کردی تاکہ ''ان باکس'' میں بھی محفوظ رہے، اس کے بعد فائل میں نے کمپیوٹر سے ڈیلیٹ کردی۔
یوں اب اس فائل کا ریکارڈ صرف میرے پاس تھا۔ ایک ہارڈ کی صورت میں اور دوسرا میری ای میل آئی ڈی کے ''ان باکس'' میں۔
''آپ کی مما کی اب طبیعت کیسی ہے؟'' یہ کام نمٹانے کے بعد میں نے کاشفہ سے پوچھا۔
''جی! اب تو بہت بہتر ہیں۔'' کاشفہ نے اپنی گھنیری پلکوں تلے سیاہ گہری آنکھوں سے میرے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے جواب میں کہا۔ ''میں نے مما کو آپ والی باتیں سمجھادی تھیں۔''
''اچھی بات ہے۔'' میں نے مختصراً ہولے سے کہا۔
پھر اس نے پوچھا۔
''آپ کا کام ہوگیا؟''
''ہاں!'' میں نے مختصراً جواب دیا اور قریب کھڑے کالیا اور گرانٹ پر ایک نظر ڈالی۔ ابھی ہم کسی بات پر تبادلہ خیال کا سوچ ہی رہے تھے کہ اسٹڈی روم میں سریلی سی بیل بجی۔ ہم چونک پڑے لیکن کاشفہ مسکرائی۔
''یہ مما نے بیل دی ہے نیچے سے...... وہ شاید ہمیں بلا رہی ہیں۔''
میں نے فائل سنبھالی اور ہم سب نیچے آگئے۔ لاؤنج میں پہنچے تو مجھے ذرا چونکنا پڑا۔
لیلیٰ صماد کافی بہتر نظر آرہی تھی۔ اس نے لباس بھی بدل لیا تھا اور ہلکا پھلکا میک اپ بھی کرلیا تھا۔ واضح طور پر وہ کافی فریش نظر آرہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے والے غم و اندوہ کے جوار بھاٹے کی سی جو اس پر کیفیات طاری ہوئی تھیں۔ آثار اس کے چہرے سے اب عنقا ہی نظر آتے تھے۔
لیکن میرے چونکنے کی وجہ اب اور تھی۔ اس نے ایک بڑی سی میز پر کچھ کھانے پینے اور چائے کے برتن لگا رکھے تھے۔ وہ ایک کرسی کے پاس ہی کھڑی تھی اور ہماری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آپ لوگ پہلے بھی آئے تھے میں کچھ پیش نہ کرسکی تھی، پھر حالات بھی کچھ ایسے رہے کہ......''
''اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی، مسز شاہ میر!'' میں نے اس کی بات کاٹ کر متانت سے کہا۔
تاہم مجھے حیرت تھی کہ اس نے کچھ زیادہ ہی جلدی خود کو سنبھال لیا تھا۔ شاید اس نے موجودہ حالات کو اب ذہنی طور پر قبول کرلیا تھا۔
''آں...... ہاں! مسز شاہ میر نہیں صرف لیلیٰ! آنٹی بھی کہہ سکتے ہو مجھے۔'' وہ مسکرا کے مجھے ٹوکتے ہوئے بولی۔ میں بھی بے تاثر سے انداز میں مسکرادیا۔
پھر ہم سب ٹیبل کے گرد بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
''معاف کیجئے گا، گھر میں بس یہی کچھ رکھا تھا۔'' لیلیٰ قدرے خفت سے بولی۔
''میں نے کہا نا اس کی بھی ضرورت نہیں تھی، آپ نے بس زحمت ہی کرڈالی، آپ کی طبیعت بھی......'' میں نے کہا اور اچانک مجھے اپنا [illegible] ادھورا چھوڑنا پڑا۔
اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایسے رخ میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے میری نگاہ [illegible] اس کمرے کے ملحقہ دروازے پر پڑی تھی جہاں ہم [illegible] بے ہوش حملہ آور کو رسن بستہ حالت میں بند کر رکھا تھا مگر اب مجھے اس کا دروازہ تھوڑا کھلا ہوا دکھائی دیا تھا۔
یک لخت کسی گڑبڑ کے احساس تلے میں چونک پڑا اور اس جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا اس کمرے میں کوئی گیا تھا؟''
میری بات پر سب نے اس کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا تھا۔
''اوہو...... نن...... نہیں تو، شاید ویسے ہی تھوڑا سا کھلا رہ گیا ہو۔'' لیلیٰ صماد نے جواب دیا۔
مجھے اس کے چہرے پر جو کچھ دیر پہلے کھلا کھلا تھا اب وہاں ایک دم میں نے گھبراہٹ کے آثار محسوس کیے تھے۔ میرے اندر کھٹک سی ابھری اور میں یہ کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں ذرا ایک نظر جائزہ لے لوں۔''
میں جب کمرے کی جانب بڑھا تو کالیا نے بھی فوراً اپنی کرسی چھوڑ دی تھی۔ کاشفہ اس وقت چائے اور بسکٹ وغیرہ سرو کررہی تھی۔
میں دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ لائٹ آن تھی۔ حملہ آور کو فرش پر جکڑ بندوں میں پڑے دیکھ کر میں نے بے اختیار اطمینان کی ایک گہری سانس لی تھی۔
وہ حملہ آور ہوش میں آچکا تھا اور میری جانب بڑی غصیلی نظروں سے گھور رہا تھا، اس نے تہدید آمیز انداز میں مجھ سے کچھ کہنا بھی چاہا تھا مگر میں اس کی زبان سمجھنے سے قاصر رہا۔ میں نے بہ غور اس کے ہاتھوں پیروں کی بندشوں



[illegible] لیا اور پھر میں اور کالیا پلٹ آئے۔
[illegible] دوبارہ ہم میز پر بیٹھے تھے۔ میں نے دیکھا لیلیٰ [illegible] چوری نگاہوں سے میرے چہرے کی جانب [illegible] رہی تھی۔
[illegible]...... بے دلی کے ساتھ چائے اور بسکٹ وغیرہ کی [illegible] ہوگیا لیکن اب جانے کیا بات تھی کہ میرے دل [illegible] سی لگ گئی تھی۔ کچھ ایسا تھا جو میرے اندر کی بے [illegible] وجہ بن رہا تھا۔ کوئی ایسی گڑبڑ جو تھوڑی دیر پہلے ہی ہوئی ہو مگر کیا؟ ایسی کیا گڑبڑ ہوئی ہوگی؟ مجرم تو بے بس اندر پڑا تھا! لیکن مجھے یاد تھا کہ جب کالیا اور او برائے گرانٹ نے اس حملہ آور کو اندر لے جا کر بند کردیا تھا تو میں نے خود اس کمرے کے دروازے کو چیک کیا تھا۔ وہ بند تھا۔
چائے وغیرہ پینے کے دوران گرانٹ تو نہیں البتہ کالیا میری طرف نظر اٹھا کر تکتا جاتا تھا۔ جیسے وہ میرے اندر ہونے والی ہلچل سے واقف ہو۔
اچانک میں نے گرانٹ کو کرسی سے نیچے گرتے دیکھا۔ میں بدکا، کاشفہ نے قدرے چونک کر اپنے حلق سے ہلکی سی چیخ سے مشابہ آواز خارج کی تھی۔
کالیا اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھا تھا، وہ بھی مجھے کرسی پر بیٹھا لہراتا ہوا سا نظر آنے لگا اور پھر وہ بھی گرا، خود میں نے اپنا سر چکراتا محسوس کیا اور اسی دوران میری ڈوبتی بصارت نے غیر ارادی طور پر سامنے بیٹھی لیلیٰ صماد کے چہرے کا جائزہ لیا تھا جہاں مجھے ایک زہریلی سی مسکراہٹ رقص کرتی دکھائی دی تھی۔
اس کے [illegible] اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہوچکا تھا۔

☆......☆

دوبارہ ہوش آیا تو میری نظروں کے سامنے تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ چند ثانیے تو میں [illegible] کی کیفیات سے دوچار رہا اس کے بعد سر کو دو تین بار [illegible] کہ ذہن سے کچھ دھند چھٹی، پھر کچھ ہوش و حواس [illegible] ہوا۔ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتے ہی میری تشویش آمیز بے [illegible] سوا ہونے لگی۔ پیش آمدہ واقعات مجھے یاد آتے گئے۔
لیلیٰ صماد کا پہلے مارے غم کے ہسٹریائی کیفیات کا شکار ہونا، اس کے بعد اچانک رویّہ بدلنا، اس کی مشکوک حرکات و سکنات اور دروازہ کھلا رہ جانا لیکن اندر حملہ آور کا موجود رہنا۔ بالآخر گرانٹ سمیت کالیا اور میرا چائے کی میز پر بے ہوش ہو کے ڈھے جانا۔
یوں پل کے پل میرے ذہن کے کمپیوٹر نے نتیجہ اخذ کرلیا کہ اس سارے پُراسرار چکر کی ذمے دار لیلیٰ صماد کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔
پوری طرح حواس بحال ہونے تک مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ میں کسی گاڑی کی ڈگی یا پھر کسی ٹرک میں پڑا تھا۔ مجھے کالیا اور گرانٹ کی فکر ہوئی۔
دفعتاً ایک کراہ سے مشابہ آواز پر میں چونکا، پھر ساتھ ہی ایک اور آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔
''کک...... کالیا! گرانٹ؟'' میں نے ایک محتاط انداز سے اپنے بے جگر ساتھیوں کو پکارا۔ تسلی ہوئی دل کو کہ وہ بھی میرے ساتھ ہی تھے۔
''ابے لے...... جگری! ہاتھ دکھا گئے دشمن۔'' تاریکی میں کالیا کی مخصوص آواز سن کر میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میرے رسن بستہ جسم کو بدستور ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔
''اوہ! تھینکس گاڈ! تم لوگ بھی یہیں ہو۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔'' یہ گرانٹ کی آواز تھی جو آخر میں غصیلی ہوگئی تھی۔ وہ بھی شاید اب تک اپنے پورے ہوش و حواس میں آچکا تھا۔
''یہ ان دونوں کنجری ماں بیٹیوں کی حرکت ہے۔'' کالیا دانت پیسنے کے انداز میں بولا۔ ''ہمیں ان پر بالکل بھروسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''
''تومی! فائلیں کہاں ہیں؟'' گرانٹ نے جیسے بھڑک کر پوچھا۔
''جہنم میں۔'' کالیا جھلا کر بولا۔ ''یہاں ہماری جان پر بنی ہے اور تمہیں فائل کی پڑی ہے۔''
''یہ حرکت کم از کم کاشفہ کی نہیں ہوسکتی۔'' میرے دماغ نے تقابلی جائزہ لینا شروع کردیا۔ ''ورنہ وہ ہماری مدد نہیں کرتی۔ یہ اس کی ماں کی حرکت ہے۔'' مجھے اس پر شبہ ہونے لگا تھا۔
''یہ باتیں بعد کی ہیں، پہلے یہ دیکھو ہم ہیں کہاں اور...... اور یہ ارے! ہم تو کسی گاڑی میں قید ہیں۔'' گرانٹ بولا۔
''ابے لے جگری! اسے ابھی پتا چلا ہے۔'' کالیا کچھ ایسے انداز میں بولا کہ مجھے ان حالات میں بھی ہنسی سی آگئی۔
''کیا تم دونوں بھی میری طرح رسیوں میں جکڑے

ہوئے ہو؟'' گرانٹ نے کالیا کی بات کا کوئی نوٹس لیے بغیر سوال کیا اور کالیا کی بھی ہمیشہ ایسے ہی نازک وقت میں نجانے کون سی رگ پھڑک جاتی تھی جل کر بولا۔

''نہیں، ہم شوقیہ گول مول پڑے ہیں۔''

''میرا مطلب تھا اگر ایسا ہی ہے تو ہم قریب کھسک کر ایک دوسرے کی رسیاں کھول سکتے ہیں۔ یہ نائیلون کی رسیاں ہیں۔ تھوڑی کوشش سے کھل جائیں گی۔''

کالیا کے مسلسل طنزیہ جملوں پر گرانٹ کو اپنی بات کی وضاحت کرنا پڑی۔ پھر اس سے پہلے کہ کالیا دوبارہ گرانٹ کو ''پن'' کرتا میں اس کی تائید میں یک دم بول پڑا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو گرانٹ! قریب آجاؤ سب۔''

اس دوران جب میری آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو ایسی آوازیں بھی آرہی تھیں جیسے گاڑی چل رہی ہو۔ کبھی کبھار کسی چھوٹے موری نما رخنوں سے روشنی بھی پھوٹ پڑتی تھی۔

ہم ایک دوسرے کے قریب آگئے اور اس طرح کہ ہماری پشت ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔ کالیا نے اس مضحکہ خیز صورت حال پر کوئی چڑتا ہوا تبصرہ بھی کیا تھا مگر میں نے یا گرانٹ نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی اور ایک دوسرے کے جکڑ بند کھولنے کی کوشش کرتے رہے۔

سب سے پہلے گرانٹ کی ایک گرہ کھلی، یہ میرا کارنامہ تھا، باقی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

گرانٹ کی ایک گرہ کیا کھلی کہ باقی بھی کھلتی چلی گئیں۔ گویا گرانٹ کے دونوں ہاتھ ہم سے پہلے آزاد ہو گئے۔ پھر اس نے میری اور کالیا کی بھی ہاتھوں کی گرہیں کھول ڈالیں۔ شکر تھا کہ لوہے کی چین یا زنجیر کا استعمال نہیں کیا گیا تھا، ورنہ مشکل پیش آتی۔

اب ہم خود ہی ہاتھوں سے آزاد ہونے کے بعد اپنے پیروں کو رسیوں سے آزاد کرنے لگے۔ اسی وقت بند ٹرک یا گاڑی کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔ وہ کوئی تنگ موڑ کاٹ رہا تھا، پھر گاڑی کو جیسے ہچکولے لگنے لگے۔

ہم نے اِدھر اُدھر حرکت کی اور کسی موری سے باہر جھانکنے کی کوشش بھی چاہی مگر عبث، یہ کوشش بیکار جاتے ہی ہم گھٹنوں اور ہاتھوں کے پنجوں کے بل پر اِدھر اُدھر رینگ کر اس گوشے کی طوالت کا اندازہ کرنے لگے تو گرانٹ نے فوراً اپنے اندازے کے مطابق بتایا کہ یہ چھوٹے سائز کا کوئی بند ڈبہ ٹرک محسوس ہوتا ہے، نیز ہم شہر کے بجائے کسی ساحلی علاقے کے مضافات میں ہیں۔

کوئی تنگ موڑ کاٹنے کے بعد ٹرک کی رفتار پھر تیز ہو چکی تھی۔ ہم نے اِدھر اُدھر لڑکھڑاتے قدموں اور ہاتھ پھیلا کر کھسکتے ہوئے بند ٹرک کے اس ڈبے کی چوڑائی اور لمبائی کا اندازہ کرنا چاہا تو یہ ایک ایسا ہی ٹرک محسوس ہوا جو عموماً آئسکریم یا دوائیوں کا چھوٹا ٹرک ہوتا ہے۔

وقت کا پتا نہیں چلا تھا۔ اندازہ یہی ہوتا تھا کہ یہ رات کا ہی وقت ہے یا پھر گاڑھی شام اتری ہوئی تھی۔

اس فائل سے ہم ایک بار پھر محروم ہو چکے تھے مگر اس بار میرے دل کو تسلی تھی کہ وہ فائل میری دونوں ای میل آئی ڈیز میں محفوظ ہو چکی تھیں، ایک ..... سینٹ بکس میں دوسرے ان بکس میں جہاں میں کسی وقت بھی اوپن کر کے پڑھ سکتا تھا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ساتھ یہ دھوکا ماں نے کیا ہے یا اس کی بیٹی نے۔'' گرانٹ ... لہجے میں بولا۔

''بیٹی نے۔'' کالیا نے فوراً اگلا۔

''غلط۔'' میں نے کالیا کا خیال رد کر دیا۔

اس عالم میں جبکہ یہ ٹرک کسی نامعلوم منزل تک نہیں پہنچ جاتا ہم نے پیش آمدہ واقعے پر غور شروع کر دیا۔

''پھر دونوں ماں بیٹیوں نے یہ دھوکا دیا ہوگا۔'' کالیا نے پھر اپنی اسٹیٹمنٹ بدلی۔

''یہ بھی غلط۔ دھوکا اس کی ماں لیلیٰ صماد نے دیا ہے۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''وہ کیسے؟'' یہ گرانٹ کا سوال تھا۔ ہم ایک دوسرے کی صورتیں تو نہیں دیکھ سکتے تھے مگر دھیمی آواز میں باتیں کرنے کے تو اہل تھے ہی۔

میں نے جواب میں کہا۔ ''اس طرح کہ اگر کاشفہ دھوکا دیتی تو وہ کبھی فائل تک ہماری رسائی کو ممکن نہیں بناتی۔ دوسرے یہ کہ جب میں نے سب سے پہلے گرانٹ کو بے ہوش ہوتے اور کرسی سے لڑھک کر فرش پر گرتے دیکھا تھا تو کاشفہ چلائی تھی، اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اس کے لیے اچانک اور غیر متوقع تھا۔ یہ اس کی باڈی لینگویج تھی۔ پھر جب میں بے ہوش ہونے لگا تو میری ڈوبتی نظریں سامنے کی کرسی پر براجمان لیلیٰ صماد کے چہرے پر پڑی تھیں۔ وہاں میں نے چونکنے یا فکر و تشویش کی بجائے ایسی ہی زہریلی مسکراہٹ دیکھی تھی جیسے یہ اسی کی حرکت ہو۔''

''ابے لے جگری! اس کا مطلب ہے اس کا دل ابھی تک صاف نہیں ہوا تمہاری طرف سے؟'' کالیا کے منہ سے نکلا۔

''ہو بھی نہیں سکتا۔'' گرانٹ نے لقمہ دیا۔ ''اس کا دل ابھی تک میلا ہے۔ آخر جوان بیٹے کی موت کا سانحہ ایک ماں کے لیے کم تو نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی حوالے سے اس کی موت کی ذمے داری تو تم پر آتی ہے ہی ہے نا ڈوڈ!'' گرانٹ نے مجھ سے کہا۔

''یہ ڈوڈ کیا بلا ہے جو تم اکثر جگری نومی کے لیے استعمال کرتے ہو؟'' کالیا نے بالآخر اس سے پوچھ ہی لیا۔ میرے ہونٹوں پہ خفیف مسکراہٹ عود کر آئی۔

''بالکل اسی طرح کے معنی ہیں اس کے جیسے تم مسٹر نومی کو ''ابے لے ..... جگری!'' کہتے ہو۔ یعنی دوست، بڈی!'' گرانٹ نے جیسے کالیا کے سامنے اپنی خلاصی کرائی۔ میں نے اس ڈر سے کہ کہیں دونوں کے درمیان کوئی بحث نہ چھڑ جائے جلدی سے موضوع بدلا۔

''اگر ایسا ہے تو لیلیٰ صماد پھر بھی اپنا ہی نقصان کرے گی۔ وہ شاید اپنے شوہر کا انجام بھول گئی ہے جو ایسے ہی لوگوں کا آلۂ کار بنا اور انہی کے ہاتھوں مارا گیا۔''

''یہ وہ جانے اس کا کام، ہم اب کیا کریں؟'' گرانٹ بولا۔

''... ہے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں آزاد ہیں، دشمن اسی مغالطے ... گا کہ ہم اس ٹرک کے اندر بے بس پڑے ہیں، ان کی اسی بے ... سے فائدہ اٹھا کر ان پر پل پڑیں گے۔''

''ویسے ڈوڈ! تم نے ایک عقل مندی کا کام کیا۔ اس فائل کو ہمیشہ کے لیے اپنی ای ... میں محفوظ کر لی۔ یہ حالات کا بھی تقاضا تھا۔'' گرانٹ نے کہا۔

اسی وقت میں چونکا۔ ہم لڑکھڑا ... ٹرک کی رفتار ایک بار پھر بتدریج کم ہونے لگی تھی اور ... جگہوں کے علاوہ اونچے نیچے راستوں پر چل رہا تھا پھر ہموار راستے پر چلنے لگا۔ کیونکہ اب جھٹکے لگنا بند ہو گئے تھے لیکن رفتار اب بھی اس کی ہلکی ہی تھی۔

''ہوشیار! ٹرک کی منزل آگئی ہے۔ یہ کہیں رکنے والا ہے۔'' میں نے خبردار کیا۔ آنے والے متوقع لمحوں کی خون ناکی اور کشاکشی کے تصور سے ہی میرے اعصاب تن گئے تھے۔

پاکستان میں پنپنے والا ادب بھی اس عالمی فکری محاذ آرائی کے پس منظر میں پروان چڑھا جس نے دنیا کو سرمایہ دارانہ اور اشتراکی تصورات و نظریات میں تقسیم کیا۔ ایک طرف مغرب نے سرمایہ دارانہ نظام کا علم اٹھایا تو روس اور بعد میں چین نے اشتراکیت کا نعرہ مستانہ بلند کیا۔ یہی تقسیم سیاسی اور ادبی سطحوں پر پاکستان میں بھی دیکھنے میں آئی بلکہ پاکستان میں تو ان نظریات کی باہمی کشمکش نے کفر اور اسلام کی جنگ کا درجہ پایا۔ اس حوالے سے انتہا پسندی کا یہ عالم تھا کہ مغرب کی دائیں بازو اور بائیں بازو کی سیاسی اصطلاحات کا تعین بھی قرآن و حدیث کے حوالے سے کیا گیا۔ پاکستان میں ان اصطلاحات کو قرآن کے ''دائیں اور بائیں'' ہاتھ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مغربی دنیا میں بائیں بازو کا فکر تبدیلی، حرکت اور مظلوم طبقات کا حامی مقصود ہوتا ہے اور یہ بھی کوئی لازم نہیں کہ بائیں بازو کی جماعت کا مارکسزم یا لینن ازم کے ساتھ واقعی کوئی بنیادی یا براہ راست تعلق ہو۔ اس کے برعکس دائیں بازو کو روایت پسندی اور سرمائے کے غلبے کو برداشت کرنے والا فکر قرار دیا جاتا ہے۔

دائیں اور بائیں بازو کی سیاست۔ از: پروفیسر وارث میر

مرسلہ: راحیل خان۔ کوئٹہ

''ایک تو کم بخت یہ نہیں پتا چل رہا ہے کہ اس کا دروازہ کس طرف ہے اور کہاں سے کھولا جائے گا؟'' کالیا جھلا کر بولا۔

''یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے کالیا!'' گرانٹ اس سے بولا۔ ''ایسے چھوٹے لوڈر ٹرکوں کا کوئی درمیانی دروازہ نہیں ہوتا، ایک ہی بڑا دروازہ ہوتا ہے، جب کھلنے لگے گا تو فوراً ہی سمت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔''

پھر اچانک ٹرک رک گیا۔ ہر سو ایک ہراس پھیلاتی خاموشی طاری ہو گئی۔ ہم تینوں بھی یکایک محتاط ہو گئے۔ میں سرتاپا سماعت بن گیا۔

میں نے چند لوگوں کے زور سے بولنے اور ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں سنی تھیں۔

اس کے بعد ایک کھٹکا سا ابھرا تھا۔ میرا دل سینے میں جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔

تب ہی ٹرک کا دروازہ کھلا۔ روشنی سی ہوئی۔ یہ میری

سمت تھی۔ میں اسی جانب بڑھا۔ وہ دروازہ کسی خودکار میکینزم کے تحت آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھنے لگا۔

ہم یک دم دائیں بائیں ٹرک کی دیواروں سے پشت لگائے چپک کر انتہائی احتیاط انداز میں کھڑے ہوگئے پھر جیسے ہی دروازہ پورا کھلا تین افراد کی جھلک دیکھتے ہی ہم نے بیک وقت ان پر ٹرک کے کھلے پڑے حصے سے ان پر چھلانگیں لگا دیں۔

یہ ان کے لیے یقیناً غیر متوقع ہی تھا کہ ہم اندر بے بس بندھے پڑے ہوں گے، شاید اسی لیے وہ "ریلیکس" موڈ میں تھے اور نہتے بھی۔ ممکن ہے پستولیں ان کے چست لباس میں چھپی ہوں۔

ایک پر تو میں پل پڑا جبکہ دوسرے پر کالیا اور گرانٹ۔ یہ کوئی بڑا گیراج سا تھا، جہاں ایک دو اور بھی گاڑیاں کھڑی نظر آئی تھیں۔ جگہ بہرحال کچھ تنگ تھی۔ اپنے شکار کو میں رگیدتا دیوار تک لے گیا اور اس کا سر پوری قوت سے دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی اور وہ وہیں ڈھے گیا۔

ادھر کالیا اور گرانٹ بھی مشترکہ طور پر اپنے شکار کو بھنبھوڑنے میں مصروف تھے۔

"ان کے لباسوں کی تلاشی لے کر ہتھیار قبضے میں کرو۔" کہتے ہوئے بلا دیر میں نے فوراً ٹرک کے ڈرائیونگ کیبن کا رخ کیا۔

وہاں سے دو افراد دروازہ کھولے نیچے اتر رہے تھے، ان کے شاید ابھی سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ پیچھے کیا ہورہا تھا۔

دوسرے کی جھلک ڈرائیونگ سیٹ پر دیکھی تھی میں نے جو اپنی طرف کا دروازہ کھولے نیچے اتر رہا تھا۔ ادھر میں نے پہلے والے اترتے شخص کو ٹانگ سے پکڑ کر کھینچ لیا۔

ظاہر ہے وہ اس اچانک اور غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ ڈرائیونگ کیبن کے پائیدان سے گھسٹتا ہوا نیچے گرا مگر اس نے اپنے حواس مختل ہونے نہیں دیے تھے۔ گرنے کے دوران ہی اس نے لات چلادی تھی جو میرے دائیں پہلو میں لگی۔

درد کی ابھرنے والی لہر کو میرے جوشِ غیظ نے دبا دیا اور تاک کر ایک گھونسا میں نے اس کے بھاری چہرے پر جڑ دیا۔

اس کے حلق سے اوغ کی آواز نکلی۔ لمحہ بھر کی دیر کیے بغیر میں نے اپنے گھٹنے کی ضرب اس کے پیٹ پر رسید کردی۔ وہ بھی اپنے جبڑے کی درد پیتا ہوا مجھے گھٹنے کی ضرب لگانے کے پر تولے ہوئے تھا کہ درد سے بلبلا کر اسے ٹرک کی باڈی سے ٹکرا کے گرنا پڑا۔

ساتھ ہی اس کا ایک ہاتھ تیزی سے لباس کے اندر رینگ گیا۔ اس کی حرکت کا مطلب میں بہ خوبی سمجھ سکتا تھا۔ اسی سبب میں نے دوبارہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی اور اپنے مضبوط اور نوکیلے جوتے کی بھرپور ضرب اس کے اسی ہاتھ پر [illegible]

وہ چیخا [illegible] کا لباس کے اندر پستول کے دستے پر پڑ چکا تھا، اس نے [illegible] نکال تو لیا مگر مضروب ہاتھ کی وجہ سے وہ اسے سنبھال نہ پایا اور وہ اس کی کمزور گرفت سے پھسلتا ہوا فرش پر جا پڑا۔

اسی وقت گولی چلی، ساتھ ہی [illegible] چیخ بھی کسی کی ابھری۔ یہ گولی شاید ڈرائیور کے نبرد آزمائی کے دوران چلی تھی جس نے مجھے چونکایا ہی نہیں بلکہ تشویش میں بھی مبتلا کر دیا۔

حسب توقع کالیا اور گرانٹ یقیناً اپنے پہلے شکار کو بچھاڑنے کے بعد دشمن کے چوتھے ساتھی یعنی ڈرائیور پر پل پڑے تھے۔

ہمارے پاس تو ویسے بھی کوئی ہتھیار نہ تھا، ڈرائیور کے پاس ہی ہوسکتا تھا اب یہ نہیں پتا چلا کہ گولی اسی نے چلائی تھی یا اس کا پستول چھین کر کالیا یا گرانٹ کو فائر کا موقع ملا تھا۔ ممکن تھا کہ میری ہدایت کے مطابق اسلحہ انہوں نے پہلے دو دشمنوں کے قبضے سے اڑا لیا ہو۔

تاہم یہ برا ضرور ہوا تھا کیونکہ یہاں ہم بہرحال دشمنوں کی کمین گاہ میں موجود تھے۔ وہ فائر کی آواز سن کر مزید تعداد میں ہتھیار بدست یہاں پہنچ سکتے تھے۔

مجھے سردست ٹرک کی دوسری جانب حالات کا جائزہ لینے کا موقع نہ ملا، میں نے اپنے شکار کو جھک کر دبوچ لیا جو اپنے پستول کو اٹھانے کے لیے حرکت پذیر تھا مگر میں اس سے پہلے ہی پھرتی سے جھک کر اس کا پستول اٹھا چکا تھا اور اسی کے دستے کی ایک زوردار ضرب اس کی کنپٹی پر بھی رسید کردی۔ اس کا سر ایک جانب ڈھلک گیا۔

میں جلدی سے پلٹا اور دوڑتا ہوا ٹرک کے بونٹ کے سامنے سے دوسری جانب پہنچا تو دیکھا گرانٹ اور کالیا کے ہاتھوں میں پستولیں تھیں اور ڈرائیور فرش پر گرا پڑا تھا۔

ان کے سینے سے خون ابل کر گیراج کے فرش کو سرخ کر رہا تھا۔

اپنے دونوں ساتھیوں کو صحیح سالم دیکھا تو میں نے سکون کی سانس لی۔

"دروازے کی طرف بڑھو۔" میں نے جلدی سے کہا تو گرانٹ بولا۔

"کیا یہ پتا چلائے بغیر نکل چلیں یہاں سے کہ یہ کون لوگ تھے؟"

"باہر نکلو، پھر دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ گرانٹ کی بات سے مجھے اتفاق تھا، پتا لگنا چاہیے تھا کہ آخر یہ کون لوگ ہیں اور ہمیں یہاں لانے کا ان کا مقصد کیا تھا؟ اگرچہ یہ سب ہم بعد میں لیلیٰ صماد کے منہ سے بھی اگلوا سکتے تھے مگر مشاہدے اور تجربے کی بات اور اپنے کھوجنا ضروری تھی۔

"ویسے اس طرف کونے میں، میں نے ایک دروازہ دیکھا تھا جو شاید عمارت کے کسی اندرونی گوشے میں کھلتا ہے۔" گرانٹ نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ بولا۔ "پھر اسی طرف بڑھو۔"

وہاں گیراج میں آخری کونے کے دائیں جانب ایک [illegible] کا دروازہ تھا جو بند تھا۔ ہم اس طرف لپکے ہی تھے کہ [illegible] گیراج کے باہر عمارت کے وسیع احاطے میں متعدد دوڑتے قدموں کی آوازیں ابھریں۔

"دشمن [illegible]" ذہن میں ابھرا۔ ابھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کوئی [illegible] عمارت تھی اور باہر سے کیسی تھی کیونکہ ہمیں سیدھا اس گیراج نما ہال کے اندر لایا گیا تھا۔

گرانٹ نے ایک لات دروازے کو رسید کی وہ دھڑاکے سے کھل گیا۔ ہم ہاتھوں میں [illegible] سے چھینی ہوئی پستولیں تھامے باری باری اندر داخل ہوگئے۔

یہ ایک اندھیری سی راہداری تھی۔ چند [illegible] طے کیے تھے کہ ایک اور دروازہ آگیا۔ یہ لوہے کی سلاخوں والا دروازہ تھا۔ کنڈا اس کا دوسری جانب تھا۔ گرانٹ نے اپنا ایک ہاتھ باہر نکال کر اس کا کنڈا کھولا۔

ہم اب ایک ایسے کمرے میں موجود تھے جہاں کاٹھ کباڑ اور جانے کیا الا بلا ابھرا ہوا تھا۔ یہاں ایک ہلکے پاور کا بلب روشن تھا۔

کمرا یہ بھی ہال نما ہی نظر آتا تھا بلکہ اسے گودام کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔ یہ کافی بڑا کمرا تھا اور اندر سے کسی "ویئر ہاؤس" کی طرح ہی معلوم ہوتا تھا۔ دائیں بائیں بالکونیوں کی ریلنگ نظر آرہی تھیں اور وہاں ذرا ذرا فاصلے سے کمروں کے دروازے دکھائی دیتے تھے۔

اسی وقت دوڑتے قدموں کی آواز قریب آتی محسوس ہوئی۔

"وہ لوگ بھی اسی راستے سے یہاں آرہے ہیں۔" کالیا نے سرگوشی میں اعلان کیا۔

میری متلاشی نظریں تیزی سے گردش کررہی تھیں اور بالآخر میں نے ایک بڑا سا گیٹ نما دروازہ دیکھا جو زینے کے سرے پر بنا ہوا تھا جدھر دائیں بائیں دو زینے تھے۔

"اس طرف دوڑو۔" کہتے ہوئے میں مذکورہ سمت لپکا۔ کالیا اور گرانٹ میرے عقب میں تھے، انہوں نے پیچھے بھی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔

اسی وقت گولی چلی۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ پھر کالیا اور گرانٹ کو بدستور اپنے پیچھے لپکتے ہوئے آتے پا کر تسلی ہوئی اور گیٹ نما دروازے کے قریب پہنچتے ہی میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ کھل گیا۔ ہم غڑاپ سے اندر داخل ہوگئے۔

یہاں مجھے بڑی بڑی مشینیں نصب دکھائی دیں۔ بڑی عجیب ساخت کی مشینریز تھیں۔ کہیں کہیں تو ان پر کسی لیبارٹری کا گمان ہوتا تھا۔ یہاں غیر معمولی ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کوئی مردہ خانہ ہو۔

یہاں بھی کوئی نہ تھا۔ ہم آگے بڑھے۔ عجیب بھول بھلیاں تھیں۔ ایک کے بعد ایک دروازہ تھا۔ عقب سے دوڑتے قدموں کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔

دائیں جانب مجھے ایک طویل راہداری نظر آئی۔ یہاں نسبتاً زیادہ روشنی تھی۔ ہم نے اسی طرف کا رخ کیا۔ دوبارہ گولی چلی۔

یہ شاید ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے اندھی گولیاں چلائی جارہی تھیں۔ ہم ان کی پروا کیے بغیر دوڑتے رہے۔ آگے جا کر راہداری ایک جانب [illegible] قریب پہنچ کر ہم اسی طرف کو مڑے اور [illegible] سامنے ایک لیبارٹری کا منظر تھا۔ وہاں [illegible] پہنے کام میں مشغول تھے۔ ان میں مردوں کے علاوہ [illegible] بھی تھیں۔

وہاں چند افراد [illegible] لباس میں [illegible] کرتے دکھائی

دیئے۔ ان کے ہاتھوں میں کراس بو تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا وہ جیسے یہاں کام کرنے والوں کے سروں پر مسلط کیے گئے تھے۔ سفید ایپرن پوش افراد میں کسی کے ہاتھ میں کوئی شیشے کی ٹیوب تھی تو کوئی بڑے سے گلاس جار کے اندر کیمیکل ملا رہا تھا۔ وہاں سے دوائیوں اور کیمیکل کی عجیب سی بو آرہی تھی۔

ہم پر ان کی نظر پڑی تو وہ اپنا اپنا کام روک کر یک ٹک حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات سے ہماری جانب تکتے رہ گئے۔ کراس بو والے ان چند افراد نے فوراً اپنے ہتھیاروں کا رخ ہماری جانب کردیا۔ ہمارے بھی پستولوں والے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے۔

یہی وہ وقت تھا جب کسی ایپرن پوش نے چلا کر ہم سے کہا۔

”خدا کے لیے یہاں گولی مت چلانا...... ہم سب پل بھر میں جل کر خاکستر ہو جائیں گے۔“ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس نے انگریزی میں کہا تھا اور وہ مجھے مقامی ہرگز نہیں نظر آتا تھا، مقامی تو مجھے کراس بو والے بھی نظر نہیں آتے تھے۔

”تب پھر کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا اور ان سے کہو کہ یہ اپنے ہتھیار بھی پھینک دیں۔“ میں نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اسی ادھیڑ عمر آدمی سے کہا۔ میرا اشارہ کراس بو تھامے ہوئے ان افراد سے تھا۔ جو ہماری طرف غیظ آلودہ نظروں سے گھورے جا رہے تھے۔

”ایک شعلہ بھی یہاں لپکا تو یہ ساری عمارت بھک سے اڑ جائے گی۔“ ادھیڑ عمر شخص نے کراس بو تھامے ہوئے افراد سے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ ”بہتر یہی ہے کہ ان کی بات مان لی جائے۔“

وہ ابھی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ سمجھتے تھے کہ ہم تینوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگی ہوئی تھیں، اسی لمحے عقب سے آنے والے دشمنوں کے قدموں کی آواز قریب آتی گئیں اور اسی وقت ہلکی سرسراہٹ کی آواز ابھری۔

راہداری کے سرے اور لیبارٹری کے درمیان خودکار انداز میں اچانک ایک سفید دیوار حائل ہوتی چلی گئی۔ میری جی میں تو آئی کہ لیبارٹری کی جانب چھلانگ لگا دوں مگر اس طرح میں کالیا اور گرانٹ کو عقب سے آتے ہوئے دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا۔

اسی وقت گولی چلی۔ ہم راہداری کی دیواروں کے ساتھ دائیں بائیں چپک گئے۔

”ان کا مقابلہ کرنا پڑے گا ڈوڈ! ورنہ یہ مختصر سی راہداری ہماری قبر بن جائے گی۔“ گرانٹ جوش سے مرتعش لہجے میں بولا۔

”جو نظر آئے اڑا دو۔“ میں نے کہہ ڈالا۔ ہماری نظریں اسی طرف جمی ہوئی تھیں اور پشت کے بل دیواروں سے لگے ایک ہاتھ میں پستولیں دبوچے اسی طرف تکے جا رہے تھے۔

تب ہی دو افراد موڑ کے سرے سے نمودار ہوئے۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی انہوں نے رکنے کی کوشش چاہی تھی مگر فرش چکنا اور [illegible] کے سبب تلے برف میں اسکیٹنگ کرنے کے انداز میں [illegible] پر پھسلتے چلے گئے، یوں ان کا توازن بگڑا اور وہ ہمارا نشانہ ٹھیک طرح نہ بنا سکے، تاہم بوکھلاہٹ میں فائر تو کر ڈالا لیکن [illegible] چھت اور دیوار سے ہی ٹکرا گئی تھیں۔

گرانٹ اور کالیا کے پستولیں [illegible] اور وہ دونوں لاشوں کی صورت میں پھسلتے ہوئے ہمارے نزدیک آپڑے۔ باقی ان کے ساتھی وہیں رک گئے تھے۔

ایک موڑ والی دیوار کی آڑ سے سر ابھار کر فائر کرنا چاہ رہا تھا جبکہ میری عقابی نظریں اور پستول کی نال اسی طرف ہی اٹھی ہوئی تھی۔

اس کے سر کی جھلک دیکھتے ہی میں نے گولی چلا دی۔ خون اور کچھ لوتھڑے اڑتے دیکھ کر باور ہو گیا کہ میرا نشانہ بے خطا نہیں گیا تھا۔ ہم محتاط انداز میں آگے بڑھے اور اسی وقت دوڑتے قدموں کی آواز ابھری۔

”وہ جتنے بھی تھے واپس لوٹ گئے ہیں۔“ کالیا نے ان کے جاتے ہوئے قدموں کی دھمک سے اندازہ لگا لیا تھا۔

ہم آہستہ آہستہ سرے کی دیوار سے طلوع ہوئے، راہداری سنسان پاتے ہی ہم آگے بڑھے اور ایک اور دروازے سے کسی اندھیرے کمرے میں داخل ہوئے... وہاں سوئچ بورڈ ٹٹول کر گرانٹ نے لائٹ آن کر دی۔

یہاں ہمیں ایک اور راستہ دکھائی دیا اور ہم اس پر ہولیے۔ زینے سے ہم اوپری منزل پر پہنچے اور وہاں سے ایک اور زینہ اس سے بھی اوپری منزل کی طرف جاتا تھا، وہ بھی چڑھتے ہوئے ہم بالآخر عمارت کی چھت پر آگئے۔

یہاں ہم .... ایک سیمنٹ کے ابھرے ہوئے

چھوٹے سے چبوترے کی آڑ میں ہو کر ٹھہر گئے۔

یہاں سے ہم بہ آسانی چاروں سمت کا جائزہ لے سکتے تھے اور یہی کر رہے تھے۔

آسمان میں تارے ٹمٹما رہے تھے اور ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم ایک بڑی سی سفید رنگ کی مستطیل عمارت کی چھت پر تھے۔ یہی نہیں اس کے ساتھ ہی مشرقی سمت میں اس سے ملحقہ ایک اور خوب صورت عمارت بھی نظر آئی جو اپنی وضع قطع سے بڑی دیدہ زیب اور خوب صورت رہائشی عمارت دکھائی دیتی تھی۔ یہ خاصی وسیع و عریض نظر آ رہی تھی۔

''اس رہائشی عمارت کے ساتھ یہ لیبارٹری کی عمارت، گراس تھامے ہوئے افراد وہاں کام کرنے والے مسلط تھے۔ آخر یہ سب کیا گھن چکر ہے؟'' گرانٹ نے جیسے مرحلہ وار حالات کی کڑی کو کڑی سے ملا کر زنجیر بنانے کی کوشش چاہی۔

''یقیناً یہاں کوئی خفیہ، غیر قانونی اور خطرناک دھندا ہو رہا ہے۔ آخر یہ ہیں کون لوگ؟'' کالیا نے بھی اس کی تائید کی۔

''کالے شیطان کا گروہ ہو سکتا ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''لیکن لیلیٰ صماد کالے شیطان کا ساتھ کیوں دینے لگی جگری؟'' کالیا نے کہا۔ ''کیا اسے نہیں پتا کہ اسی کے حکم پر ہی تو بن رائد نے اس کے شوہر (شاہ میر) کو ہلاک کر دیا تھا؟''

''کالیا کی بات قابلِ غور ہے ڈوڈ!'' گرانٹ نے اس کی تائید میں میری طرف دیکھ کر کہا۔

''درمیان میں کوئی پُراسراری گڑبڑ ضرور ہے۔'' میں نے غور کرنے والے انداز میں کہا۔ ''ممکن ہے یہ کالے شیطان کو نزے اسٹاکر کا کوئی مخالف گروپ ہو مگر یہاں آخر کیا ہو رہا ہے؟''

''لیکن لیلیٰ صماد کا مبینہ طور پر ان کے ساتھ اگر کوئی خفیہ گٹھ جوڑ ہے تو کیا اسے نہیں معلوم کہ ہم بھی تو کالے شیطان کے دشمن ہیں، وہ ہم سے اتحاد کر سکتے تھے۔ بشرطیکہ ...یہ کوئی مخالف گروپ ہو؟'' کالیا بولا۔

''یہ ایک دم سناٹا کیوں ہو گیا ہے؟'' گرانٹ نے اچانک کچھ محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے اتنا ہی کافی ہے ہمیں نکل جانا چاہیے۔'' اس نے رائے دی۔

''ہرگز نہیں، یہاں رہائشی عمارت بھی موجود ہے۔ اس کا مطلب ہے دشمن خفیہ طور سے ہمیں زیر نہیں کر سکا ہے تو وہ اب یہاں زیادہ لڑائی اور خون خرابہ بھی نہیں چاہتا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''ضروری تو نہیں، یہ جگہ آبادی اور شہر سے دور بھی تو لگتی ہے۔'' کالیا بولا۔

''لڑائی اور دو چار گولیاں چل جانے سے کیا فرق پڑے گا۔''

''ایسے لوگوں کے لیے ضرور فرق پڑے گا مسٹر کالیا جو یہاں مجرمانہ سرگرمیوں میں مشغول ہوں اور پوشیدہ بھی۔'' گرانٹ نے کہا۔

''اب کو ڈوڈ ...چھت پر ہی ڈیرہ ڈالے رہیں گے یا آگے کی بھی سوچیں ...'' کالیا نے گفتگو تمام کرنے کی غرض سے کہا۔

''میں اس راز کی نقاب کشائی کیے بغیر یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں۔'' میں نے مسکت جواب دیا۔

ہم متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے ...بعد میں نے آگے قدم بڑھائے۔

چھت کے جنوبی کونے کی سمت سے رہائشی عمارت قریب تھی۔ ہم جھکے جھکے اور محتاط انداز میں اس طرف کو بڑھنے لگے۔ یہاں میں نے ایک منڈیر سے ذرا سر ابھار کر جھانکا تو مجھے رہائشی عمارت کا اندرونی احاطہ اس کے وسیع و عریض لان اور ایک عدد سوئمنگ پول نظر آیا، وہاں خاصی روشنی تھی، اس قدر کہ مجھے سوئمنگ پول کے شفاف پانی کی سطح سے اس کے اندر کا ہلکا سبز فرش اور دیواریں تک صاف دکھائی دیں، وہاں فلوٹنگو اور کچھ چیئرز دو چھتریاں، ان کے گرد میز کرسیاں لگی دکھائی دیں۔ دو بیش قیمت بھاری بھرکم گاڑیاں بھی کار پورچ میں کھڑی تھیں۔

غور طلب نظارہ ان چار پانچ افراد کا تھا جو غیر مسلح وہاں دائرے کی صورت میں کھڑے تھے اور ان کے درمیان میں ایک خوب گھٹی ہوئی جسامت کا شخص صرف سلیپنگ گاؤن پہنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پائپ تھا جس کے وہ وقفے وقفے سے گہرے کش لگا رہا تھا۔ ایک دراز قامت اور خوب صورت سی حسینہ بھی اس آدمی کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ اس کے بال لمبے اور گھنے تھے۔ وہ بھی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس نے گردن سے ٹخنوں تک لمبا ریشمی چغا پہن رکھا تھا، جس کا رنگ ہلکا نیلا تھا۔ وہ خاصی متناسب الاعضا بدن اور رعنائی کا شاہکار دکھتی تھی۔ تاہم یہ بھی مجھے کہیں سے بھی محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

میں نے اطراف میں نظریں دوڑائیں اور پھر ایک جانب چھت کی دیوار سے میں نے کسی بڑے ہال کمرے کی چھت کو باؤنڈری تک باہر نکلے ہوئے دیکھا۔ میں ذرا آگے بڑھا اور منڈیر سے اس طرف کو چھلانگ لگا کے اتر آیا۔ کالیا اور گرانٹ اب خاموشی سے میری تقلید کیے جا رہے تھے۔

اب یہاں سے رہائشی عمارت کی باؤنڈری وال بے حد قریب تھی مگر وال کے سرے پر خم دار آہنی بریکٹ نصب تھے اور ان پر تین رویہ خاردار باڑھ لگی نظر آتی تھی۔

میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے پھر ذرا گردن آگے بڑھا کر نیچے اس خلاء میں جھانکا جو مذکورہ ہال یا کمرے اور رہائشی عمارت کی باؤنڈری وال کے درمیان بنا ہوا تھا۔ وہاں سناٹا پاتے ہی میں بلا دیر منڈیر پھلانگ کر نیچے جا کودا۔

میرے پیچھے کالیا اور گرانٹ بھی کود پڑے تھے۔ چند لمحے کسی متوقع گڑبڑ کی سن گن لیتے رہے، خاموشی پا کر میں نے دائیں بائیں دیکھا اور عمارت کی عقبی سمت والی ایک طویل سی گلیاری میں داخل ہو گیا۔ تب ہی گرانٹ کی مجھے عقب سے سرگوشی سنائی دی۔

''...طرف دیکھو ذرا......'' میں رک کر مذکورہ سمت دیکھنے لگا، کالیا اور گرانٹ بھی ذرا سر اٹھا کر اسی عمارت کی جانب دیکھ رہے تھے جس کے اندر ہم تھوڑی دیر پہلے ہی موجود تھے۔

اس کی منڈیر کے نیچے بیرونی طرف تقریباً چار فٹ چوڑے بیم پر سیاہ موٹے حروف میں ''ریسرچ کیمیکل لیب'' لکھا ہوا تھا۔

''اوہو! یہ کیا کوئی دوائیوں وغیرہ ...معلوم ہوتی یا پھر!'' میں زیر لب بڑبڑایا اور اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچ لیے۔ ''آگے بڑھو۔'' بالآخر میں نے کہا۔

اس واقعے کے بعد یہاں جہاں جہاں بھی لائٹ کا انتظام تھا وہ روشن کر دی گئی تھیں۔ اسی روشنی میں ہم تینوں آگے پیچھے قطار بنائے آگے بڑھتے رہے۔ ہمارے ہاتھوں میں ہنوز پستول دبے ہوئے تھے۔

چند قدم چلنے کے بعد میں رکا۔ میرے پیچھے ساتھ آتے ہوئے کالیا اور گرانٹ بھی جام ہو گئے۔ مجھے رہائشی عمارت کے پچھواڑے ایک بالکل سپاٹ دیوار نظر آئی جس پر مجھے تھوڑی حیرت ہوئی کہ یہاں کوئی بھی ایسا دروازہ یا گیٹ نہ تھا جو کہ عموماً رکھا جاتا ہے۔

ابھی میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک آواز پر ہم تینوں بری طرح چونک پڑے۔

یہ پولیس سائرن کی آواز تھی اور ایک سے زائد گاڑیوں کی محسوس ہوتی تھی۔

''ابے لے......!'' کالیا کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ ''یہ پولیس کدھر سے آ گئی؟''

خود میں بھی پریشان سا ہو گیا۔ گرانٹ کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اسی انداز میں بولا۔ ''پولیس آئی نہیں ہے، اسے فون کر کے بلوایا گیا ہے۔''

''تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟'' کالیا نے بے اختیار پوچھا۔

''ہاں! مجھے اندازہ ہی ہوا ہے کیونکہ ان کا ایک دم خاموش ہو جانا بھی ظاہر کرتا ہے، ورنہ تو مجھے یہاں ان دو عمارتوں کے سوا میلوں تک کوئی ایک چھوٹا سا مکان تک دکھائی نہیں دیا ہے جس کے مکین نے کسی مشکوک گڑبڑ کو محسوس کرتے ہی پولیس کو انفارم کر دیا ہو۔''

''ٹھیک۔'' میرے منہ سے نکلا۔ ''چھت سے میں نے بھی اطراف کا جائزہ لیا تھا۔ آس پاس خشک اور بنجر ویرانی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا تھا مجھے۔''

''تو پھر ان لوگوں نے بڑی مکاری سے کام لیا ہے۔'' کالیا بولا۔ ''کسی کاروبار کی آڑ میں یہاں غیر قانونی دھندا کیا جاتا ہے اور اب پولیس کے ذریعے خود کو قانون پسند بھی ظاہر کیا جا رہا ہے۔''

''میرا خیال اتنا ہی کافی ہے، یہاں دوبارہ آیا جا سکتا ہے۔'' گرانٹ نے کہا۔ ''اب ہمیں یہاں سے رفو چکر ہو جانا چاہیے۔ یہ لوگ مکاری سے کام لے رہے ہیں۔''

''لیکن ہم اپنی کمین گاہ تک پہنچیں گے کیسے؟ نجانے آبادی سے کتنی دور ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''ممکن ہے پولیس کے پہنچتے ہی نہ نکل پائیں۔ اس صورت میں ان کی چال کامیاب جائے گی۔''

''ابے لے......جگری! تو تمہارا کیا خیال ہے ادھر ہی پھنسے رہیں؟'' کالیا حیرت سے بولا۔

''یہاں ہم پھنسے ہوئے کہاں ہیں؟'' ''کالیا! یہ کہنا ہے ڈوڈ! ہمیں یہاں سے نکل

جانا چاہیے۔‘‘ گرانٹ نے کالیا کی تائید میں مجھ سے کہا۔

دونوں دوستوں کی یک رائے پر مجھے بھی اپنا خیال بدلنا پڑا۔ ورنہ میرا تجسس یہاں سے بغیر کسی نقاب کشائی کے چلے جانے سے روکے ہوئے تھا۔

ہم ادھر ہی سے پلٹے اور ایک کھلے راستے پر تقریباً دوڑتے ہوئے اس ویرانے میں بنیں ان دونوں عمارتوں سے دور ہوتے چلے گئے۔

ہم اس وقت تک بغیر تکان دوڑتے رہے تھے جب تک کہ عمارتوں کی روشنیاں دور نہیں ہوگئیں۔ پھر ایک جگہ رک کر ستانے لگے۔

کچھ سانسیں بحال کرنے کے بعد میں نے چہار اطراف نظریں دوڑائیں۔

آسمان پر ٹمٹماتے تاروں اور دور کہیں جھکے محاق کے چاند کی براق روشنی میں حد نگاہ خشک بنجر صحرا کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ فضا سرد تھی۔ ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی۔ صحراؤں کا بھی عجیب مزاج ہوتا ہے، دن میں گرم اور رات کو سرد۔

’’کم بختوں نے اتنی دور لا پھینکا، اب کدھر جائیں؟‘‘ کالیا چڑ کر بولا۔

’’یہ ساحل سے کوئی قریب کا علاقہ لگتا ہے۔‘‘ گرانٹ فضا میں کچھ سونگھتے ہوئے بولا۔ ’’مجھے ساحلی ریت اور سیلن زدہ کائی کی بو آرہی ہے۔‘‘

’’ابے لے...... جگری! یہ تو بو کیر کتے جیسی خصلت پائی ہے اپنے گرانٹ بھیانے۔‘‘ کالیا نے اردو میں مجھ سے کہا۔ مجھے ہنسی تو آئی مگر میں نے کالیا کو جھڑک دیا۔

’’ایسا مت کہو اسے یار! یہ بھی ہمارا ساتھی ہے۔ سونگھنے کی حس انسانوں میں بھی کسی کسی میں تیز ہوتی ہے۔‘‘

’’میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا جگری! گرانٹ واقعی ہمارا بہترین اور جانثار ساتھی ہے۔‘‘ کالیا بھی مسکرا کر بولا۔

’’یہ تم دونوں میرے بارے میں کیا باتیں کر رہے ہو؟‘‘ گرانٹ نے ہمیں اردو میں بات کرتے اور درمیان میں اپنا نام سن کر پوچھ لیا۔

’’ایسے ہی، یہ کالیا جب کوئی بے کار کا مشورہ دیتا ہے تو اجنبی زبان بولتا ہے تاکہ صرف میں ہی اس کے مشورے پر ہنس سکوں۔‘‘

میں نے ہنستے ہوئے گرانٹ سے کہا اور اس نے منہ پھاڑ کر قہقہہ لگایا۔ کالیا مجھے گھور کر رہ گیا مگر گرانٹ پر دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے طنزیہ بولا۔

’’ذرا آہستہ ہنسو...... تمہارا قہقہہ کہیں ہمارے لیے موت کا قہقہہ نہ ثابت ہو۔ ابھی ہم اپنے نامعلوم دشمنوں سے زیادہ دور بھی نہیں ہوئے۔‘‘

’’تم شاید کوئی مشورہ دے رہے تھے گرانٹ؟‘‘ میں نے جلدی سے موضوع بدلتے ہوئے گرانٹ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

’’ہاں! اگر اسی سمت پر آگے بڑھتے جائیں تو کسی ساحل پر پہنچ جائیں گے، ممکن ہے وہاں کسی جیٹی یا چھوٹی موٹی بندرگاہ سے ہمیں آبادی تک رہنمائی مل جائے۔‘‘

’’پولیس کو اب تک ہمارے بارے میں بتا دیا ہوگا۔‘‘ کالیا سنجیدگی سے بولا۔ ’’اگر وہ تفتیش کرتی ہوئی وہاں تک پہنچ گئی تو ہمارے خلاف ان کے ہاتھ [illegible] جائے گا۔‘‘

’’اگر ہمیں وہ راستہ مل جائے جس [illegible] ہمیں یہاں تک لایا گیا تھا تو میرا خیال ہے اس [illegible] قریبی آبادی تک پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے۔‘‘ میں نے [illegible]

’’بات تو پھر وہی ہو جائے گی۔‘‘ گرانٹ یک دم بولا۔ ’’ہمیں کسی نہ کسی کی نظروں میں تو آنا ہی پڑے گا بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں اب مناوا کی بجائے صرافقہ کا ہی رخ کرنا چاہیے۔ ممکن ہے ہمارے نامعلوم مکار دشمنوں نے پولیس کو ہمارے نام بتا دیے ہوں، اس میں لیلیٰ صماد کی مدد بھی شامل ہوگی۔ یہاں پر حملہ کرنے کا جواز ان کے ہاتھ لگ جائے گا اور وہ اپنا گناہ ہمارے سر ڈال دیں گے بلکہ ڈال چکے ہوں گے۔‘‘

’’تمہاری بات میں وزن ہے گرانٹ!‘‘ میں نے اس کی تائید میں کہا۔ ’’میرا خیال ہے پھر ہمیں ساحل کا ہی رخ کرنا چاہیے اور جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جائیں۔‘‘

لہٰذا صائب الرائے فیصلہ ہونے کے بعد ہم اسی سمت کو چل پڑے جس کی اوبرائے گرانٹ نے ایک اندازے سے نشاندہی کی تھی۔

رات کی اس ٹھٹھرتی تاریکی میں خشک صحرا کا پیدل سفر شروع ہو گیا۔

ہم چلتے رہے اور آپس میں باتیں بھی کرتے رہے۔ لگ بھگ کوئی چند فرلانگ چلتے رہنے کے بعد جب ہماری ٹانگیں تھکن سے جواب دینے لگیں تو ہمیں ذرا دور ہی قدرے نشیب میں روشنیاں سی نظر آئیں۔ ہم رک گئے۔

[illegible] تو یہ آبادی ہے یا پھر کوئی بندرگاہ۔‘‘ میں نے کہا۔

’’اگر اس مقام سے قریب ترین علاقہ یہی ہے تو [illegible] کے بعد یہاں بھی پہنچ سکتی ہے۔‘‘ کالیا نے پھر [illegible]

’’آگے بڑھو، دیکھا جائے گا۔‘‘ میں نے کہا اور ہم [illegible] ستانے کے بعد پھر آگے چل دیے۔

گرانٹ کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ وہ ساحل پر کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہی تھی۔

قریب پہنچے تو وہاں ایک بورڈ بھی زمین پر گڑھا دکھائی دیا۔ جس پر ’’الشمن‘‘ درج تھا اور نیچے بریکٹ میں ’’الخورہ‘‘ جس کا مطلب تھا، یہ علاقہ الشمن، الخورہ میں تھا اور الخورہ منادا کی طرح بحرین کا کوئی بڑا شہر تھا۔

ہم دھیرے دھیرے اس طرف بڑھنے لگے تو ہمیں چند متحرک روشنیاں بھی نظر آئیں، جلد ہی عقدہ کھلا کہ وہ ایک پختہ سڑک تھی جو اس بندرگاہ پر ختم ہوتی تھی۔

وہ متحرک روشنیاں ایک ٹرالی ٹرک اور دو ہیوی ٹرالر ٹرکوں کی تھیں جن پر بڑے بڑے کنٹینر لدے ہوئے تھے۔

ساحل ابھی تک تو ویران ہی نظر آرہا تھا البتہ بندرگاہ کی چھوٹی سی عمارت خاصی خوبصورت تھی۔ اب قریب پہنچے [illegible] چند لوگوں کی نقل و حرکت بھی نظر آرہی تھی۔ چند چھوٹی گاڑیاں [illegible] ٹاپ وینیں بھی کھڑی تھیں۔

سمندر میں [illegible] کے قریب اور دور کچھ لانچوں کی بھی روشنیاں نظر آرہی تھیں [illegible] کوئی بڑا بار بردار جہاز، دور قریب میں بھی نہیں دکھائی دیا [illegible]

وہاں چند ہٹس اور دو بنگلا نما مکان بھی نظر آئے۔ تاہم اس طرف سناٹا ہی تھا۔

ہم اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے [illegible] بندرگاہ کی طرف جانے کی بجائے چاندنی میں چمکتی [illegible] آگئے۔ [illegible] کنارے کھڑے ہو کر ہم انتظار کرنے لگے کہ شاید کوئی ٹرک یہاں سے گزرے تو ہم اس پر چوری چھپے سوار ہو کر کسی آبادی تک تو پہنچ جائیں۔

کافی دیر ہو گئی مگر کوئی ٹرک بندرگاہ سے شہر کی طرف جاتا نظر نہ آیا۔ میری بے چینی اور تفکر سوا ہونے لگا تو اچانک مجھے اپنے سیدھے ہاتھ کی سمت سے کچھ روشنیاں تیزی سے حرکت کرتی دکھائی دیں۔ میں اس طرف غور سے دیکھنے لگا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔

وہ دو گاڑیاں تھیں جن کی ہیڈ لائٹس تو روشن ہی تھیں مگر ان کی چھتوں پر لگی پیلے اور سرخ رنگ کی ’’گردشی لائٹ‘‘ نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔

’’پولیس۔‘‘ یک دم میرے منہ سے نکلا تو کالیا اور گرانٹ بھی چونک کر پہلے میرے چہرے کی طرف اس کے بعد میری نظروں کے تعاقب میں وہیں تکنے لگے جہاں میں ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔

وہ کوئی ذیلی سڑک تھی جو مشرقی سمت سے گھوم کر اسی روڈ سے ملتی تھی اور مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں چنداں مشکل نہ ہوئی تھی کہ ہمیں بھی اس بند ٹرک میں ڈال کر اسی سڑک سے لایا گیا تھا کیونکہ یہی سڑک ’’رچ کیمیکل لیب‘‘ تک جاتی تھی۔

میرے منہ اور میری نظروں کی سمت دیکھتے ہی کالیا اور گرانٹ بھی چونک کر اس سمت دیکھنے لگے۔

’’اوہو...... اب تو ہمارا آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہیں۔‘‘ کالیا بولا۔

’’یہ تو مجھے وہی راستہ دکھائی دیتا ہے جو......‘‘

’’ہاں!‘‘ میں نے گرانٹ کی بات درمیان میں اچک لی اور آگے بولا۔ ’’اور پولیس کا اسی سمت سے بندرگاہ والی روڈ پر آنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان نامعلوم مکار لوگوں نے چالاکی سے پولیس کو ہماری تلاش میں لگا دیا ہے۔‘‘

’’اگر کہیں سے ایک فون کرنے کا موقع مل جاتا تو بہت اچھا ہوتا لیکن اب ہمیں اسی بندرگاہ والی سڑک پر پیدل چلنا ہوگا، جب تک کہ کوئی شہر کی طرف جانے والی گاڑی ہمیں لفٹ نہ دے دے۔‘‘ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

’’یہی سہی، اللہ مالک ہے، ہو سکتا ہے آگے دونوں میں سے کوئی ایک موقع مل ہی جائے۔‘‘ کالیا بولا۔ گرانٹ نے بھی کندھے اچکا کر میری بات پر صاد کیا تھا۔

ہم اللہ کا نام لے کر پیدل چل پڑے۔ پولیس کی دونوں گاڑیاں مذکورہ ذیلی سڑک سے اب بندرگاہ والی سڑک پر آچکی تھیں۔ ان کا رخ بندرگاہ کی طرف ہی تھا۔ ہم سڑک سے ہٹ کر صحرائی زمین پر ان کے متوازی آگے بڑھتے رہے۔ ذیلی سڑک پیچھے رہ گئی اور اب ہم یقینی طور پر شہر

جانے والی سڑک کے کنارے کنارے چلے جارہے تھے۔
یہ احتمال اپنی جگہ تھا کہ اسی سڑک پر پیچھے سے بندرگاہ جانے والی پولیس کی دونوں گاڑیاں واپس لوٹ سکتی تھیں۔ اسی لیے ہم اپنے عقب سے بھی محتاط تھے۔ یوں ہمارے لیے یہ دُہری تہری مشکل صورت حال تھی۔ ہم لفٹ کے چکر میں پیچھے سے آنے والی گاڑی سے لفٹ لینے کے لیے اشارہ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ مبادا وہ پولیس کی واپس لوٹتی ہوئی تفتیشی گاڑی نہ ہو۔

اس مغالطے میں... دو تین گاڑیاں تیزی سے گزر بھی گئیں اور ہم انہیں پولیس گاڑی کے ڈر سے ہاتھ کا اشارہ بھی نہ دے سکے۔

ایک مقام پر تو کالیا جھلا کر وہیں کہیں لب سڑک خشک سے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے جا بیٹھا۔

"بھاڑ میں جائے پیدل چلنا۔ پہلے ان کم بخت پولیس والوں کو گزر جانے دو تاکہ ہم کسی اور گاڑی کو لفٹ کے لیے اشارہ تو دے سکیں۔"

اس کی بات صحیح تھی۔ یوں میں اور گرانٹ اکتا سے گئے تھے۔ لہٰذا ہم بھی سڑک سے ہٹ کر درخت تلے آ بیٹھے۔

کافی دیر گزر گئی۔ اس دوران بھی دو مزید گاڑیاں گزر گئیں۔ بندرگاہ کی طرف جانے والی بھی دو تین گاڑیاں گزری تھیں۔ ان میں ایک دو ہی پرائیوٹ کاریں تھیں زیادہ تعداد وین یا بار بردار چھوٹے بڑے ٹرک تھے۔

اچانک گرانٹ چونک کر بولا۔ "ہوشیار! پولیس کی گاڑیاں آرہی ہیں۔" اس کا چہرہ بندرگاہ کی طرف تھا۔ اس نے شاید پیلی نیلی لال "گردشی" بتیاں دیکھ لی تھیں جو پولیس کار کی چھت پر نصب تھیں۔ ہم جلدی سے مزید سڑک سے دور ہوتے چلے گئے اور اونچے نیچے ریتیلے ٹیلوں کی طرف جا دبکے۔

دونوں پولیس گاڑیاں جن میں ایک جیپ اور دوسری کار تھی۔ زناٹے کے ساتھ نکلتی چلی گئیں کیونکہ سڑک دور تک سنسان اور خالی تھی۔

کوئی نصف کلومیٹر کے بعد آگے ایک موڑ آتا تھا۔
جب ہمیں تسلی ہوگئی کہ دونوں پولیس کی گاڑیاں دور جاچکی ہیں تو ہم سڑک پر آگئے۔ دور جاتی پولیس گاڑیوں کی بیک ریڈ لائٹس تھوڑی دیر تک نظر آتی رہیں اس کے بعد نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔

"جان چھوٹی اس مصیبت سے۔" کالیا ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "اب بتاؤ جگری! کیا کرنا ہے؟ ادھر ہی سڑک کنارے کھڑے ہوجائیں یا آگے چلا جائے؟"

"چلتے رہو۔ جہاں تھک گئے۔ کھڑے ہوجائیں گے۔ کوئی گاڑی پیچھے سے آئی تو سوار ہوجائیں گے۔" میں نے کہا۔

"کوریکٹ!" اوبرائے گرانٹ نے حلق سے تیز آواز نکالی۔

ہم ہنسنے لگے اور قدم بڑھا دیے۔ ساتھ ہی تھوڑے تھوڑے وقفے سے پیچھے بھی مڑ کر دیکھ لیتے تھے اگر کوئی گاڑی آرہی ہو تو..... ہم اسے رکنے کا اشارہ دے سکیں۔
اس بار کالیا نے مڑ کر دیکھا تو اس کے منہ سے "ابے لے....." برآمد ہوا۔

گرانٹ اور میں نے بھی دیکھا تو کسی گاڑی کی ہیڈلائٹس تھیں۔

ہم تینوں فوراً سڑک کنارے کھڑے ہوگئے اور گرانٹ .... اپنے ایک ہاتھ کے انگوٹھے کا اشارہ بنا کر لہرانے لگا۔ گاڑی قریب آئی اور زوردار زناٹے کی آواز سے ہمارے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ یہ کوئی وین تھی۔

"دھت تیرے کی .....! انسانوں میں انسانیت ہی نہیں بچی ہے۔" کالیا نے جھلا کر تلخ سا تبصرہ کیا۔ گرانٹ ہونٹ سکیڑے سیٹی بجانے لگا۔ ہم پھر چل دیے۔

رات جانے کون سے پہر میں تھی۔ ہر طرف چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور ٹھنڈ بڑھتی جارہی تھی۔

اچانک اوبرائے گرانٹ چلتے چلتے ٹھٹک گیا۔
"کیا ہوا؟" میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔ کالیا بھی رک کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"ششش......!" اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر گہری تشویش عود آئی تھی۔

"یہاں قریب میں کہیں صحرائی بھیڑیوں یا کتوں کا بھوکا آوارہ غول موجود ہے۔" اس نے جیسے سرسراتی سرگوشی میں کہا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کالیا کے چہرے پر بھی گرانٹ کی بات سن کر تشویش طاری ہوگئی تھی۔ بولا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"
"میں نے ان کی آوازیں سنی ہیں۔ تم لوگ بھی ذرا غور کرو۔ تمہیں بھی سنائی دے جائیں گی لیکن ذرا وقفے

[illegible] سنائی دیتی ہیں۔" گرانٹ نے کہا۔
[illegible] رک گیا تھا... میں اور کالیا بھی ٹھہر گئے تھے۔ [illegible] کی سمت دیکھ رہا تھا۔ [illegible] نے بھی غور سے کچھ سننے کی کوشش چاہی تھی۔ [illegible] نے پہلے توجہ نہیں دی تھی اور اسے ماحول سے تشبیہ [illegible] کیا تھا جبکہ حقیقت یہی تھی کہ دور پرے کہیں [illegible] کے چلانے اور گیدڑ کے رونے کی سی چند ایک بار [illegible] نے بھی سنی تھیں۔

"کچھ ایسی آوارہ جانوروں کی آوازیں تو تھوڑی تھوڑی دیر بعد مجھے بھی سنائی دیتی رہی تھیں لیکن میں یہی سمجھا تھا کہ....." کالیا کہتے کہتے رک گیا۔
"یقیناً سنی ہوں گی۔" گرانٹ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "دشت لوط میں ایسے ہی صحرائی بھیڑیوں اور کالاہاری کے صحرا میں بھوکے جنگلی کتوں سے میرا سامنا دو تین بار ہوا تھا۔

یہ جب اکیلے دکیلے ہوتے ہیں تو شکار کی بو سونگھ کر وقفے وقفے سے آوازیں خارج کر کے اپنے دیگر ساتھیوں کو یکجا کرتے ہیں۔ بھوک میں ان کی خونخواری اور سونگھنے کی حس تیز ہوجاتی ہے۔ وہ جب تک غول نہ بنالیں، چھپ کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں، ایسے میں ہی ان کے تھوتھنوں سے ایسی ہی آوازیں خارج ہوتی رہتی ہیں۔
میں [illegible] آوازیں سن کر چونکا ہوں، پھر یہ غول کی شکل میں ایک دم [illegible] دیتے ہیں۔ بڑی اذیت ناک موت ہوتی ہے اس کی جو [illegible] ان کے چنگل میں پھنس جائے، میں نے فیلڈ ورک کے دوران اپنے ساتھیوں کو ایسی کرب ناک موت سے ہمکنار ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

اوبرائے گرانٹ بولتا چلا گیا۔ میں اور کالیا اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئے تھے۔ اس صحرائی ویرانے میں [illegible] بھوکے خونخوار درندوں کا سامنا اس بے سروسامانی کے عالم میں یقیناً ہولناک ہوسکتا تھا۔ اسی تصور سے میرے وجود میں ایک جھرجھری سی آگئی۔
دفعتاً ہی کسی چوپائے سے مشابہ کوئی مٹیالی اور خاکستری سی شے تیزی کے ساتھ ایک قریب خشک ٹیلے سے نمودار ہوئی اور چشم زدن میں ہمارے سامنے سے گزرتی سڑک کراس کرتی دوسری جانب تاریک ٹیلوں کی طرف جاکر غائب ہوگئی۔

ہم تینوں تھرا اٹھے۔ ابھی ہم سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ اچانک اسی طرح کی اور شے یک دم ہمارے عقب سے ایک زوردار خراتا مارتی دوسری جانب دوڑتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی دائیں بائیں پہلے گھٹی گھٹی غراہٹوں کی اور پھر خراٹے مارنے کی آوازیں ابھرتی رہیں۔
"یہ گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔ ہوشیار۔" گرانٹ نے سرگوشی کی۔ مجھے اس کی آواز واضح طور پر کپکپاتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔
"پستولیں نکال کر ہاتھ میں پکڑ لو فوراً اور حرکت کوئی نہ کرے اب....." گرانٹ نے دوسری ہدایت دی۔ "اپنے پستولوں کے راؤنڈ چیک کرو جلدی۔"
پستول ہنوز ہمارے قبضے میں تھے۔ ہم نے ان کے میگزین چیک کیے۔ میرے پستول میں چار گولیاں تھیں، گرانٹ تین اور کالیا کے پستول میں چار گولیاں۔
"گڈ! انہیں اب دھیان سے کھپانا ہوگا، کوشش یہی کرنا کہ کسی بھیڑیے کو اس وقت نشانہ بنانا جب وہ دوسروں کے درمیان میں ہو، اس طرح وہ اپنے ساتھی کی خون آلودہ لاش دیکھ کر خوف زدہ ہوجائیں گے، الگ الگ ہلاک کرنے سے ان کی تعداد بڑھتی جائے گی اور یہ مزید بپھر جائیں گے۔" گرانٹ نے تاکید کی۔
وہ نجانے ان کی کون کون سی حیوانی جبلت سے واقف تھا، بہرحال وہ اس قسم کی سنگین صورت حال کا تجربہ رکھتا تھا اور ہم سے زیادہ اسے پتا تھا کہ اس سے کیسے نمٹا جائے۔
ہم سڑک کا ریتیلا کنارا چھوڑ کر بیچ میں آ کر پشت سے پشت ملا کر کھڑے ہوگئے۔
اچانک دائیں جانب سے تین چار خونخوار بھیڑیے ہمارے سامنے آگئے۔ ان خوفناک انداز میں غراتے ہوئے [illegible] کے ادھ کھلے کریہہ تھوتھنوں سے جھاگ اور رال سی ٹپک رہی تھی اور ان کے بھیانک جبڑوں سے نوکیلے شکاری دانت صاف نظر آرہے تھے۔
"یہ اس وقت بہت بھوکے اور خونخوار ہو رہے ہیں۔ [illegible] جیسے میں نے کہا ہے ویسے ہی کرنا۔" [illegible] تاکید کی۔
ستاروں اور دور [illegible] میں اس بنجر صحرائی ویرانے [illegible] زندگی اور موت کے کھیل کی ابتدا ہو چکی تھی۔

میں نے بہ غور اپنی آنکھیں سکیڑ کر انہیں دیکھا تھا۔ یہ خاصے جسیم اور جھبرے سے تھے۔ ان کی آنکھوں میں مجھے مقناطیسی چمک محسوس ہوتی تھی۔

اچانک دائیں بائیں سے بھی تین چار بھیڑیے اور نمودار ہوگئے، انداز ایسا ہی تھا جیسے انہوں نے ہمارا راستہ روک کر بالآخر حملہ کرنے کی ٹھان لی ہو۔

''ٹارگٹ کرو...... ہر گولی پر ایک شکار ہونا چاہیے۔'' معاً گرانٹ نے سرسراتی آواز میں کہا اور اپنی پستول کا رخ غول کی جانب کرکے ٹرائیگر دبا دیا۔

ٹھٹرائے ہوئے صحرائی ویرانے میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا، ایک بھیڑیا گرا، دوسرا دھماکا میرے پستول کی نال نے اگلا، دوسرا بھیڑیا فنا ہوا، تیسرے کو کالیا نے نشانہ بنایا، وہ بھی سڑک پر گر کر تڑپنے لگا جبکہ پہلی گولی چلتے ہی وہ بدک کر بکھرنے لگے تھے مگر کالیا اور میں نے اپنے اپنے ''ٹارگٹ'' کو جانے نہیں دیا تھا۔

سڑک ایک دم صاف ہوگئی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق بھیڑیوں کا یہ غول آٹھ، دس پر مشتمل تھا۔ جن میں سے اب تین مارے گئے تھے اور ان کی لاشیں سڑک پر پڑی تھیں، باقی دائیں بائیں قریب ٹیلوں کی جانب تاریکی میں غائب ہوتے چلے گئے تھے۔

''گڈ......! اب آگے بڑھتے رہو مگر اپنے دائیں بائیں سے چوکنا رہنا۔ صورتِ حال اب بھی سنگین ہی ہے مگر اسی انداز سے ہم انہیں دور بھاگنے پر مجبور کردیں گے۔''

ہم نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ خطرہ ابھی ٹلا نہیں بلکہ ''ہم رکاب'' تھا۔

ہم تینوں دائیں بائیں تاریکی میں محتاط سی نظریں دوڑاتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اس دوران ہمیں مدھم مدھم سی روشنی میں بھیڑیوں کے جسیم ہیولے بھی گویا ہمارے ہم رکاب چلتے ہوئے دکھائی دیتے رہے تھے۔ وہ شاید ہم پر دوبارہ ہلہ بولنے کے پر تولے ہوئے تھے۔

ان کے وقفے وقفے سے خوفناک انداز میں غرانے کی بھی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں، ایک بڑی تشویشناک اور خوفناک سی فضا پیدا ہوگئی تھی کہ انسان اور خونخوار جانور کے بیچ جیسے چوہے بلی کا کھیل شروع ہوچکا تھا۔

اچانک بہت قریب سے ایک اور بھیڑیے کی زوردار انداز میں غرانے کی آواز ابھری اور ساتھ ہی میں نے جھپکتی کا نگاہ سے ایک بھیڑیے کو چھلانگتے دیکھا، اس کا نشانہ گرانٹ تھا۔

مجھے اور کالیا کو تو کیا خود بے چارے گرانٹ تک کو اس پر گولی چلانے کا موقع نہ ملا اور وہ بھیڑیا گرانٹ کو گردن کے قریب کندھے کی جانب سے بھنبھوڑتا ہوا اسی سمیت نیچے آرہا۔

موت کی دھمک دیتے اس چیختے ہوئے سناٹے میں ابھرنے والی گرانٹ کی چیخ بڑی کرب ناک محسوس ہوئی تھی۔ ... اور کالیا بدکے، دو اور بھیڑیوں نے بیک وقت ہم پر بھی چھلانگ لگائی تھی، میں نے یک دم پستول والا ہاتھ سیدھا کیا اور ... چلا دی۔ دھماکا ہوا، مجھ پر چھلانگنے والے بھیڑیے کا کھوپڑی ... کالیا کو بھی گولی چلانے کا موقع تو ملا تھا مگر اس کا نشانہ شاید ... یا مارے خوف کے خطا چلا گیا تھا۔ بھیڑیے نے اسے اپنے پنجوں اور خونخوار شکاری دانتوں کی زد میں لے لیا تھا۔ اس کے حلق سے بڑی کرب ناک چیخ خارج ہوئی تھی اور وہ چمکتی سڑک ...

گرانٹ پہلے ہی ایک بھیڑیے کی زد آ چکا تھا، پستولیں دونوں کے ہاتھ سے نکل چکی تھیں اور وہ دونوں ... تھے۔ میں نے ایک اور بھیڑیے کو اپنی جانب جست لگانے کے پر تولتے دیکھا اور فوراً میں نے جگہ بدلی اس کے بعد اپنے حواس بحال رکھتے ہوئے پہلے گرانٹ پر حملہ کرنے والے بھیڑیے کو نشانہ بنایا اور پھر کالیا کے وہ دونوں ڈھے گئے۔ اسی وقت مجھ پر عقب سے ایک بھیڑیے نے جست لگائی۔ وہ میرے کندھے پر جھپٹا۔ حیوانی بو کا ناگوار بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا۔ میں نے خود کو گرنے نہیں دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے بھیڑیے کے بھاری وجود کو دبوچ کر خود سے پرے پھینکا۔ میرا پستول خالی ہوچکا تھا اسی لیے میں نے اسے پھینک دیا تھا۔ بھیڑیا ... سڑک پر آرہا اور اسی وقت گرانٹ اور کالیا نے لپک کر اپنی پستولیں اچک کر شاید خوف اور کچھ جوشِ غیظ تلے ان پر فائرنگ کھول دی۔

مزید دو تین بھیڑیے سڑک ... اور اس کے ریتیلے کنارے پر تڑپنے لگے۔

میں کالیا اور گرانٹ کی خیریت پوچھنے کے لیے ان کی جانب لپکا۔ وہ دونوں اپنے زخم سہلا رہے تھے۔ کالیا کے مقابلے میں گرانٹ زیادہ زخمی تھا۔ اس کے کاندھے میں گردن کے قریب سے خون رس رہا تھا اور وہاں سے شرٹ سمیت کھال ادھڑی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ یہ دیکھ کر بلاشبہ مجھے گرانٹ کی قوتِ ارادی اور قوتِ برداشت کا احساس ہوا

... سخت جان تھا۔ چہرے پر بھی خراشیں آئی ہوئی ... قدرے بہتر حالت میں تھا، اس نے غالباً بھیڑیے کو خود پر زیادہ جھپٹنے کا موقع نہیں دیا تھا، یوں ... بغیر گرانٹ کو سنبھالنے کے لیے لپکا۔ میں بھی ... کے قریب پہنچ چکا تھا۔

''گرانٹ! تم ٹھیک تو ہونا؟'' میں نے اس کی ... کیا۔ بھیڑیے ہم سے ذرا دور بھاگ گئے ... کالیا! تم بھی زخمی ہو؟'' میرے لہجے میں تشویش در آئی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں جگری! گرانٹ کا زخم زیادہ گہرا ہے۔'' اسے بھی گرانٹ کی فکر ہوئی۔

''میرا خیال ہے ہمیں سڑک چھوڑ کر کسی ٹیلے وغیرہ کی ... لینی چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''ہرگز نہیں۔'' گرانٹ نے قدرے کراہتے ہوئے انکار کردیا۔ ''وہاں ہم ان کے گھیرے میں آجائیں گے۔ ابھی یہ تتر بتر ہوگئے ہیں۔ ادھر ہی کھڑے رہو۔''

''ابے لے...... جگری!'' اچانک کالیا کے منہ سے نکلا۔ ''وہ دیکھو کوئی گاڑی آرہی ہے۔''

اس نے ایک طرف کو اشارہ کیا۔ اس طرف کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتی نظر آئی۔ اگرچہ وہ گاڑی ہمارے ... راستے کے بجائے شہر کی سمت سے آرہی تھی تاہم بھیڑیوں ہی ... چھٹکارا پانے کے لیے اس وقت یہ بھی غنیمت ہی تھا، ... ان خونی درندوں کے نرغے سے تو نکل جاتے۔ یہ بہت تاریک ... تھیں۔ ادھر ایک خدشے کے مطابق بھیڑیوں کی تعداد ... جا رہی تھی۔

بہرکیف میں نے فوراً اس طرف اپنا رخ کرکے دونوں ہاتھ فضا میں ہلانے لگا۔ ابھی ... گرانٹ اور کالیا کے پستولوں میں گولیاں اِکا دُکا بچی تھیں ... کالیا ... کرلیا تھا کہ گاڑی نہیں رکی تو وہ اس کا ٹائر برسٹ کرڈ ... کوئی بھلا مانس تھا اس نے گاڑی ہمارے قریب لا ... دی۔

کار کی ہیڈ لائٹس ہم پر مرکوز تھیں۔ اسی لیے میں یہ دیکھنے سے قاصر ہی رہا کہ اندر کون اور کتنے افراد تھے؟ کار کا دروازہ کھلا، تب تک میں اور کالیا، زخمی گرانٹ کو سنبھالے اس کی جانب بڑھ رہے تھے کہ قریب پہنچنے پر پتا چلا وہ کوئی خاتون تھی اور شاید اکیلی بھی اس نے میرے قریب آتے ہی اردو میں اس قدر چونکتی ہوئی آواز میں اپنے حلق سے

''ارے......آپ......؟'' میں ہی نہیں کالیا اور گرانٹ کو بھی میں بری طرح چونکتے پایا۔ لڑکی نے اردو میں یہ جملہ کہا۔ تب ہی غور سے دیکھنے پر مجھے ایک حیرت آمیز مسرت ہوئی۔ وہ مجھے تو پہچان ہی گئی تھی مگر میں اب اسے پہچان پایا تھا۔ یہ وہی خوب صورت سی پاکستانی لڑکی تھی جس سے میری ملاقات پاکستان سے بحرین آتے ہوئے طیارے میں ہوئی تھی۔ اس کے معصوم بچے ''پپو'' کو عالی جاہ کے بھائی سلطان نے محض چھوٹی سی بات پر بڑے زور کا تھپڑ مارا تھا اور پپو کا ننھا معصوم گال پھٹنے کے ساتھ، گرنے کے سبب اس کا سر بھی پھٹ گیا تھا، تب میں نے طیش میں آکر سلطان کی دھنائی کردی تھی۔ بعد میں اس لڑکی نے میرا شکریہ ادا کیا تھا اور بحرین کے ایئرپورٹ پر بھی مجھ سے مختصراً ملاقات کی تھی۔

''ناقابلِ یقین!'' میں بھی خوشی سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ اسی وقت قریب میں بھیڑیوں کے غرانے کی آوازیں آنے لگیں اور میں نے اس لڑکی کو جلدی جلدی سب بتا دیا۔ اس دوران اس نے پسنجر سیٹ کا دروازہ بھی کھول دیا تھا اور کالیا گرانٹ کو سنبھالے سوار ہوچکا تھا۔ میں بیٹھ گئے۔

اور وہ لڑکی بھی کار میں بیٹھ گئے۔ لڑکی نے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہی کار آگے بڑھا دی۔ وہ اکیلی تھی۔ میں نے صرف اسی قدر ہی بتایا کہ ہم یہاں کسی کام سے آئے تھے اور پھنس گئے۔

گرانٹ بھی اب اسے پہچان رہا تھا کیونکہ وہ بھی اس وقت اس روز طیارے میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ سوار تھا اور اسی موضوع پر ہی میری اس سے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

''او مائی گاڈ! آپ لوگ کس قدر خطرناک حالات کا شکار ہوئے تھے یہاں۔ ویری سیڈ۔'' وہ متوحش سی حیرانی سے بولی۔ ''اس تصور سے تو میری بھی جان نکلی جارہی ہے کہ آپ لوگ یہاں ویران صحرا میں بھوکے اور خونخوار بھیڑیوں کے چنگل میں پھنس گئے۔'' وہ کہتی جارہی تھی۔ ''سچ پوچھیں تو مجھے یقین ہی نہیں آرہا ہے کہ میرا آپ سے دوبارہ اور وہ بھی ان حالات میں سامنا ہوسکتا ہے۔''

''بس! اتفاقاتِ زمانہ ہیں۔ کیا کہا جاسکتا ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''پپو کیسا ہے آپ کے ساتھ؟ وہ ٹھیک تو ہے نا......؟''

''بالکل ٹھیک ہے وہ اپنی دادی اماں کے پاس ہے۔''

''آپ یہاں کہاں اس وقت رات میں اور وہ بھی

اس دور افتادہ بندرگاہ کی طرف؟" میں نے پوچھا۔

"آپ سے جو ملاقات ہونا تھی۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔ اس کے نرم و گداز ہونٹ دلنشین انداز میں وا ہوئے تھے۔ وہ یہاں بھی مشرقی روایات کو برقرار رکھے ہوئے تھی۔ اس نے جدید طرز کا بہترین شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور دل کش چہرے پر ہلکا میک اپ اس کی صاف رنگت کو نکھرا ستھرا بنائے ہوئے تھا۔ گھنے سیاہ بالوں کو اس نے سلیقے سے ربن کیا ہوا تھا۔

اسی دوران میں کالیا سے تعارف کروا چکا تھا، لڑکی نے اپنا نام سارہ بتایا تھا اور وہ مزید اپنے بارے میں بتانا چاہتی تھی کہ اچانک کالیا نے اسے بڑے اخلاق سے مطلع کرتے ہوئے بتایا۔

"مس سارہ! آپ تو ہمارے لیے اس خطرناک اور سنگین موقع پر فرشتہ بن کے آ گئیں۔ آپ ایک اور احسان کر دیں۔ یہ مسٹر گرانٹ اس حادثے میں زخمی ہیں اگر آپ......"

"مسٹر کالیا! آپ اس کی فکر بالکل نہ کریں۔" سارہ اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے سامنے عقبی منظر پیش کرنے والے ویو مرر میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر اس سے بولی۔

"ہم اس وقت جہاں جا رہے ہیں، وہاں آپ کو اور آپ کے ساتھی کو مکمل طبی سہولیات میسر آ جائیں گی۔ دوسری بات یہ کہ میں مس نہیں بلکہ مسز ہوں۔"

"شکریہ خاتون! ویسے آپ جا کہاں رہی ہیں، ایسے رات کے آخری پہروں میں؟" اس بار گرانٹ نے براہ راست اس سے مخاطب ہو کر پوچھ لیا۔

"بس! اس سڑک پر مڑتی ہوں۔" کہتے ہوئے سارہ نے اسی ذیلی سڑک کی جانب کار کا اسٹیئرنگ گھما دیا جو "رچ کیمیکل لیب" کی طرف جاتی تھی۔ اس نے جیسے گرانٹ کا سوال سنا اَن سنا کر دیا تھا۔

اسے اس سڑک پر کار موڑتے دیکھ کر مجھے تو جیسے بچھو نے ڈنک لیا۔ عقب سے کالیا کی بھی گھبرائی ہوئی مخصوص آواز برآمد ہوئی۔

"ابے لے...... جگری! اسے بریک لگواؤ۔"

"اوہ...... روکو اسے......" گرانٹ بھی چلا اٹھا۔ خود میری کیفیت ایسی تھی کہ میں تو ایک لمحے کو جیسے صم بکم سا ہو گیا تھا، یکدم میں نے سارہ کو کار روکنے کا کہا۔

اس نے حیران و پریشان ہو کر بریک لگا دیے۔ کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔

پوری تاریک سی فضا ہی جیسے یکلخت تھم گئی تھی۔ ٹھٹکا دینے والا سناٹا سا چھایا ہوا تھا ہر سو۔ صرف اندیشناک لمحوں کی دھمک دھڑکنیں بن کر بازگشت کی صورت سنائی دینے لگیں یا پھر کار کے انجن کی مدھم سی گھرگھراتی آواز۔

ہمارے اطراف میں تاریک اور ویران صحرا پھیلا ہوا تھا۔ ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی۔ دور کہیں اونچے نیچے ریتیلے ٹیلوں کے ہیولے یوں محسوس ہوتے تھے جیسے عفریت... [illegible] منہ دبائے عالم خواب میں ہوں۔ دور بندرگاہ کی جانب [illegible] روشنیاں اب بھی نظر آ رہی تھیں۔

"[illegible] یہ اچانک کیا ہوا آپ لوگوں کو؟"

"آ...... آپ وہاں رچ کیمیکل لیب میں کیا کام کرتی ہیں؟ میرا مطلب ہے [illegible] پوسٹ پر فائز ہیں؟" میں نے اس سے قدرے اٹکتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"میں وہاں ایز اے [illegible] لیب اسسٹنٹ جاب کرتی ہوں!" اس نے بھی جواب میں قدرے حیرت سے کہا۔ [illegible] میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ میں شدید الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ "اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو آپ [illegible] بندرگاہ تک چھوڑ دیں وہاں سے ہم کسی سے لفٹ لے کر روانہ ہو جائیں گے۔"

"مگر کیوں؟" سارہ بدستور حیران و پریشان ہو کے بولی۔ "آپ میرے محسن ہیں نعمان صاحب! میں آپ لوگوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں، رہائش کا کوئی پرابلم نہیں، وہاں آپ تینوں آرام سے رات گزاریں کل صبح میں دفتر کی گاڑی میں آپ تینوں کو......"

"میں نے آپ پر بھلا کون سا احسان کر دیا؟ ایک معصوم بچے کو ہٹے کٹے شخص کے چانٹا مارنے پر ہر دردمند انسان کا دل تڑپ جاتا ہے۔"

"لیکن جو دل کی بھڑاس میں اپنے معصوم بچے کو تھپڑ مارنے والے کے سامنے نہ نکال سکی وہ آپ نے ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کر کے نکال دی تھی۔ اس وقت میرے دل و دماغ کی کیا حالت تھی آپ اندازہ کر سکتے ہیں! اسی لیے بعد میں مجھے بھی آپ کی فکر لاحق ہو گئی تھی کہ کہیں اس دشمنی میں وہ عربی لوگ آپ کے لیے مسائل نہ پیدا کریں۔"

مجھے یاد تھا بحرین ایئرپورٹ اترتے ہی سارہ اسی حوالے سے مجھے دوبارہ ڈھونڈتی ہوئی لاؤنج میں آئی تھی اور

[illegible] پہنچی تھی مگر میں اس سے جان چھڑا کر ٹیکسی [illegible] طرف بڑھ گیا تھا۔

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ سب [illegible] لیب جانے سے اس قدر پریشان کیوں ہو گئے [illegible]"

"آپ نہیں سمجھیں گی اور ہم ابھی آپ کو سمجھا نہیں [illegible] معاملہ وہاں کچھ گڑبڑ ہے آپ کو شاید پتا نہیں۔" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "بلکہ آپ ہم پر ایک احسان کیجیے گا کہ وہاں کسی سے ہمارے بارے میں ذکر بھی مت کیجیے گا۔"

"میں آپ لوگوں کی بات بالکل نہیں سمجھ رہی ہوں۔" وہ مزید الجھ گئی۔

"ہم آپ کو اس وقت سمجھا بھی نہیں سکتے۔" میں نے فوراً کہا۔ "بلکہ اب تو آپ سے دوسری ملاقات بھی ازبس ضروری ہو گئی ہے۔ آپ اپنا کوئی کونٹیکٹ نمبر دے سکتی ہیں؟"

"شیور......" وہ ایک دم بولی اور ڈیش بورڈ پر رکھے اپنے پرس میں سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر مجھے تھما دیا۔

"ویسے حیرت ہے آپ رات کے اس وقت نکلی ہیں [illegible] پر جانے کے لیے؟" میں نے بھی گرانٹ کا سوال [illegible]

[illegible] جواب میں بولی۔ "یہ جگہ چونکہ شہر سے [illegible] چالیس کلومیٹر کے فاصلے کی دوری پر ہے۔ ہفتے میں دو چھٹیاں ہوتی ہیں، [illegible] شہر (مناوا) گھر میں گزارتی ہوں، اپنی ماں [illegible] کے ساتھ۔ کل صبح سویرے ڈیوٹی پر پہنچنا ہوتا ہے اس لیے میں رات میں ہی نکل جاتی ہوں... ورنہ مجھے شہر سے [illegible] میرے نکلنا پڑتا ہے۔ نیند بھی خراب ہوتی ہے۔ اس طرح [illegible] گھنٹے پہلے "الجورین" پہنچ کر آرام بھی کر لیتی ہوں اور ڈیوٹی بھی جوائن کر لیتی ہوں، ویسے ایسا [illegible] ہے، آج اتفاق سے میں رات میں ہی نکل آئی تھی۔" اتنا بتا کر وہ ذرا سانس لینے کو رکی پھر پر قطعیت لہجے میں دوبارہ گویا ہوئی۔ "لیکن میں آپ کو بندرگاہ نہیں بلکہ شہر لے چلوں گی۔" کہتے ہوئے اس نے گیئر ڈال کر یوٹرن لیا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "دراصل ہمارے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔" بالآخر میں نے کہا۔

"واٹ......؟" وہ بری طرح چونکی۔ "مگر کیوں؟ آپ تو شریف انسان ہیں۔"

"بس شرافت میں ہی سمجھ لیں ایک غلطی ہو گئی لیکن میں نے کہا نا کہ میں آپ کو بہت جلد اصل حقیقت بتا دوں گا بلکہ آپ کو تو اب ویسے بھی بتانا ضروری ہو گیا۔"

"کیا لیب میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟ اور آپ تینوں اس میں انوالو ہو؟" سارہ کے لہجے میں پہلی بار میں نے تشکیک کے آثار محسوس کیے اور میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میری اپنی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا بتاؤں اور کیا نہیں؟ جیسا کہ مجھے خود بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ رچ کیمیکل لیب میں درون خانہ کوئی بڑی گڑبڑ تھی، اب پتا نہیں سارہ اس سے واقف تھی یا نہیں، کوئی بعید نہیں کہ وہ بھی ان کی ساتھی ہو یا پھر لاعلم ہو۔

"کیا سوچنے لگے آپ؟" اس نے پوچھا جبکہ میں الجھن آمیز انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے ہوئے تھا۔

"گڑبڑ تو آپ کو اب وہاں جا کر معلوم ہو ہی جائے گی۔" بالآخر میں نے کہا۔ "لیکن میں آپ سے پھر وہی استدعا کروں گا کہ پلیز! ہمارے بارے میں آپ وہاں کوئی ذکر مت کیجیے گا لیکن آپ مطمئن رہیں، میرا خیال ہے کہ آپ کے لیے وہاں کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوگی کیونکہ بہ قول آپ کے آپ وہاں ملازمت کرتی ہیں۔"

کار کا انجن ہنوز بیدار تھا۔ سارہ نے وہ بند کر دیا۔ پھر ایک نگاہ گردن موڑ کر گرانٹ اور کالیا کی طرف دیکھا پھر میرے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے بعد دروازہ کھولے باہر اتر گئی۔

"ابے لے...... جگری! یہ کیا کر رہی ہے؟" کالیا کے منہ سے نکلا۔

میں خود الجھا ہوا تھا۔ سارہ تاریکی میں کار سے پیچھے اتر کر ڈگی کی جانب گئی۔ اسے کھولا اور اندر سے ایک سیاہ باکس نکال کر کھڑکی سے کالیا کی طرف بڑھا دیا پھر دوبارہ اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔

"اپنے ساتھی کی مرہم پٹی کرو، اس میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود ہے۔" اس نے کالیا سے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر گہری متانت سے بولی۔ "اب بتائیں آپ آخر یہ کیا معاملہ ہے اور آپ لوگوں کے ساتھ ہوا کیا ہے؟"

مجھے اس کے پوچھنے کا انداز ایسا ہی لگا جیسے وہ تہیہ کیے بیٹھی ہو۔ میں نے بے اختیار ایک گہری ہنکاری لی اور بولا۔

"میرا خیال ہے پہلے آپ رچ کیمیکل لیب میں اپنی حیثیت واضح کریں۔ مجھے بتائیں وہاں ہوتا کیا ہے؟"

"کیا مطلب؟ تمہارے پوچھنے کا انداز تو ایسا ہے جیسے وہاں کوئی غیر قانونی دھندا ہو رہا ہے۔" سارہ حیرت سے زیادہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہم پر کچھ لوگوں نے کراس بو جیسے ہتھیاروں سے کسی گھر میں حملہ کیا تھا مگر ہم نے ان کا مقابلہ کیا اور انہیں خاک چٹا دی، بس کسی دھوکے میں آ کر ان کے دوبارہ ہتھے چڑھ گئے اور وہ ہمیں بے بس کر کے یرغمال بنائے ایک بند ڈبہ ٹرک میں ڈال کر یہاں لے آئے۔ یہاں ہم نے پھر ان کے ساتھ ٹھیک ٹھاک فائٹنگ کی اور نکل بھاگے بعد میں انہوں نے پولیس کو بلا لیا تب تک ہم یہاں سے رفو چکر ہو گئے تھے۔ یہ تھی ہماری کہانی۔ اب آپ بتائیں کیا ایسی جگہ سے تعلق رکھنے والے ایسا کام کر سکتے ہیں؟"

میری مختصر اصراحت بتانے پر اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا اور وہ اس روپ میں بھی خاصی پُرکشش اور حسین نظر آنے لگی۔

"انبلیو ایبل!" بالآخر اس نے کہا۔

کالیا پچھلی سیٹ پر اوبرائے گرانٹ کی مرہم پٹی کرنے میں مصروف تھا مگر وہ دونوں غور سے ہماری باتیں بھی سن رہے تھے۔ مجھے ابھی کچھ ٹھیک طرح اندازہ نہیں تھا کہ اگر رچ کیمیکل لیب میں کوئی غیر قانونی دھندا ہو رہا تھا تو اس کا سارہ سے کوئی تعلق تھا یا نہیں تاہم اس کی امید کم ہی تھی کہ وہ کسی غیر قانونی دھندے میں ملوث ہوتی، نادانستگی کی بات اور تھی اسی لیے میں نے بھی اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ میں نے دیکھا سارہ کے چہرے پر اب حیرت کے ساتھ خوف کے بھی تاثرات ابھر آئے تھے۔

"مس سارہ! کیا آپ بتا سکتی ہیں ویسے وہاں بظاہر ہوتا کیا ہے؟" یہ سوال گرانٹ نے اس سے پوچھا تھا۔

"رچ لیب، درحقیقت ایک واشنگ کیمیکل بنانے والی کمپنی ہے، تاہم یہاں کروڈ آئل میں استعمال ہونے والے ایک خاص قسم کے کیمیکل پر بھی ریسرچ کی جا رہی ہے، کیونکہ اسی عمارت میں ایک اور زمین دوز لیبارٹری ہے اور اس کے لیے تین غیر ملکی سائنٹسٹ کی خدمات لی گئی ہیں، ان کی مستقل رہائش وغیرہ کا بندوبست بھی وہیں کیا گیا ہے جو کمپنی کے سپرد ہے۔ ان میں ایک افریقا سے تعلق رکھتا ہے باقی دو میں سے ایک انڈین ہندو ہے تیسرا جرمن سے بلوایا گیا ہے۔ دو امریکی سائنٹسٹ حال ہی میں اسی مقصد کے لیے بلوائے گئے ہیں۔"

"ہمم......" میرے منہ سے پُرسوچ انداز میں نکلا۔

"جگری! یہ معاملہ بہت گہرا اور پُراسرار لگتا ہے۔ میرا خیال ہے اس بے چاری سارہ کو اس سے دور ہی رکھو۔ اوپر کے ملازمین کو اس چکر کا کچھ پتا نہیں کہ در پردہ ہو کیا رہا ہے؟" کالیا نے کہا۔ تو گرانٹ بولا۔ "میرا خیال یہ ہے کہ مس سارہ! وہاں ایک عام ملازم کی حیثیت سے رہتے ہوئے اس بلڈنگ [illegible] لگائے کہ وہاں درونِ خانہ ہو کیا رہا ہے؟"

"[illegible] اب ظاہر ہے یہ سب پتا چلانے کی کوشش کروں گی [illegible] یقیناً جھوٹ نہیں بول سکتے۔" سارہ بھی جیسے ایک دم [illegible] بے جوش تلے بولی۔ "کیونکہ تم نے جو کراس بو نامی ہتھیار [illegible] جن افراد یا حملہ آوروں کا ذکر کیا ہے، میں نے انہیں [illegible] دیکھا ہے۔ حالانکہ وہاں گارڈ اور محافظین کے نام پر جو لوگ [illegible] وہ گن بردار ہوتے ہیں۔ ایسے سیاہ چست لباس والے کراس بو پکڑے افراد کو میں نے بلڈنگ نمبر سیون میں دیکھا ہے جہاں ملازمین کو بھی جانے کی اجازت نہیں ہے ماسوائے مسٹر ہوپر بولڈ اور مس ٹریسا فنٹر کے۔"

"یہ دونوں کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہی دونوں تو رچ لیب کے روحِ رواں ہیں۔"

"ناموں سے تو غیر ملکی معلوم ہوتے ہیں۔" کالیا بولا۔

"ہاں! مخلوط النسل سے ان کا تعلق ہے، مسٹر ہوپر بولڈ امریکی نژاد اطالوی ہیں جبکہ مس ٹریسا فنٹر کی شخصیت ذرا پُراسرار سی ہے، وہ خود کو تو شرقِ وسطیٰ سے بتاتی ہیں، تاہم ان دونوں کا رویہ سارے ملازمین کے ساتھ بے حد اچھا ہے۔"

"ٹھیک ہے سارہ! آپ ہمیں اب بندرگاہ اتار دیں، میں آپ سے چند روز بعد فون پر رابطہ کر کے آپ سے رپورٹ لوں گا کہ آپ نے کیا کیا؟" بالآخر میں نے کہا۔

"ہم اب سب شہر چلیں گے اور وہاں آپ میرے مہمان ہیں، میرے ہسبینڈ طاہر آپ سے مل کر یقیناً بہت خوش ہوں گے۔"

"لیکن آپ کی جاب؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نو پرابلم! ایک دن کی ایمرجنسی کال لیو مل ہی جاتی ہے۔ مسٹر ہوپر بولڈ اور مس ٹریسا فنٹر بہت مہربان انسان ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

"ہوں...... مہربان......" میں نے زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے اپنا سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا دیا۔

تقریباً نصف یا پون گھنٹے بعد ہم مناوا میں تھے۔ رات [illegible] تھی۔ شہر سنسان تھا۔ ایسے اوقات میں پولیس [illegible] کی چیکنگ کا خطرہ تھا مگر خیریت رہی کہ ایسا کچھ نہ ہوا۔

سارہ کا اپارٹمنٹ جس علاقے میں تھا وہاں سے گلنارا کا [illegible] زیادہ دور نہ تھی۔ میں نے سارا سے کہا بھی کہ وہ ہمیں وہاں پہنچا دے مگر اس نے اصرار کیا کہ ہم کم از کم ایک دن کے لیے اس کے ہاں مہمان ضرور بنیں۔

اپارٹمنٹ خاصا کشادہ تھا۔ سارا نے بتایا کہ وہ کرائے کا تھا جس کا ساٹھ فیصد کرایہ کمپنی کے ذمے تھا۔ تیسری منزل پر ہم لفٹ کے ذریعے پہنچے تھے۔ گھر کے باقی افراد اس وقت اپنے اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔ سارہ کے پاس ڈپلی کیٹ چابی تھی۔ ایک کمرا اضافی تھا۔ سارہ نے وہ ہمیں دے دیا۔ یہاں آ کر بھی سارا ہماری خدمت کرنے سے باز نہ آئی تھی۔ ابھی ہم نہا دھو کر فریش ہی ہوئے تھے کہ وہ کھانے کی ٹرے اٹھا لائی۔

"اس وقت جو ہو سکتا وہی میں لے آئی۔" وہ جھینپی مسکراہٹ تلے بولی۔

"یہ بھی [illegible] نے بلاوجہ زحمت کر ڈالی۔ کیا ضرورت تھی اس کی؟" میں نے [illegible]

"نہیں خیر اب ایسا بھی نہیں ہے، آپ جانے کتنی دیر سے ایسے حالات کا شکار رہے ہیں کچھ کھایا پیا بھی کہاں ہوگا۔" وہ شائستگی سے مسکرا کر بولی۔

کھانے میں سنکے ہوئے توس، ابلے ہوئے انڈے اور چائے تھی۔ یہ ایک طرح سے ناشتا ہی تھا جس کا مطلب تھا کہ ہم یہ کھانے کے بعد دن چڑھے تک سوتے رہیں۔

اور ایسا ہی ہوا۔

کھانے کے بعد گرانٹ اور کالیا کو میں نے بیڈ پر سونے کا کہا اور خود قالین پر بستر ڈالے سو گیا جو سارہ نے ہمیں لا دیا تھا۔ کالیا نے نیچے سونے کی ضد کی تھی مگر میرے آنکھیں دکھانے پر وہ بحث کی جرأت نہ کر سکا۔ گرانٹ کی طبیعت اب کافی بہتر تھی۔

اگلے دن آنکھ کھلی تو ایک معصوم بچہ دو زانو بیٹھا مجھے جگا رہا تھا۔

"نومی انکل...... نومی انکل! اٹھیے۔ بہت دن نکل آیا ہے۔"

میں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے اوپر سے اس بچے نے رضائی ہٹا دی تھی۔ میں اسے پہچان گیا تھا وہ بچہ تھا۔

میں نے مسکرا کر پیار سے اس کے نرم ملائم بالوں کو سہلایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

پھر گردن موڑ کر بیڈ پر دیکھا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ کالیا اس طرح بیڈ پر ٹانگیں پھیلائے بے سدھ خراٹے لے رہا تھا کہ اس کی ایک ٹانگ گرانٹ کے پیٹ پر لدی ہوئی تھی اور خود گرانٹ اس "بوجھ" سے بے خبر گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے انہیں آواز دے کر جگا دیا۔ بچہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ کھانے کی میز پر پاپا ان کے منتظر ہیں۔

مجھے حیرت ہوئی اس نے اپنی "مما" کا ذکر نہیں کیا تھا۔ بہر طور ہم منہ ہاتھ وغیرہ دھو کر لاؤنج میں آ گئے، وہاں ڈائننگ ٹیبل پر بچہ ایک پختہ عمر کے آدمی کے ساتھ کرسی پر موجود تھا۔ وہ آدمی بھی مجھے پاکستانی نظر آیا تھا۔ سارہ وہاں موجود نہیں تھی جبکہ وہ آدمی میرا کسی طرح بھی شناسا تو نہیں تھا مگر پھر بھی میں اسے دیکھ کر چونکا تھا۔

"ان سے ملیے، یہ میرے پپا ہیں۔" بچے نے اپنے سیدھے ہاتھ والی کرسی پر موجود اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے مسکرا کر کہا تھا۔ اس شخص کی سپاٹ نظریں بالکل سیدھی اور سامنے کے رخ پر جمی ہوئی تھیں۔ گھنی مونچھیں تھیں اور تلے اس کے خیر مقدمی ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ وہ شخص نابینا تھا۔

"آیئے...... تشریف لائیں......" اس آدمی نے مسکرا کر کہا۔ "معافی چاہتا ہوں، آنکھوں سے نابینا ہوں...... مجھے آپ معزز مہمانوں کا استقبال کھڑے ہو کر کرنا چاہیے تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہونے لگا تو میرے دل کو جیسے ایک گھونسا لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے جانے کیوں سارہ کا سندر و نجل چہرہ گھوم گیا۔

"ارے...... رے...... کیا کر رہے ہیں آپ جناب!" کہتے ہوئے میں فوراً اس کی جانب لپکا اور بڑے اخلاق اور محبت کے ساتھ اس کے دونوں شانے تھام کر اسے دوبارہ کرسی پر بیٹھا دیا۔

"اس میں معذرت کی کوئی بات نہیں۔ آپ تو خوش قسمت ہیں، اتنی پیاری سی فیملی کے سربراہ ہیں۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کے۔" میں نے کہا۔ میرا دل اس شخص کے لیے ترحم و ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہو گیا تھا، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے...... اپنوں میں بھی اسی طرح کی معذوری دیکھی تھی۔ ایک اپنے چھوٹے بھائی فہیم میں اور دوسری فوزیہ میں۔

آہ......! فوزیہ......! وہ تو اب بس میرے لیے ایک آہ ہی بن کر رہ گئی تھی۔

بہرکیف میں نے اس سے ہاتھ ملایا، کالیا اور گرانٹ کا تعارف کروایا، انہوں نے بھی باری باری اس آدمی سے مصافحہ کیا۔

سارہ اگرچہ اپنے شوہر کا غائبانہ تعارفاً نام طاہر بتا چکی تھی پھر بھی اس نے اپنا نام بتا دیا۔ میں نے اس نام کا حوالہ سارہ کے تعارف کے ساتھ ذکر کرنا بھی ضروری سمجھا تھا۔

ہم کرسیاں سنبھالے بیٹھ گئے۔ کھانا پُرتکلف تھا، اسی درمیان میں طاہر نے بتایا کہ اس کی بیوی سارہ کو اچانک الحورین جانا پڑ گیا تھا۔ وہ ہمارے لیے ایک زبانی پیغام چھوڑ گئی تھی جس کے مطابق جب اس نے آج ڈیوٹی پر نہ آنے کے لیے فون پر کمپنی کو مطلع کیا تو انہوں نے اس کا کوئی عذر قبول کیے بغیر فوراً پہنچنے کا کہا تھا اور یوں وہ صبح منہ اندھیرے ہی روانہ ہو گئی تھی۔ سارہ نے یہ پیغام دیا تھا کہ ہم اس کے فون کا انتظار کریں۔ وغیرہ۔

میں ہی نہیں اس بات پر کالیا اور گرانٹ بھی چونکے تھے۔ طاہر کو کچھ معلوم نہ تھا کہ ہمارے ساتھ کیا بیتی تھی اور ہمارا اور اس کا حادثاتی طور پر کون سے خطرناک حالات میں سامنا ہوا تھا، تاہم طاہر نے بھی ایسا کچھ نہیں پوچھا تھا۔

البتہ میرے بارے میں اس جہاز والے ناخوشگوار واقعے کے سلسلے میں اسے ضرور بتا رکھا تھا اس لیے وہ بھی ہمارے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آ رہا تھا لیکن اب میرا دل یہاں زیادہ دیر رکنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

کھانے کے بعد ہم نے دونوں باپ بیٹے کا شکریہ ادا کیا اور جانے کی اجازت چاہی، طاہر نے بصد اصرار ہمیں روکنے کی کوشش چاہی تھی۔

"سارہ کے فون کا ہی انتظار کر لیتے، جانے اس نے کون سی ضروری بات کرنا تھی تم سے؟" وہ بولا۔

"میرے پاس نمبر ہے، میں بعد میں بات کر لوں گا، یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اس وقت مجھے بہت ضروری کام سے اوالی نکلنا ہے۔"

ہم وہاں سے چلے آئے۔ مناوا کی سڑکیں اور بلند و بالا جدید عمارتیں تیز دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ ہم نے ٹیکسی کی اور سیدھا لیلیٰ صماد کے گھر کا رخ کیا مگر وہاں ایک بڑا سا تالا لگا ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔

"وہ دونوں مکار ماں بیٹیاں ضرور اندر موجود ہیں۔ ہمیں نقب لگانی چاہیے۔" کالیا نے دانت پیس کر کہا۔ ہم تینوں اب کافی حد تک فریش اور تازہ دم ہو گئے تھے۔

"نہیں......" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ سارہ سے ملنے کے بعد اب خود ہی بہت سی باتوں سے پردہ اٹھنے والا ہے۔ پہلے گلنارا کے ہاں چلیں گے۔"

"مگر تم تو اوالی جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے؟" گرانٹ نے جیسے مجھے یاد دلایا۔

"ہاں! لیکن میں پہلے گلنارا کے ہاں جانا چاہتا ہوں تاکہ وہاں سے دبئی فون کر کے اپنے بھائی فہیم اور فوزیہ کی خیریت لوں اس کے بعد آج ہی شاید مجھے دبئی نکلنا پڑے۔ تم اور کالیا اوالی روانہ ہو جانا میں بھی واپسی میں سیدھا وہیں آؤں گا۔"

"ابے لے...... جگری! تو اکیلا دبئی جائے گا، میں بھی تیرے ساتھ......"

"کالیا! ہر وقت بحث میں میرے ساتھ مت الجھا کرو۔" میں نے اسے جھڑک دیا وہ کان دبا کر چپ ہو رہا۔

ہم گلنارا کے ہاں پہنچے، وہ ہمیں اچانک دیکھ کر خوش بھی ہوئی اور حیران بھی۔ میں نے وہاں سے سب سے پہلے صرائفہ شہزادی نیلم کو فون کیا اور محمود الحسن سے بھی بات ہوئی۔ وہ میری خیریت پا کر مطمئن و مسرور ہوئے تھے۔ میں نے انہیں اپنے دبئی جانے کے "فوری" پروگرام سے آگاہ کر دیا تھا۔

اس کے بعد جب میری اپنے بھائی فہیم سے بات ہوئی تو اس نے مجھے فوراً ہی فوزیہ سے متعلق ایک ایسی اطلاع دی کہ میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔

اب تو میرا دل کر رہا تھا جیسے اسی وقت میرے پر نکل آئیں اور میں پلک جھپکنے کے ساتھ ہی اڑ کر دبئی جا پہنچوں۔

(جاری ہے)

ادب شناس 03

اداره

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

گزشتہ ماہ سے ایک نیا سلسلہ "ادب شناس" شروع کیا گیا ہے۔ یہ نیا سلسلہ جو آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی دے گا۔ ہر ماہ کسی ایک مشہور مصنف کی تحریر کا اقتباس دیا جائے گا۔ آپ ذہن پر زور دیں، اندازہ لگائیں کہ یہ اقتباس کس معروف مصنف کے قلم کا شہکار ہے۔ اس اعادہ سے تحریر شناسی پر عبور حاصل ہوتا رہے گا۔ درست جواب بھیجنے والے قاری کو چھ ماہ تک "سرگزشت" اعزازی طور پر بھیجا جائے گا۔ درست جواب ہمیں 30 دسمبر 2018ء تک موصول ہو جائے۔ تاہم ایک سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتہ کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اس ماہ کا اقتباس

اخبارات یہاں بارہ بجے سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری [illegible] سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرے میں آتا ہے۔ جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی۔ لیکن پھر [illegible] چونک اٹھتا۔ جیلر آتا تھا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار [illegible] پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا۔

ادب شناس 01 کا جواب

یہ اقتباس سعادت حسن منٹو کی تحریر "عصمت چغتائی" سے لی گئی ہے۔

آج سے تقریباً ڈیڑھ برس پہلے جب میں بمبئی میں تھا۔ حیدرآباد سے ایک صاحب کا ڈاک کا پرچہ موصول ہوا۔ مضمون [illegible] اس قسم کا تھا۔

"یہ کیا بات ہے کہ عصمت چغتائی نے آپ سے شادی نہ کی؟ منٹو اور عصمت اگر یہ دو ہستیاں مل جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا مگر افسوس کہ عصمت نے شاہد سے شادی کر لی اور منٹو..."

انہی دنوں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ میں اس میں شریک نہ تھا لیکن حیدرآباد کے ایک پرچے میں اس کی روداد دیکھی جس میں یہ لکھا تھا کہ وہاں بہت سی لڑکیوں نے عصمت کو گھیر کر یہ سوال کیا۔ "آپ نے منٹو سے شادی کیوں نہ کی؟"

ادب شناس 01 کا یہ سوال ہمارے قارئین کے لیے بہت آسان ثابت ہوا ہے کیونکہ ڈھیر سارے جوابات بالکل صحیح تھے، مجبوراً قرعہ اندازی کرنی پڑی۔

اس قرعہ اندازی میں انور یوسف زئی، اسلام آباد کا نام نکلا ہے، انہیں 6 ماہ تک سرگزشت اعزازی طور پر ارسال کیا

جائے گا۔

ڈھیر سارے جوابات دیر سے آئے اس لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ ادب شناس 02 کا جواب اگلے شمارے (مارچ) میں دیا جائے گا۔ اسی طرح ادب شناس 03 کا جواب اپریل کے شمارے میں تاکہ دیر سے آنے والے جوابات بھی شامل ہو جائیں۔

کراچی سے سدرہ بانو ناگوری، واصف احمد، نعیم الدین، مورا برار حسین، فرقان اکبر، زرینہ آفاق، فرید حسن، اظہر اقبال، سکندر خان، فصاحت حسین، عبدالکریم، ولی شاہ، فصیح الدین سہروردی، عابد حسین مظہری، مالک قہسوانی۔ لاہور سے شاکر حسن، ضیاء الدین انصاری، سعدیہ بٹ، اشفاق حسین، عمر اسلم، دیدار حسن خان، حمید اشرف۔ جھنگ سے امیر الاسلام، اکبر علی، نعمان ظہیر، اصغر حسن، نسیم احمد۔ حیدرآباد سے ملک فیضان، سردار حسین، فرید الدین، خالد شیخ، وقار اکبر، قیصر حسن۔ کوئٹہ سے اطہر حسین، فیض محمد، نادر علی چنگیزی، کمال الدین، اصغر عباس۔ پشاور سے ضیاء الحق [illegible] خان، جمال حسن زکی، فاروق احمد، واصف خان۔ شیخوپورہ سے عزیز الحسن، سعید مصطفی، عدنان آفریدی، بختاور بھٹ، افضال [illegible] سے عمر مقصود، اطہر یونس، حسن عالم۔ فیصل آباد سے عبادت حسین، محمد یاسین، نعیم الدین فاروقی، گل باز خان۔ ہنگو سے [illegible] خان، مجاہد اکبر، مصطفی خان، ذیشان طوری، عنایت ہاشمی۔ راولپنڈی سے ارباب خان، ذیشان خالق، زاہد علی۔ گلگت سے حماد احمد۔ اسلام آباد سے فدا حسین، منظر علی، فہد قریشی، نازنین شاہ، حسن ابدالی۔ واہ کینٹ سے شفیق بھٹی، نصیر احمد گجراتی، بیگم انوار ملک، [illegible] الاسلام۔ سرگودھا سے اشفاق رند، اشتیاق قمر، سبین خلیل، مظفر علی خان۔ راجن پور سے افضال احمد، کاظم علی۔ بھکر سے محمد عارف قریشی۔ ڈی آئی خان سے ذیشان فرحت، کاظم طٰہٰ، حسن الیاس۔ ڈی جی خان سے امیر حسن، ہارون محمد بادشاہ، علی اوسط شاہ، سہیل بٹ۔ [illegible] سے آصف قریشی، سرفراز بٹ، احمد پراچا، ظفر احمد۔ وزیر آباد سے اسرار خان اچکزئی، ناصر ساند، آس محمد۔ ساہیوال سے قمر [illegible] اقبال، آصف علی پوتا، نازش سلطان خان۔ جہلم سے اوسط زیدی، نگار حسن، زویا مصطفی، اختر عباس، داروغہ خان۔ چیچہ وطنی سے [illegible] امام، سلطانہ فرید۔ روہڑی سے اعظم شہباز، نیاز احمد۔ پسرور سے وسیم خان۔ لالہ موسیٰ سے امیر حسن۔ میرپور خاص سے [illegible] بٹ، نوید ظفر۔ لیہ سے بدر بھٹی۔ ایبٹ آباد سے شہباز احمد۔ حافظ آباد سے ہارون خان، تہذیب الحسن، جمیل بخش، عرفانہ صدیقی۔ بہاولپور سے حسن عباس، کشف احمد۔ بہاولنگر سے ناہید سلطانہ۔ جیکب آباد سے وسیم نیازی۔ راجن پور سے شیراز امجد۔ کراچی سے سالار خان، آفتاب حسن، شفاعت حسن، نہال قیوم، محسن اختر بلوچ، شوکت علی ابڑو، نادرہ بانو، نسیم .... سلطان احمد، نوشین اختر، زاہد حسین، فلک بانو، نازش اختر، ارباز خان، سید عباس رضوی۔ نادر علی۔ اٹک سے نزاہت افشاں۔ شاہین چنگیزی، ضیاء اللہ خان، فیضان ملک، آذر فاروقی، ابرار احمد، یاسین بٹ، نصر طفیل، شاکر علی، احسن قلندری فیضان، سعد حسن۔ فیصل آباد سے فیض احمد، ناصر حسین، ارباب یوسف زئی، شریف خان، عزیز خان آفریدی۔ ہنگو سے ملک فیض۔ شیخوپورہ سے علی اختر، اطہر احمد صدیقی، ضیاء کریمی۔ راولپنڈی سے رملہ حسن خان، انیلا جہاں، عاصم حسن، فوزیہ تنویر۔ اسلام آباد سے فریدہ افتخار، کائنات بتول، سعدیہ کاشف۔ واہ کینٹ سے انیلا قیوم، آصفہ انصاری، حمید نیازی، عذرا اطہر۔ حیدرآباد سے آصف حسن، شاوار زیدی، کلیم الدین۔ چنیوٹ سے لیاقت جعفری، محمد نثار۔ سرگودھا سے انعام شیخ۔ راجن پور سے عمر حیات۔ مظفر گڑھ سے محمد عمر۔ منچن آباد سے آصف خان، شبیر علی۔ ڈی آئی خان سے رحیم ابڑو۔ حیدرآباد سے شمیر خان اچکزئی۔ ہنگو سے نصیر اختر۔ ملتان سے نیاز حسن۔ کوٹلی سے اعجاز احمد۔ وزیر آباد سے محمد شفیق۔ ساہیوال سے نظیر حسن۔ چارسدہ سے ناصر خان۔ جہلم سے ایم ایس سید، زاہد خان، دلبر خان۔ کوہاٹ سے طلحہ خان، نظیر شاہ، عباس اچکزئی۔ چیچہ وطنی سے ناصر عباس۔ خوشاب سے احمد علی۔ منچن آباد سے اطہر حسین، ثمینہ خان۔ روہڑی سے زاہد بزنجو، زرینہ جونیجو۔ پسرور سے شاہد علی۔ مشرف پور سے عدنان۔ لالہ موسیٰ سے فرحت جان، بابر زمان خان۔ حضرو سے فرید یار خان، اظفر خان، شبیر خان۔ بی سے ہیت خان اچکزئی۔ میرپور خاص سے راؤ سکندر علی، مومن خان، فصاحت اللہ سہروردی، شاہد پرویز۔ لیہ سے مشرف الدین، عبدالکریم۔ ایبٹ آباد سے اعجاز حسن خان، کاظم شاہ، کاشف حسن۔ حافظ آباد سے محمد ابراہیم، عقیل چٹھہ، فصیح الدین۔ پشاور سے داروغہ خان، سلطان محمد، امتیاز حسین۔ جھجھ سے افضال احمد۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے محمد سیف الدین۔ لیہ سے احمد حفیظ، اسد اکبر، فصیح خان۔ حیدرآباد سے زوفشاں پروین، سردار خان، صنم کوثر، عنایت مسیح، فہیم درانی، لیاقت علی، پرویز علی، نعیم انصاری، ملک فیروز۔ ڈیرہ غازی خان سے کلیم الدین، نعمان سار، محمد سیف۔ بہاولپور سے احتشام حسن، عارف احسان، محسن خان۔ بہاولنگر سے سید شانی، شہنشاہ احمد۔ سرگودھا سے عابدہ اطہر، محمد شفیق، اسماعیل ڈرائیور۔ جیکب آباد سے فہیم الدین احمد، کمال احمد جونیجو، عارف احمد۔

ادب شناس 03 — 28 فروری 2019

میرے خیال میں یہ تراشہ مصنف .... کی تحریر سے لیا گیا ہے۔

....

....

....

کوپن کے ہمراہ جوابات مورخہ 28 فروری 2019ء تک موصول ہونا ضروری ہے

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

چسپاں

سرورق دیکھ کر کوئی ایسا شعر منتخب کریں جو پوری طرح چسپاں ہو جائے۔ فیصلہ قارئین کریں گے کہ یہ شعر سرورق پر [illegible] ہوتا ہے یا نہیں۔ شعر الگ کاغذ پر صاف صاف لکھا ہو۔ ساتھ شاعر کا نام بھی ہو۔

نام ....

پتا ....

....

....

فون نمبر: ....

03

چسپاں

قارئین

فیضان محمد.........اٹک

رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لو تھر تھراتی رہی رات بھر

(شاعر: نامعلوم)

ابریز نوید.........سرگودھا

کسے معلوم تھا فصل بہاراں
خود اپنے ساتھ لائے گی خزاں بھی

(شاعرہ: رضیہ پروین)

نفیس احمد.........فیصل آباد

کوئی رہ رہ کے یاد آرہا ہے
دل مضطرب ہے کہ گھبرا رہا ہے

(شاعرہ: مدینہ بیگم)

نسیم اللہ خان.........ایبٹ آباد

نہ اپنے درد کا درماں ہی کر سکی اب تک
نہ عہد رفتہ کے لمحے پگھل سکے اس سے
چھپائے رکھتی ہے وہ آج بھی مری تصویر
مرے خطوط ابھی تک نہ جل سکے اس سے

(شاعر: کفیل آزر)

رضی شہاب.........حیدرآباد

اس کی ہنسی میں چھپے درد کو محسوس تو کر
وہ تو یونہی ہنس ہنس کے خود کو سزا دیتا ہے

(شاعر: نامعلوم)

نزہت جبیں.........فیصل آباد

وقت بہا کے لے جاتا ہے نام و نشاں مگر
کوئی ہم میں رہ جاتا ہے اور کسی میں ہم

(شاعرہ: گل افشاں)

نادر علی.........جھنگ

ازل سے ہجر زدہ شوق دید سے بیکل
تمہاری راہ میں نظریں بچھا کے بیٹھ گئے

(شاعر: ناصر زیدی)

ناہید عثمانی.........حیدرآباد

آنکھوں سے میری ہو کے رہا سوز غم نہاں
ہر چند دل میں آتش نہاں رہی

(شاعر: صالحہ تجلی)

عنایت مسیح.........کراچی

بھولنے کی انہیں کی تو کوشش بہت
یاد دل سے نہ جائے تو میں کیا کروں

(شاعر: زیب بھروی)

امجد جعفری.........عجمان، یو اے ای

چھن گئے غم ہوئی رخصت میری زندہ دلی
ہونٹ اس دن سے ہیں میرے تبسم آشنا

(شاعر: نسیم سحر)

نوروز علی.........کراچی

جاؤ بھی اب نہ دو مجھے ...
مر جائیں گے تڑپ کے تمہاری بلا ...

(شاعر: ...)

آفتاب احمد نصیر اشرفی.........کراچی

یہ شکل حسن کی ہیبت سے زرد ہے کہ نہیں
یہ آنکھ عشق کی وحشت سے لال ہے کہ نہیں
پڑے پڑے درودیوار دیکھنے والے
تیرا یہاں کوئی پرسان حال ہے کہ نہیں

(شاعر: میر احمد نوید)

فیصل جاوید.........مظفر گڑھ

بدن کے کرب کو وہ بھی سمجھ نہ پائے گا
میں دل میں روؤں گی آنکھوں میں مسکراؤں گی
وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے
میں کس سے روٹھ سکوں گی کسے مناؤں گی

(شاعرہ: پروین شاکر)

قاضی شرف الدین حیدی.........لاہور

نظر ملائی ہے ساقی تو لاج بھی رکھ لے
تمام عمر نظر میں خمار رہنے دے

(شاعر: نامعلوم)

اسماء توقیر.........چنیوٹ

ہجر کی ماری ان آنکھوں کی تمہید مبارک
جن آنکھوں میں تم بستے ہو ان آنکھوں کو عید مبارک

(شاعر: نامعلوم)



مرزا انیس بیگ.........حیدرآباد

اب کیا کہیں یہ سنگ دلی ہے کہ بے حسی
دل ہے غموں کی زد پہ مگر آنکھ نم نہیں

(شاعر: معلوم)

شاہد خان.........کراچی

تیرے تصورات سے تنہائیوں میں بھی
محسوس کر رہا ہوں کہ اک انجمن ہوں میں

(شاعر: رعنا جگی)

نازیہ شبیر.........لاہور

ایسی تنہائی تو میں نے کبھی سوچی بھی نہ تھی
کاش آجائے کوئی دل ہی دکھانے کے لیے

(شاعر: ساغر اعظمی)

آصف جاہ.........کراچی

وہ ہم سے دور جائیں گے جہاں بھی
ہماری آہ پہنچے گی وہاں بھی

(شاعر: نامعلوم)

ڈاکٹر ادیب عبدالغنی شکیل.........ملتان

کھول بال پریشاں نہ کرو روح کو تم
اے میرے سوگ کے کمرے میں سنورنے والے

عبدالحکیم شمر.........کراچی

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

آفتاب احمد.........حیدرآباد

کیا کہیں گھر گئے کن بلاؤں میں ہم
کچھ محبت کے غم کچھ زمانے کے غم

(شاعر: باوا کرشن گوپال مغموم)

ناہید عثمان.........لاہور

کبھی جو ذہن میں آتا ہے واقعہ کوئی
تو دل میں ایک انوکھی کسک سی ہوتی ہے

(شاعر: کفیل آزر)

ارباز خان.........کوئٹہ

شب غم سوزن صبر و رضا سے
رفو میں نے بھی چاک دل کیا ہے

(شاعر: [illegible])

ریاض الرحمٰن.........پشاور

درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

(شاعر: نامعلوم)

چسپاں 01 کا جواب

نازیہ شبیر لاہور کے شعر

ایسی تنہائی تو میں نے کبھی سوچی بھی نہ تھی
کاش آجائے کوئی دل ہی دکھانے کے لیے

اس شعر کو 130 افراد نے ٹائیٹل پر چسپاں قرار دیا ہے

زندگی کوہِ گراں

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

انسان کی زندگی بھی کسی ناول کسی فلم سے کم نہیں۔ عذراکے ساتھ جو کچھ ہوا اس پر جو گزری یہ کسی فلمی کہانی سے کم نہیں۔ انسان کا دشمن انسان ہی ہوتا ہے۔ خدا کا خوف جب دل سے ختم ہو جاتا ہے تو ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ قسمت کس طرح قدم قدم پر قیامت ڈھاتی ہے یہ آپ کو عذراکی زندگی میں نظر آئے گی۔

غلام رضا جعفری (کراچی)

آئینہ گرا اور چھناکے کی آواز کے ساتھ کرچیوں میں بدل گیا۔ چھوٹا سا آئینہ اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے میں اپنی صورت دیکھ رہی تھی کہ آئینہ پھسل گیا تھا بلکہ میں نے خود چھوڑ دیا تھا اس لیے کہ آئینہ سچ بولتا ہے اور سچ کڑوا ہوتا ہے۔

امی کی زبانی کئی بار یہ سن چکی ہوں کہ جب میں پیدا ہوئی تھی تو بہت خوب صورت تھی۔ رنگت گلابی، آنکھیں بڑی بڑی، ناک ستواں، دہانہ چھوٹا لیکن جب آئینے کے روبرو ہوتی ہوں تو ماں کی بتائی ہوئی ہر بات غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ رنگت کالی، آنکھیں چھوٹی، دہانہ اتنا بڑا کہ مسکرانے پر پوری بتیسی نمایاں ہو جائے، ناک بھی چپٹی دکھائی دیتی ہے۔

جب بھی چھوٹے سے آئینہ میں اپنا دیدار کرتی تو آئینہ منہ چڑاتے ہوئے کہتا۔ ”تیری ماں تجھے کیا کہتی ہے اور حقیقت کیا ہے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔“

”اور ہاں! امی اکثر مجھے یہ بھی کہتی ہیں کہ میں اتنی دیر سے پیدا کیوں ہوئی، امی اور ابو کی شادی کے پندرہ سال بعد میری پیدائش ہوئی، لو بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے۔ کون اپنی مرضی سے پیدا ہو سکتا ہے یا مر سکتا ہے۔“

میری پیدائش کے آٹھ سال بعد میرے چھوٹے بھائی نادر کی آمد ہوئی۔ وقت گزرتا رہا اور میں جوانی کی دہلیز پر پہنچ گئی۔

جب سے ہوش سنبھالا امی ابو کو بحث و مباحثہ کرتے دیکھا مگر ان دنوں ان کی بحث کا موضوع میں تھی۔ وہ دونوں کمرے سے باہر چھوٹے سے برآمدے میں اپنی اپنی چارپائیوں پر ہوتے، میں اور نادر کمرے میں ہوتے۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ میں گہری نیند سو جاتی ہوں اور ان کی باتوں سے بے خبر رہتی ہوں لیکن میں ان کی ہر بات سن رہی ہوتی تھی بس اپنے آپ کو سویا ہوا ظاہر کرتی۔

”اللہ نے اتنے برسوں بعد اولاد دی بھی تو بیٹی، اگر لڑکا ہوا ہوتا تو کیا اچھا ہوتا، بڑھاپے کا سہارا ہوتا۔“ امی نے اتنی زور سے آہ بھر کر کہا کہ جیسے وہ سنگدل بدنصیب ہیں۔

”سب سے بڑا سہارا تو اللہ کا ہوتا ہے نیک بخت۔ شکر ادا کر کہ اللہ نے اولاد دے دی، اگر نہ ہوتی تو کیا کر لیتے۔ پچیس سال ہو گئے دلدار حسین کی شادی کو۔ مال، دولت، کاروبار نوکر چاکر سب کچھ ہے مگر اولاد سے محروم ہے۔“ ابو نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”یہ معاملہ ہنسی مذاق میں ٹالنے والا نہیں ہے۔“ امی نے فکرمندی سے کہا۔ ”عذرا کے ہاتھ پیلے کرنے کی سوچو۔“

”صبح سلیم اسٹور سے پیلا رنگ لا کر اس کے ہاتھوں پر مل دوں گا۔“ ابو نے کہا تو امی کو جیسے ان کی بات پر غصہ آ گیا۔

”تو کیا ساری عمر گھر میں بٹھا کر رکھو گے۔“

”میں نے ایک دو لوگوں سے بات چلائی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی خوشخبری مل جائے گی۔ اب تم سو جاؤ۔“ ابو نے کہا اور چارپائی کے چرچرانے کی آواز نے بتا دیا کہ ابو نے کروٹ لے کر منہ دوسری طرف پھیر لیا ہے۔

”میں اتنے برسوں بعد پیدا ہو کر بھی امی ابو کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی تھی۔ اگر اللہ نے مجھے نہ پیدا کیا ہوتا تو کیا ہوتا۔“ میں نے سوچا اور نہ جانے کتنی دیر تک ان ہی سوچوں میں غلطاں رہی اور پھر پتا نہیں کس وقت آنکھ لگ گئی۔

صبح آنکھ کھلنے میں ذرا دیر ہوئی تو نادر نے جھنجوڑ دیا۔ وہ ایسا ہی کرتا تھا۔ اسے ناشتا کرنے کی بڑی جلدی ہوتی تھی۔ وہ ساتواں سال عبور کر چکا تھا۔ میں جاگ کر بھی دیر تک پڑے رہنا چاہتی تھی مگر نادر کی ضد نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں برآمدے میں بنے کچن میں آ گئی۔

صبح ہی صبح سرد ہوا چلنے لگی تھی۔ امی ابو ابھی تک بے خبر سو رہے تھے۔ امی کے خراٹوں کی ہلکی ہلکی آواز گونج رہی تھی۔ ہوا ذرا تیز چلی تو دھول میرے چہرے پر پڑی اور میں نے یکدم دوپٹا اپنے منہ پر پھیلا لیا۔

”واہ باجی کھڑے کھڑے دلہن بن گئی ہو۔“ نادر نے کہا جو امی کی چارپائی پر بیٹھا تھا۔

میں نے اس کی بات سن کر بھی اَن سنی کر دی۔ میں چائے تیار کرنے لگی تو نادر میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”چائے تیار ہو گئی۔“ میں نے رات کی روٹی توے پر گھی میں تلتے ہوئے نادر سے کہا۔ ”ابو کو جگاؤ۔ کام سے دیر نہ ہو جائے۔“

ابھی میں نے یہ کہا ہی تھا کہ ابو کے کھنکھارنے کی آواز آئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ شاید جاگ رہے تھے۔ انہوں نے میری بات سن لی تھی۔

”اٹھو بھئی…… دن چڑھ آیا ہے۔ سوتی رہو گی کیا سارا دن؟“ ابو نے امی سے کہا اور منہ ہاتھ دھو کر اپنی چارپائی پر جا بیٹھے۔ ابو ناشتا کر کے اپنے کام پر چلے گئے۔ ناشتے کے بعد میں برتن دھونے بیٹھ گئی۔ امی نے چادر سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں مارکیٹ جا رہی ہوں سبزی لینے۔ مجھے ذرا دیر ہو جائے گی۔ خالہ بلقیس کے ہاں جاؤں گی۔“

نادر بھی باہر کھیلنے چلا گیا۔ پڑھائی میں تو اس نے کبھی توجہ نہ کی تھی۔

امی ابو اکثر میرے سلسلے میں پریشان ہی رہا کرتے تھے۔ ان کو میری رخصتی کی فکر لگی ہوئی تھی۔ امی اتنی صبح صبح

جو خالہ بلقیس کے گھر گئی تھیں یقیناً میرے رشتے کی بات ہی کرنے گئی ہوں گی۔ خالہ بلقیس نے کئی لڑکیوں اور لڑکوں کے رشتے کرائے تھے۔ میری شادی کی طرف امی کا دھیان بھی اسی نے دلایا تھا۔ اس نے چند ایک لڑکوں کی تصویریں بھی دکھائی تھیں جو کسی نہ کسی وجہ سے امی ابو کو پسند نہ آئے تھے ورنہ خالہ بلقیس نے تو بہت کوشش کی تھی کہ ان میں سے کسی ایک سے میری بات پکی ہوجائے۔

میری پیدائش اسی گھر میں ہوئی تھی۔ بچپن میں تو مجھے نہیں پتا کہ ابو کیا کرتے تھے لیکن جب سے میں نے ہوش سنبھالا تو ابو کو جوڑیا بازار میں ایک پنساری کی دکان پر جاتے دیکھا جہاں وہ ہاون دستہ پر جڑی بوٹیوں کی کٹائی پسائی کرتے۔ اکثر امی ابو جب آپس میں گزرے اوقات کا ذکر لے کر بیٹھتے تو پتا چلتا کہ ان کو غربت نے ایک عرصے سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ امی ابو اپنے ماضی اور حال میں درپیش مسائل پر پریشان ہی رہتے تھے۔ ان کی غربت کی آگ میں میری جوانی نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

مجھے اسکول جانے کا بہت شوق تھا اور امی ابو بھی چاہتے تھے کہ میں زیادہ سے زیادہ پڑھ لوں۔ انتہائی غربت کے باوجود وہ میری تعلیمی ضروریات جیسے تیسے پوری کررہے تھے لیکن شہر میں کمسن لڑکیوں کے ساتھ ہونے والے غیر اخلاقی واقعات نے انہیں چوکنا کردیا تھا، کچھ عرصہ تو امی مجھے اسکول چھوڑنے اور لانے کا کام بھی کرنے لگیں لیکن جب ہمارے ہی اسکول کی ایک لڑکی ہندرہ کو اسکول سے آتے ہوئے اغوا کر کے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تو اس خوف کے پیش نظر مجھے اسکول سے ہٹا دیا گیا۔ میں نے اسکول نہ چھوڑنے کی ضد بھی نہ کی۔ اپنی اور اپنے والدین کی تذلیل سے بچنے کی خاطر چپ چاپ گھر بیٹھ گئی۔ میں صرف پانچ جماعتیں ہی پڑھ سکی تھی اور جب سے اب تک میرا گھر بسانے کی کوشش جاری ہے۔ کبھی کبھی اپنے آپ پر بہت غصہ آتا کہ میں خوب صورت کیوں نہیں ہوں۔

میری شادی کے حوالے سے امی ابو میرے سامنے تو کوئی بات نہ کرتے تھے۔ وہ اکثر رات کو ہی میری شادی کا مسئلہ چھیڑتے تھے۔ ان کے لبوں سے بے بسی کی آہ اتنی زور سے نکلتی کہ اندر کمرے میں میرے کانوں تک پہنچ جاتی اور میں اپنے دل سے اٹھنے والی آہ کو دبالیتی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی۔ ”بابا! میں آپ پر بوجھ ہوں۔ شاید قدرت نے میرے نصیب کا مرد اس دنیا میں نہیں اتارا ہے۔“

☆☆☆

برتن دھو کر فارغ ہوئی۔ جھاڑو اٹھا کر کچے صحن میں پھیرنے کے لیے جھکی ہی تھی کہ اماں گھر میں داخل ہوئی اور پکارنے لگی۔ ”عذرا......عذرا!“

”کیا ہوا اماں؟“ میں جھاڑو رکھ کر اماں کی طرف بڑھی۔

”یہ دیکھ کیا ہے؟“ اماں نے میری طرف ایک لفافہ بڑھایا۔ میں نے وہ لفافہ ماں کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔

لفافے میں ایک نوجوان کی تصویر تھی۔ میں نے چند لمحے تصویر کو بغور دیکھا پھر واپس ماں کو تھمادی۔

”تجھے پسند ہے؟“

”ہاں ماں! مجھے پسند ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر اس طرح کہا کہ جیسے واقعی ... جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے وہ لڑکا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ بہت زیادہ خوب صورت نہ سہی کم از کم میرے جیسا تو ہوتا۔ اس کی تعریف میں آپ کو اتنا بتانا ہی کافی ہوگا کہ وہ افریقی نژاد لگتا تھا۔

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے پسند کر ہی لیا کیوں کہ میرے ماں باپ چاہتے تھے کہ میں جلد از جلد اس گھر سے چلی جاؤں۔

میں کام میں جت گئی۔ دل بہت پریشان تھا۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ واقعی میں ماں باپ پر بوجھ ہوں۔ میرے دل میں عجیب عجیب وسوسے آنے لگے تھے۔ دل میں دکھ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ آنکھوں سے دو قطرے گرے اور صحن کی کچی زمین میں جذب ہوگئے۔

☆......☆

دن ڈھل چکا تھا۔ امی ابو حسب معمول برآمدے میں بچھی اپنی اپنی چارپائیوں پر براجمان تھے۔ میں نے چائے تیار کر کے ان کے سامنے رکھی امی نے خوشی خوشی وہ تصویر ابو کی طرف بڑھائی۔ ”یہ دیکھو عذرا کے لیے بر دیکھا ہے۔“

ابو کے چہرے پر بھی خوشی چھا گئی۔ ”اچھا!“ انہوں نے کہا اور تصویر لے کر دیکھنے لگے۔ میں نے دیکھا ابو کے چہرے پر یک دم سنجیدگی چھا گئی۔ انہوں نے نظر جما کر امی کی طرف دیکھا۔ امی ان کے جواب کی منتظر تھیں۔ میں چپ چاپ کمرے میں چلی گئی۔

”بیٹی سے ملنے کے لیے افریقا جاؤ گی؟“ ابو نے ...

”کیا مطلب؟“ امی نے حیرت سے پوچھا۔

”کوئی اچھا، خوب صورت رشتہ دیکھو میری بیٹی کے ...“ ابو نے کہا۔

”اس میں کیا برائی ہے؟ اچھا خاصا تو ہے۔ کھاتے کمانے کا ہے۔“

”یہ تو افریقا کا بندر معلوم ہوتا ہے۔“ ابو نے کہا تو بے اختیار مسکراہٹ میرے لبوں پر آگئی۔

”اپنا کاروبار ہے اس کا، ہماری عذرا خوش رہے گی۔ کسی چیز کی کمی نہ ہونے دے گا ہماری بیٹی کو۔“ امی نے اس کی حمایت میں کہا۔

”کیا کاروبار ہے اس کا؟“ ابو نے پوچھا۔

”ارے آپ بھول گئے اس کو۔ کلو برف والے کا بھائی ہے۔“ امی نے کہا۔

”وہ جو ہکلا کر بات کرتا ہے جس کی ایک ٹانگ پولیو زدہ ہے۔“ ابو نے کہا۔

”ہاں ہاں وہی، وہی ماشاء اللہ سے۔“ امی نے خوشی سے کہا۔

”ارے تمہارا دماغ خراب ہے کیا۔ بیٹی کو جیتے جی جہنم میں جھونک رہی ہو۔“

”... اپنی بیٹی سے دشمنی کروں گی۔“ امی نے چڑ کر کہا۔

”یہ دشمنی نہیں تو اور کیا ہے۔ ایک شادی شدہ سے باندھ رہی ہو بیٹی کو۔“ ابو نے ... سے کہا۔

”اولاد کی خاطر تو وہ دوسری شادی کررہا ہے۔ آدھی جائیداد اس کے نام لکھ دے گا ... سونا دے گا اسے اور کیا چاہیے ہماری عذرا کو۔“ امی نے ...

”سوکن پہ جائے گی تو کیا سکھی رہے گی؟“ ابو نے افسردگی سے کہا۔

”جب کوئی بر نہیں مل رہا تھا تو پریشان تھے۔ اب بر مل گیا ہے تو بھی تمہارا دل مطمئن نہیں ہو رہا۔“ امی نے کہا۔

”کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری بچی......“ ابو نے اس سے آگے کچھ نہ کہا۔ ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ ان کے سسکنے کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو میرا دل بھی بھر آیا۔ میری وجہ سے میرے ماں باپ بہت پریشان تھے۔

”اور پھر ہماری عذرا کون سی خوب صورت ہے، سچ پوچھو تو کئی لوگوں نے تصویر دیکھتے ہی انکار کردیا ہے۔ ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ لڑکی غریب ہو لیکن خوب صورت ہو۔ گوری چٹی۔“ امی نے کہا۔

تصور ہی تصور میں آئینہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اپنی سیاہ صورت دیکھ کر اپنے آپ سے نفرت سی ہوگئی۔ دل میں ایسا ملال ہوا کہ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اگرچہ باتیں کرنے والی میری ماں ہی تھی پھر بھی مجھے اچھے تئیں تذلیل محسوس ہو رہی تھی۔ ڈپریشن نے مجھے ساری رات سونے نہ دیا۔ بے شمار باتیں دماغ میں گھومتی رہیں۔ کوشش تو بہت کی کہ کچھ دیر ہی سہی آنکھ لگ جائے۔

اس وقت رات کا نجانے کیا وقت ہوگا۔ جب میں باتھ روم جانے کی غرض سے کمرے سے باہر نکلی تو ابو جاگ رہے تھے۔ وہ بیٹھے سوچوں میں گم تھے۔ شاید ان کی پریشانی کی وجہ بھی یہی کچھ تھی۔ میں ابو کے پاس بیٹھ گئی۔ میرے بیٹھنے پر وہ یکدم چونک پڑے۔

”کیا ہوا ابو؟“ میں نے ان کے قریب ہوکے پوچھا۔

وہ میرے چہرے کو چند لمحوں بغور دیکھتے رہے اور پھر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے بولے۔ ”کچھ نہیں بیٹا۔“ ابو مجھے بیٹا ہی کہا کرتے تھے۔ اکثر وہ کہتے۔ ”تم میری بیٹی نہیں بیٹا ہو۔“

میں نے ان کی آواز میں لرزش اور طبیعت میں بے چینی محسوس کی۔

”ابو! میں آپ پر بوجھ ہوں؟“

”نہیں ہم تمہیں اپنے گھر سے تمہارے گھر بھیجنا چاہتے ہیں۔ لڑکیاں ماں باپ کے گھر میں مہمان ہوتی ہیں۔“

”ابو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مہمان کو زبردستی گھر سے نکالا جاتا ہو۔“

ابو مسکرا دیے۔ ”مہمان کو تو نکالا بھی جاسکتا ہے مگر گھر کے مالک کو نہیں۔“

”کیا مطلب ابو۔“ میں نے پوچھا۔ واقعی میں ان کی بات کو نہ سمجھ پائی تھی۔

”میری بیٹی تو اس گھر کی مالک ہے ناں۔ ہم کون ہوتے ہیں بھلا اسے نکالنے والے۔“ ابو نے کہا اور ایک بار پھر میرے سر پر ہاتھ دھرا۔

''مگر امی جو......'' ابو نے میری بات کاٹ دی۔
''ہاں وہ ذرا جذباتی ہو جاتی ہے۔ اس کا انداز اپنا ہے۔ دل پر مت لیا کرو اس کی باتوں کو۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر اسی طرح گھبرا جاتی ہے۔ جاؤ سو جاؤ۔'' ابو نے کہا تو میں پہلے واش روم گئی اور پھر کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ ابو بھی اس دوران لیٹ گئے تھے۔ امی تو ویسے ہی بے خبر سو رہی تھیں پھر نجانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح امی نے جگایا تو میری آنکھ کھلی۔ بہت دیر تک سوئی۔ اتنی دیر تک میں سوئے رہنے کی عادی نہ تھی۔ رات ابو کی باتوں سے جو دل مطمئن ہو گیا تھا۔ ناشتا بھی امی نے تیار کر لیا تھا ورنہ امی تو مجھے جگاتے ہوئے کہتیں۔ ''چھوڑو یہ دیر تک سوئے رہنے کی عادت۔ ایسی حرکتیں کرو گی تو ساس چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دے گی۔ لڑکیوں کو صبح سویرے اٹھنا چاہیے۔ گھر کے کام کاج میں جتے رہنا چاہیے۔''

آج میں اپنے آپ کو فریش محسوس کر رہی تھی۔ ابو بھی منہ ہاتھ دھو کر تیار بیٹھے تھے۔
''آج آپ اتنی صبح کیسے جاگ گئے ابو۔'' میں نے پوچھا۔
''گیارہ بج رہے ہیں۔ میں آج کام سے بہت لیٹ ہو گیا ہوں۔'' ابو نے کہا اور مجھے بلا کر اپنے پاس چارپائی پر بٹھا لیا۔ ''آج ہم باپ بیٹی ایک ساتھ ناشتا کریں گے۔''

ابو کی اس بات پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں آپ ہی آپ اترانے لگی۔ امی نے ہمیں ناشتا دیا اور اپنے لیے ناشتا لے کر اپنی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

ابو نے جلدی جلدی ناشتا کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''آج تو میں بہت ہی لیٹ ہو گیا ہوں۔'' ابو نے کہا اور دروازے کی طرف چل پڑے۔
''اپنا خیال رکھنا، دیکھ بھال کر سڑک پار کرنا، طبیعت ذرا سی بھی بگڑتی ہوئی محسوس کریں تو فوراً کام چھوڑ کر گھر آ جانا۔'' امی نے رٹے رٹائے جملے دہرائے۔ امی روز ہی ابو کو کام پر جاتے وقت یہی ہدایات دیا کرتی تھیں۔
''اچھا اچھا...... ماسٹرنی صاحبہ!'' ابو نے دروازے کے پاس رک کر مسکراتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئے۔ ابو کے جانے کے تھوڑی دیر بعد امی بھی اپنے کسی کام سے چلی گئیں۔

گھر میں اکیلی تھی کہ اچانک ہی کسی نے دروازہ اتنی زور سے کھٹکھٹایا کہ جیسے توڑ گرائے گا۔ میں برتن دھو رہی تھی۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ میرا دل دہل گیا۔ میں صابن والے ہاتھ دھوئے بغیر ہی تقریباً دوڑتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔
''کون...... کون ہے۔'' میں نے پردے کی اوٹ سے جھانکا۔ [illegible] والا پتا نہیں کون تھا۔ پھولی ہوئی سانس سے اس نے بتایا۔
''تمہارے ابو [illegible] پتا نہیں کیا ہوا۔ ادھر چوک میں گرا ہوا ہے۔'' اس نے گلی کے [illegible] پر چوک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
''کک...... کیا ہوا میرے ابو [illegible]'' اچانک خبر نے میرے جسم میں لرزش پیدا کر دی تھی [illegible] دھڑکن تیز ہو گئی۔
''یا اللہ خیر کر...... کیا ہو گیا ابو کو؟ گھر سے تو ٹھیک ٹھاک نکلے تھے۔'' یہ سوچتے ہوئے میں نے کمرے سے امی کی چادر اٹھائی، سر پر اوڑھی اور دروازے کی طرف بڑھی مگر صحن کے بیچ میں ہی رک گئی۔ ابو کی کہی ہوئی نصیحت یاد آ گئی تھی۔ ابو نے ایک دن کہا تھا۔ ''میں خاص طور پر تمہیں نصیحت کرتا ہوں اگر کوئی آ کر یہ کہے کہ تمہارے ابو کے ساتھ ایسا ہو گیا، ویسا ہو گیا یا پھر کوئی میرے ایکسیڈنٹ کی خبر دے کر تمہیں ساتھ چلنے کے لیے کہے تو خبردار مت جانا۔ آس پڑوس کے مردوں یا عورتوں کو اطلاع کرنا یا ان کو ساتھ لے لینا۔''

پڑوس میں نومی بھائی کا گھر تھا، انہیں بتا دوں یہ سوچا اور چادر اوڑھ کر ایک بار پھر دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے قریب پہنچی ہی تھی کہ یک دم دروازے کے دونوں پٹ کھلے اور نادر دوڑتا ہوا اندر آیا اور مجھ سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگا۔
''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ ابو کو...... پتا نہیں کیا ہوا چوک پر گرے پڑے ہیں۔'' اور میں نادر کے ساتھ چوک کی طرف چل پڑی۔ نادر مجھ سے چند قدم آگے تھا۔ میں تیز تیز چل کر اس کے برابر پہنچنے کی کوشش میں تھی کہ ایک جگہ گڑھے میں میرا پیر آ گیا۔ اگرچہ گڑھا چھوٹا سا تھا مگر پیر مڑ جانے کی وجہ سے میں آگے کی طرف گھٹنوں کے بل جا گری اور میرے منہ سے

بے اختیار چیخ نکل گئی۔ نادر نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور مجھے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے گھٹنوں پر کنکر چبھ گئے تھے۔ چند عورتیں میرے نزدیک آئیں۔ انہوں نے کھڑے ہونے میں میری مدد کی۔ مجھے سہارا دیا اور میں ان کے سہارے آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ بھیڑ کے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا...... میرے ابو کو...... کیا ہوا......'' اسی وقت ایمبولینس کی آواز سنائی دی۔
''ان کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔''
''کیا...... اٹیک......!'' میرے منہ سے اتنا ہی نکل پایا تھا۔ مجھے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ زمین، آسمان سب گھومتے ہوئے دکھائی دینے لگے تھے اور پھر مجھے ہوش ہی نہ رہا۔

ہوش آیا تو میری نظر خالہ بلقیس کے چہرے پر پڑی۔ وہ میرے سرہانے کھڑی میرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھیں۔
''خالہ...... خالہ...... ابو...... ابو...... میرے ابو......'' بے اختیار میرے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ میں اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔
''[illegible] رہو۔ سب خیریت ہے۔ تمہارے ابو ٹھیک ہیں۔'' خالہ نے کہتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ ہاتھ پر چبھن کا احساس ہوا تو میں نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ میری رگ میں [illegible] لگی ہوئی تھی۔ اوپر اسٹینڈ پر گلوکوز کی تھیلی لٹک رہی تھی۔ میں نے گردن گھما کر اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس وقت میں کسی کلینک میں تھی۔
''ابو کہاں ہیں؟'' میں نے خالہ سے پوچھا۔
''تمہارے ابو جناح اسپتال میں ہیں۔''
''اور...... امی......'' میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔
''وہ بھی تمہارے ابو کے پاس ہیں۔ تمہارے ابو کی طبیعت سنبھل گئی ہے جیسے ہی اور بہتر ہو گی وہ گھر آ جائیں گے۔'' خالہ نے تسلی دی۔
''اور نادر......!'' مجھے چھوٹے بھائی کا خیال آیا۔
''وہ ابھی پاس کھڑا تھا باہر گیا ہے ابھی آ جائے گا۔''

ڈسپنسر نے آ کر گلوکوز کی تھیلی چیک کی جو خالی ہو چکی تھی۔ اس نے میری نس سے سوئی نکالی اور بینڈ پلاسٹ لگا دیا۔ ڈاکٹر کی تجویز کردہ دواؤں کی پرچی خالہ بلقیس کے ہاتھ میں تھمائی اور گھر جانے کا کہہ کر چلا گیا۔ خالہ بلقیس نے ڈاکٹر کی فیس ادا کی۔ مجھے اسٹریچر سے اتارا اور سہارا دے کر کلینک سے باہر لایا۔ نادر جو پہلے سے ہی باہر کھڑا تھا اسے رکشا روکنے کے لیے کہا۔ رکشا روکنے میں ذرا دیر لگ گئی تھی۔ خالہ نے مجھے اپنے گھر لے جانے کو کہا تو میں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا اور اپنے گھر آ گئی۔ خالہ کچھ دیر ہمارے پاس رہی اور پھر دوا کھانے کا طریقہ اور پرہیز بتا کر چلی گئی۔ میں برآمدے میں ہی لیٹ گئی تھی۔ دن ڈھل چکا تھا۔

ابو کو دو دن جناح اسپتال میں رکھا گیا اور میں یہاں گھر میں بستر علالت پر رہی۔ نادر میری خدمت کرتا رہا۔ وہ گھر کے کام بھی کرتا رہا۔ وقت پر دوا پلاتا، دودھ [illegible] روٹی لاتا، چائے بناتا سب کچھ وہ کرتا رہا۔ جب کہ پہلے گھر کے کسی کام کو ہاتھ تک نہ لگاتا تھا۔
''دو دن ہو گئے چچا اور ماموں نے ہماری خبر بھی نہ لی۔'' نادر نے شکوہ کیا۔ ''میں نے فون پر ان کو اطلاع کر دی تھی۔'' نادر نے بتایا۔
''اچھا...... ابو کا بتایا تھا؟''
''ابو کا بھی بتایا۔ تمہارا بھی بتایا تھا کہ اس طرح باجی سڑک کے بیچ گر گئی تھی۔ دو تین دفعہ فون کیا تھا میں نے ان کو۔''
''اچھا۔'' اس کی اتنی سمجھ داری پر مجھے اس پر بہت پیار آیا۔ وہ میرے پاس ہی برآمدے میں چارپائی پر بیٹھا مجھے بتا رہا تھا۔
''کوئی ضروری کام پڑ گیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔
''باجی ایک بات بتاؤں۔''
''ہاں بتاؤ۔'' میں نے کہا۔
''یہ جو خالہ بلقیس ہے ناں۔'' اس نے کہا۔
''ہاں ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''کلینک میں تمہارے بارے میں دوسری عورتوں سے باتیں کر رہی تھی۔'' اس نے کہا۔
''کیا باتیں کر رہی تھی میرے بارے میں۔'' میں نے پوچھا۔
''یہی کہ عذرا ایسی سیاہ بخت ہے کہ اسے کوئی قبول ہی نہیں کرتا۔'' اس نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میری آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ میں نے اسے دلاسہ دیا۔ اس معصوم کو کیا پتا کہ خالہ بلقیس نے سچ ہی کہا ہے۔ میں ہوں ہی سیاہ بخت۔

رات ہو چکی تھی جب ابو کو اسپتال سے گھر لایا گیا۔ ان کے آتے ہی میں ان سے لپٹ گئی۔ خود بخود آنسو میری آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ ابو بھی رو پڑے تھے۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" میں نے ان سے الگ ہو کر آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں۔ مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔ ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہے پگلی۔" ابو نے کہتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ ان کے چلنے اور بات کرنے سے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ ان کے جسم میں لاغری ہنوز باقی ہے۔ میں نے برآمدے میں ان کی چارپائی کی چادر درست کی اور ان کو لٹا دیا۔ انہوں نے لیٹتے ہی آنکھیں موند لیں شاید دواؤں کے اثر سے ان پر غنودگی طاری تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے خالہ بلقیس گھر کے باہر کہیں آس پاس کھڑی تھیں کہ ابو کے آتے ہی گھر میں آگئیں۔

"کیسی طبیعت ہے اب سلیم بھائی کی؟" انہوں نے آتے ہی تیز آواز میں پوچھا۔

"شش۔" امی نے اپنے منہ پر انگلی رکھ کر کہا اور خالہ بلقیس کے قریب ہو کر سرگوشی میں بولیں۔ "آہستہ بولو، ڈاکٹر نے سکون کی دوا دی ہے۔ شور شرابہ کرنے سے منع کیا ہے۔"

"سنا ہے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" خالہ نے سرگوشی میں پوچھا۔

"ہاں! ڈاکٹروں نے یہی بتایا ہے۔" امی نے جواب دیا۔

"ہائے ہائے۔" خالہ نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔ "جوان بیٹی کا غم دل کو لگا لیا ہو گا۔" اس کا انداز کسی میت پر بین کرنے کا سا تھا۔

"اے ہے...... بیٹی کے کون سے غم کی بات کر رہی ہو؟" امی نے پوچھا۔ میں حیرت زدہ اس کا منہ تک رہی تھی۔

"یہی کہ ابھی تک باپ کے دروازے پر بیٹھی ہے۔" اس کی بات سے امی اور میں دونوں ہی چونکے بغیر نہ رہ سکیں۔

"اس میں دل کو روگ لگانے والی کون سی بات ہے

بہن۔ بیٹیاں شادی ہونے تک اپنے ماں باپ کے گھر نہ رہیں گی تو کہاں جائیں گی؟ شادی ہونے سے پہلے تم بھی تو ماں باپ کے سر پر سوار تھیں۔" امی نے کہا تو خالہ بلقیس متذبذب ہو گئیں اور حیرت سے امی کا منہ تکنے لگیں۔ امی نے یک دم پینترا بدلا اور خالہ کے کندھے پر ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے بولیں۔ "برا مت منانا بہن، بس ایسے ہی مذاق میں کہہ دیا۔" خالہ بھی ہنسنے لگیں۔

"میں نے تو اپنے طور پر بہت کوشش کی ہے۔ تمہاری عذرا کا [illegible] لگانے کی مگر نصیبوں کی ڈھیلی ہے۔" خالہ بلقیس نے [illegible] کہا۔

"اس کا کیا ہوا [illegible] پہلے تم نے تصویر دکھائی تھی۔" امی نے سنجیدگی سے پوچھا تو میں سمجھ گئی کہ امی اس کالے حبشی کی بات کر رہی ہیں جو مجھے کیا ابو کو بھی پسند نہ آیا تھا۔ بہرحال امی چاہتی تھیں کہ جیسے [illegible] شادی ہو جائے اور میں ان کے سر سے ٹل جاؤں۔ [illegible] بلا ہوں۔

"تم نے دو دن سے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔" [illegible] بلقیس نے کہا۔

"کیا جواب دیتی۔ تمہارے سامنے ہے ساری حقیقت۔" امی نے ابو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے بسی کا اظہار کیا۔

"وہ ہے ناں۔ ملا دودھ والے کی بیٹی۔"

"کون سی والی؟" اماں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"اری جس کا میاں پچھلے مہینے انتقال کر گیا ہے کار ایکسیڈنٹ میں۔"

"اچھا اچھا...... ہاں ہاں۔" اماں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اس کے ساتھ ہو گئی ہے بات پکی۔" خالہ نے کہا۔

"تو کیا وہ عدت پوری نہیں کرے گی؟" اماں نے فوراً ہی کہہ دیا۔

"اے ہے باؤلی ہو گئی ہے کیا؟ عدت پوری کر کے ہی شادی کرے گی ناں۔" خالہ نے کہا۔

"اچھا!" امی نے دھیمی آواز میں کہا۔ ان کے لہجے سے ہی افسردگی ظاہر تھی۔

"جوڑے بھی نصیبوں سے ہی بنتے ہیں۔" امی نے

[illegible] کر کہا۔

"اچھا...... لاؤ میرے پیسے۔" خالہ نے یک دم [illegible] ہو کر ہاتھ پھیلا دیا۔

"کون سے پیسے؟" امی نے حیرت سے پوچھا۔

"اری تمہاری عذرا کا جو علاج کرایا ہے۔ مرتے [illegible] بچی ہے بے چاری۔" خالہ نے کہا۔

"اچھا دے دوں گی۔" امی نے کہا۔

"اب میں چلتی ہوں۔" خالہ نے کہا اور یک دم اٹھ کر چلی گئی۔

☆......☆

دوپہر تقریباً ڈھل چکی تھی۔ ابو برآمدے میں اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اب ان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ میں ابو کے پیروں پر سرسوں کے تیل کی مالش کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ابو نے بھی لیٹے لیٹے سر اٹھا کر خارجی دروازے کی طرف دیکھا۔

"کوئی آیا ہے۔" ابو نے کہا اور اٹھنے کی کوشش کی اور پھر لیٹ گئے۔ ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ ابھی اس قدر تندرست نہ ہوئے تھے کہ یکدم اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ میں ان کے پیر دبانے لگی۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ [illegible] بازار سے سودا سلف لینے کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ نادر تو [illegible] کا کھانا کھانے کے بعد جو گھر سے نکلا تھا تو ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔

"سلیم چاچا [illegible] آیا ہے۔" اس بار آنے والے نے بلند آواز میں کہا۔

"فون!" ابو نے میری [illegible] کہتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی۔

"آپ لیٹے رہیں ابو، میں دیکھتی ہوں۔" میں نے کہا اور چارپائی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ [illegible] اوڑھے ہوئے دوپٹے کو پھر سے درست کیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"کون ہیں بھائی آپ؟" میں نے پردے کی اوٹ سے اسے مخاطب کیا۔

"میں ہوں سلمان، جنرل اسٹور والا۔" اس نے اپنا تعارف کرایا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی اور سوال کرتی۔ اس نے خود ہی کہہ دیا۔ "پنساری کی دکان سے فون آیا ہے۔ چاچا سلیم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" اس

نے کہا اور موبائل فون آگے پردے کی طرف بڑھایا۔ میں نے اپنا ہاتھ پردے سے باہر نکال کر فون پکڑ لیا۔

"دکان پر کوئی نہیں ہے۔ میں جا رہا ہوں فون بھجوا دیجیے گا۔"

"جی اچھا بھائی۔" میں نے جواباً کہا تو وہ چلا گیا۔ میں نے دروازہ بھیڑا اور ابو کے پاس آگئی۔

"آپ کی دکان سے فون آیا ہے۔" میں نے کہا اور فون ابو کی طرف بڑھایا۔ ابو نے فون لے کر کان سے لگا لیا۔

"ہیلو...... ہیلو...... ذرا اونچا بولیں مجھے سنائی نہیں دے رہا۔" ابو نے کال کرنے والے کو چند ایک بار مخاطب کرنے کے بعد کہا۔

"عذرا بیٹی تم بتا دو میں کل سے آؤں گا [illegible]" [illegible] نے کہتے ہوئے فون مجھے دے دیا۔

"السلام علیکم!" میں نے فون کرنے والے کو مخاطب کیا۔

"آپ کون؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"میں سلیم صاحب کی بیٹی بول رہی ہوں۔" [illegible] نے اپنا تعارف کرایا۔

"بیٹا! یہ نمبر تمہارے ابو نے دیا ہے [illegible] کوئی ضروری بات ہو تو کال کر لوں۔ اپنے [illegible] کال کر لی۔" انہوں نے کہا۔

"ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے [illegible] ابو کی طبیعت بگڑنے اور کارڈیو میں زیر علاج رہنے کا احوال بتایا اور دو تین دن مزید آرام کر کے کام پر آنے کا کہہ دیا۔

"نادر آ جائے تو فون دکان پر بھجوا دوں گی۔" ابو کے پوچھے بنا ہی میں نے کہا اور موبائل ابو کے سرہانے کی طرف رکھ دیا۔ میں دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ فون کی بجنے والی تیز گھنٹی نے مجھے اور ابو کو چونکا دیا۔

"کسی کا فون آیا ہے۔" ابو نے کہا۔

"پتا نہیں کس کا ہو گا۔ سلمان بھائی کی ضروری کال بھی ہو سکتی ہے۔ نادر بھی نہیں آیا ورنہ فوراً بھجوا دیتی۔" میں نے کہا۔

اتنی دیر میں کئی دفعہ موبائل کی گھنٹیاں بج چکی تھیں۔

"نادر بھی پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا ہے۔ اس کے ہاتھ فون بھجوا دیتی۔ کوئی ضروری کال ہو گی۔" میں نے

تشویشی انداز میں کہا۔

''جاؤ......تم خود ہی دے آؤ دکان پر۔'' ابو نے کہا۔ ''کوئی ضروری کال ہوگی۔ ورنہ وہ آیندہ ہماری بات بھی نہیں کرائے گا۔'' ابو نے زور دے کر کہا۔

سلمان بھائی کا جنرل اسٹور مشہور تھا۔ بہت بڑا جنرل اسٹور تو نہیں تھا لیکن ضرورت کی ہر شے با آسانی دستیاب تھی۔ اس کے اچھے اخلاق کی وجہ سے علاقے کا بچہ بچہ اس کا گرویدہ تھا۔ سلمان بھائی تھے بھی خدا ترس۔ غریبوں کی اس بستی میں دو چار کے پاس ہی اپنا فون تھا۔ جن کے پاس رابطہ کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اپنے ملنے والوں کو اسی کا موبائل نمبر دے رکھا تھا۔ ان ہی لوگوں میں ہم بھی شامل تھے۔ ہم نے بھی ابو کی دکان پر اور دیگر رشتہ داروں میں اسی کا فون نمبر دے رکھا تھا۔ جب بھی کسی کا فون آتا تو وہ خود بات کرانے کے لیے اس کے گھر پہنچ جاتا۔ جیسے آج وہ ہمارے گھر آیا تھا۔ وہ بھی ہر ایک پر اعتماد کرتا تھا۔ جب ہی تو وہ ہمارے گھر فون چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ اہل علاقے کے ساتھ براہ راست رابطہ میں ہونے کی وجہ سے ہر ایک کے ذاتی معاملات سے بھی پوری طرح واقف تھا۔ وہ لوگوں کے دکھ درد میں بھی شریک ہو جاتا تھا۔

ابو نے سلمان بھائی کی دکان پر جا کر اس کا موبائل واپس کرنے کی اجازت تو دے دی تھی میں اس پر تیار بھی تھی مگر ابو گھر میں اکیلے رہ جاتے۔ ان کی طبیعت بھی ناساز تھی۔ ان کو اس طرح اکیلا چھوڑ کر جانے کو جی بھی نہ چاہتا تھا۔ میں اسی شش و پنج میں تھی کہ ایک بار پھر موبائل نے شور مچانا شروع کر دیا۔

''دے آؤ ناں موبائل واپس۔'' ابو نے کہا۔ ذرا دیر کو ان کی آنکھ لگی تھی کہ موبائل کی تیز آواز نے ان کی نیند خراب کر دی۔

''اچھا!'' میں نے کہا۔ چادر سنبھالی اور تیز تیز قدم اٹھاتی گھر سے باہر نکل آئی اور تیز تیز چلتی ہوئی سلمان بھائی کے جنرل اسٹور پر جا پہنچی۔ ایک دو گاہک کھڑے تھے۔

''جی باجی۔'' سلمان بھائی مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

''یہ آپ کا موبائل۔'' میں نے کہا اور موبائل ان کو پکڑا دیا۔ واپس پلٹی تو کھنکھارنے کی آواز میری سماعت

سے ٹکرائی۔ میں نے اس جانب نہیں دیکھا۔ کیوں کہ میں پہلے ہی دیکھ چکی تھی کہ دکان سے ذرا ہٹ کر منا کھڑا تھا۔ یقیناً یہ آواز اسی نے نکالی ہوگی۔ مجھے مخاطب کرنے کے لیے۔ وہ محلے کا اوباش ترین لڑکا تھا۔

''ابو چائے بنا کر دوں آپ کو؟'' میں نے گھر آتے ہی چادر سر سے اتار کر چارپائی پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''رہنے دو۔'' ابو نے دھیمی آواز میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کا دل چاہ رہا ہے چائے ... کو۔ میں ابھی بنا دیتی ہوں۔'' میں نے کہا اور پانی ... بھر کر چولہے پر رکھا۔

''اوہ......دودھ تو ہے ہی نہیں۔'' میں نے سوچا۔

''ابو دودھ ... ہو گیا ہے۔ نادر باہر کھیل رہا ہے۔ میں اس سے دودھ منگوا لیتی ہوں ...'' میں نے کہا۔ ابو کے سرہانے پڑے ہوئے امی ... کے پلو میں بندھے پیسے کھولے اور جا کر صدر درو... کھڑی ہو کر پردے کی اوٹ سے نادر کو دیکھ رہی تھی ... آ گیا۔

''ایک گلاس پانی مل جائے گا۔ پیاس بہت ... کر رہی ہے۔'' اس نے مسکینوں جیسی صورت بنا کر کہا۔

''اچھا! دوں گی پہلے مجھے دودھ لا کر دو۔'' میں نے شرط رکھ دی۔

''پیاس کے مارے حلق میں کانٹے چبھ رہے ہیں۔ پانی پلا دو۔ فٹافٹ لے آؤں گا۔'' اس نے منت کرتے ہوئے کہا۔

''اپنے مطلب کا ہے نامراد۔'' میں نے کہا اور اپنی غرض کی خاطر اسے جلدی سے پانی کا گلاس بھر کر لا کر دے دیا۔ اس نے ٹھہر ٹھہر کر پانی پیا۔ حالانکہ مٹکے کا پانی اتنا زیادہ ٹھنڈا نہیں ہوتا کہ ایک ہی سانس میں پیا نہ جا سکے۔ میں اس انتظار میں کھڑی رہی کہ وہ پانی کا خالی گلاس مجھے واپس کرے اور دودھ لا کر دے۔ اللہ اللہ کر کے اس نے پانی پیا اور خالی گلاس مجھے دے کر دودھ لینے چلا گیا۔

''شکر ہے۔'' میں نے کہا اور آ کر ابو کے پاس بیٹھ گئی۔

''اوہ......!'' چولہے پر رکھی ہوئی پتیلی پر نظر پڑتے ہی میں چونک پڑی۔ پانی کھول رہا تھا۔ میں نے جلدی سے پتیلی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔

''باجی......باجی......'' پکارتا ہوا نادر آ کر میرے روبرو کھڑا ہو گیا۔ میں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

...کو کیوں کہا تھا تم نے دودھ لانے کے لیے؟'' ... میں کہا۔

''تم سارا دن گھر سے غائب رہا کرو۔ ابو کی طبیعت ... رہی ہے۔ تمہیں کوئی پروا نہیں ہے۔ کچھ منگوانا ... کس کو بھیجوں۔'' میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ... جواب پر اس کا سارا غصہ کافور ہو گیا۔ وہ کچھ ...

''کیا ہوا؟'' ابو نے پوچھا۔

''ابو وہ سب لڑکوں کے سامنے کہہ رہا تھا۔ اپنی باجی کو بولو مجھے سودا لانے کے لیے نہ بولا کرے۔ میں کوئی نوکر ہوں کیا۔ کبھی دودھ پلانے کا لالچ دیتی ہے تو کبھی پان کھلانے کا۔ لڑکوں نے میرا خوب مذاق اڑایا ہے۔'' نادر نے ابو سے شکایت لگائی۔

''کس نے کہا اس کو پان اور دودھ کا لالچ دیا ہے۔ میں تو اسے منہ بھی نہیں لگاتی۔ لچے لفنگے کو۔'' میں نے چڑ کر اونچی آواز میں کہا۔

ابو نے میری طرف دیکھا۔ میں ان کی ٹٹولتی ہوئی نظروں کا مطلب سمجھ گئی۔ ان کی نظروں میں کئی سوال تھے۔ اندیشے تھے۔

''پھر اس نے کیوں کہا تمہارے بارے میں ایسا؟'' ابو نے پوچھا۔

''پتا نہیں......و......و......ویسے ہی کہہ دیا ہوگا اس ... بوکھلا گئی۔ ... اس نامراد نے خوامخواہ ہی الزام لگا دیا تھا مجھ پر ... کبھی اس کے سامنے بھی نہیں گئی۔'' ابو کافی دیر تک مجھے ... گھورتے دیکھتے رہے اور میں آپ ہی آپ شرمندگی سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ ابو نے کوئی بات نہ کی مگر ان کی نظروں نے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ میں ان کے ان کہے سوالوں کا کیا جواب دیتی۔ کوئی ایسی بات ہی نہ تھی کہ جس کا جواب دیتی۔ اس خبیث لڑکے نے جو بات کی تھی اس کا کوئی جواب نہ تھا میرے پاس۔

''دودھ کے پیسے کہاں ہیں؟'' میں نے نادر سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں اپنی خجالت مٹانا چاہتی تھی۔

''مت بناؤ چائے۔ میں نہیں پیوں گا۔'' ابو نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ان کے لہجے میں غصہ تھا۔ چہرے پر سرخی نمایاں تھی۔

''یہ رہے پیسے۔'' نادر نے مٹھی کھول کر دکھائی۔

''جاؤ دودھ لے آؤ۔'' میں نے حاکمانہ لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا نا، میں چائے نہیں پیوں گا۔ جاؤ تم کمرے میں۔'' ابو نے کہا اور کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

میں حیرت زدہ اپنی جگہ کھڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد کمرے میں چلی آئی۔ اگرچہ ابو نے اونچی آواز میں جھڑک کر بات نہ کی تھی لیکن ان کا اس طرح کروٹ بدل کر منہ پھیر لینا ہی میرے لیے کافی تھا۔ میں نے ابو کو بھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اور نہ ہی کبھی کوئی ایسی حرکت کی تھی جس سے وہ مجھ پر برہم ہو جائیں۔

اس خدائی خوار منے نے لڑکوں کے سامنے اپنا بھرم بنانے کے لیے کہا ہوگا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ وہ اپنے اور میرے تعلقات کو ظاہر کرنا چاہتا تھا جب کہ آج سے پہلے میں نے اس سے کبھی کسی موضوع پر کوئی بات ہی نہ کی تھی۔ میں نے تو صرف دودھ لانے کے لیے کہا تھا۔ اسے پانی پینے کے بہانے نہ آ گیا میں اتنا کام بھی نہ کہتی اگر وہ ... مجھے ... ہوتا۔ میری ہی مت ماری گئی تھی کہ میں اس ... کو دودھ لانے کا کہہ بیٹھی۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے میں کمرے سے پھر باہر آ گئی اور امی والی چارپائی پر ابو کی طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔ نادر کمرے میں چلا گیا تھا۔

اس بدنام زمانہ لوفر لفنگے کو بھلا میں کیوں منہ لگانے لگی۔ آئے دن اس کی بری حرکتوں کی خبریں نادر کے ذریعے ہی سننے کو ملتی تھیں۔ وہ بلا کا ڈھیٹ اور بے غیرت تھا۔ کل ہی تو امی نے خبر سنائی تھی کہ بھرے بازار میں اس نے کسی لڑکی سے بدتمیزی کر دی تھی۔ وہ لڑکی بھڑک نہ جاتی تو اور کیا کرتی۔ اس نے جوتے سے اس کی پٹائی کر دی۔ تب وہ وہاں سے بھاگا مگر ڈھیٹ ایسا کہ ذرا بھی شرمندہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ آئے دن اس کا کسی نہ کسی سے جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ اس جھگڑے میں بھی اسی خبیث کی زیادتی ہوا کرتی تھی۔ ویسے تو محلے میں ایک سے ایک سوا سیر تھے لیکن ماموں سردار خان کی وجہ سے کوئی بھی اس کے منہ نہیں لگتا تھا۔ ماموں پولیس کا مخبر تھا جس کی وجہ سے اس کا سکہ جما ہوا تھا۔ شروع شروع میں جب ایک دو لڑکوں نے منے کو سبق سکھایا تو جواب میں سردار خان نے ان کو ایسے کیسوں میں پھنسوایا کہ وہ پورے علاقے کے لیے مثال بن گئے۔ جب ہی تو منا سرکش بھینسے کی طرح دندناتا

پھرتا تھا۔
اب اس ذلیل انسان نے نجانے کن عزائم کے تحت مجھے نشانہ بنایا تھا۔ میں اسی بات پر غور کرنے لگی۔
تبھی دروازہ کھلنے کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔
"کوئی اندر آیا ہے۔" میں نے دل میں سوچا۔ اس سے پہلے کہ میں سر اٹھا کر آنے والے کو دیکھتی۔ آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں پھر سے دم سادھ گئی۔
"سب کے سب سو رہے ہیں۔ دروازہ بھی بند نہیں کیا۔ کوئی لچا لفنگا اندر گھس آئے۔ چوری چکاری ہو جائے تو ہم بنا دیکھے کس کے گلے پڑیں گے۔" امی کی آواز آئی۔
"آ گئی ہو تم؟" اسی وقت ابو کی آواز آئی۔
"ہاں ذرا دیر ہو گئی واپسی میں۔" امی نے جواب دیا۔
"دیر تو تم نے بہت کر دی۔ آؤ بیٹھو۔" ابو نے کہا اور امی کو اپنے پاس بلایا، امی آ کر میری چار پائی پر بیٹھ گئیں۔
"خیریت تو ہے ناں؟" امی نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔
"خیریت ہی تو نہیں ہے۔" ابو نے فکرمندی سے کہا۔
"یا اللہ خیر کر۔" امی نے دعائیہ کلمات کہے اور پھر ابو نے منا والی ساری باتیں سرگوشی میں امی کے گوش گزار کر دیں اور میں بے سدھ پڑے رہنے کا ناٹک کر کے سب کچھ سنتی رہی۔ اس دوران امی بھی بے چینی سے بیٹھے بیٹھے پہلو بدلتی رہیں۔
"یہ لڑکی کچھ کر نہ بیٹھے۔" امی نے پریشانی کے عالم میں کہا۔
"دھڑکا تو مجھے بھی یہی لگا ہوا ہے۔" ابو نے کہا۔
"میں تو کہتی ہوں۔ جتنا جلدی ہو سکے۔ اسے اپنے گھر کا کر دیں۔" امی نے کہا۔
میرا دل یک دم دھڑک کر رہ گیا۔ وہ دونوں مجھے گھر سے نکالنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ میں بہت دیر تک ایک ہی طرف کروٹ لیے پڑی رہی۔ تھک بھی گئی تھی۔ پہلے تو میں بہت دیر تک مردہ سی بنی پڑی رہی اور پھر بالآخر ذرا حرکت کی۔ کروٹ بدلی اور پھر کھنکھارتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"جا اپنے کمرے میں بھائی بھی اکیلا ہے۔" اس سے پہلے کہ میں کوئی بات یا سوال کرتی۔ امی نے کہہ دیا اور میں چپ چاپ اٹھ کر کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔
"مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں ایسا ویسا قدم ہی نہ اٹھا لے۔" امی نے فکرمندی سے کہا۔
"اللہ نہ کرے۔" امی کی بات سن کر آنکھوں سے آنسوؤں کی قطار بندھ گئی۔ امی ابو کو کتنی بڑی غلط فہمی ہو گئی تھی۔ میں ان کی نظروں سے گر گئی تھی۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے میں زمین میں گڑھ گئی ہوں۔ اس میں میرے ماں باپ کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ انہوں نے جو سنا تھا، انہیں بھی خدشات [illegible] لگ گئے تھے۔ اب ان کو میرے فرض کی ادائیگی سے زیادہ اپنی عزت بچانے کی فکر پڑ گئی تھی۔ مجھے کسی صورت چین نہیں آ [illegible] تھا۔ بار بار دائیں بائیں کروٹیں بدلتی اور کبھی اٹھ [illegible]۔ امی ابو کی باتوں کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی [illegible] میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ دروازے [illegible] پاس ہی رک گئی۔ ان دونوں کی نظریں مجھ پر جم گئیں [illegible] لمحے نظر جما کر مجھے دیکھتے رہے اور پھر منہ دوسری طرف پھیر لیا لیکن امی زہر آلود نگاہوں سے مجھے گھورتی رہیں۔ میں چپ چاپ امی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔
"اپنا منہ کالا کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تم نے؟" امی نے میرے بال نوچ لیے۔
"آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔" میں نے دبی دبی آواز میں کہا۔
"نادر نے سب کچھ تمہارے سامنے ہی تو بتایا تھا؟"
"وہ تو کسی پر بھی کوئی بھی الزام لگا دیتا ہے۔" میں نے کہا تو امی مجھے غصے سے دیکھنے لگیں۔
"تمہیں شرم نہیں آئی زبان چلاتے ہوئے۔" امی نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا اور ابو کی طرف آنکھ گھما کر اشارہ کیا۔ امی کا مطلب تھا کہ میں ابو کی موجودگی میں اس موضوع پر بحث کر رہی ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔
خجالت تو مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن اس وقت میرا خاموش رہنا مجھے مجرم بنا دیتا اس لیے ضروری تھا کہ میں اپنی بے گناہی ثابت کروں۔ اس کم ظرف کی اس حرکت کی وجہ سے نہ صرف میں ذلیل ہو رہی تھی بلکہ میرے ماں باپ بھی بے عزت ہو رہے تھے۔ میرا جینا تو دوبھر ہو!

[illegible] ان کی بھی زندگی اجیرن ہو رہی تھی۔ یہ بدبخت تو [illegible] لیے سوہان روح بن گیا تھا۔ اس میں کوئی شک [illegible] کہ مجھے ابو کے سامنے اس موضوع پر زبان نہیں کھولنی [illegible] لیکن میری خاموشی بھی تو ان کو مجھ سے بدظن [illegible] تھی۔ جب میں نے ایسا کوئی کچھ کیا ہی نہیں تو [illegible] خاموش رہوں۔ میں ان کو اپنے اعتماد میں لینا چاہتی [illegible] "امی آپ میری بات کا غلط مطلب مت لیں۔ وہ [illegible] عزت کی دھجیاں بکھیرنا چاہ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ لحہ بھر کو میں خاموش ہوئی، تھوک نگل کر اپنے خشک حلق کو تر کرنے کی کوشش کی اور پھر کہا۔ "امی دو دن پہلے آپ نے ہی آ کر بتایا تھا کہ اس لعنتی نے بھرے بازار میں ایک لڑکی کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ اس نے دودھ والے کمال شاہ کی بیٹی کا راستہ روک کر فضول قسم کی بکواس کی تھی۔ ایسا شخص اگر میرے بارے میں کوئی ایسی افواہ پھیلا دے تو کیا وہ سچ ہو گا۔ نہیں امی مجھے آپ کی عزت کی قسم میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس سے آپ کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔" میں نے کہا اور ابو کے پاس جا بیٹھی۔ میں نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ ابو یکدم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر اپنے سینے سے لگا لیا۔
"مجھے تم سے ایسی ہی امید ہے میری بچی۔" ابو نے کہا۔ ان [illegible] بھر آئی اور پھر وہ باقاعدہ سسکیاں بھرنے لگے۔ امی بھی رو [illegible] میں بھی ابو کے سینے سے لگ کر بہت روئی۔ اپنے دل کا [illegible] پہلے زبان سے اور پھر آنسوؤں سے ہلکا کر لیا۔
"اچھا لعنت مار اس ذلیل کمینے [illegible] جا جا کر سو جا۔" امی نے کہا۔ اب ان کے لہجے میں [illegible] ایک احساس تھا۔ یقین تھا میری بے گناہی کا۔ میں [illegible] میں چلی آئی تھوڑی دیر لیٹی رہی اور پھر میری آنکھ لگ گئی۔
اگرچہ ابو کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی مگر کمزوری باقی تھی۔ اٹھنے بیٹھنے میں تو ان کو زیادہ پریشانی نہ ہوتی تھی لیکن باتھ روم وغیرہ جانے میں ان کو سہارا دینا پڑتا تھا اگر امی موجود نہ ہوتیں تو مجھے ہی کرنا پڑتا۔ نادر کوشش کے باوجود بھی سنبھال نہ پاتا تھا۔ آج بھی جب طبیعت میں بوجھل پن محسوس ہوا تو محلے کے ایک کلینک میں لے جانا پڑا۔ نادر رکشا لے آیا۔ امی اکیلے ابو کو سنبھال نہیں پا رہی تھیں اس لیے مجھے بھی ان کے ساتھ ہی جانا پڑا۔ کلینک بہت زیادہ دور تو نہیں تھا لیکن ابو میں پیدل چل کر جانے کی ہمت نہیں تھی اس لیے رکشا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ [illegible]
ڈاکٹر نے ابو کا چیک اپ کیا۔ [illegible] اسپتال کی دی ہوئی دوائیں جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ ڈاکٹر نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ ان کو کوئی ڈپریشن نہ ہونے پائے۔
کلینک سے نکل کر گھر جانے کے لیے رکشا کی طرف جا رہے تھے کہ نجانے کہاں سے منا آ دھمکا اور ابو کو ایک طرف سے سہارا دینے کے لیے بڑھا۔
"میں لے چلتا ہوں۔" میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور جہاں تھی وہیں کھڑی ہو گئی۔ ابو ٹھیک طرح سے کھڑے نہیں ہو پا رہے تھے۔
"امی جلدی آئیں۔" میں نے پکارا۔ امی آئیں تو منے کو دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ ان کی [illegible] اس پر نہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔
"تمہیں کس نے بلایا ہے؟" [illegible] مخاطب ہو کر تلخ لہجے میں پوچھا۔
"یہ خود ہی آ گیا ہے، نامراد۔" ابو بول [illegible]
"رکشا کی ضرورت نہیں ہے۔ [illegible] گھر کوئی زیادہ دور تو نہیں۔" اس نے کہا۔ [illegible]
"نہیں ہم ابو کو رکشا میں لے جائیں گے [illegible] تمہیں [illegible] سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔" [illegible] مخاطب ہو کر نفرت آمیز لہجے میں کہا۔
"بھائی آپ آ جائیں۔" میں نے کچھ دور [illegible] مخاطب ہو کر کہا تو وہ وقت سے آ پہنچا۔ [illegible] رکشا ڈرائیور سے مخاطب ہو کر کہا تو [illegible] رکشا میں بٹھا دیا۔ [illegible] نے منا کو ہٹا کر ابو کو سہارا دیتے ہوئے [illegible]
"کبھی تو نفرت محبت میں بدل لے گی۔" یہ بات اس نے جاتے وقت کہی تھی۔
"ذلیل...... بدذات۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔
"اماں اس کی باتوں پر دھیان مت دو [illegible] یہ بہت بے غیرت ہے۔ یہ اپنی ان ہی حرکتوں کی وجہ سے کئی لوگوں سے پٹ چکا ہے۔" رکشا ڈرائیور نے کہا۔
"تم اسے جانتے ہو بیٹا؟" [illegible]
"مجھے سب پتا ہے اماں [illegible] حرام کی کمائی کھانے والے ایسے ہی [illegible] بے حیا۔" اس نے کہا اور رکشا چلانے لگا۔

''بس بھائی یہیں روک دو۔'' گھر کے قریب پہنچ کر میں نے کہا۔ ہم ابو کو سہارا دے کر اندر لے آئے۔

گھر پہنچے تو ماموں طلال اور ممانی کو موجود پایا۔ وہ برآمدے میں ہی چارپائی پر ہمارے انتظار میں بیٹھے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ماموں نے آکر ابو کو سہارا دیا اور لے جا کر چارپائی پر بٹھا دیا۔

''نادر نے فون پر اطلاع تو کردی تھی مگر...... آنے میں دیر ہوگئی۔'' ماموں نے کہا۔

''ہاں اپنے ضروری کام بھی تو ہوتے ہیں بھائی۔'' امی نے کہا۔

میں نے فٹافٹ نادر سے چائے ناشتے کا سامان منگوایا اور تیار کر کے پیش کیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

ماموں ممانی کی رہائش شیرشاہ میں تھی۔ وہ کبھی کبھار ہی ہم سے ملنے اجمیر نگری آتے تھے۔ وہ بھی جب کبھی غمی یا خوشی کا بہانا ہوتا تب، ماموں ایک کباڑ کے گودام میں منشی گیری کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا نام بھی اپنے نام سے ملا کر طلال رکھا تھا۔ طلال کی اور میری عمر میں صرف ایک سال کا ہی فرق تھا۔ وہ مجھ سے ایک سال بڑا تھا اور دسویں جماعت تک پڑھ چکا تھا۔ جلال ماموں امی سے چار سال چھوٹے تھے۔ ان دو بہن بھائیوں کے علاوہ میرے نانا نانی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ماموں کو بھی نادر بھائی کی طرح پڑھنے کا شوق نہیں تھا۔ نانا نانی کے ڈنڈے کے زور پر نو جماعتیں پڑھ کر ہی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ میں ابو کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گئی اور بسکٹ چائے میں ڈبو کر انہیں کھلانے لگی۔

''میں چاہتا ہوں کہ عذرا کا فرض ادا کردوں۔'' اِدھر اُدھر کی لمبی باتوں کے دوران موقع پا کر ابو نے ماموں سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں اٹھ کر کمرے میں چلی آئی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے بھائی صاحب۔'' ممانی نے کہا۔

''کہیں بات پکی کردی ہے۔ کون لوگ ہیں؟ لڑکا کیا کرتا ہے؟'' ماموں نے پوچھا۔

''نہیں بات تو کہیں نہیں ہوئی، رشتے تو آ ہی رہے ہیں لیکن دیکھ بھال کر ہی کرنا ہوگا۔'' امی نے جواب دیا۔

''تمہارا طلال جو ہے تو کہیں اور بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لڑکی اپنے باپ کے گھر سے ماموں کے گھر چلی جائے گی۔ لڑکا بھی گھر کا اور لڑکی بھی۔'' ابو نے ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا۔ ان کی سانس پھولی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

''نہیں نہیں...... بھائی صاحب!'' ممانی نے فٹ سے دوٹوک الفاظ میں انکار کردیا۔ ماموں نے اس بات کا خود کوئی جواب نہیں دیا پھر سب خاموش ہوگئے۔ کافی دیر تک ایسا سناٹا چھایا رہا۔ جیسے کوئی موجود ہی نہ ہو۔ ممانی کے انکار کرنے کا لہجہ انتہائی حقارت بھرا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے مجھے ٹھوکر ماردی ہو۔ ان کے اور ہمارے رہن سہن میں بہت فرق تھا مگر ایسا بھی نہیں کہ ہم بالکل ہی بھوکے ننگے ہوں۔ انہوں نے مجھے یک لخت ٹھکرا دیا تھا۔

''وہ...... ماموں بول پڑے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ شاید کوئی بہانا سوچ رہے تھے پھر کچھ دیر بعد وہ کھنکھار کر دوبارہ بولے۔ ''وہ دراصل طلال ابھی پڑھ رہا ہے ناں۔ اس کی تعلیم مکمل ہونے میں بہت ٹائم لگے گا۔ اس کی شادی کوئی اچھی نوکری لگنے کے بعد ہی کریں گے۔'' ماموں نے کہا۔

''نہیں، شادی میں تو دیر نہیں کریں گے لیکن ایک دم چٹی اَن پڑھ سے تو کرنا بھی نہیں ہے ناں۔'' ممانی کا جواب سن کر تو میں دھک سے رہ گئی۔ مجھے اپنی تذلیل پر رونا آرہا تھا۔

''چھوڑیئے جی۔'' امی نے جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھی تھیں بولیں۔ ''ہمیں بھی کوئی اتنی جلدی نہیں ہے۔ کوئی اچھا گھر دیکھ کر ہی بیاہوں گی اپنی عذرا کو۔ کباڑیوں کے گھر میں بیاہ دیا تو ساری عمر کباڑن ہی کہلائے گی۔'' امی نے کہا۔ ان کا لہجہ بھی تلخ ہوگیا تھا۔ آواز غصے میں بلند ہوگئی تھی۔ میں جانتی ہوں امی ایسا ہرگز نہیں کہتیں مگر ممانی کی تکبرانہ باتیں امی کی برداشت سے باہر ہوگئی تھیں۔

''اری بہن! دلہن کا کام صرف گھر کا چولہا برتن ہی تو نہیں ہوتا، کل کو بچے ہوئے تو ان کو اپنی طرح جاہل گنوار تھوڑا ہی رکھنا ہے۔ ان کی تعلیم اور تربیت بھی تو کرنا ہوگی۔ جب ماں کو ہی الف ب کا پتا نہ ہوگا تو وہ انگوٹھا چھاپ ماں بچوں کو کیا سکھائے گی؟''

امی اور ممانی کی بحث کافی دیر تک چلتی رہی۔ ابو اور ماموں خاموش بیٹھے تھے۔ ابو سے تو ٹھیک طرح سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا اور ماموں نے بھی چپ سادھ لی تھی۔

''اچھا چلتے ہیں، پھر کسی وقت چکر لگاؤں گا۔'' ماموں نے کہا اور کھڑے ہوگئے۔ میں نے ذرا باہر کی طرف جھانک کر دیکھا، ممانی بھی جانے کو تیار کھڑی تھیں۔ میں کمرے سے باہر برآمدے میں آگئی۔ ان سے ملی۔ ماموں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور خارجی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

''تم نے ماں باپ کو ضرور تنگ کر رکھا ہے تبھی یہ تمہیں گھر سے نکالنے کے چکر میں ہیں۔'' ممانی نے جاتے جاتے ایک اور جوتا میرے منہ پر مارا۔

میں نے خجالت سے امی ابو کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں کے تاثرات اس بات کے غمازی تھے کہ ان کو بھی ممانی کی بات ناگوار گزری تھی۔

''ہونہہ!'' امی نے نفرت آمیز لہجے میں کہا اور لمحہ بھر کے توقف کے بعد بولیں۔ ''میرے بھیا کی زبان تو اس نے ایسی بند کر رکھی ہے کہ چپ چاپ سنتا رہتا ہے۔ اس کے منہ میں تو جیسے زبان ہی نہیں ہے۔'' امی غصے سے لال پیلی ہوئے جا رہی تھیں۔

''عذرا بیٹی!'' امی نے مجھے پکارا تو میں ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

''جی ابو۔'' میں نے کہا اور ان کے پاس جا کھڑی ہوئی، وہ مجھے بغور دیکھ رہے تھے۔

''آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' انہوں نے کہا۔ ان کے چہرے سے شفقت چھلک رہی تھی۔ میں پائنتی کی طرف بیٹھ گئی۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور میرا سر اپنے سینے سے لگالیا۔ میں بھی ابو سے لپٹ گئی۔

''اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے میری بیٹی۔'' ابو نے دعا دی۔ میں لبوں سے تو خاموش ہی رہی مگر میرے دل نے یہ ضرور کہا۔ ''آمین ثم آمین۔'' ہر لڑکی کے دل کی مراد یہی ہوتی ہے کہ اس کے نصیب اچھے ہوں۔ اسے اچھے گھر جانا نصیب ہو۔ اچانک ہی میرے دل میں ایک ٹیس اٹھی اور بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

''پگلی ہوئی جا رہی ہو کیا؟'' ابو نے میرے سر پر اپنے دونوں ہاتھوں سے دباؤ دے کر کہا۔

''میں آپ پر بوجھ ہوں ناں ابو؟'' میں نے سسکاری بھرتے ہوئے کہا۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا تھا۔ حالات ہی کچھ ایسے پیدا ہوگئے تھے۔ میری بھی یہی خواہش تھی کہ میری زندگی میں سب اچھا ہو لیکن ہر ایک کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ سوچ کے مطابق کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مجھے پکا یقین ہو چلا تھا کہ میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوگا۔ ہر وقت میرا دل ہول کھاتا رہتا تھا۔ ابو بھی ان حالات کے پیش نظر ہی اتنے جذباتی ہو رہے تھے۔ امی کے دل کی کیفیت کو میں محسوس کرسکتی تھی۔

''دل چھوٹا مت کرو۔ عذرا کے ابا بہت اچھے نصیب ہیں میری بیٹی کے، دنیا رشک کرے گی اس کے نصیبوں پر۔'' امی نے ابو کو دلاسہ دیا۔ ابو کے ہاتھوں کی گرفت میرے سر پر سے نرم ہوئی تو میں اٹھ کر کمرے میں چلی آئی۔

گھر میں یک دم خاموشی چھا گئی جو کافی دیر تک برقرار رہی۔ دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ امی ابو دونوں ہی خاموش بت بنے کسی سوچ میں کھوئے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کوئی بات کر کے خاموشی کا طلسم توڑ دوں۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتی۔ امی بول پڑیں۔ ''آپ کو رشتے کی بات خود سے نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' امی نے ابو سے مخاطب ہو کر کہا۔

قدیم مذاہب کی ایک خصوصیت، خاندان کے ہلاک شدہ ارکان کی پرستش ہے۔ ٹیلر نے نظریہ پیش کیا کہ قدیم لوگ اپنے رخصت ہو جانے والے عزیزوں اور دوستوں کے خواب دیکھتے اور پھر یہ اخذ کر لیتے ہیں کہ وہ حقیقتاً مرے نہیں بلکہ محض ایک اور دنیا میں زندہ ہیں۔ آیا یہ مذہب کے آغاز کا موجب تھا یا نہیں یہ محض قیاس آرائی ہے۔ تاہم قدیم مذاہب کے متعلق معلومات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ مردہ کم از کم کچھ عرصے کے لیے کسی اور شکل میں زندہ رہتا ہے اور یہ کہ مردہ زندہ لوگوں کو مدد یا اذیت پہنچا سکتا ہے۔ یہ لوگ اس شرکے شدید خوف میں مبتلا ہیں کہ مردے اکثر خود کو زندہ لوگوں کو نقصان پہنچانے کے لیے، قبروں سے لوٹ آنے سے محفوظ رکھنے کے لیے بہت دکھ سہتے ہیں۔ جسموں پر بڑے بڑے پتھر رکھ کر یا ان کی چھاتیوں میں کھونٹیاں گاڑ کر دفن کیا جاتا۔ انہیں آوارہ گھومنے سے روکنے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔ کچھ قدیم معاشروں میں متوفیوں کے نام کچھ عرصے کے لیے عام استعمال نہیں کیے جاتے اور جن گھروں میں ان کی موت واقع ہوتی انہیں جلا دیا جاتا تاکہ وہ واپس نہ آسکیں۔

مرسلہ: سمیرش مرزا۔ لاہور

''تمہارا بھائی ہے۔ میں نے سوچا اس گھر میں ہو جائے تو اچھا ہے۔ اپنی اولاد کی طرح رکھے گا۔'' ابو نے جواب دیا۔ ابو دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔ ان کی طبیعت کی ناسازی ان کو کھل کر بولنے بھی نہیں دے رہی تھی لیکن پھر بھی آواز میرے کانوں میں باآسانی پڑ رہی تھی۔

''جہاں نصیب لکھا ہوگا وہیں جائے گی۔ زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' امی نے سمجھاتے ہوئے نصیحت کرنے کے انداز میں کہا۔

''میں چاہتا ہوں۔ میرے جیتے جی فرض ادا ہو جائے تو اچھا ہے۔'' ابو نے کہا۔

''یہ تو میں بھی چاہتی ہوں لیکن کھائی میں تو نہیں پھینکنا بچی کو۔ دیکھ بھال کر ہی کرنا ہوگا۔'' امی نے کہا۔

''یہ سارے اوپر والے کے کام ہیں۔'' ابو نے کہا۔

''اچھا ابھی آرام کرو۔ سکون سے لیٹ جاؤ میں آپ کے لیے سوپ بناتی ہوں۔'' امی نے کہا۔

''آپ رہنے دیں۔ میں کر دیتی ہوں۔'' میں نے امی کی بات سن کر کمرے سے باہر آ کر کہا اور کچن میں سوپ بنانے میں مصروف ہو گئی۔

☆......☆

حسبِ معمول صبح ہی صبح چائے تیار ہونے تک برآمدے کے فرش پر چادر بچھائی، نادر جلدی سے آیا اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ امی منہ ہاتھ دھو کر اپنی مخصوص چارپائی پر بیٹھی اپنے دوپٹے کے پلو سے منہ خشک کرنے لگیں۔ ابو بھی جاگ رہے تھے لیکن ابھی تک لیٹے ہوئے تھے۔ تیار چائے چولہے سے اتار کر میں توے پر گھی ڈال کر رات کی بچی روٹیاں تلنے لگی۔ اسی وقت دروازے پر ہونے والی دستک نے سب کو ہی اپنی طرف متوجہ کیا۔

''اتنی صبح صبح کون آ گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''دکان دار آیا ہوگا باجی۔ کل ہی کہہ رہا تھا، ابھی تک راشن کے پیسے نہیں بھجوائے۔'' نادر نے بتایا۔

''اس سے کہہ دو کہ دس تاریخ کو دے دیں گے۔'' امی نے نادر سے مخاطب ہو کر کہا۔ اتنی دیر میں ایک بار پھر دستک ہوئی۔ اس بار دستک ذرا زور سے دی گئی تھی۔

''دس تاریخ کو مکان کا کرایہ بھی دینا ہے۔ کل سے آنا شروع ہو جائے گا۔'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر چائے سے بھرا پیالہ اور تلی ہوئی روٹی اماں کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''نادر جا کر دیکھو تو سہی...... کوئی اور ہی نہ ہو۔'' ابو نے لیٹے لیٹے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

نادر اٹھ کر دروازے کی طرف گیا۔ ہماری تشویشی نظریں بھی اسی طرف تکی ہوئی تھیں۔ دروازہ کھلتے ہی نمودار ہونے والے چہرے کو دیکھ کر ابو اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''کلیم [illegible] ہے۔'' ابو کے چہرے پر خوشی چھا گئی۔ جیسے ابو [illegible] کا شدت سے انتظار ہو۔ میں اپنے سر سے سرکا ہوا [illegible] درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ امی نے بھی اپنی [illegible] ہو کر ان کا استقبال کیا۔ اتنی دیر میں وہ برآمدے تک پہنچ چکے تھے۔ چچا کے ساتھ چچی نادرہ بھی تھیں۔ چچی نے [illegible] آمدے تک آتے آتے اونچی آواز میں کہا:

''کیا ہو گیا تھا بھائی جان...... سنا تھا کہ [illegible] پر گر پڑے تھے۔'' انہوں نے یہ بات اتنی اونچی آواز میں کہی تھی کہ آس پڑوس کے لوگوں نے بھی سن لی ہوگی۔

''ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔'' نادر فٹ سے بول پڑا۔

''ہائے نصیب دشمناں۔'' چچی نادرہ نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

چچا نے امی اور میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ ابو سے مصافحہ کیا اور ابو کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ چچی ہمارے پاس ہی چادر پر بیٹھ گئیں۔ میں نے ان کی خدمت میں چائے پیش کی۔

''نہیں نہیں...... ناشتا تو ہم کر کے ہی نکلے تھے۔'' چچا نے تکلف کرتے ہوئے کہا۔

''لیجیے چچا...... ہضم ہو گئی ہوگی آتے آتے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور انہوں نے پیالہ پکڑ لیا۔

''لو...... ہم کوئی پیدل آئے ہیں کیا اورنگی ٹاؤن سے، کل ہی تو نئی موٹر سائیکل لی ہے تمہارے چاچو نے۔'' چچی نے عادتاً بلند آواز میں کہا اور چائے کا پیالہ اٹھا لیا۔

''سرکاری اسپتال لے گئے ہوں گے۔ بھائی صاحب کو۔'' چچی نے ناگواری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''سچ بات تو یہ ہے کہ پرائیویٹ اسپتال غریبوں کی پہنچ سے دور ہے۔'' امی نے جواب دیا۔

''افسوس تو ہوتا ہے بہن تمہاری غربت کا۔ اگر پہلے [illegible] ہو جاتا تو موٹر بائیک نہ خریدتے اور آپ کی مدد [illegible]۔'' چچی نے منہ بسورتے ہوئے بھنویں سکیڑ کر کہا۔ ان کا انداز متکبرانہ تھا۔ امی نے خجالت سے نظریں اِدھر اُدھر گھمائیں۔ ان کی بات مجھے بھی اچھی نہ لگی تھی۔

''اللہ کا شکر ہے بھابی! نصیب کا لکھا رزق تو ہر حال میں ملتا ہی ہے۔'' امی نے جھینپ کر جواب دیا۔

''ہر کوئی پرائیویٹ اسپتالوں میں تھوڑا ہی جاتا ہے۔ سرکاری اسپتالوں میں بھی اچھا علاج ہوتا ہے۔'' چچا نے کہا۔

چچی کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ ان کا کھلا ہوا چہرہ مجھے زہر آلود لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں غرور عیاں تھا۔ مجھے بہت برا لگا کہ وہ ہمیں نیچا دکھانے کے درپے تھیں۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ ایسا کرارا جواب دوں کہ ان کا سارا غرور و تکبر ہوا ہو جائے لیکن ایسا کرنا میرے لیے نامناسب بات تھی۔ بس اسی سوچ نے مجھے خاموش رکھا۔

''فیکٹری سے لون لیا تھا تمہارے بھائی نے۔'' چچی گردن گھما کر ابو سے مخاطب ہوئیں۔

''اچھا!'' ابو نے مختصر جواب دیا۔

''یہ تو آپ نے پوچھا ہی نہیں کتنا لون لیا تھا؟'' چچی نے [illegible] ہوئے گردن کو کسی رقاصہ کی طرح دائیں بائیں حرکت [illegible] ہوئے کہا۔

''چھوڑو کیا بات لے کر بیٹھ گئی ہو تم۔'' چچا بول پڑے۔ چچا کا چہرہ بتا رہا تھا کہ ان کو بھی چچی کی باتیں گراں گزر رہی تھیں۔ چچی خاموش [illegible] مگر چہرے سے پتا لگ رہا تھا جیسے ان کو چچا کا یوں ٹوکنا [illegible] ہو لیکن چچی بھی اس وقت غرور کے پر لگا کر اڑ رہی تھیں۔ ان سے خاموش نہ رہا گیا اور چند لمحوں کے توقف [illegible] بول پڑیں۔ ''چلو...... بہر حال...... یہ بات ہر ایک [illegible] ضروری بھی نہیں کہ ہم نے کتنا لون لیا تھا، واپس بھی تو ہم نے خود ہی کرنا ہے۔''

''ہاں بہن! اپنے منہ کی کالک تو خود ہی دھونا ہوتی ہے۔'' امی نے ہنستے ہنستے جواب دیا۔

''ادھر لون لیا۔ ادھر خرچ کچھ بچا ہی نہیں۔ یہاں وہاں کی فضول خرچیوں میں ضائع کر دیا۔'' چچی نے اپنے تکبر کا ایک اور نمونہ پیش کیا۔ میں نے خجالت سے امی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ان کے تاثرات بدلنے لگے تھے۔ ان کا نچلا ہونٹ پھڑکنے لگا تھا، ان کی یہ کیفیت شدید غصے کی حالت میں ہوتی تھی اور ایسا تب ہوتا تھا جب بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا تھا۔ اس کنڈیشن میں امی کچھ بھی کہہ دیا کرتی تھیں۔ ان پر ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ چچی کی نظریں بھی امی کے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ امی ان کی باتوں کو نظر انداز کر رہی تھیں کہ گھر آئے مہمانوں کو کوئی ایسی بات نہ کہہ دیں کہ ان کی تذلیل ہو جائے مگر ایسا لگ رہا تھا کہ چچی امی کے اس مرض سے بخوبی واقف ہیں۔ جبھی تو ان کو اکسانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ امی ان کو کوئی بھاری سا جواب دیں۔ میں نے امی کو مخاطب کیا۔

''امی آپ بلڈ پریشر کی دوا کھا لیں ورنہ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' میں نے کہا اور کمرے سے امی کی دوا اٹھا لائی۔ یہ بات کہنے کا میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ چچی کو معلوم ہو جائے کہ امی کی طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اپنی زبان کی نشتر زنی بند کر دیں۔ چچی نے بھی امی کے بدلتے ہوئے تاثرات کو بھانپ لیا تھا [illegible] یکدم پینترہ بدلا۔

''وہ دراصل...... میرا مطلب ہے کہ میرا بیٹا اسد بہت فضول خرچ ہو گیا ہے۔ کالج کے لڑکے لڑکیوں کی پارٹیوں میں ہی الجھا رہتا ہے۔ ابھی دو دن پہلے ہی اٹھارہ ہزار روپے والا موبائل خریدا ہے میرے لعل نے۔ فیس بک پر ہزاروں لڑکیوں سے دوستی چل رہی ہے اس کی۔'' ان کی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان ایک لمحے کے لیے رکی۔ ان کی باتوں سے امی اکتا چکی تھیں۔ میں بھی کسمسانے لگی تھی۔ ابو بھی بے چینی سے بیٹھے پہلو بدل رہے تھے۔ ابو تو ویسے ہی خاموش طبیعت کے مالک تھے۔ غیر ضروری بات نہیں کرتے تھے۔

''چلو مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' چچا نے کہا۔ وہ بھی چچی کی باتوں سے اکتا گئے تھے۔

''چلتے ہیں جی۔ روز روز تھوڑا ہی آنا ہوتا ہے یہاں۔'' چچی نے کہا۔ انہیں ایک بار پھر [illegible] انہوں نے اشارے سے پانی [illegible] میں نے پاس ہی رکھے ہوئے کولر سے پانی کا گلاس بھر کر دے دیا۔

''سلیم بھائی نے باتوں باتوں میں ایک دفعہ اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا تھا۔'' چچی نے خوشی خوشی کہا۔

"کون سی خواہش چاچی؟" میں نے جلدی سے پوچھ لیا۔ چچی زور سے ہنسیں اور ایک آنکھ دبا کر بولیں:

"تمہاری شادی کی۔ میرے اسد کے ساتھ۔" انہوں نے کچھ ایسے رومانوی انداز میں کہا کہ میں شرما گئی۔ اپنی جگہ سے اٹھنے لگی تو انہوں نے میرے بازو سے پکڑ کر وہیں بٹھا لیا۔

"اری بیٹھی رہو۔ کہاں بھاگنے چلی ہو۔ میں کوئی تمہارا رشتہ لینے تھوڑا ہی آئی ہوں۔" اور میں وہیں بیٹھ گئی۔

چچی کی اس چھچھوری حرکت پر امی، ابو اور چچا بھی حیرت زدہ انہیں دیکھ رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا کہ چچی ہمیں شرمندہ کرنے کا منصوبہ بنا کر آئی ہیں۔

"ہر ماں باپ کی بہت خواہش ہوتی ہے کہ ان کی بیٹی ہمارے جیسے کھاتے پیتے گھرانوں میں بیاہی جائیں۔ لڑکی چاہے کتنی ہی بدصورت... کیوں نہ ہو۔" چچی کی اس بات پر سب ہی چونک پڑے۔ میں تو ندامت کے مارے زمین میں ہی گڑی جا رہی تھی۔ امی کسمسا کر پہلو بدلنے لگی۔ اب تو امی کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا۔

"میں نے ذکر کیا تھا اپنے اسد سے اس بارے میں۔ سچ پوچھو تو بہن آج کل کے نوجوانوں کی سوچ اوپر کی طرف جا رہی ہے۔" چچی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اڑنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ امی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ابو گہری سوچ میں گم تھے۔

ان کو اپنے بھائی کی عزت کا پاس تھا، ورنہ ایک منٹ میں بے عزت کر کے گھر سے نکال دیتے۔ دراصل امی کو بھی ان کا خیال تھا کہ کلیم چچا ذاتی طور پر بہت اچھے تھے اور بنا سوچے سمجھے کوئی بات نہ کرتے تھے۔ اب بھی وہ خاموش تھے۔ چچی زبان دراز تھیں۔ وہ آئے بھی بہت مہینوں کے بعد تھے۔ چچی اس سے پہلے بھی کئی بار ایسے حربے کر چکی تھیں کہ ابو اور چچا کی آپس میں ناراضگی ہو جائے مگر وہ ہر بار اپنی چال میں ناکام رہیں۔ ایک دو بار تو ہمارے گھر میں ہی چچا نے انہیں جھڑک دیا تھا۔ آج بھی چچی اپنی فطرت سے مجبور تھیں اور زبان چلائے جا رہی تھی۔

"چلو گھر...... اب تمہاری بکواس لمبی ہوتی جا رہی ہے۔" چچا نے چچی سے مخاطب ہو کر کہا تو چچی بجائے شرمندہ ہونے کے ڈھٹائی سے ہنسنے لگیں۔

"بس تھوڑی دیر میں چلتے ہیں۔" چچی نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ پتا نہیں کس مٹی کی بنی ہوئی تھیں کہ اپنی تکبرانہ فطرت کی غلاظت اچھالے چلی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ پھر بولیں۔ "میرا اسد کہہ رہا تھا کہ فیس بک پر اس کی ایک سے ایک لڑکی سے دوستی ہے۔ بہت لڑکیوں کی آفر ہو چکی ہیں اسے۔" چچی نے کہا میں کمرے میں جانے کے لیے اٹھنے لگی تو امی نے کہا۔ "سب کے لیے اچھا سا [...] بناؤ۔"

میں بجائے [...] جانے کے وہیں کچن میں ہی مصروف ہو گئی۔ میں [...] تھی کہ امی نے ایسا کہہ کر موضوع بدلا تھا اور ان باتوں سے سب کا دھیان ہٹانے کے لیے کہا تھا۔

"نہیں بس ہم چلتے ہیں۔" چچا [...]

"بیٹھو بھائی...... کس بات کی جلدی ہے؟" ابو نے چچا سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کسی جاننے والے کے ذریعے ایک دو لوگوں نے میری عذرا کے لیے بات چلائی تھی۔ وہ بھی تمہاری طرح گھمنڈی، مالدار اور جھوٹی شان و شوکت کے پر لگا کر ہوا میں اڑنے والے لوگ تھے۔ میں نے سوچا......!" اتنا کہنے کے بعد امی ایک لمحے کو رکیں۔ چچی حیرت سے امی کا منہ تکنے لگیں۔ ان کے چہرے پر شرمندگی چھا گئی۔ امی پھر بولیں۔

"میں نے سوچا کہ ہم غریب لوگ ہیں اور یہ مالدار ہوتے بہت لالچی ہیں۔ ہم نے تھوک دیا ان کھاتے پیتے گھرانے پر۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ میں تو اپنی اس کالی صورت والی بیٹی کو اپنے جیسے غریبوں میں ہی بیاہوں گی۔ ویسے صورت نہیں سیرت اچھی ہونی چاہیے۔" امی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اچھا بہن ہم چلتے ہیں۔" چچی نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھنے لگیں تو امی نے انہیں بازو سے پکڑ کر بٹھا لیا۔ جیسے انہوں نے مجھے بٹھایا تھا۔

"بیٹھو بہن! آج دوپہر کا کھانا تم ہمارے ساتھ ہی کھانا۔" امی نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ "تم نے اپنی نوما کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔" امی نے ان کی بیٹی کے بارے میں پوچھا۔ چچی خاموش ہی رہیں۔ "تمہاری نوما بھی تو ماشاء اللہ بہت خوب صورت

[...] میں ایک ہے۔ گوری چٹی۔" امی کی اس [...] اترانے لگیں۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ [...]

"[...] ماشاء اللہ سے دسویں جماعت میں پڑھ رہی [...]" چچی نے کہا۔

"[...] کیوں نہیں لے کر دیا۔ تم نے ٹچ موبائل؟" [...] ہنستے ہوئے کہا۔

"[...] پیچھے رہنے والی ہے۔ اس نے بھی بیس ہزار والا موبائل لیا ہے۔"

"اچھا......!" امی نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تمہاری نوما کے فیس بک والے دوست بھی اسد سے دو چار سو زیادہ ہی ہوں گے۔" امی نے کہا تو چچی کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی چھا گئی۔ وہ حیرت سے امی کو دیکھنے لگیں چچا بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ "توبہ توبہ اللہ معاف کرے۔ اس فیس بک والی یاری دوستی سے۔ آئے دن اخباروں اور ٹی وی میں پڑھنے سننے کو ملتا ہے۔ فلاں لڑکی فلاں کے چکر میں پھنس گئی۔ فلاں کی بیٹی عاشق کے ساتھ بھاگ گئی۔ میں تو کہتی ہوں نظر رکھا کرو اپنی گوری چٹی نوما پر۔ کہیں اس کی [...] فیس بک والے کے ساتھ بھاگنے کی خبر نہ [...]" امی کی اس بات نے سب کو ہی چونکا دیا تھا۔ [...] اس طرح اچھل پڑیں کہ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"منہ سنبھال کر [...] بھابی۔" چچی ایک دم غصے میں آگئیں۔ ان کا رنگ سرخ ہو [...]

"سنا آپ نے۔ کیسا بہتان لگا رہی ہیں ہماری نوما پر۔" چچی نے چچا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ان کی بلند آواز پورے گھر میں گونجنے لگی تھی۔ آخر چچی [...] مطلب میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ ان کا یہی وتیرہ تھا۔ خود [...] باتیں کر کے سامنے والے کو مجبور کر دیتی تھیں اور پھر [...] کے سامنے مظلوم بننے کی کوشش کرتی تھیں۔ آج بھی انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔

چچا پہلے تو خاموش رہے اور پھر بولے۔ "میں نے تمہیں گھر سے نکلتے وقت اور راستے میں بھی سمجھایا تھا کہ کوئی ایسی بات مت کرنا جس سے جھگڑا بنے۔"

"ابھی فیس بک والی بات کس نے کی۔ کیا ہماری نوما بھاگنے والی لگتی ہے۔" انہوں نے چچا کو اکسانے کی کوشش کی۔

"میں نے تو اس ماحول کی بات کی ہے فیس بک کی دوستیوں یاریوں کا انجام بتا رہی تھی۔ آج کل ایسا ہو رہا ہے۔" امی نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"چھوڑو ان باتوں کو کوئی اور قصہ چھیڑو۔" ابو نے کہا لیکن چچی نے بات کو خواہ مخواہ ہی طول دے دیا۔

"چھوڑیے امی...... آپ ہی چپ ہو جائیں۔" میں نے امی کو ٹہوکا دیتے ہوئے کہا اور پانی کا گلاس بھر کر چچی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پانی پیو چچی۔"

چچی نے میری طرف غصے سے دیکھا اور کہا۔ "نہیں پینا مجھے پانی وانی۔" اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "کیا گل کھلائے ہیں تم نے کہ ماں باپ نے تمہیں گھر سے نکالنے کی ٹھان لی ہے۔ جیسی ماں ایسی بیٹی۔" چچی نے کہا۔

"ہاں ہاں...... میں تمہیں بھی تو نصیحت کر رہی ہوں۔ کل کلاں کو کوئی بات ہو گئی تو لوگ کہیں گے کہ نوما کی ماں بھی بھاگ کر آئی تھی سلیم کے چھوٹے بھائی کے ساتھ۔"

"یہ تو آپ غلط بات کر رہی ہیں بھابی۔ وہ آپ کی بیٹی جیسی ہے۔" چچا نے امی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اچھا! جو میں اتنی دیر سے تمہاری بیوی کی شر انگیزی کو نظر انداز کر رہی تھی وہ تمہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے تو ہر بات ہمیں ذلیل کرنے والی کی۔ اگر سلیم نے رشتہ دینے کی بات کی تو تمہارے بیٹوں کو اپنا بیٹا سمجھ کر ہی بات کی ہوگی۔ اگر تم لوگوں کو رشتہ پسند نہیں تو نہ سہی۔ اگر تمہارے بچے ہواؤں میں اڑ رہے ہیں تو ہماری دعا ہے کہ وہ اور بھی اونچی ہواؤں میں اڑیں۔" امی نے چچا سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جلنے والے تو جلتے ہی رہیں گے۔" چچی نے ایک اور فسادی گولا پھینکا۔

"جلتی ہے ہماری جوتی۔ تھوکتی ہوں ایسی اڑان پر...... آخ تھو۔" امی نے کھنکھار کر زمین پر تھوکا۔

"بس کرو...... بس کرو...... چپ ہو جاؤ۔" ابو نے اونچی آواز میں چیخ کر کہنے کی کوشش کی مگر بیماری کی وجہ سے ان سے بولا نہیں جا رہا تھا پھر ابو نے غصے میں اپنے پاس ہی رکھے ہوئے گلاس اور پیالہ ایک ایک کر کے صحن کی پکی زمین پر پھینک دیا۔ پیالہ تو کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا

گلاس اسٹیل کا تھا اس لیے ٹوٹا نہیں۔ ”کیوں مارنا چاہتے ہو مجھے۔ کیوں مارنا چاہتے ہو۔“ ابو نے اپنا منہ پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ میں دوڑ کر ابو کے پاس پہنچ گئی۔ ان کے ہاتھ پکڑے۔

”اب تو خوش ہو ناں۔ اتنی دیر سے اپنی شیطانیت کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔“ امی نے چچی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”تم لوگ میری طبیعت پوچھنے نہیں بلکہ ہمارے منہ پر کالک ملنے آئے ہو۔“ ابو نے روتے ہوئے کہا۔

”خدا نہ کرے بھائی۔ آپ یہ کیسی بات کر رہے ہیں۔“ چچا نے کہا۔

”ہم کالک کیوں ملیں۔ کالک تو تمہاری بیٹی ملے گی تمہارے منہ پر۔“ چچی نے چیختے ہوئے کہا۔

”بکواس بند کرو۔ جب میں تمہیں سمجھا کر لایا تھا۔ تو تم نے ایسی بات کیوں کی؟“ چچا نے چچی سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ غصے میں تھے۔

”میں نے کون سی غلط بات کی ہے۔“ اب چچا اور چچی کے درمیان تکرار ہونے لگی تھی۔ میں چچا کے سامنے آ گئی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر ان کی منت کرنے لگی۔

”خدا کے لیے چچا خاموش ہو جائیں۔ چلو مانا کہ امی کی غلطی ہے۔“

”کیوں امی کی غلطی ہے؟ غلط بات تو اس نے کی ہے۔“ امی نے میری بات کاٹ کر کہا۔

”اچھا! ہم چلتے ہیں۔“ چچا نے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

”اب تو یاک نہیں تیرے چرچے ہوں گے فیس بک پر۔“ چچی نے انگلی کے ساتھ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”چلو گھر چلو۔“ چچا نے چچی کو... بازو سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ وہ غصے میں لرز رہے تھے۔ وہ دونوں چلے گئے۔

”خس کم جہاں پاک۔“ امی نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

ان کے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک گھر میں وحشت چھائی رہی۔ گھر کے تمام افراد ہی اداس رہے۔ میرا دل تو خون کے آنسو رو رہا تھا۔ امی میرے چہرے کی طرف دیکھتی تو میں اپنی نظریں اِدھر اُدھر گھما دیتی جیسے کوئی مجرم نظر چراتا ہے۔ ابو کا دھیان بھی میری طرف ہی تھا۔ وہ میرے دل کی کیفیت کو خوب سمجھتے تھے۔ میں نے کمال ضبط سے کام لینے کی کوشش کی لیکن جب صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو پلکوں کا بند ٹوٹ گیا اور آنسوؤں کا سیلابی ریلا بہہ نکلا اور بے اختیار میری ہچکیوں کی آواز پورے گھر میں گونجنے لگیں۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں تھا۔ میں برآمدے میں ہی کچن کے پاس بیٹھی تھی۔ میرا جسم بے جان ہونے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں گر جاتی امی آ کر میرے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ انہوں نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

”[illegible] باتوں کو دل پر مت لو۔“ امی نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”میں نصیبوں جلی ہوں ناں ماں؟“ میں نے روتے روتے پوچھا۔

”نہیں! تم تو بہت نصیبوں والی ہو۔“ امی نے کہا تو میں نے چونک کر ان کے چہرے [illegible] کہا۔ میں چہرے کے تاثرات سے ان کے دل کی بات [illegible] چاہتی تھی کہ ماں مجھ پر طنز تو نہیں کر رہی ہیں لیکن وہ [illegible]

”ہاں! نصیبوں جلے تو وہ لڑکے ہیں جن کا ساتھ [illegible] سے نہیں مل پا رہا۔ تم سے ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے۔ سارا قصور تو اس معاشرے کا ہے ان لوگوں کا ہے جو اپنے گریبان میں نہیں جھانکتے اور اپنے ہاتھوں کی کالک دوسروں کے منہ پر ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ ماں کی ممتا نے آج مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تھا ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی کہ شاید ماں کی نظر میں بھی میں ہی قصوروار ہوں۔ اماں نے جو مجھے ڈھارس دی تو دل کو اطمینان ہوا۔

”تمہیں ہی خاموش ہو جانا چاہیے تھا۔“ ابو نے کہا جو اتنی دیر سے خاموش مجسم بنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے امی کو مخاطب کر کے کہا۔

”آپ اس کی باتیں بھی سن رہے تھے یا نہیں؟“

”سن تو سب کچھ رہا تھا۔ میں چاہتا تو دو ٹوک جواب بھی دے سکتا تھا مگر گھر آئے مہمان تھے۔“

”تو...... ہر آنے والا مہمان ہمیں ذلیل کر کے چلا جائے۔ کیوں؟ ہم کوئی ایسے گرے پڑے ہیں۔“ امی نے کہا۔ تھوڑی دیر کے توقف کے بعد امی ایک لمبی سانس خارج کرتے ہوئے بولیں۔ ”میری بھابی نے آ کر جلی کٹی سنائیں پھر آپ کی بھابی نے زمین آسمان ایک کر دیے۔ بہت ضبط کیا۔ آخر مجبور کر ہی دیا بولنے پر۔“ امی نے سرد

[illegible] غربت جو ہے ناں یہ لوگوں کی نظروں سے گرا دیتی ہے سدرہ۔“ ابو نے امی کا نام لے کر کہا۔

”امیری، غریبی تو سب اللہ کے کام ہیں۔ اس میں [illegible] کا کیا قصور ہے؟“ امی نے کہا۔

میرا دل بہت ملول ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر کمرے میں [illegible]۔ ٹھنڈے فرش پر لیٹ گئی۔ چچی کی باتوں کی [illegible] ہونے لگی تھی۔ آنکھیں موند کر میں نے سو جانے کی کوشش کی مگر ذہن الجھا ہوا تھا۔ نہ جانے مجھے کیا ہونے لگا تھا۔ چیخنے چلانے کو جی چاہ رہا تھا۔ زور زور سے رونے اور اپنے کپڑے پھاڑ دینے کو دل چاہ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ پاگلوں جیسی حرکتیں کروں۔ پاگل نہ ہو کر بھی پاگل بن جاؤں۔

”یا اللہ خیر کر۔“ میں نے دعا کی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ کچن میں پانی کے بھرے جگ سے گلاس بھرا اور بے صبروں کی طرح منہ سے لگا لیا۔ میرے جسم میں کپکپی ہونے لگی تھی۔ میں نے پانی سے بھرا جگ یکدم اپنے اوپر انڈیل دیا۔

”عذرا یہ کیا کر رہی ہو؟“ امی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے امی کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھا اور پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

ہوش آیا تو مجھے اپنے بازو پر اس قدر دباؤ محسوس ہوا کہ جیسے شکنجے میں جکڑ لیا ہو۔ میں نے سر کو دائیں بائیں جھٹکنے کی کوشش کی۔ پورے وجود میں دکھن کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ ڈاکٹر آگے کو جھکا ہوا تھا۔ وہ میرا بلڈ پریشر چیک کر رہا تھا۔ بازو پر بی پی آپریٹر کے بیلٹ کا دباؤ تھا جس میں ہوا بھری ہوئی تھی۔ اسی کے دباؤ سے مجھے تکلیف ہو رہی تھی۔ جسم جلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے چاروں طرف آگ جل رہی ہو۔ [illegible] طرف نادر کھڑا سسکتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ رو رہا تھا۔ امی بوکھلائی ہوئی میرے بھیگے بدن پر کپڑا پھیلا رہی تھیں۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نیم جان ان کے درمیان چارپائی پر برآمدے میں پڑی تھی۔ سب کچھ دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر کی آواز سنائی دی۔ ”بخار بہت تیز ہے۔ بلڈ پریشر بھی کم ہو گیا ہے۔ ذہنی دباؤ کی وجہ سے ہی ایسا ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ دوا تجویز کی اور ہدایات دے کر چلا گیا۔

☆......☆

ابو کی طبیعت سنبھلتے سنبھلتے تقریباً دس دن لگ گئے ہوں گے۔ اتنے دنوں بعد ابو آج نہائے تھے ورنہ تو چارپائی پر ہی بیٹھے بیٹھے ان کے ہاتھ پاؤں اور کبھی سر دھلا دیا جاتا۔ یہ ذمے داری بھی میں انجام دیتی اور کبھی امی۔ آج ہی سلمان جنرل اسٹور والے نے ابو کو بلوایا تھا۔ بلاوا بھی نادر کے ذریعے ہی آیا تھا۔ بلانے کی وجہ پوچھی تو جواب ملا۔

”کوئی ضروری کام ہوگا ناں۔“ امی نے کہا۔ ابو بھی پیغام سن کر خوشی خوشی جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ امی اور ابو نے ایک طرف ہو کر آپس میں کوئی بات کی۔ [illegible] لگ رہا تھا کہ اندر کی بات ان کو معلوم ہے مگر ہم [illegible] مجھ سے اور نادر سے چھپائی جا رہی ہے۔ ابو گئے اور کافی دیر بعد لوٹے۔

”تمہارے رشتے کی بات چل رہی ہے۔“ [illegible] وقت شام کی چائے کا دور چل رہا تھا۔ [illegible] امی نے میرے قریب ہو کر سرگوشی کرتے ہوئے [illegible] کہا۔ [illegible] کے جواب میں، میں کیا کہتی۔ سوائے شرما کر [illegible] لینے کے۔

”سلمان جنرل اسٹور والے کے جاننے والے [illegible] لوگ ہیں۔ لڑکے اور تمہاری عمر میں زیادہ نہیں تو دس سال کا فرق ہے۔ اتنا فرق تو کوئی فرق نہیں کہلاتا۔ لڑکا کسی گارمنٹ فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ کل تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں۔“ امی نے کہا۔ میں اپنے کام میں مصروف رہی۔

اس رات میں سہانے تصورات میں کھوئی رہی۔ [illegible] آنکھوں کے سامنے مردانہ وجاہت سے لبریز نوجوانوں کی صورتیں میری نگاہوں کے سامنے آتی جاتی رہیں۔ [illegible] جانے کی بھرپور کوشش کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور رہی۔ امی نے تصویر دیکھنے کو کہا تو [illegible] یکسر انکار کر دیا تھا۔ اپنے ہونے والے شریک حیات کو دیکھنا کوئی بری بات تو نہ تھی۔ دل میں [illegible] تصویر [illegible] گئی۔ میں نے اٹھ کر اِدھر اُدھر [illegible] تصویر [illegible] دی پر رکھی ہوئی ملی۔ [illegible] اچھی تھی۔ متاثر کن [illegible] آپ ہی آپ تھا۔ دل میں مچلنے والی خوشی [illegible] مسکان آ گئی اور پھر نجانے کس پہر آنکھ لگ گئی۔

اس وقت تقریباً دن ڈھل چکا تھا۔ جب مہمانوں کی آمد ہوئی۔ سلمان جنرل اسٹور والا ان کے ساتھ تھا۔ اسی کی کوششوں سے یہ رشتہ ہوا تھا جس سے میرا رشتہ ہونے جا رہا تھا اس کا نام عادل تھا۔ دو تین عورتیں اور اتنے ہی مرد تھے۔ ان کا تعلق حیدرآباد سے تھا۔ میں کمرے میں چھپ گئی تھی۔ اس دن امی نے مجھے گھر کا کوئی کام بھی نہ کرنے دیا تھا۔ انہوں نے خود ہی سارے کام نمٹائے تھے۔ گھر میں گہما گہمی تھی۔ پُررونق ماحول میں ہر ایک کے لہجے میں خوشی ترنم بن کر نکل رہی ہو۔ امی، ابو اور نادر مہمانوں میں مصروف تھے۔ میں اکیلی ہی کمرے میں ایک طرف اپنے آپ میں سمٹی بیٹھی تھی۔ دل میں خوشی اس بات کی تھی کہ والدین کے سر سے میرا بوجھ اتر جائے گا۔ جس کی خاطر وہ برسوں سے پریشان تھے۔ برسوں بعد خوشی نصیب ہوئی تو نہ کوئی بہنیں نہ سہیلیاں۔ نہ ہم جولیوں کا ہنسی مذاق اور نہ چھیڑ خانی۔ عورتوں نے آکر مجھے دیکھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" ایک بڑی بی نے پوچھا۔

"عذرا۔" میں نے دھیرے سے جواب دیا۔

"کچھ کھانا پکانا آتا ہے......یا......"

"جی!" میں بیچ میں بول پڑی۔ یہ دوسری عورت نے پوچھا تھا۔ انہوں نے میرے گھونگھٹ کے اندر سے جھانک کر مجھے غور سے دیکھا۔ آپس میں کوئی کھسر پھسر کی اور دعائیں دیتی ہوئی باہر چلی گئیں۔ اس لمحے میرا دل زور سے دھڑک کر چھاتی کی دیوار سے ٹکرا گیا۔

"اب اس مختصر سے انٹرویو کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

باہر سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ شربت بنانے کی بات ہو رہی تھی، مٹھائی تقسیم کرنے کی بات سنائی دی۔ تبھی ایک بھاری آواز سنائی دی۔ "بھائی صاحب ہمیں سلمان نے آپ کے حالات کھل کر بتائے ہیں ہمیں کچھ بھی نہیں چاہیے۔ آپ صرف ایک کپڑے میں رخصت کریں گے۔"

"لیکن......!" ابو نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ اسی بندے کی آواز سنائی دی۔

"میرا مشورہ ہے کہ آپ نے جب لڑکے کو پسند کرلیا، ہمیں بھی لڑکی پسند آگئی ہے تو دیر کس بات کی۔ جو کام کل ہو وہ آج کیوں نہ ہو جائے۔ میرا مشورہ ہے کہ آج ہی نکاح پڑھا کر رخصتی دے دیں۔"

"مگر......" ابا نے پھر کچھ کہنا چاہا تھا کہ امی بولیں۔

"ہمیں منظور ہے۔ اسی وقت مولوی صاحب کو بلا لیا جائے۔"

"شکر ہے۔ تمہارا نصیب جاگ گیا ہے۔ تم تو بہت نصیبوں والی ہو۔" امی نے آکر خوشی خوشی مجھ سے کہا۔ میرا دل بھی بلیوں اچھلنے لگا تھا۔

"میں صدقے، میں واری۔" اماں نے میری بلائیں لیں۔ میں خاموش نظر جھکائے بیٹھی تھی۔

"ان لوگوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا۔ کبھی کبھی سر کا سائیں [illegible] بھی ہو جاتا ہے۔ نرم لہجے میں دھیمی آواز میں بات کرنا [illegible] جتنی خدمت کروگی تو اس کی اتنی محبت پاؤ گی۔ مرد، [illegible] کا تاج ہوتا ہے۔" اماں نے ساری باتیں سمجھائیں [illegible] دیر باتیں کرتی رہیں۔ اتنی دیر ہی میرے گھونگھٹ اور پلو کو [illegible]

اچانک ہی باہر سے شور کی [illegible] دی تو اماں اور میں نے چونک کر باہر دروازے کی طرف [illegible]

"یہ کیا ہوا؟" میں نے دھیمی آواز میں [illegible] آواز چچی کی تھی۔ وہ اپنے انداز میں چیخ کر بات کر رہی تھیں۔

"میں دیکھتی ہوں۔" اماں نے کہا اور کمرے سے باہر کی طرف دوڑی۔

سب لوگ برآمدے میں ہی تھے اس لیے ذرا ذرا سی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ چچی کہہ رہی تھی۔

"بڑی دھوم مچا رکھی ہے تمہاری عذرا نے فیس بک پر......!"

"فیس بک......!" میں نے حیرت سے اس لفظ کو دہرایا اور پھر چچی کی بات کی بازگشت میرے کانوں میں ہونے لگی۔ جب چچی نے غصے میں ہمارے گھر سے نکلتے ہوئے کہا تھا۔

"اب تمہاری عذرا بھی آئے گی فیس بک پر۔" میرا پورا وجود کانپ کر رہ گیا۔

"جاؤ خالہ جاؤ، پھر تمہیں بلالیں گے۔"

سلمان اسٹور والے کی آواز تھی جو ضرور چچی سے مخاطب تھا۔ میرا دل ہول کھانے لگا۔

اٹھ کر دو قدم بڑھ کر دروازے کے قریب ہو گئی۔ میں باہر ہونے والی باتوں کو غور سے سننے لگی اور دروازے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔ چچی نے موبائل ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور کہہ رہی تھیں۔ "توبہ توبہ! کوئی دیکھے تو روح کانپ

[illegible] بی؟" مہمان چچی کو حیرت زدہ پھٹی پھٹی [illegible] رہے تھے۔

[illegible] لاؤ موبائل۔" سلمان اسٹور والے نے چچی [illegible] چھیننے کی کوشش کی۔

[illegible] چھوڑو۔ تم کہاں سے ٹپک پڑے بیچ میں۔" [illegible] دھکا دیتے ہوئے کہا۔

[illegible] ناٹک ہے تمہارا۔" امی نے جھڑک کر چچی سے [illegible] ششدر کھڑا تھا۔ مہمان آپس میں کھسر پھسر [illegible] تھے۔

"ناٹک نہیں۔ تمہاری عذرا کے کرتوت ہیں۔" چچی نے کہا اور آناً فاناً موبائل ایک مہمان عورت کو دکھایا۔

"ہائی ماں!" اس عورت نے دیکھتے ہی چیخ کر کہا اور اپنا سینہ پیٹ لیا۔ اس نے دوسری عورت سے کہا اس عورت نے آگے بڑھ کر موبائل اس کے ہاتھ سے لے لیا اور توبہ توبہ کرتی ہوئی کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔ سب کے تاثرات بگڑ گئے تھے۔

"اچھا ہوا سچ سامنے آگیا۔" ایک عورت نے کہا۔

"چلو چلو مجھے نہیں کرنی شادی وادی۔" عادل نے بلند آواز میں کہا تو ان کے ساتھ آئے ہوئے سب ہی مہمان [illegible] تائید کرتے ہوئے چلنے کو تیار ہو گئے۔

[illegible] یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ خدا کے [illegible]" امی ابو ایک ایک کو روکنے کی کوشش [illegible] کے سامنے ہاتھ جوڑ رہے تھے مگر کوئی بھی ان کی بات [illegible] رہا تھا۔

میں نے نادر کو پکارا جو [illegible] رہا تھا۔ وہ جلدی سے میرے پاس آگیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے نادر سے پوچھا۔

"باجی......" نادر نے کچھ کہنا چاہا [illegible] پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا مہمان آئی ہوئی ایک عورت [illegible] میری طرف بڑھا دیا۔

[illegible] یہ بات ہے۔" موبائل کی اسکرین کو دیکھ کر میں ہکا بکا [illegible] گئی۔ تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ میرا جسم سن ہو گیا۔ فیس بک میں لگی ہوئی میری عریاں تصویر میرے سامنے تھی۔

"یہ......یہ غلط ہے......جھوٹ ہے......" میں نے کہا اور ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "یہ الزام ہے۔"

"تمہیں شادی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کوٹھا آباد کرلو۔" اس عورت نے کہا اور سب کو چلنے کا کہتی ہوئی خارجی دروازے کی طرف بڑھی۔ مجھے گھر کی ہر چیز گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ میں زمین پر گری اور پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو پتہ نہ جان پائی کہ میں کہاں ہوں۔ حرکت کرنے کی کوشش کی تو ایسا لگا کہ جیسے میرے جسم کے تمام جوڑ اکڑ گئے ہوں۔ حلق میں خشکی کے ساتھ کانٹوں کی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ کانوں میں تیز ہواؤں جیسی آواز پڑ رہی تھی۔ کروٹ بدلنے کی کوشش کی تو جسم جیسے لکڑی کی طرح اکڑ گیا ہو۔

"میں کہاں ہوں؟" میں نے سوچا۔ آنکھ کھولی تو دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھیں جھپکائیں، دھیرے دھیرے منظر صاف ہوا۔ پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ غنودگی کے سبب پھر آنکھیں خود بخود ہی بند ہو گئیں۔ کسی نے میرے ہاتھ کو پکڑ کر اوپر کو اٹھایا۔ بمشکل تمام گردن گھما کر اپنے دائیں جانب دیکھا۔ سفید کوٹ پہنے ہوئے گلے میں آلہ لٹکائے ڈاکٹر کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی خالہ بلقیس کا چہرہ دکھائی دیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو

"لیٹی رہو، لیٹی رہو۔" ڈاکٹر نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ میں پھر لیٹ گئی۔ اٹھنے کی ہمت بھی نہیں پڑ رہی تھی۔ نیم جان ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر میری نبض چیک کر رہا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے؟" ڈاکٹر کی آواز سنائی دی۔ میں آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتی مگر کہیں کھل پا رہی تھیں۔ غنودگی ایسی کہ جیسے کوئی نشہ آور چیز کھالی ہو۔ دوسرے ہاتھ پر چبھن کا احساس ہوا۔ سر اٹھا کر دیکھا۔ ڈرپ کی سوئی لگی ہوئی تھی۔

"میں اسپتال میں ہوں۔" میں نے سوچا۔

"اسٹاف اسے یہ انجکشن لگا دو۔" ڈاکٹر نے کسی سے مخاطب ہو کر کہا۔ تھوڑی دیر بعد میرے دوسرے بازو پر نرس نے انجکشن لگا دیا۔ میں نے پھر سے آنکھیں موند لیں۔

"ہاتھ مت ہلانا۔ سوئی ہل جائے گی۔" یہ خالہ بلقیس نے کہا تھا۔

"اچھا......چھا......" میں نے کہا۔ آواز حلق میں ہی دب گئی۔ آہستہ آہستہ نیند کا غلبہ ہونے لگا اور پھر میں ہر چیز سے غافل ہو گئی۔

نہ جانے کتنی دیر بعد مجھے دوبارہ ہوش آیا تھا۔ سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا۔ اس وقت میں اسپتال کے وارڈ میں تھی۔ میرے بیڈ

کے پاس بینچ پر خالہ بلقیس بیٹھی تھی۔ وہ نجانے کن سوچوں میں گم تھی۔

"خالہ!" میں نے پکارا تو وہ یکدم چونک کر میری طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اٹھ کر میرے قریب ہو گئی۔

"میری بچی۔" خالہ نے محبت سے کہا۔

"مم...... میں یہاں۔" میں نے کہا۔

"بس اچانک تمہاری طبیعت ذرا خراب ہو گئی تھی۔ اب ٹھیک ہو جاؤ گی۔" خالہ نے پیار سے میرے گال پر تھپکی لگائی۔

"یہ دوائیں۔" مردانہ آواز کان میں پڑی۔

گردن گھما کر اپنے بائیں طرف دیکھا۔ سلمان بھائی کھڑے تھے۔ دواؤں سے بھرا شاپر ان کے ہاتھ میں تھا۔

"کیسی طبیعت ہے بہن؟"

"بہن!" اس کے منہ سے نکلے ہوئے لفظ کو دہرایا تو نجانے کیوں۔ میرا دل بھر آیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"ہمت سے کام لو۔ حوصلہ رکھو۔" سلمان بھائی نے دلاسا دیا۔

"ڈاکٹر سے پوچھ تو لو۔" خالہ نے سلمان بھائی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ڈاکٹر نے گھر جانے کا کہا ہے۔" سلمان بھائی نے جواب میں کہا۔

"چلو بیٹی گھر چلیں۔" خالہ نے کہا اور مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ میں ان دونوں کے ساتھ اسپتال کے وارڈ سے باہر چل پڑی۔

"امی...... ابو...... نادر......!" اچانک ہی مجھے خیال آیا تو میں نے رک کر خالہ سے پوچھا۔

"سب گھر میں ہیں۔" خالہ نے کہا۔

"اچھا!" میں نے کہا اور ان کے ساتھ چل پڑی۔ سلمان بھائی نے میرا ضروری سامان اٹھا رکھا تھا۔ میں ان کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ خالہ بلقیس نے میرے گرد اپنے دائیں بازو کا حلقہ بنا کر مجھے تھام رکھا تھا۔ سلمان بھائی ہم سے دو چار قدم آگے چل رہے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ تھی، کوئی اسٹریچر پر مریض کو ڈالے لیے جا رہا ہے تو کوئی وہیل چیئر پر، کوئی ویسے ہی مریض کو سہارا دیئے چل رہا تھا۔ جیسے خالہ مجھے لیے جا رہی تھی۔ ویسے بھی مریضوں کے ساتھ آنے والے بے شمار لوگ تھے جو تیز تیز چلنے کی کوشش میں کسی نہ کسی سے ٹکرا جاتے۔ جیسے مجھ سے کوئی نہ کوئی ٹکرا جاتا۔ مجھے ویسے بھی چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ سر بوجھل ہو رہا تھا۔

"ابو کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں خالہ؟" میں نے مری مری آواز میں پوچھا۔

"ہاں ہاں وہ بالکل ٹھیک ہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔

سلمان بھائی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ میں نظریں گھما کر ان کو تلاش کر رہی تھی۔

"یوں لگتا ہے کہ جیسے سارے شہر کے لوگ اسی اسپتال میں آ گئے ہوں۔" خالہ نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

اسپتال کے احاطے سے باہر نکلے تو بے شمار لوگ دیوار کے ساتھ، چادریں، رلیاں وغیرہ بچھائے بیٹھے تھے، مرد و زن، بچے بوڑھے، کوئی لیٹا ہوا تھا، کوئی بیٹھا ہوا تھا، کوئی جاگ رہا تھا، تو کوئی سو رہا تھا۔

گیٹ سے باہر نکلے تو رکشا والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ایک جگہ رکشا کے پاس سلمان بھائی دکھائی دیئے۔ انہوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا۔ ہم دونوں ان کے پاس پہنچے۔ "گھر کا پتا تو ٹھیک طرح سے سمجھا دیا ہے ناں؟" خالہ نے اس سے پوچھا۔

"ہاں خالہ۔" سلمان بھائی نے کہا اور مجھے رکشا میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خالہ نے پہلے مجھے رکشا میں بٹھایا اور پھر خود بیٹھ گئیں۔

"تم آگے ڈرائیور کے پاس بیٹھ جاؤ۔" خالہ نے سلمان بھائی سے کہا۔ وہ کوئی جواب دیئے بغیر ڈرائیور کے برابر میں بیٹھ گئے اور ڈرائیور نے رکشا چلانا شروع کیا۔

ابھی تک میرے حواس بہتر طریقے سے بحال نہیں ہوئے تھے۔ دماغ بوجھل سا ہو رہا تھا۔ میں اسی کشمکش میں تھی کہ اس وقت امی ابو میرے ساتھ کیوں نہیں ہیں۔ میں ذہن پر زور دے رہی تھی۔ سب کچھ مجھے یاد آ رہا تھا۔ اس دن میرا نکاح ہونے والا تھا۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ لڑکے والے بھی خوش تھے۔ انہوں نے مجھ میں کوئی عیب نہیں نکالا تھا۔ نہ کالی رنگت کا اور نہ ہی میرے بھدے نقوش کا عیب۔ بس بات پکی ہوئی کہ چچی نے آ کر سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ اس نے امی کے ساتھ ہونے والی تکرار کا انتقام لیا تھا۔ میرا گھر بسنے سے پہلے ہی اجاڑ دیا تھا۔ اس نے میرے سسرالیوں کو جو میری تصویر دکھائی تھی۔ اس کے بارے میں بعد میں پتا چلا تھا کہ دو تصویروں کو جوڑ کر چچی نے سوفٹ ویئر کی مدد سے کسی اور کے دھڑ پر میرا چہرہ لگا دیا تھا۔ فیس بک کی اس تصویر میں میرے چہرے کی دھجی بھی دکھائی نہ دے رہی تھی لیکن انہوں نے کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ میں تو اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ مجھے تو ٹھیک طرح سے موبائل چلانا بھی نہیں آتا تھا۔ بس صرف کال سننا اور کرنا آتا تھا۔ ہمارے پاس ایسے وسائل تو نہ تھے کہ ان کا استعمال کرنے کی ضرورت پیش آتی۔

امی ابو بھی مجھ پر شک کر رہے ہوں گے۔ انہوں نے چچی کی جھوٹی بات کو سچ سمجھ لیا ہوگا اسی لیے وہ میرے ساتھ اسپتال بھی نہیں آئے۔ اسی غصے میں انہوں نے خالہ بلقیس اور سلمان بھائی کو کہہ دیا ہوگا کہ وہ ہی مجھے اسپتال لے جائیں لیکن میرے ماں باپ ایسے سنگدل تو نہ تھے۔ وہ تو میرا ... مجھ پر واری صدقے جاتے تھے۔ میں ہر ایک ... کرادی گئی تھی اور یہ ساری چال چچی کی تھی۔

ایک جھٹکا لگا اور میں چونک گئی۔ رکشے سے باہر میں نے اپنے اطراف جھانک کر دیکھا۔ رکشا ہمارے گھر کے آگے کھڑا تھا۔ گلی محلے کے چھوٹے بڑوں کا ہجوم جمع ہو رہا تھا۔ سب حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ خالہ مجھ سے پہلے ہی اتر گئیں۔

"چلو ... کیا تماشا لگا رکھا ہے۔" سلمان بھائی نے کھڑے ہوئے تماشائیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

خالہ نے آگے بڑھ کر گھر کا دروازہ دھکیلا۔ دروازے کے دونوں پٹ با آسانی کھل گئے۔ دروازے کو اندر سے کنڈا نہیں لگایا گیا تھا۔ خالہ مجھے تھام کر اندر لے گئیں۔ میں گھر میں داخل ہوتے ہی حیرت سے ادھر اُدھر کا جائزہ لینے لگی۔ ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

سلمان بھائی نے آگے بڑھ کر برآمدے میں بچھی ہوئی چارپائی کی بے ترتیب چادر کو ذرا سا جھٹکا تو دھول اڑی جیسے طوفان آ گیا ہو۔ ہم تینوں کو ہی کھانسی ہونے لگی۔ اس نے چادر لپیٹ کر ایک طرف پھینک دی۔

"آؤ...... بیٹھو......" سلمان بھائی نے کہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اپنے ہی گھر میں مہمان ہوں۔

"چلو آؤ۔ تھوڑا آرام کر لو۔" خالہ نے کہا اور مجھے سہارا دے کر برآمدے میں چارپائی پر بٹھا دیا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ گلی کے بچے گھر کے اندر گھس آئے تھے۔ وہ حیران کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"امی ابو؟" میں نے کہا اور خالہ اور سلمان بھائی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ دونوں ہی جواب میں خاموش رہے۔ میرا دل دھڑک گیا۔ مجھے دل پر ایسا بوجھ محسوس ہونے لگا کہ جیسے کسی نے مٹھی میں دبوچ لیا ہو۔

"پانی پیو گی؟" خالہ نے پوچھا۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی تھی اور سلمان بھائی ایک طرف ہنوز کھڑے تھے۔

"کہاں ہیں امی ابو؟" میں نے پوچھا۔ میری آواز بھر آئی۔ حلق میں پھانس آئی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔

"باجی...... باجی...... باجی......" اسی وقت دروازے کی طرف سے آواز آئی۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ نادر گھر کے صحن میں کھڑے بچوں کو دھکیلتا ہوا دوڑتا ہوا آیا۔ میں نے یکدم اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر وہیں ڈھے گئی۔ وہ مجھ سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگا۔ میں نے بھی اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

"باجی ابو مر گئے...... ابو مر گئے۔" اس نے بلکتے ہوئے کہا تو میں نے یکدم اسے اپنے آپ سے ہٹا دیا اور حیران اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"کیا؟" میں نے کہا اور ایک بار پھر خالہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں بیٹی، اسی دن تمہاری چچی کی چیخ پکار پر سینہ پکڑے ایسے گرے کہ پھر اٹھ نہ سکے۔" خالہ نے کہا اور اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔

اس خبر نے مجھے آپے سے باہر کر دیا تھا، میں رونے چیخنے لگی۔ اپنا منہ پیٹا، سینہ کوبی کی، بال نوچے، بہت روئی، بہت دیر تک روتی رہی۔ بے بسی کا رونا رو رو کر خاموش ہو گئی۔ اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔ آنسوؤں کا نہ رکنے والا سیلاب رک ہی گیا۔ نڈھال ہو کر بے جان شے کی طرح چارپائی پر گر پڑی۔

نادر میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس کی بھی سسکاریاں گونج رہی تھیں۔

"امی......!" مجھے اچانک ہی امی کا خیال آ گیا۔

"کمرے میں ہیں۔" نادر نے کہا۔

"کیا...... کمرے میں ہیں امی!" میں اچھل گئی اور اٹھ بیٹھی۔ میں دوڑ کر کمرے کی طرف بڑھی۔ دروازے کو ذرا سا دھکیلا تو دونوں پٹ کھل گئے۔ کمرے میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں وہیں دروازے کے پاس ہی رک گئی۔

خاموشی چھائی ہوئی تھی جیسے اندر کوئی موجود نہ ہو۔
"امی......امی جان۔" میں نے پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا۔
"نادر۔" کوئی جواب نہ پا کر میں نے چھوٹے بھائی کو پکارا۔ نادر کمرے میں آ گیا۔ اتنے میں میری نظر ایک طرف کونے میں سہمی ہوئی بیٹھی اپنی ماں پر پڑی۔
وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ میں دو قدم واپس دروازے کی طرف پلٹی۔ میں نے دروازے کے برابر لگی کھڑکی کھول دی۔ روشنی کمرے میں پھیل گئی۔ اب ہر چیز واضح دکھائی دے رہی تھی۔ کمرا دھول سے بھرا ہوا تھا۔ ماں کے بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر دھول جمی ہوئی تھی۔ کپڑے مٹی سے اس قدر بھر چکے تھے کہ ان کی اپنی رنگت ہی نہ رہی تھی۔
"اماں......اماں جی۔" میں اسے پکارتی ہوئی ان کے قریب ہو گئی مگر ماں تو کچھ بول ہی نہ رہی تھی۔ میں وہیں امی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔
"یہ کیا ہو گیا ماں؟" میں نے پوچھا۔ میری بھرائی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔ ایک بار پھر میرے آنسوؤں کی دھار بہنے لگی۔ ماں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن وہ اس طرح سانس لینے لگی کہ اس کا جسم باقاعدہ طور پر ہلنے لگا تھا۔ پھر اس کے منہ سے لمبے لمبے سانس لینے کی آواز خارج ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی وہ نظریں لگائے مجھے گھورے جا رہی تھی۔
"باجی باہر آ جاؤ۔" نادر نے میرے کندھے سے پکڑ کر کہا۔
"کیوں؟" میں نے بیٹھے بیٹھے سوالیہ نظروں سے نادر کی طرف دیکھا اور پھر اچانک ہی میرے منہ سے چیخ نکلی۔ میں آگے کی طرف گر پڑی۔ ماں نے میرے بالوں کو اپنی انگلیوں میں جکڑ لیا تھا۔
"یہ کیا کر رہی ہو ماں؟ کیوں ایسا کر رہی ہو؟" میں نے اپنے بالوں کو چھڑانے کی کوشش کی۔
"سلمان بھائی......خالہ......" نادر نے پکارا۔
اتنے میں ماں نے مجھے مارنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے مجھے پیٹ رہی تھی اور میں اس کے آگے گری اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس میں اتنی قوت نجانے کہاں سے آ گئی تھی۔ وہ مجھے مارے جا رہی تھی۔ میں اٹھنے کی کوشش میں بار بار گری جا رہی تھی۔ خالہ اور سلمان بھائی بھی کمرے میں آ گئے تھے۔ ان دونوں نے بمشکل تمام امی کو پکڑا۔ انہوں نے مجھے چھڑایا اور ماں کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ میں ایک طرف کھڑی ہو کر رونے لگی۔ ماں کی حالت نفسیاتیوں جیسی ہو گئی تھی۔ وہ خالہ اور سلمان بھائی سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ لپک کر مجھ پر پھر سے حملہ کرنے کی کوشش میں تھی۔
"باجی باہر آ جاؤ باجی۔" نادر نے اونچی آواز میں کہا۔ وہ دروازے کے بیچ کھڑا تھا۔
"تم باہر چلی جاؤ۔" سلمان نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔
کمرے سے باہر نکلی ہی تھی کہ کمرے سے کسی سامان کے گرنے کی آواز آئی تھی۔ نادر نے کچن کے ایک کونے میں رکھے ہوئے بلاک کو سرکا کر کوئی چیز اٹھائی اور کمرے کی طرف دوڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی تھی۔
"یہ انجکشن ہے سلمان بھائی۔" نادر نے کہا اور انجکشن سلمان بھائی کو تھما دیا۔ نادر اور خالہ نے اماں کو بازو سے پکڑا اور سلمان بھائی نے انجکشن لگا دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اماں کسی بے جان شے کی طرح گرنے لگی تو خالہ نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اماں اس کی بانہوں میں جھولنے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر اماں کو سہارا دیا۔
"باہر چار پائی پر ڈال دو ان کو۔" سلمان بھائی نے کہا۔
"عذرا تم ٹانگوں سے پکڑ لو۔" خالہ نے کہا تو میں نے اماں کے دونوں پیروں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔ خالہ، اماں کو اٹھائے دروازے کی طرف دو قدم ہی بڑھی تھیں کہ میں لڑکھڑا گئی۔ میں آگے کی طرف گر پڑی۔ اماں کے پیر میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئے۔
"پکڑو پکڑو سلمان۔" خالہ نے چلا کر کہا اور سلمان بھائی نے برق رفتاری سے آگے بڑھ کر ماں کو پکڑ لیا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ میں رونے لگی۔
"صبر، میں کندھے پر لاد کر لے جاتا ہوں۔" سلمان بھائی نے کہا اور اماں کو اپنے کندھے پر لاد کر برآمدے میں لے گیا۔ اماں کا جسم اتنا بھاری نہیں تھا۔ بے ہوشی کی وجہ سے ان کو سنبھالنا مشکل پڑ رہا تھا۔ میں روتی پیٹتی کمرے سے باہر نکل آئی۔

"اس طرح کرنے سے کچھ نہیں ہوگا بہن۔ حوصلہ رکھو۔" سلمان بھائی نے کہا۔
"ہاں بیٹی! اب تم ہی اس گھر کا واحد سہارا ہو۔" خالہ نے کہا اور اپنے ہاتھوں سے میرے بکھرے بالوں کو سنوارنے لگی۔ میں نے آنسو صاف کیے۔
"چلو بیٹا اٹھو۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔" خالہ نے کہا اور سلمان بھائی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "وہ چار پائی یہاں برآمدے میں لے آؤ سلمان۔" خالہ کے کہنے پر سلمان بھائی نے ایسا ہی کیا۔
"جاؤ کچھ کھانے کے لیے لے آؤ۔" سلمان بھائی نے جیب سے پیسے نکال کر نادر کی طرف بڑھائے۔ نادر پیسے لے کر باہر چلا گیا۔
اماں چار پائی پر کسی مردے کی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ اپنے دوپٹے کے پلو سے میں نے اماں کے چہرے سے دھول مٹی صاف کی۔
نادر کے آنے تک ان دونوں نے گھر کی صفائی ستھرائی میں میری مدد کی۔
"یہ رکھ لو بہن۔" سلمان بھائی نے پانچ سو کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"رہنے دیں بھائی۔" میں نے نوٹ لینے سے انکار کر دیا۔
"تو پھر گزارا کیسے کرو گی؟" خالہ نے پوچھا۔
"کسی بنگلے میں [illegible] کی نوکری کر لوں گی۔" میں نے جواب دیا۔
"اچھا پھر واپس کر دینا۔" سلمان بھائی نے کہا۔
"رکھ لو، رکھ لو۔" خالہ نے زور دیتے ہوئے کہا تو میں نے سلمان بھائی سے پیسے لے لیے۔
"آپ دونوں کو اللہ تعالیٰ اس کا اچھا اجر دے۔" میں نے ممنونیت سے کہا۔
آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان حالات میں میرے دل پر کیا گزری ہوگی۔ آخری وقت میں ابو کا منہ بھی نہ دیکھ پائی۔ خالہ نے بتایا کہ میں پانچ دن اسپتال میں بے ہوش رہی۔ ہوش آنے کے بعد گزرے حالات پر بہت روئی پیٹی اور آخر خاموش ہو گئی۔ سب سے زیادہ دکھ، ابو کی آخری رسومات میں شریک نہ ہونے کا تھا۔ چچی نے جو اپنی کمینگی کا ثبوت دیا تھا۔ اس پر ابو کو دل کا دورہ پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ امی اپنے حواس کھو بیٹھیں۔ چونکہ خالہ بلقیس اور سلمان بھائی اسی وقت موقع پر موجود تھے۔ جب میں گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسی وقت چچی کو خالہ اور سلمان بھائی نے گھر سے نکال دیا تھا، آئے ہوئے مہمان تو اسی وقت ہی چلے گئے تھے۔
ابو کے کفن دفن اور دیگر ساری رسومات سلمان بھائی، خالہ بلقیس اور محلے کے چند لوگوں نے مل کر کیے تھے۔ میرے علاج پر بھی انہوں نے ہی اخراجات کیے تھے۔ امی بھی اسی وقت اپنے حواس کھو بیٹھی تھیں۔ وہ نفسیاتی مریضہ بن گئیں۔ ان کا بھی ڈاکٹر سے چیک اپ سلمان بھائی اور خالہ نے ہی کرایا تھا۔ انجکشن لگانے سے اماں پر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ نادر نے ابو کے انتقال کی خبر چچا اور چچی کو نہیں دی تھی۔ یہ ساری باتیں مجھے نادر نے بتائی تھیں۔ امی پُرسکون نیند میں تھی۔ میں دوسری چار پائی پر لیٹ گئی۔ نادر بھی میرے ساتھ ہی لیٹ گیا تھا۔
"کیوں چچا چچی کو کیوں نہیں بتایا تھا؟" میں نے پوچھا۔
"ان کی وجہ سے تو آپ پر اتنی بڑی آفت ٹوٹی ہے۔ سارے محلے میں تصویر کے چرچے ہو رہے ہیں۔ ہر کوئی مجھے طعنے دے رہا ہے۔ میں نے سارے دوستوں سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔" وہ بولے جا رہا تھا۔ میں چپ چاپ سن رہی تھی۔ نادر کے منہ سے اپنی تصویر والی بات سن کر میں شرم سے پانی پانی ہوئے جا رہی تھی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لیٹے لیٹے گردن گھما کر میری صورت دیکھنے لگا۔
"تمہارے کپڑے بہت میلے ہو گئے ہیں۔" میں نے موضوع گفتگو بدل دیا۔
"میلے تو ہونا ہی ہیں۔ اتنے دن جو گزر گئے ہیں۔ ایک ہی سوٹ پہن رکھا ہے۔" نادر نے کہا۔
"کیوں!" میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں حیرت زدہ تھی۔
"کون دھوتا، امی کی یہ حالت ہو گئی۔ تم اسپتال پہنچ گئیں۔" نادر نے کہا اس کی آواز بھر آئی۔ آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے۔ دکھ سے میرا دل پھٹ گیا۔ کمرے میں جا کر میں نے الماری سے اس کا سوٹ ڈھونڈ نکالا اور لا کر دیا اور اس نے کپڑے تبدیل کر لیے۔
سلمان بھائی باہر جانے کے لیے کھڑے ہوئے تھے

کہ باہر دروازے پر دستک ہوئی اور دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے اور ایک خاتون تیز تیز چلتی ہوئی آکر سلمان بھائی کے روبرو کھڑی ہوگئی۔

''تم...... یہاں کیوں آئی ہو؟'' سلمان بھائی نے اس خاتون سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ اس خاتون کو دیکھ کر بری طرح چونک گئے تھے۔

''اس لیے کہ میں بھی تو دیکھوں کہ ایسی کون سی آسمانی مخلوق ہے جس کے پیچھے تم رات دن لٹو ہوئے پھرتے ہو۔'' اس عورت نے سلمان بھائی سے مخاطب ہو کر کہا۔ اس کا لہجہ نوک نشتر کی طرح چبھنے والا تھا۔

''بکواس بند کرو۔ میں اسے اپنی بہن کی طرح سمجھتا ہوں۔'' سلمان بھائی نے اسے جھڑک کر کہا۔ میں اور نادر حیران ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ ہماری زبان گنگ ہوگئی تھی۔

''میں تو سمجھ رہی تھی کہ کوئی حور پری ہوگی جس کے پیچھے سلمان صاحب نے بیوی بچوں کو بھی ایک طرف کر دیا ہے۔ دیکھنے سے پتا چلا کہ یہ تو ڈائن ہے۔'' اس خاتون نے مجھے زہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتی میں نے سلمان بھائی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''سلمان بھائی! یہ آپ کا احسان ہے کہ آپ میری عزت بہنوں جیسی کرتے ہیں۔ اب تک آپ نے جو ہمارے ساتھ ہمدردی کی اس کے صلے میں ہم آپ کو صرف دعا دے سکتے ہیں۔ ہماری خاطر آپ اپنا گھر خراب نہ کریں۔ معذرت کے ساتھ کہہ رہی ہوں۔ آپ چلے جائیں۔ خدا آپ لوگوں کو سکھی اور آباد رکھے۔'' میں نے کہا۔ میری آواز بھرا گئی تھی۔ نادر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہم دونوں بہن بھائی زار و قطار رونے لگے۔

''اگر اس کی جگہ تمہاری بہن ہوتی تو پھر؟''

سلمان بھائی نے اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر کہا اور خارجی دروازے کی طرف چل پڑے مگر اس کی بیوی وہیں کھڑی رہی... ہمارے پاس' اس کے چہرے پر ندامت عیاں تھی۔

''چلو...... آؤ بھی۔'' سلمان بھائی نے دروازے کے پاس رک کر اونچی آواز میں کہا۔

اس نے سلمان بھائی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی چادر کے پلو سے میرے آنسو پونچھنے لگی۔

''سوری تم بے قصور ہو تو قصور میرا بھی نہیں ہے۔ معاشرے کے لوگ ایسے ہی ہیں۔ صرف ظاہر کے جھوٹ کو دیکھتے ہیں۔ باطن کے سچ کو نہیں۔'' اس نے کہا اور میرے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ سلمان بھائی بھی واپس آگئے۔

سلمان بھائی نے سونیا سے فون لے کر کوئی نمبر ملایا۔

''[illegible] میں سلمان بول رہا ہوں باجی۔ میری چھوٹی بہن [illegible] نے کہا تھا کہ آپ کو گھر کے کاموں کے لیے...... نہیں [illegible] آپ کو شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ ہاں ایک چھوٹا بھائی ہے اس کا نادر...... دس بارہ سال...... اچھا چلو ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔'' سلمان بھائی نے بات ختم کی اور بتایا۔

''دو دن بعد بلایا ہے۔ پی [illegible] ملازمہ ہے۔ بہت اچھی خاتون ہیں۔ خدا ترس۔'' سلمان بھائی نے کہا۔

''اماں کا کیا ہوگا سلمان بھائی؟'' اماں کا خیال آیا تو میں نے پوچھا۔

''اماں جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتیں۔ ان کو نفسیاتی اسپتال میں داخل کروا دیں گے۔'' سونیا نے کہا اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔

دو دن بعد سلمان بھائی کے بتائے ہوئے پتے پر میں اور نادر پہنچ گئے۔ مالکن نے بہت سارے سوالات کیے تھے۔ جن کے جوابات دینا پڑے۔ یہاں آئے دو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان کے گھر کے تمام کام مجھے کرنا پڑتے ہیں۔ نادر اوپر کے کام کر لیتا ہے۔ انہوں نے رہائش کے لیے اپنے بنگلے میں ہی ایک چھوٹا سا سرونٹ کوارٹر دے رکھا ہے۔ جب کبھی ماضی یاد آتا ہے تو روح کانپ جاتی ہے۔ ہفتے میں ایک آدھ دفعہ نفسیاتی اسپتال جا کر اماں سے ملاقات کر آتی ہوں۔ آخری وقت میں ابو کا منہ تو نہ دیکھ سکی تھی، کبھی کبھار قبرستان جا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہوں۔ اپنی بے بسی کا رونا روتی رہتی ہوں۔

یہ صرف میری ہی نہیں۔ مجھ جیسی کئی لڑکیوں کی کہانی ہے جو ایسے حالات سے گزر کر میری طرح رو دھو کر خاموش ہو جاتی ہیں۔

تیسرا راستہ

محترم [illegible]
السلام عل[illegible]
ایک اور سچ بیا[illegible] کے ساتھ حاضر ہوں۔ اُمید ہے یہ بھی سرگزشت کے معیار کی ثابت ہوگی۔ قارئین سبق حاصل کریں گے۔

کنیز زہرا
(لاہور)

[illegible] سرخ اینٹوں [illegible] میں دو اینٹیں جما کر رکھی گئی [illegible] کی مدھانی کے گرد لپٹی چاٹی میں رسیوں کی مدد سے [illegible] رسیوں کو بے دلی سے کھینچتی ماروی مکھن بلوتے ہوئے جانے کن سوچوں میں تھی۔ نوری نے چھوٹی چھوٹی سی لکڑیوں کو مروڑ کے مٹی کے چولہے میں رکھا اور پاس پڑے کاغذ کو آگ دکھا کر ان سوکھی لکڑیوں پر پھینکا لمحوں میں سوکھی لکڑی نے آگ پکڑ لی تھی۔ نوری نے لکڑی کا قدرے بڑا ٹکڑا جو لہے کے اندر جمایا اور توا رکھ کے پیڑے بنانے لگی۔ کچھ ہی [illegible] میں

خستہ پراٹھوں کی خوشبو سارے صحن میں پھیل گئی۔ نرم گرم سی دھوپ نے گھر کی چوکھٹ پہ قدم رکھ دیا تھا۔ اوائل نومبر کی صبحیں اتنی سرد نہیں تھیں اس لیے وہ لوگ حویلی کے آنگن میں ہی ڈیرا جماتے تھے۔ سندھ کا یہ غیر معروف گاؤں ان کا مسکن تھا۔ ان کی گاؤں میں بہت عزت تھی ورثے میں ملنے والی یہ حویلی اور کئی کنال پہ پھیلے کھیت جو آدھے گاؤں کو گھیرے ہوئے تھے ان کی ملکیت تھے۔ ماروی کے ماں باپ بچپن میں ہی لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ باقی حویلی میں لوگ ہی کتنے تھے۔ ماروی سے بڑا سجاول اس کی بیوی نوری' ان کی چھ ماہ کی بیٹی بختاں، ان کی پھوپی مائی میراں، سجاول سارا دن زمینوں کے جھگڑے نمٹانے میں اور نوری چھوٹی سی بختاں کو سنبھالنے میں مگن رہتی۔ ماروی زیادہ تر مائی میراں کے پاس پائی جاتی۔ مائی میراں کو ان کے بابا نے اپنی زندگی میں ہی قرآن سے شادی کر کے بٹھا دیا تھا۔ ان کی زندگی کی ویرانی ماروی کو اپنے دل میں محسوس ہوتی۔ جبکہ مائی میراں تھیں کہ انہیں اس جہان سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔ انہیں اپنے کمرے کی دہلیز عبور کرنے کی اجازت نہیں تھی مگر دن میں ہزاروں بار ماروی کو لگتا کہ وہ خود دہلیز پار کرنا نہیں چاہتیں۔ شاید وہ دنیا سے روٹھ گئی تھیں دنیا تو انسانوں سے روٹھتی ہے وہ کیسی انسان تھیں دنیا سے روٹھ گئی تھی۔ جانے وہ پھر باتیں کس سے کرتی تھیں کہ ماروی ابھی بھی ان ہی کے بارے میں سوچ کے افسردہ تھی جب سجاول نے کاندھے پہ تولیہ ڈالے کسلمندی سے صحن میں قدم رکھتے ہوئے ایک کونے میں بنے ہینڈ پمپ کا رخ کیا۔ سجاول نے بائیں ہاتھ سے نلکا چلاتے ہوئے دائیں ہاتھ کی اوک میں پانی بھرا اور منہ پہ چھپاکے مارنے لگا مندھی مندھی سی آنکھیں جیسے پوری کھل گئیں۔ منہ صاف کر کے داتن سے دانت چمکاتا وہ چارپائی پہ آ بیٹھا تولیہ ایک طرف ڈالے وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا انگلیوں سے اپنے بال سنوار رہا تھا۔

"ماسی سکھاں کا فون آیا تھا کل اداسخاوت کے فون پہ، بہت بھلا لڑکا ہے۔ جب بھی چاچی چاچے سے ملنے گوٹھ آتا ہے مجھ سے ماسی سکھاں کی بات ضرور کرواتا ہے۔ سانول کا بڑا بیلی ہے، شہر میں اسی کے پاس رہتا ہے۔" پراٹھے چنگیر میں رکھتے ہوئے ان پہ اچار کا ٹکڑا سجایا اور سجاول کے سامنے رکھتے ہوئے نوری نے تفصیل سے بتایا تو ماروی کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے جلدی سے پاس پڑی کٹوری پکڑی اور دائیں ہاتھ سے مکھن نکال کے الگ رکھا اور باقی بچنے والی لسی پیتل کے بڑے سے گلاس میں بھر کے دونوں چیزیں سجاول کے پاس لے آئی۔

"اچھا، کیسی تھیں ماسی، کیا کہہ رہی تھیں؟" پراٹھے کے بڑے بڑے نوالے اچار اور مکھن کے ساتھ کھاتے سجاول نے پوچھا تو واپس مڑتی ماروی کے قدم ایک لمحے کے لیے سست پڑے۔

"بھلی چنگی تھیں بس اسرار کر رہی تھیں کہ اب تو سانول بھی اپنے پیروں پہ کھڑا ہو گیا ہے ہماری امانت ہمیں دے [illegible] دو تین پراٹھے مزید بنا کے نوری نے لکڑی کا بڑا ٹکڑا نکال [illegible] زمین پہ مار کے بجھایا تھا۔ اب کے چولہے میں مر[illegible] ہوئے کوئلے بچے تھے۔ نوری نے پاس ہی پڑے شا[illegible] آلو نکال کے چمٹے سے راکھ میں دبائے اور ہاتھ جھاڑتی [illegible] سجاول کے مقابل چارپائی پہ بیٹھ گئی۔

"تو اس میں ایسی کون سی بات ہے [illegible] تھا ان کا گھر ہے ان کی امانت ہے جب چاہیں آ[illegible]ئیں۔ ہم کتنی دیر دھی کو بٹھائے رکھیں۔ اب پڑھ لیا بڑا [illegible] گیا اب آئے اور لے کے جائے اپنی امانت۔" [illegible] گھونٹ بھرتے ہوئے سجاول بولا تو اس کا لہجہ خوشگوا[illegible] ہوئے تھا۔

"پتا ہے سجاول مجھے لگتا تھا کہ سانول اب پڑھ لکھ گیا ہے۔ وکیل بن گیا ہے۔ سنا ہے بہت بڑا گھر ہے اس کا شہر میں۔ تو مجھی شاید وہ ہماری ماروی کو نہ اپنائے۔ شاید وہ شہر میں شادی کر لے۔" خدشات سے پُر نوری کے لہجے میں شک کی آمیزش تھی۔

"اللہ نہ کرے۔" بھرجائی کی جگہ پیڑھی پہ بیٹھ کے دو پراٹھے اپنی چنگیر میں رکھتی ماروی کے ہاتھ کانپے تھے۔ بھرجائی پھر گویا ہوئی۔

"مگر اللہ کا شکر ہے کہ ماسی سکھاں اپنی بات پہ قائم رہیں۔ بے شک انہوں نے اماں کی سکھی ہونے کا فرض اچھے سے نبھایا ہے۔ ورنہ ہمارے گوٹھ کی روایات کے مطابق ماروی کو بھی تارک بیٹھنا پڑتا اب سانول کی چھوڑی ہوئی منگ کو کون اپناتا۔" اپنی ہی سوچ پہ جھرجھری لیتے ہوئے نوری نے کہا تو جہاں ساکت سی ماروی نے پراٹھے لیے قدم مائی میراں کے کمرے کی طرف بڑھائے وہیں سجاول نے دہل کے نوری کی جانب دیکھا اور غصے سے بولا۔

[illegible] سارا دن جانے کیا الٹا سیدھا سوچتی رہتی ہے۔ [illegible] ماروی مجھے بختاں جتنی عزیز ہے۔ کبھی تو سوچ [illegible] بے عقل عورت، کوئی لمحہ قبولیت کا بھی ہوتا [illegible] ناشتا کر چکا تھا۔ نوری کو گھرک کر سر پہ جمی [illegible] کرتا وہ گھر سے نکلتا چلا گیا۔ ماروی بھائی کی اس [illegible] نہال ہو گئی۔ نوری کو یکلخت اپنی بات کی سنگینی کا [illegible] تھا۔ شرمندگی کے گہرے احساس نے جیسے [illegible] کی روح کو جکڑا تھا۔ ماروی اسے بہنوں کی طرح [illegible] بھی۔ تب ہی بختاں کے رونے کی آواز پہ اٹھ کے اندر کو بھاگی۔ کچھ لمحوں میں وہ اسے گود میں لیے باہر آ گئی۔ صحن میں اب ہلکی سی دھوپ بسیرا کر چکی تھی۔ پیڑھی پہ بختاں کو گود میں لیے بیٹھ کے اس نے بچے ہوئے واحد پراٹھے کا لقمہ منہ میں ڈالا۔ پُرسوچ نگاہیں قد آدم سے بھی چھوٹی منڈیر پر بیٹھی فاختہ پہ ٹکی تھیں۔ پاس ہی درخت پہ گھات لگائے بیٹھی بلی نے لمحوں میں شب خون مارا تھا۔ اس نے منڈیر پہ چھلانگ لگاتے ہی اپنے نوکیلے دانت فاختہ کی گردن میں گاڑھ دیے اور فاختہ کے مردہ وجود کو لیے دوسری طرف اتر کر بھاگتی چلی گئی۔ سہمی نگاہوں سے دیکھتی نوری چاہ کے بھی [illegible] نہ کر سکی۔

"[illegible] ظالم پیٹ کی بھوک کسی کی معصومیت نہیں دیکھتی۔" [illegible] نوری کے حلق میں جیسے نوالہ اٹکا تھا۔

☆......☆

"اماں میراں [illegible] کمرے کی گھٹن میں تیرا دل نہیں گھبراتا؟" وہ پراٹھے لیے [illegible] داخل ہوئی تو کمرے کی سیلن زدہ دیواروں میں چھپی ٹھنڈ [illegible] گہرے احساس نے جکڑ لیا۔ بے اختیار وہ ہر بار پوچھے ہوئے سوال کو دہرا بیٹھی۔

"دھی رانی! کمروں کی گھٹن سے دل نہیں گھبرایا کرتے۔ ہاں لوگوں کے لہجوں میں [illegible] جلتے الاؤ [illegible] میں ان دیکھا غبار بھر دیتے ہیں۔ ایسی گھٹن کہ پھر سانس لینے کو بھی دل نہ چاہے۔" اماں میراں نے اٹھتے ہوئے اسے اپنے پاس جگہ دی۔

"آپ کیسے یہ بڑی بڑی باتیں کر لیتی ہیں۔ سچی بات ہے مجھے تو بالکل سمجھ نہیں آتی۔ پتا ہے مجھے لگتا ہے آپ بہت پڑھی لکھی ہیں بس مجھے نہیں بتاتیں۔" اس نے نوالہ اچار کی ڈلی سے رگڑ کے منہ میں رکھتے ہوئے انہیں چھیڑا تو وہ مسکرا دیں۔ ماروی کو ان کی ہنسی میں ان سنے بین سنائی

دیئے۔

"جھلی! بندے کا دل کوزے کا [illegible]
رب اس پہ اپنی محبت اپنی مرضی اپنی چاہت [illegible]
اسے اپنے بنائے ہوئے پیالوں پہ [illegible]
بری لکھ کر تارک الدنیا کر دیتی ہے تو پھر سوچ [illegible]
اثر زیادہ ہوگا۔ جو نفرت سے دھتکارے [illegible]
سے اپنا لے اس کی۔" انہوں نے [illegible]
کے برتن پیچھے کر دیئے اور سہل الفاظ میں [illegible]
ناشتا کرتی ماروی سر دھننے لگی۔

"ظاہر ہے جو چاہت سے اپنائے [illegible]
اماں! میں جب اماں اور بابا کو یاد کر کے اداس ہوتی [illegible]
مجھے آپ کے چہرے کا سکون یاد آتا ہے [illegible]
باپ کھو کے بے چین رہتی ہوں، آپ [illegible]
سکون میں کیسے ہیں۔ ایک بات کہوں [illegible]
نہیں ہوگا میں آپ کو بتا دوں کہ [illegible]
اپنے غموں پہ ماتم انسان کا حق ہوتا ہے [illegible]
پُرکشش نقوش اور [illegible] گندمی رنگت [illegible]
ملبوس پہ کہیں کہیں سفیدی جھانک رہی [illegible]
کے بالوں میں کہیں کہیں کوئی [illegible]
نیلاہٹیں لیے گہری آنکھوں میں [illegible]
"تمہیں کس نے کہا میں [illegible]
نہیں عام سی انسان ہوں نہ روؤں تو دل [illegible]
چیخ کے روؤں تو صبر کا دامن چھوٹ جائے [illegible]
پر اس کی رضا پہ راضی ہو جانے کی دعا کر [illegible]
جانے کہ جب کوئی اس کی رضا پہ راضی ہو جاتا ہے [illegible]
کے دل میں کتنا سکون اتار دیتا ہے۔" [illegible]
ہوئے زیر لب ورد کرتے ہوئے [illegible]
تو ماروی کے جیسے لب سل گئے۔

"اری چری! تو یہاں بیٹھی ہے اور میں [illegible]
گھر میں ڈھونڈ آئی۔ بھرجائی بھی بشیراں [illegible]
دھاڑ رہی ہے میں نے اس سے [illegible]
سکھی عائشہ پھولے سانسوں کے ساتھ [illegible]
میں داخل ہوئی اور اسے تقریباً جھنجوڑ ڈالا۔
"کیوں صبحان کی بچی تیری چوٹی [illegible]
گئی تھی جسے بجھانے کے لیے [illegible]
جو خالی برتن لیے کھڑی تھی اس اچانک [illegible]
تھی سو دھڑام سے ناشتے کے برتن زمین بوس ہوئے۔
ماروی نے برتن اٹھانے کی بجائے صبحان کی چوٹی کھینچی

ہوئے مذاق اڑایا۔

"اری لڑکیو کیوں ایک دوسرے کی دشمن ہوئی پڑی ہو۔ ماروی چھوڑ۔ اسے بتانے تو دے کہ تجھے ڈھونڈ کیوں رہی تھی۔" مائی میراں کا دل عیشاں کی درگت پہ پگھلا تھا۔ ماروی کو اس کے بال چھوڑنے کا کہتی اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ جبکہ ماروی نے عیشاں کے بال چھوڑتے ہوئے بھی ایک زوردار جھٹکا دیا تھا۔

"اماں میراں! دیکھ نا اسے میں تو سکھی سمجھ کر ہر جگہ جانے سے پہلے بھاگی بھاگی اسے لینے آجاتی ہوں۔ اک یہ ہے اسے قدر ہی نہیں میری۔" اپنا سر سہلاتے ہوئے اس نے شکوہ کناں نظروں سے ماروی کو دیکھتے ہوئے مائی میراں سے کہا تو وہ مسکرا دیں۔ ماروی برتن لیے باہر نکل گئی۔

"اچھا بتا تو جانا کہاں ہے۔" ماروی نے واپس آ کے اس کے کاندھے پہ جھول کے پوچھا تو وہ مسکرا دی۔ ان کی دوستی ایسی ہی تھی بات بات پہ روٹھ کے بلاوجہ مان جانے والی۔ تسبیح کے دانے گراتی اماں میراں بھی مسکرا دی۔

"اماں! گوٹھ میں میلا لگا ہے۔ تجھے تو پتا ہے بھرجائی کو میرا اس کو ساتھ لے جانا پسند نہیں تم بھرجائی کو سنبھال لینا۔ ہم ان سے کہیں گے کہ تیری اجازت سے جا رہے ہیں باہر۔" مائی میراں کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھے التجائیہ انداز میں کہتی عیشاں اس وقت ماروی کو بڑی اچھی لگی۔ عیشاں کو بھی اس کے بنا چین کہاں پڑتا تھا۔

"ہاں تا کہ بھرجائی اماں میراں کے سر ہو جائے نا بابا نا مجھے اماں کو مشکل میں ڈال کے جانے کا کوئی شوق نہیں۔" آنکھوں میں گہری یاسیت لیے وہ بولی تو اماں میراں نے نثار ہونے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ ان کی یہ بھتیجی ان کی شباہت لیے ہوئے تھی۔ ان کے جیسی ہی کشادہ پیشانی، ستواں ناک، ہلکی نیلی آنکھیں، کتابی چہرہ، سرو قد، کبھی کبھی وہ اسے دیکھ کے دہل جایا کرتی تھیں۔ کہیں ان کے سیاہ نصیب کا سایہ ان کی ماروی پہ نہ پڑ جائے۔

"تم لوگ جاؤ وہ اتنی ظالم بھی نہیں ہے کہ دوبدو ہو۔ دل کی اچھی ہے وہ بس تیری فکر کرتی ہے۔" ابھی بھی ایک اچٹتی نظر ڈال کر نگاہیں جھکاتے ہوئے انہوں نے اجازت دے دی تو عیشاں اپنی جگہ سے اچھلتی ہوئی اس کا ہاتھ پکڑے باہر کو لپکی تھی۔

"آج یہ سواریاں کہاں جا رہی ہیں۔ بندہ کم از کم کسی بڑے سے اجازت ہی لے لیتا ہے۔ یہ کیا کہ بے تحاشے بیل کی طرح باہر بھاگ جاؤ۔ ماروی میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ اب تم بڑی ہو گئی ہو تمہارا یوں گوٹھ میں گھومنا اچھا نہیں اور عیشاں تجھے اپنے گھر میں چین نہیں؟" دھوپ میں بچھی چارپائی پہ لیٹ کے فیڈر پیتی بختاں کے ساتھ لاڈ کرتی نوری کی ان پہ نظر پڑی تو تیکھے لہجے میں ٹوک بیٹھیں۔

"اماں میراں سے اجازت لی ہے ہم نے بھرجائی ویسے بھی میلے میں جا رہے ہیں ایک دو گھنٹے میں واپس آ جائیں گے... اور بس آج جانے دو پھر نہیں جائیں گے وعدہ پکا والا۔" [illegible] ہی قدموں پہ مڑتے ہوئے عیشاں نے وضاحت [illegible] وعدہ بھی کر لیا تو صحن میں جھاڑو دیتی کام والی چاچی بشیراں [illegible]۔

"جانے دے [illegible]! اس بیچاری کی نا ماں ہے نہ کوئی بہن لے دے کے یہ ہی ایک [illegible] تو ہے پھر یہ ہی تو ان کڑیوں چڑیوں کے گھومنے کے دن ہیں پھر پیا قسمت یا نصیب۔" اماں بشیراں نے مسکرا [illegible] ان کی حمایت کی تو وہ مسکرا کر سر ہلا گئی۔

"ٹھیک ہے جاؤ مگر جلدی آ جانا! [illegible]" وہ دوبارہ بختاں کی طرف متوجہ ہو گئیں تو یہ دونوں کلانچیں بھرتی دہلیز پار کر گئیں۔

تیز چمکتی دھوپ نے جیسے سردی کا دم خم نکال دیا تھا۔ اونچی نیچی پگڈنڈیوں پہ گزرتے اکا دکا لوگ اپنے آپ میں مگن تھے۔ فلک بوس درخت جیسے سنہری رنگ میں رنگے تھے۔ اکا دکا نظر آتے گھروں کی عورتیں گھروں کے باہر بیٹھی سبزی بنانے اور خوش گپیوں میں مصروف تھیں، یہ لوگ جلد ہی میلے پہنچ گئیں۔ جہاں بچوں کے کھلونوں، رنگ برنگی اجرکوں، شہر سے لائے ہوئے میک اپ چوڑیوں اور مٹی کے برتنوں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ ماروی مٹی کے برتنوں کی دیوانی تھی ابھی بھی مٹی کے نقشین پیالوں کو دیکھ کے پاگل سی ہو گئی۔ گھر سے نکلتے ہوئے وہ کچھ پیسے دوپٹے کے پلو سے باندھ کے لے آئی تھی۔ اس نے جھٹ سے مٹی کے مختلف رنگوں پہ عمدہ نقش و نگار بنے پیالے خرید لیے۔ دوسری چیز اس نے سیاہ چوڑیاں خریدی تھیں سیاہ اور سرخ چوڑیاں اس کی کمزوری تھیں۔ وہ جوڑا جس رنگ کا بھی پہنتی سرخ اور سیاہ چوڑیاں اس کے ہر پہناوے کا حصہ ہوتیں۔ وہ ابھی میلے میں گھوم ہی رہی تھیں جب عیشاں کا بھائی بھاگتا آیا۔

"ادی جلدی چل اماں پھسل کے گر گئیں ہیں ان کے سر سے خون نکل رہا ہے۔" ہانپتے کانپتے کہتے ہوئے وہ اس [illegible] کے کھینچنے لگا تو ماروی کو دیکھنے لگی۔

"[illegible] چاچی گر گئی ہے عیشاں! جا تو جلدی گھر جا۔ میں بھی [illegible] بھرجائی کے ساتھ آتی ہوں چاچی کو دیکھنے۔ تو تو [illegible] میں بھرجائی کو بتائے بنا کہیں نہیں جا سکتی ورنہ میں [illegible] ساتھ چلتی۔" اسے تسلی دے کے روانہ کرتی وہ بھی [illegible] کی طرف چل دی۔ پیپل کے درخت کے پاس اسے [illegible] نظر آیا جسے گوٹھ کے بچے پتھر مار رہے تھے۔ ماروی نے [illegible] انہیں للکارا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ دور سے [illegible] جھلے کے ہونٹوں اور ماتھے سے بہتے خون کو دیکھ سکتی تھی۔ اس کا حساس دل ترس اور ہمدردی سے بھر گیا۔ جھلے کی ماں بچپن میں ہی مر گئی تھی۔ باپ دوسرے ملک جا کے بس گیا۔ رشتے دار کوئی اس پیدائشی ذہنی معذور کو رکھنے پہ آمادہ نہیں تھا۔ اس طرح یہ بے نام ذہنی معذور بچہ پورے گوٹھ کا ہی بیٹا بن گیا۔ اس کی بھی سائیکی عجیب تھی کبھی بالکل بچوں کی طرح باتیں کرتا کبھی اتنا سنجیدہ لگتا کہ ہوش مندوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا۔ ماروی نے پاس پہنچ کے دوپٹا اس کے ماتھے سے بہتے خون پہ رکھا اور اسے اپنے ساتھ لیے چلنے لگی۔ ارادہ یہ ہی تھا کہ اسے اماں جنتاں کے حوالے کر کے گھر چلی جائے گی۔

"ادی! یہ سب بڑے ہیں بہت برے ہیں نہیں رہنا مجھے یہاں۔ چل چل تو اور میں بھاگ چلیں کہیں۔ جہاں یہ سب نہ ہوں۔" دائیں بازو کی آستین سے ہونٹ صاف کرتا وہ بڑبڑاتے ہوئے یوں بول رہا تھا جیسے مکمل ہوش میں ہو مگر وہ [illegible] بولتا تو سوچ کے بولتا۔ بچپن سے وہ اس کی کسی بات کا برا نہیں مانتی تھی اس کا دل جھلے کی حالت پہ کٹتا تھا۔

"ہاں ہاں میں بھاگوں گی تیرے ساتھ ابھی تو اماں جنتاں کے گھر چل۔ دیکھ تو کیسا [illegible] خون بہہ رہا ہے تیرا۔" اسے بہلاتی پھسلاتی وہ بدستور [illegible] کھینچتی آ گے لے گئی۔ کچھی تنگ پگڈنڈی پہ چلتے چاچے رمضان [illegible] انہیں دور تک دیکھا تھا۔ ان کی سماعتوں نے بس ماروی [illegible] تھا۔ دور جاتے جھلے کی ابھی بھی یہ ہی گردان تھی۔ "بھاگ [illegible] نا تو میرے ساتھ وعدہ کر۔" کاندھے پہ کدال اٹھائے زمینوں سے گھر کی طرف جاتا رمضان ابھی بھی مدھم ہوتی ان کی پرچھائیوں کو گھور رہا تھا۔

"ارے کیا ہوا ابا! کیوں بت بنا کھڑا ہے چل گھر نہیں چلنا۔ اماں فکر بنائے راہ تاک رہی ہوگی۔" راستہ اب سنسان تھا۔ بچل نے اس کا کاندھا ہلاتے ہوئے جیسے اسے ہوش میں لانا چاہا۔

"یار بچل مجھے یہ جھلا کبھی کبھی بالکل ٹھیک لگتا ہے۔ [illegible] کہیں ہم گوٹھ والوں کو چرا تو نہیں رہا۔" [illegible] سوچ انداز میں [illegible] نیچے تلے قدم بڑھاتے ہوئے اس نے کہا تو بچل نے [illegible] باپ کو دیکھا۔

"ابھی جھلا حویلی والوں کی بیٹی کو کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ بھاگ چل۔ اور تو اور وہ بھی کہہ رہی تھی میں تیرے ساتھ ضرور بھاگوں گی۔" رمضان چاچا کی آنکھیں [illegible] احساس سے سرخ تھیں۔ آخر ماروی اس گوٹھ کی عزت تھی۔

"ارے ابا! تو بھی کس چکر [illegible] پڑ گیا [illegible] جانتا نہیں وہ تو جھلا ہے کچھ بھی بولتا ہے [illegible] ہے۔ جانتا نہیں وہ تو جھلا ہے [illegible] مائی جنتے کے گھر گیا۔ اسے بھی بھی کہہ رہا تھا [illegible] بھاگ چل میرے ساتھ۔" رمضان کا شک دور کرتا بچل آخر میں جھلے کی نقل اتار کے ہنسنے لگا تو رمضان خاموش [illegible] ٹھیک کہہ رہا تھا بھلا وہ جھلا ٹھیک کیسے ہو سکتا ہے [illegible] بچپن یونہی پاگل پنے میں گزرا ہو۔ رمضان بچل کے ساتھ چل دیا۔

☆ ☆ ☆

"اماں میراں! جانتی ہو میرا کیا دل چاہتا ہے [illegible]" تیل کی شیشی میں سے تھوڑا سا تیل ہاتھ میں [illegible] پوچھنے لگی تو آنکھیں موندے بیٹھی میراں مسکرا دی۔

"کیا چاہتا ہے؟" وہ بالوں میں [illegible] ماروی کی انگلیوں سے پھوٹتے روح تک [illegible] سکون کو محسوس کرنے لگیں۔

"میرا دل چاہتا ہے میں جھلے کا علاج کرواؤں۔ دیکھتی نہیں کبھی کبھی وہ بالکل صحیح دماغ لوگوں جیسی باتیں کرتا ہے۔ شاید تھوڑے بہت علاج سے وہ ٹھیک ہو جائے۔" [illegible] کے گھنے گھنگریالے بالوں کی جڑوں کو انگلیوں کی پوروں سے [illegible] مانگ نکال نکال کے تیل سے بھگوتی ماروی [illegible] محسوس کی جانے والی ہمدردی تھی [illegible] کہے کے مشرق کو کھلنے والی کھڑکی کھلوائی تھی [illegible] کرتی دھوپ کی کچھ کرنیں احسان جتاتی [illegible] قدم رکھ چکی تھیں۔ میراں جیسے ماروی کی محبت پہ نہال ہو گئی [illegible]

"ہاں کیوں نہیں جلد ہی تیری شادی [illegible] جائے گی۔ سنا ہے بڑا وکیل بن گیا ہے [illegible] شاید وہ جھلے کو بھی شہر علاج کے لیے لے جائے۔" ماروی کے گھٹنے پہ کہنی مارتے ہوئے انہوں نے ہنس کے کہا تو وہ بھی

مسکرا دی۔

''تب تو میں تجھے بھی ساتھ لے جاؤں گی یہاں تھوڑا ہی چھوڑوں گی۔ میں نہیں مانتی اس تارک شارک کی رسم کو تو میرے ساتھ میرے گھر میں ہی رہے گی۔'' تھوڑا سا لجاتے ہوئے وہ دوٹوک لہجے میں بولی تو بال کمیٹی میراں متوحش ہو گئیں۔

''ایسا نہیں کہتے خدا نہ کرے تجھ پہ کبھی میری کم نصیبی کا سایہ پڑے۔ بیٹیوں کے گھر نہیں رہا جاتا، بس انہیں بستے دیکھ کے ان کی بلائیں لی جاتی ہیں۔'' دل میں اٹھتے ہیجان پہ قابو پاتی وہ اسے سمجھانے لگیں تو وہ ان کی حالت کے پیش نظر خاموش ہو گئی۔

''اللہ! میری ماروی کو سکھوں کے ہنڈولے میں رکھے تمام عمر۔ ایک بھی غم کبھی بھی تجھے چھو کر نہ گزرے آمین۔'' اس کی پیشانی چومتے ہوئے انہوں نے دعا دی۔ مگر پتا نہیں کیوں انہیں لگا دعا عرش کو چھو کے واپس آ چکی ہے۔ یکلخت ان کے دل کو عجیب سے احساس نے گھیرا تھا۔

تب ہی دروازے پہ ہونے والی زوردار دستک پہ ماروی اٹھ کے باہر کو بھاگی جبکہ میراں نے جھٹ کمرے سے ملحقہ چھوٹے سے واش روم میں جا کے وضو کیا اور جا نماز بچھا کے سجدے میں گر گئیں۔

''ارے ادی وسائی آپ؟ بڑے عرصے بعد چکر لگایا آپ نے۔'' ماروی نے دروازہ کھولا تو سامنے نوری کی بڑی بہن وسائی کھڑی تھی۔ اس نے خلوص سے پوچھتے ہوئے انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''کیا بتاؤں کتنے بکھیڑے ہیں میری جان کو۔ میرا بس چلے روز آؤں تیری یہ موہنی صورت دیکھنے کو مگر کیا کروں آ نہیں سکتی۔ ویسے یہ نوری کہاں ہے۔'' اس نے نوری کا پوچھا تو ماروی نے وہیں سے آواز دی۔ وسائی نے بغور اس کے سرخ و سفید رنگت اور پرکشش نقوش والے نوخیز چہرے کو دیکھا۔ ایسے ہی تو ان کا لاڈلا شادو اس سے شادی کے لیے کوئی پچیس بار اسے رشتے کے لیے نہیں بھیج چکا تھا۔ وہ تھی بھی تو پریوں جیسی۔ یہ الگ بات کہ سگی بہن کا گھر ہونے کے باوجود وہ ہر بار نامراد لوٹتی تھی۔

''تو کب آئی ادی؟ بختاں کی طبیعت خراب ہے رات سے۔ ساری رات اس لڑکی نے مجھے جگائے رکھا۔ ابھی سوئی تھی تو ساتھ میری بھی آنکھ لگ گئی، تو سنا تو کیسی ہے؟'' وسائی سے گلے ملتی نوری نے تابڑ توڑ سوال شروع کر دیئے۔

''جھلی میں ابھی آئی ہوں، تو ایک سانس میں ایسے سوال پوچھ رہی ہے جیسے ابھی سب کچھ پوچھ پاچھ کے مجھے باہر کا راستہ دکھا دے گی۔'' وسائی نے ہنس کے کہتے ہوئے نوری کے کاندھے پہ دھپ لگائی تو وہ بھی کھسیانی ہنسی ہنس دی۔

''لیں ادی! گرم گرم گاجر کا حلوا کھائیں، بھرجائی نے سحری میں ہی اٹھ کے بنایا تھا بہت مزے کا ہے۔'' ماروی نے [...] پلیٹ میں حلوے پہ ہوائیاں سجائیں اور وسائی کے پاس [...] اسے یہ مہربان سی شخصیت دل سے پسند تھی۔

''جیوندی [...] اللہ تیرا نصیب اچھا کرے۔'' ہمیشہ کی طرح اس نے دعا دی تو ماروی مسکرا دی۔

''نصیب تو اس کا اچھا [...] بھی شہر کا بجیلا بابو جو آئے گا اس کی برات لے کر [...] چھیڑتے ہوئے کہا تو ماروی شرما کر اندر بھاگ [...]

''ناگن کہیں کی۔'' اسے دور تک جا [...] وسائی نے طنزیہ لہجے میں سرگوشی کی جو نوری نے [...] تھی۔

''ادی! ایسے کیوں کہہ رہی ہے، اتنی اچھی تو ہے [...] اتنی خدمت کرتی ہے میری۔ تجھے بھی تو ہمیشہ عزت دیتی ہے حالانکہ میری بہن ہے تو۔'' نرمی سے سمجھاتی نوری اسے ٹوک کے بولی تو ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ٹھہر گئی۔

''ایسی باتیں اس لیے کر رہی ہوں کہ میں تیری طرح چری (پاگل) نہیں ہوں۔ اس کی وجہ سے جو طوفان ہم بہنوں کے منتظر ہیں ان کی آہٹ سن رہی ہوں میں۔'' سنسان دوپہر میں سبک خرامی سے چلتی ہوا نے وسائی کے دوغلے چہرے پہ ہلکا سا تھپڑ رسید کیا تھا۔

''کیسا طوفان ادی! میں کچھ نہیں کیا کہہ رہی ہے تو؟'' نوری نے چونک کے پوچھا تھا۔

''میرا شادو اس حور کو اپنی بیوی بنانے کے لیے روز میری منتیں کرتا ہے۔ یہ تک کہتا ہے کہ یہ نہ ملی تو زہر کھا کے مر جائے گا۔ یہ اس کی ایسی خواہش ہے جسے میں پوری نہیں کر سکتی کیونکہ یہ سانول کی منگ ہے۔ اس کی وجہ سے کسی دن میرا جوان پت زہر پھانک لے گا پھر تو کہتی ہے میں اسے ناگن نہ کہوں۔'' زہرخند لہجے میں بولتی وسائی کے لہجے میں نفرت کے شرارے تھے۔

''[...] میں نے بتایا تو ہے سجاول کبھی بھی اس کا رشتہ [...] سے توڑ کے تجھے نہیں دے گا۔ کتنی بار کہوں کہ میں [...]'' نوری واقعی بے بسی کی انتہا پہ تھی۔

''رشتہ لینا کون چاہتا ہے۔ میں تو تجھے اس طوفان [...] بارے میں بتانا چاہتی ہوں کہ جس سے تو بے خبر ہے یا [...] دانستہ نظر چرا رہی ہے۔'' چارپائی پہ نیم دراز ہوتی [...] نے کہا۔

''ادی جو بھی بات ہے صاف صاف کیوں نہیں بتاتی [...]'' نوری نے اکتاتے ہوئے کہا تو وسائی نے بڑے غور سے بیس بائیس سال کی اپنی خوبصورت [...] چری بہن کو دیکھا۔

''سن پھر صاف صاف تجھ پہ رب کا بڑا کرم ہے آدھے گوٹھ کی مالکن ہے تو۔ ماروی کی شادی کروا کے تو اپنی [...] بانٹنا چاہتی ہے؟ آج تیری بیٹی ہے کل کو اللہ تجھے پت دے گا اس کے لیے کیا چھوڑے گی؟ یہ بٹی ہوئی جائیداد؟ [...] تجھ سے تو سیانا تیرا سسر تھا۔ کیسے سمجھداری سے اماں میراں کو ٹھکانے لگایا کہ جائیداد بھی نہ بٹی اور بیٹی بھی ٹھکانے لگ گئی۔ بہانہ بھی کیسا سچل ملا اسے کہ برادری میں رشتہ نہیں [...] تو سارے گوٹھ میں اماں میراں کے حسن کا چرچا تھا۔ [...] اچھا خاندان ان کو بہو بنا لیتا پھر یہ جاگیر بٹ [...]۔ ذرا سوچ تو اگر وہ نہ کرتے تو تمہارے حصے کیا [...] تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا تو نوری کی [...]

[...] ہے ادی! لیکن نہیں ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ سانول [...] ہے۔ بہت بڑا اس کا گھر ہے وہ بھی اس نے صاف [...] ہے کہ اسے جہیز کے نام پہ ایک سوئی بھی نہیں چاہیے۔ جب [...] میں نہیں رہتا تو کیا کرے گا حصہ لے کے۔'' [...] رد کرتے ہوئے اس کا لہجہ اتنا کھوکھلا تھا کہ خود وسائی [...]

''تیرا کیا خیال ہے جسے ضرورت نہیں ہوتی [...] تمام عمر ضرورت نہیں پڑتی۔ اب نہ سہی کبھی تو ضرور کرے گا ... پھر تمہارے پاس اسے حصہ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا اور یہ بھی تو نے خوب کہی کہ رہتا نہیں تو زمین کا کیا کرے گا۔ اری چری ظاہر ہے بیچ باٹ کے نکل جائے گا اور کیا کرے گا۔ تیرے بچوں کے منہ کا نوالہ شہر میں بیٹھے غیر اڑائیں گے اور کیا۔'' چولہے کے پاس دوپہر کی ہانڈی بناتی ماروی پہ گہری نظر ڈالتی وسائی کا لہجہ اتنا پریقین تھا کہ نوری کا چہرہ رنگ بدلنے لگا۔

''یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں [...] ادی! مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔'' بہت دیر سوچنے کے بعد نوری بولی تو اسے لگا اس کی آواز پاتال سے آ رہی ہے۔

''تیرے پاس دو ہی راستے ہیں۔ ایک تو [...] سانول سے بیاہ کے آدھی جاگیر [...] کی دلہن بنا کے گھر میں بات گھر [...]

پھوپھی سے دھواں اٹھتے چولہے میں [...] کے درمیان رکھے کاغذ کو پھونک [...] ماروی کی آنکھیں دھوئیں کی شدت سے سرخ [...] لیکن آگ جل گئی تھی۔ وہ بے خبر تھی ایک انجانی آگ تو کہیں اور بھی بھڑک چکی ہے۔

''اب یہ دو تو ان [...] سجاول تجھے رشتہ نہیں دے گا ... اور سانول کی دلہن اسے اب میں نہیں بننے دوں گی اس سے بہتر ہے کہ میں اسے گلا گھونٹ کے مار

اردو میں جدید مرثیہ نگاری کی روایت کو تاب و توانائی عطا کرنے میں سید آل رضا کی خدمات قابل قدر اور لائق منزلت ہیں۔ جبھی تو اردو کے عظیم شاعر اور جدید مرثیہ نگاروں کے سرخیل جوش ملیح آبادی نے آل رضا کی خدمات جلیلہ کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے ''مرثیوں سے ہمیشہ آنسوؤں اور آہوں کا کام لیا گیا ہے اور کسی ایک مرثیہ گو نے بھی اس جانب توجہ مبذول نہیں کی ہے کہ حسین کے کردار کو پیش کر کے مومنین کو یہ سبق دے کہ دیکھو اگر تم حسینی ہو تو جبر و باطل کی طاقت کے سامنے کبھی سر نہ جھکانا اور قربانی ردا یا ان دہر کو خاطر میں نہ لانا۔ یہ تاج فخر قدرت نے سید آل رضا کے واسطے عطا کر رکھا تھا۔ جو حضرات اعلان کرتے ہیں کہ میر انیس کے بعد [...] زوال ہے، وہ غلط کہتے ہیں۔ حقیقت [...] نگاری پوری قوت کے ساتھ نہ صرف [...] کا ارتقائی سفر بھی جاری ہے۔'' سید آل رضا [...] 1939ء میں نجم آفندی کی نظم [...] ہو کر اپنا پہلا مرثیہ تصنیف کیا۔ [...] کہ اگر نجم آفندی کے انقلابی اشعار [...] جدید مرثیہ نہیں کہہ سکتا تھا۔

مرسلہ: قاسم حیدر [...]

دوں۔" اب کے آنکھوں میں سفاکیت لیے نوری بھی ماروی کو ہی گھور رہی تھی۔ تب ہی دروازے پہ زور دار دستک ہوئی۔ ماروی نے اٹھ کے دروازہ کھولا تو دروازہ دھکیلتا جھلا اندر آ کے وہیں دہلیز پہ گر گیا۔

"ادی! میں نے کہا تھا نا یہ دنیا اچھی نہیں، بھاگ چل یہاں سے۔ مجھے بھی لے چل۔ سب یہاں مجھے مارتے ہیں ذرا ذرا سی غلطی پہ۔ مجھ سے اماں شریفن کا گھڑا ٹوٹ گیا اس نے مجھے مارا، کھانا بھی نہیں دیا۔" بچوں کی طرح سسکتے ہوئے بتا کر وہ اپنے خاک آلود بالوں سے نکلتا خون دکھاتے ہوئے بے ربط انداز میں بتانے لگا۔ ماروی نے ایک بار اسے کہہ دیا تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ شہر لے جائے گی تب سے وہ اس سے ایک ہی رٹ لگائے رکھتا۔

"اچھا میں سمجھاؤں گی اماں شریفاں کو، تو یہاں سے تو اٹھ۔" دھان پان سی ماروی بائیس چوبیس سال کے لمبے چوڑے جھلے کو سہارا دے کے چولہے کے سامنے رکھی پیڑھی پہ بٹھاتے ہوئے ہانپ گئی۔ اس نے جلدی سے ہلدی کا ڈبہ کھول کے جھلے کے سر میں آئے گہرے زخم پہ ہلدی انڈیل دی۔ وہ کراہ کے رہ گیا۔ ماروی کا حساس دل تڑپ کے رہ گیا۔ کچھ دور چارپائی پہ بیٹھی دونوں بہنوں نے اس منظر کو من پسند رنگ پہنائے تھے پھر طنزیہ ہنسی کا تبادلہ ہوا۔

"اری نوری! ایک تیسرا راستہ بھی تو ہے ادھر آ تجھے بتاؤں۔" ماروی نے اب صبح کا بچا پراٹھا اچار کے ساتھ جھلے کے آگے رکھ دیا تھا۔ تب ہی وسائی نے کہنی سے ٹہوکا مار کے نوری کو متوجہ کیا پھر سرگوشی میں راز و نیاز کرنے لگی۔

☆......☆

سجاول نے ماں باپ کے بعد ماروی کو ہمیشہ بیٹیوں جیسی چاہت دی تھی، وہ اس کے لیے بختاں سے کم نہیں تھی۔ لیکن اس کی دی ہوئی ہر دلیل کو رد کرتی نوری نے اپنے دل و دماغ میں بھڑکتی آگ اس کے دل میں لگا کے چھوڑی تھی۔ نوری ٹھیک کہتی تھی، سانول ایک کامیاب وکیل تھا حصہ لینے پہ آتا تو ان کے حلق سے نکلوا لیتا پھر وہ اپنی اولاد کو کیا دے گی بٹی ہوئی جاگیر؟ کل کو خدا اسے اپنی نعمت سے نوازے گا تو اسے یہ کیا دے گا فقط چند مربعے بٹی ہوئی حویلی۔ نہیں وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ اسے اب بہت جلد ادی وسائی کے بتائے ہوئے تیسرے راستے پہ چلنا تھا۔ اس ایک پل میں وہ بس ایک مہربان باپ تھا۔ وہ مہربان باپ جو اپنے اندر موجود ایک شفیق بھائی کو مار چکا تھا۔ اب وہ صرف بختاں کا باپ تھا۔ اپنے وارث کی جائیداد کا رکھوالا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کبھی بھی ماروی کا ہاتھ سانول کے ہاتھ میں نہیں دے گا۔ ادی وسائی نے تیسرا راستہ یہ ہی بتایا تھا کہ سانول کو انکار کر کے وہ ماروی کو بھی تارک بٹھا دے۔

شام سے ہی چلتی سرد ہوا اور گرجتے کڑکتے سیاہ بادلوں نے آسمان سے زمین تک ٹھنڈ کی چادر سی تان دی تھی۔ موسم یکلخت سرد ہوا تھا۔ تیز ہوا سے کھڑکی دروازے تک بج رہے تھے۔ جب دروازے پہ تیز دستک ہوئی وہ لوگ جو رات کا کھانا کھاتے ہی گرم لحافوں میں گھسے تھے، ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے۔ سردرد کے گہرے احساس سے تنگ سجاول نے اس خراب موسم میں آنے والے کو دل ہی دل میں خوب کوسا۔ دروازہ کھولتے ہی جھلے کو دیکھ کے وہ غصے سے دیوانہ ہی ہو گیا۔

"کیا موت پڑی تجھے اتنے [illegible] میں بھی ٹک کے نہیں بیٹھتا۔" سجاول نے تقریباً جھڑکتے [illegible] سے پوچھا۔

"ادا سجاول! مائی جنتاں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ اللہ کے لیے اندر آنے دے میں برآمدے میں پڑا رہوں گا کچھ نہیں کہوں گا۔" آج وہ کچھ ہوش مند لگ رہا تھا۔ التجائیہ لہجے میں کہتا ہوا تیز ہوا کے تھپیڑوں سے کپکپا اٹھا۔ آج مائی جنتے کی بیٹی اور داماد آئے تھے شہر سے اس لیے وہ جھلے کو رکھ نہیں سکتی تھی۔ یہ سوچ کے باہر نکال کے دروازہ بند کر دیا کہ گوٹھ میں وہ اکیلی نہیں تھی جس نے اس جھلے کا ٹھیکا اٹھا رکھا تھا۔ کوئی نا کوئی گھر اس طوفانی موسم میں اس کا آسرا بن جائے گا۔ مگر ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہار کے وہ ان کے دروازے پر آیا تھا۔ جانے آج سارا گوٹھ ہی بے حس ہو گیا تھا کہ تقدیر ہی بے رحم ہو رہی تھی۔

"کیوں تیرا میں نے ٹھیکا اٹھا رکھا ہے۔ جا دفع ہو جا یہاں سے۔ چل اماں شریفاں کے گھر جا، وہ تجھے ڈال دے گی اپنے گھر کے کسی کونے میں۔" ٹھنڈ میں اٹھ کے آیا سجاول اس کی فرمائش پہ آگ بگولہ ہو گیا۔ بولا تو سب لحاظ بالائے طاق رکھ کر دروازہ بند کرنا چاہا۔

"ادا! اماں شریفاں مارتی ہے، بات بات پہ مجھے گھر سے نکال دیتی ہے۔ اماں جنتاں نے کھانا بھی نہیں دیا مجھے۔ کھانا ہی دے دے بھا، صبح سے بھوکا ہوں میں۔" گڑگڑاتے جھلے نے دروازے میں ہاتھ رکھا تو اس کا ہاتھ دروازے میں آ کے کچلا گیا۔ جبکہ سر میں اٹھتی [illegible] پہ قابو پاتا سجاول چیخ اٹھا۔

[illegible] اب تو نے دروازہ کھولنے یا دستک دینے کی کوشش [illegible] تیرے ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گا۔" اس کے خون آلود [illegible] بندگی باہر نکال کے دروازہ زوردار آواز سے بند کرتا [illegible] اندر آ گیا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے سب سنتی [illegible] کا دل انجانے دکھ سے بھر گیا۔ اس نے جھٹ کھونٹی [illegible] کی چادر اوڑھی اور ابھی بنائی ہوئی روٹیوں میں سے بچی [illegible] روٹی پہ ساگ کا سالن رکھتی اپنے کمرے میں دھرے صندوق سے گرم لحاف نکالتی دروازہ کھول کے گھر سے نکل گئی ہوئی۔ کمرے سے دودھ پتی بنانے نکلتی نوری نے یہ منظر بہت مسکرا کے دیکھا تھا۔ اس مسکراہٹ میں چھپی حیوانیت پہ تقدیر بھی دنگ ہوئی تھی۔ وہ جلدی سے اندر کو بڑی وسائی کے بتائے ہوئے حقیقی تیسرے راستے پہ عمل کرنے کا وقت آ چکا تھا۔ وہ وقت جس کی آبیاری کچھ عرصے سے سجاول کے ذہن میں قطرہ قطرہ زہر انڈیل کر وہ کافی دنوں سے کر رہی تھی۔ اس کا چھوڑا ہوا تیر ٹھیک نشانے پہ لگا تھا۔ تکلیف کا احساس تھا یا اعتماد ٹوٹنے کا غم کہ گھر میں ماروی کو تلاش کرتا سجاول لمحوں میں غصے سے اندھا ہوتا کلہاڑی اٹھائے تیز قدموں سے باہر لپکا تھا۔ عالم جنون میں اٹھتے قدموں نے بہت جلد ماروی کے قدموں کا سراغ پا لیا تھا۔ [illegible] سجاول کے اندر اٹھتے جنون کو مات دے رہی تھی۔ اس [illegible] کا غصہ اسے شیطان بنا چکا تھا۔ اب وہ ماروی سے چند قدم [illegible] کی رفتار سے اس کا سایہ بن کے چل رہا تھا۔ جیسے کوئی [illegible] اپنے شکار پہ گھات لگائے خاموشی سے کچھ دیر چلتا ہے موقع ملتے ہی جھپٹ کر شکار کو مردہ کر دے گا۔

ماروی کو پتا تھا جب جھلے کو سارا گوٹھ دھتکار دیتا تھا تو وہ پیپل کے پیڑ کے پاس بنی اپنے ماں باپ کی قبروں کے پاس پایا جاتا تھا۔ وہ سیاہ چادر کو ہونٹوں سے [illegible] ہوئے تیز قدموں سے پیپل کے پیڑ کی طرف چل رہی تھی۔ کن من بارش شروع ہو چکی تھی۔ سرد ہوا نے جیسے درختوں پہ جھولے ڈال لیے تھے۔ اس کی طرف جھکے آتے درخت کی شاخیں جیسے اسے پچھاڑ کے پھینکنے والی تھیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے کی ہولناکی جیسے ماروی کے ننھے دل میں خوف کے پنجے گاڑ رہی تھی۔ ایک پل کو اس کا دل کیا وہاں سے پلٹ جائے پھر خدا کی رضا کے لیے ایک مخبوط الحواس شخص کو تھوڑی سی آسانی فراہم کرنے کی خوشی جیسے اس کے قدموں میں بجلی سی بھر گئی۔ پیپل کے پیڑ کے پاس وہ [illegible] سر نہوڑائے بیٹھا کانپ رہا تھا۔ اس نے گرم لحاف اس کے کاندھوں پہ رکھا تو جیسے اس کے بجتے دانت [illegible]

"ادی! کیوں نہیں بھاگ چلتی میرے ساتھ [illegible] یہاں سب بہت برے ہیں، آج بھی اماں [illegible] نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ وہ...... وہ کہتی ہے کہ [illegible] شروع ہو گیا تھا۔

"شش چپ، مجھے سب پتا ہے۔ بس تم جلدی [illegible] کھانا کھا لو پھر میں تمہیں اماں شریفاں کے گھر چھوڑ کے [illegible] چلی جاؤں گی۔" جلدی سے پوٹلی میں سے روٹی نکال [illegible] چھوٹے چھوٹے لقمے اسے کھلانے لگی تب ہی بادل زور [illegible] گرجا تھا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بجلی [illegible] کوندے میں اسے لگا کوئی ہیولا اس کے سامنے [illegible] قریبی درخت کے پیچھے چھپا ہے۔ ٹھیک اسی وقت [illegible] ہوئے آسمان نے پوری شدت سے برسنا شروع [illegible] نے وہم سمجھ کے سر جھٹک دیا پھر [illegible] اٹھاتی اسے لیے ایک طرف کو چل دی۔

"چل جلدی چل! تجھے گھر چھوڑ کے [illegible] ہے۔" جانے کیوں عجیب سے خوف [illegible] ہزارویں حصے میں پکڑا اتھا۔ اس سے [illegible] بات کا کوئی جواب دیتا۔ درخت کے پیچھے سے [illegible] نے کلہاڑی کا وار جھلے کی گردن پہ کیا تھا [illegible] بیل کی طرح ڈکراتا ہوا زمین بوس ہوا تھا۔ [illegible] کے بعد اس کا بے معرف وجود ساکت ہو گیا تھا۔

"تو کیا سمجھتی تھی ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کے اس جھلے کے ساتھ بھاگ جائے گی اور میں دیکھتا رہوں گا۔ بے غیرت، سمجھا ہے تو نے مجھے؟" سیاہ چادر کی بکل میں آدھا چھپا کریہہ چہرہ اس کے اپنے بابا جائے کا تھا وہ ایک پل کو سن ہو گئی تھی۔

"ادا! غلط سمجھ رہے ہیں آپ یہ بھوکا تھا اس لیے اسے کھانا دینے آئی تھی۔ اب اسی مائی شریفاں کے گھر چھوڑنے جا رہی تھی۔" اس نے کانپتے لہجے میں وضاحت دینا چاہی [illegible] سامنے تن کے کھڑے زمین کے خدا پہ جیسے اثر ہی [illegible] وہ خون آلود کلہاڑی لیے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے [illegible] مڑ کے بھاگنا قدم پیچھے کو بڑھانا شروع کیے۔ اس ایک پل میں اسے لگا موت اس کے سامنے کھڑی ہے اور زندگی اپنا

بھیا تک کھیل کھیل چکی ہے۔ اس کا پاؤں کسی چیز میں اڑا تھا وہ گری اور اس کا لباس پچھے راستے کی مٹی میں لتھڑ گیا۔ سرخ اور سیاہ چوڑیاں ٹوٹ کر کہیں مٹی میں ملی تھیں۔ کچھ دور جھلے کی خون آلود لاش اپنی حرماں نصیبی پہ ماتم کناں تھی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹ رہی تھیں بے یقین دل لرز رہا تھا۔

اس پچھاڑیں کھاتے دل میں ایک خیال نے کروٹ لی۔ اسے خود کو بچانے کی ایک کوشش کرنی چاہیے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اٹھ کے گھر کی سمت اندھا دھند بھاگنا چاہا تھا مگر اس سے پہلے ہی سفاک قاتل نے اس پہ کلہاڑی کا وار کیا تھا، اتنا کاری وار کہ وہ دوسری سانس نہ لے سکی۔ غیرت مند شخص کلہاڑی پھینک کر بڑے کروفر سے اس راستے پہ چل دیا جہاں سے وہ اپنی جنت میں جا کے پُرسکون نیند لینے والا تھا۔ تقدیر نے اس کے دو پل کے سکون کو مسکرا کے دیکھا تھا۔

☆......☆

ساری رات لاوارث پڑی لاشوں کو صبح کسی نے دیکھا تھا۔ گاؤں میں جیسے کہرام مچ گیا۔ لاشوں کے گرد پورا گوٹھ اکٹھا تھا جب کوئی بھاگ کر سجاول کو بلا لایا۔

”میں نے مارا ہے اس زمین کے بوجھ کو، کل یہ بھاگنے والی تھی جھلے کے ساتھ۔ میری غیرت نے گوارا نہ کیا تو میں نے مار دیا انہیں۔ کیا غلط کیا میں نے؟“ وہ پوچھ رہا تھا جبکہ ان کے گوٹھ میں غیرت کے نام پہ قتل کو قتل نہیں بہادری مانا جاتا تھا۔ اس ہی کے جیسے کئی غیرت مندوں نے آگے بڑھ کر اس کے عمل کو سراہتے ہوئے شاباش دی۔ جس پہ سجاول کی تنی ہوئی گردن کچھ اور تن گئی تھی۔ وہ نام نہاد غیرت مند یہ بھی نا سمجھ پایا کہ اس کے ہی سامنے اس کی عزت اس کی بہن کے بارے میں سارا گوٹھ چہ مگوئیاں کر رہا تھا۔ جو اس کے حکم پہ اپنی اکلوتی سہیلی کو چھوڑ چکی تھی۔ جو اسے بھائی کی بجائے باپ کا درجہ دیتی تھی۔ اس کی اسی فرشتہ صفت بہن پہ بہتان لگا کے پورے گوٹھ میں تماشا بنا کے وہ خود کب عزت پا سکتا ہے۔

”میں نے تجھے کہا تھا نا یہ جھلا کوئی جھلا نہیں۔ مکر کرتا ہے یہ، دیکھا وہی ہوا نا جو میں نے کہا تھا۔“ رمضان نے پاس کھڑے بچل کو باآواز بلند کہا۔ پھر لوگوں کے پوچھنے پہ اپنا کئی دن پہلے والا خدشہ دہرا دیا۔ کچھ آپس میں سرگوشیاں کرتے سجاول کے شک کو بے بنیاد کہہ کے اس کے عمل کو ظلم گردان رہے تھے مگر پھر اپنے ہی خیال کو جھٹک دیتے

بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ماروی کو اولاد کی طرح چاہنے والا سجاول بے بنیاد بات پہ اسے قتل کر دے۔ کسی نے آگے بڑھ کے ماروی کی دہشت سے پھٹی کھلی آنکھیں بند کی تھیں۔

جھلے کی لاش کو گوٹھ کے کچھ ہمدرد لوگ کفن دفن کے لیے لے گئے تو مجبوراً اسے ماروی کی لاش کو گھر لانا پڑا۔ لمحوں میں ان کا وسیع آنگن عورتوں سے بھر گیا تھا۔ تب ہی اماں میراں اپنی دہلیز پار کر کے آئی تھیں۔ کئی عورتوں نے اسے واپس کمرے میں دھکیلنا چاہا مگر اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ کئی نے جوان موت پہ روتے ہوئے اس کے اپنی یتیم بھتیجی کے آخری دیدار کرنے کی حمایت کی تھی لیکن وہ کسی کی ہمدردی یا کسی کا بغض دیکھ ہی کب رہی تھی۔ وہ تو مدہوشی کے عالم میں چلتی صحن کے بیچوں بیچ پڑی چارپائی پہ سفید چادر سے ڈھکی لاش کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چارپائی کے پاس پہنچتے ہی وہ کٹے شہتیر کی مانند گری تھی۔

”تو چاہتی تھی نا ماروی میں کھلی فضا میں سانس لوں۔ مجھے بھی دھوپ محسوس ہو۔ میں اپنے آنگن میں سب کے درمیان آؤں۔ لے دیکھ اب میں آئی ہوں تو چادر میں چھپی لیٹی ہے۔ سو گئی ہے کیا، آج نہیں کرے گی مجھ سے ڈھیروں باتیں۔“ اماں میراں جیسے ہوش میں ہی نہیں تھی۔ وہ ماروی کی لاش سے ایسے مخاطب تھی جیسے وہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں۔ درد دل رکھنے والی عورتیں با آواز بلند رو رہی تھیں۔ جبکہ بغض رکھنے والیاں صحن کے ایک کونے میں بیٹھی نوری کو اس کے شوہر کی غیرت مندانہ اقدام پر سراہ رہی تھیں۔ ان کی نظر میں ماروی جیسی لڑکی کا یہ ہی انجام ہونا چاہیے تھا تا کہ آئندہ بھی کوئی بیٹی ذات بھاگنے کا سوچ نہ سکے۔

”تو روز میرے سر میں تیل ڈالتی تھی نا دیکھ آج بھی میرے بال سوکھے ہیں اور تو ہے کہ بے خبر سو رہی ہے۔ اری چری! اٹھ دیکھ میرے بال جھاڑ جھنکار ہو رہے ہیں۔ دیکھ سر میں کتنا درد ہے آج نہیں تیل ڈالے گی میرے سر میں۔“ مجمعے میں بیٹھی وہ مخبوط الحواس لگ رہی تھی۔ اپنے کمر تک آتے گھنے بال کھول چکی تھی۔ کہیں کہیں سے سفید پڑتے بال آج بھی خوبصورت تھے۔ پاس بیٹھی عورتوں نے سرگوشیاں شروع کر دیں۔

”اری عیشاں! سنبھال میراں کو، تو اس کے لیے ماروی کے جیسی ہے نا، صدمے سے جھلی ہو رہی ہے سمجھا اس کو۔“ اماں جنتے نے عیشاں کا بازو ہلا کے کہا۔ عیشاں تو

ماروی کو دیکھ کے خود ہوش میں نہیں تھی۔اماں میراں کو کیا سنبھالتی۔

"اری اٹھ! کیوں پڑی ہے ایسے دل بند کردے گی کیا میرا۔تو کبھی سوئی نہیں ایسے کہ میری پکار پہ بھی نا اٹھے، اٹھ۔" اسے حکم دیتی میراں نے غصے سے اس کے چہرے سے چادر ہٹائی تھی۔ اس پہ ایک نظر ڈالتے ہی میراں کی دلدوز چیخیں بھرے صحن میں گونجی تھیں۔ وہ اب چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ کسی نے آگے بڑھ کے سفید چادر سے ماروی کا چہرہ پھر سے ڈھک دیا تھا۔ بہت دیر رونے کے بعد میراں نے آنکھیں کھولیں اور جنونی انداز میں چادر اس کے چہرے سے ہٹا دی۔ ناک کی نوک تک کٹی ہوئی پیشانی عجیب شکل اختیار کر چکی تھی۔ یہ وہ پیشانی تھی جسے وہ دیوانہ وار چوما کرتی تھیں۔ ہلکی نیلی پرامید جگر جگر کرتی آنکھیں بند تھیں۔ وہ آنکھیں جن سے میراں خواب دیکھتی تھی۔ ان پہ جما خون سیاہ ہو چکا تھا۔ ہونٹوں پہ لگا گہرا زخم پورا کھلا تھا جو شاید گرنے سے آیا تھا۔ میراں نے شہادت کی انگلی کی پوران بے جان ہونٹوں پہ پھیری تھی۔ یک لخت اسے لگا اس کا دل پھٹ گیا ہے درد کی لہریں منجمد ہوتے دماغ کو مفلوج کرنے پہ تلی تھیں۔

"کہا تھا نا مت دیکھا کر اسے غور سے، یہ تیرے جیسی ہے۔ پڑ گیا نا اس کے نصیب پہ تیری سیاہ بختی کا سایہ۔ ڈائن کھا گئی تو اپنی ہی سکھی کو۔" زارو قطار روتے ہوئے وہ اب اپنے کھلے بال نوچ کر خود کلامی میں معروف تھی۔ پاس بیٹھی عورتوں نے گھبرا کر اس کے ہاتھ پکڑے۔

"نہ کر جھلی مردے کو تکلیف ہوتی ہے۔ بس پڑھ اور پڑھ کے بخش تا کہ اس کی روح کو سکون ملے۔" اس کا ہاتھ پکڑتی شریفاں نے کہا تو اس نے اسے وہ زوردار دھکا دیا کہ وہ منہ کے بل پیچھے کو گری۔

"خبردار جو میری ماروی کو مردہ کہا تو۔ مردہ ہوگی تو، تیرے پچھلے۔ میری ماروی تو ناراض ہے مجھ سے، ابھی دیکھنا میں اسے منا لوں گی تو یہ اٹھ جائے گی۔" مائی شریفاں دھکا کھا کے بکتی جھکتی وہاں سے اٹھ کے روانہ ہوگئی۔

"ماروی! میری بچی تو کہتی تھی نا کہ تو مجھے اپنے ساتھ شہر لے جائے گی۔ مت لے جا، بس ناراض مت ہو اٹھ کے بیٹھ جا بس۔ تو چاہتی تھی نا کہ تو جھلے کا علاج کروائے۔ چاہتی بھی کیوں نا، جھلا تجھے سجاول کی طرح ہی عزیز تھا، بھرا جو سمجھتی تھی اسے۔ لے دیکھ آج اس کا علاج بھی ہو گیا۔ اب تو اٹھ جا، مان لے میری۔" میراں کے لہجے میں التجا تھی۔ وہ اپنے جنون میں کیا بول رہی تھی۔ کسی کام سے آنگن میں آتا سجاول ساکت رہ گیا۔ آنگن کے کنارے بیٹھی نوری نے سجاول کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھا تو ایک پل کے لیے شرمسار ہوئی پھر سجاول کو ہارے قدموں سے باہر جاتا دیکھ کے سر گھٹنوں پہ ٹکا گئی۔

"اماں جنتے! دیکھ یہ میری سنتی ہی نہیں، اسے سمجھا یہ شرم کرے۔ میں اسے منا رہی ہوں، یہ ہے کہ اکڑی لیٹی ہے۔ اسے میرے سفید بالوں کا بھی لحاظ نہیں رہا۔ یہ تو گھر آئے بڑے کانوں کا لحاظ کرتی تھی نا۔ یہ اب میری، اپنی سگی پھوپی کی نہیں سن رہی۔" مجنونانہ لہجے میں بلا کی التجا تھی۔ وحشت سے پھٹی آنکھوں میں دم توڑتا ہوش و خرد، جنتاں اسے سنبھالتی پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ جبکہ پاس ہی سب سنتی دسائی کا ضمیر جیسے ایک جھٹکے سے جاگا تھا۔ وہ اسے ابھی تو ادی کہتی تھی۔ بہنوں جیسی عزت دیتی تھی۔ صرف اپنے بیٹے کے جنون سے گھبرا کر وہ کیا کر بیٹھی۔ پل میں اشکبار ہوتیں اس کی آنکھیں اپنی راہ میں سے کانٹے کے ہٹ جانے پہ بھی ماتم کناں تھیں۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چل دی۔ گھر جا کے اسے اپنے ضمیر کو بھی تو سلانا تھا۔ ابھی تو وہ نوری کو تسلی دے رہی تھیں کہ سجاول نے قتل نہیں کیا بلکہ ایک بوجھ زمین سے کم کیا ہے۔ وہ بھی میراں کی باتیں سن کر نم آنکھوں سے مجمع چھوڑ گئیں تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے ظالم اپنے ظلم پہ خود روتا ہے۔ جیسے گھر کی پچھلی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا بلک بلک کے روتے سجاول کو ماروی ٹوٹ کے یاد آئی تھی۔ جانے کتنی دیر وہ روتا رہا اندر مردے کو نہلانے لے جایا جا رہا تھا۔

بچل اسے ڈھونڈتا گھر کی پچھلی سائیڈ پہ آیا تھا۔ اس کی سوجی آنکھیں دیکھ کے حیران رہ گیا۔ سامنے بیٹھا شخص اتنا بہادر تھا کہ غیرت کے نام پہ اپنی پھولوں جیسی بہن پہ کلہاڑی چلانے سے نہیں چوکا۔ پھر اب کیا ہوا کہ یوں بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ کچھ بھی پوچھنے کی بجائے وہ اسے بازو سے پکڑے دیگ تیار کرتے نائی کے پاس لے آیا جو اسے بلا رہا تھا۔ دفنانے سے کچھ پہلے پہنچا سانول اس کے پاس سوگوار سا بیٹھا تھا۔ کسی نے سانول کو پکارا تھا۔ سجاول کے ذہن کے پردے پہ دو ہلکی نیلی آنکھیں جم سی گئیں۔ جن میں اس نام سے جگنوؤں سی چمک بھر جاتی تھی۔ سجاول نے اس نام پہ شرم سے رنگین ہوتے چہرے کا تصور کیا۔ اس نام سے کسی کی مدھم مسکراہٹ نے جیسے دل موہ لیا تھا۔ یکلخت اس

تصور کی اسکرین نے منظر بدلا تھا۔ جگنوؤں سے چمکتی ہلکی نیلی آنکھیں کلہاڑی کے ایک وار پہ وحشت سے پھٹ گئی تھیں جیسے پتھر کی ہوں۔ گل رنگ چہرہ اس نے اپنے ہاتھوں سے خون میں نہلا دیا۔ مدھم مسکراہٹ لیے ہونٹ ساکت جیسے اس سے قیامت تک کے لیے روٹھ گئے ہوں۔ دل میں اٹھتے شور کو دبانے کے لیے سجاول نے چیخ چیخ کے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ وہ چیختے ہوئے اپنے بال نوچ رہا تھا۔ پاس کھڑے مرد اسے سنبھالنے میں ناکام ہوئے تھے۔ اندر میراں کو ساتھ لگائے بیٹھی سکھاں کی بھی آنکھیں خشک ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

☆......☆

کئی برس بیت گئے تھے ماروی کو مرے۔ بظاہر سب کی راہ کا کانٹا نکلا تھا پھر جانے انہیں ایسا کیوں لگتا تھا کہ ان کی زندگیوں سے سکون اور خوشی مرگئی ہے۔ جس وارث کے لیے انہوں نے اتنا بڑا کھیل کھیلا تھا وہ تو ان کے نصیب میں ہی نہیں تھا۔ ان کے نصیب میں بس ایک اولاد لکھی تھی۔ بس ان کی بختاں ان کی جان۔ ان کی آنکھ کا تارا۔ ان کے سکون کی واحد وجہ۔ انہوں نے کس کس دربار پہ جا کے اولاد کے لیے منت نہیں مانی۔ کس کس پیر فقیر کے پاس وہ نہیں گئے۔ یہاں تک کے شہر جا کے ڈاکٹر تک سے چیک کروا آئے۔ کوئی بیماری ہوتی تو علاج کرواتے۔ نصیب کا علاج بھی تو کیسے؟ بختاں بڑی ہو رہی تھی۔ وہ ان دونوں کو بحث کرتے روتے دیکھ کر کئی کئی سوال پوچھتی جس کے جواب میں ان کے پاس ایک چپ کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بختاں سب کچھ جان کے ان سے نفرت کرے اس لیے نوری نے بختاں کو شہر میں مقیم اپنے بھائی کے پاس بھجوا دیا جہاں وہ پڑھتی تھی۔ سال میں ایک بار دو دن کے لیے ان کے پاس آتی تھی۔ کوئی اپنا مر جائے تو انسان خدا کی رضا جان کر صبر کر لیتا ہے۔ کوئی بہت اپنا مارا جائے وہ بھی اتنی بے دردی سے تو انسان اپنے حواس کھو دیتا ہے۔ مائی میراں نے بھی اپنی باقی زندگی اک کمرے کی تنہائی میں چیختے گزاری تھی۔ وہ عورت جو صبر کے اس مقام پہ تھی کہ اپنے نصیب پہ اف کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ خدا سے سرگوشیوں میں راز و نیاز کرتی تھی۔ اب چیخ چیخ کر سوال کرتی تھی۔

"کیوں میری ماروی کو اٹھا لیا، وہ تو خوش تھی۔ شہر جانا چاہتی تھی۔ پڑھنا چاہتی تھی۔ تو، تو اس کے نیت کا حال جانتا تھا نا کہ وہ جھلے کو بھرا سمجھتی ہے اپنا۔ پھر کیوں نہیں بچایا اس کو، کیوں اس جرم کی سزا دی جو اس نے کیا ہی نہیں۔" سجدے میں گری میراں کے شکوے ختم نہیں ہوتے تھے۔ وہ آنکھیں موندھتی تو تصور کی اسکرین پہ کٹی ہوئی پیشانی، ادھڑا ہوا ہونٹ اور بے نور آنکھیں آجاتیں، وہ گھبرا کے آنکھیں کھول کے چیخنے لگ جاتی۔ سیاہ راتوں کی ہولنا کی بڑھاتی اس کی متوحش چیخیں باہر سے گزرنے والوں کو یوں لگتیں جیسے کئی روحیں اپنی حرماں نصیبی پہ ماتم کناں ہیں۔ نوری اور بختاں سہم جاتیں۔ سجاول کو سنتے سر پہ پچھتاوے کے ناگ ڈسنے لگتے۔ پھر ایک شب میراں نے آنکھیں موندھی تو سامنے ماروی کا مسکراتا چہرہ تھا۔ سفید لباس میں مسکراتی ماروی خوش تھی۔ ان کے مقابل کھڑی وہ مسکرا رہی تھی۔ انہیں لگا وہ بھی کئی دن بعد دل سے ہنس رہی ہے۔ پھر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچنے لگی۔ وہ کسی ہوا کی طرح اس کے پیچھے کھنچتی چلی گئی۔ یوں جیسے ان کے دل و دماغ آزاد ہو گئے ہوں دکھ کے ہر بوجھ سے۔ اماں میراں مر گئی تھیں۔ ان لوگوں نے گویا سکھ کا سانس لیا۔ زندگی یا جس بھی گھڑی مسکرائی تھی کہ قیامت تک وہ ان کے بھی پاس نہیں رہنے والی تھی۔

سانول اور سکھاں ایک بار پھر آئے تھے۔ سانول کی آنکھوں میں چھپی گہری اداسی اس بات کی گواہ تھی کہ جیسے ماروی نے بس ایک نام سانول کو کل جانا تھا تو ماروی کا نام بھی سانول کے دل پہ لکھا تھا۔ وہ بہت کم ان کے سامنے آئی تھی مگر اماں سکھاں کی اٹھتے بیٹھتے ان کے نام کے ساتھ ماروی کا نام جوڑنے کی عادت نے جیسے ماروی کے نام کو اس کے لیے لازم و ملزوم کر دیا تھا۔ وہ لوگ دو دن رہ کے چلے گئے۔ سجاول اور نوری کی اماں میراں کی پچھتاوے کے الاؤ میں دھکیلتی چیخوں سے نجات ہو گئی تھی۔ مگر اس الاؤ کا کیا کرتے جو ان کے اندر جلتا تھا۔ سجدوں کا سکون بھی جسے ٹھنڈک نہیں پہنچاتا تھا۔

پر لگا کے بھاگتا وقت ان کے دلوں میں دبے پچھتاوے کے بیجوں کو تناور درخت بنا چکا تھا۔ سجاول اور نوری آج بھی خالی دامن تھے کیونکہ ان کے نصیب میں ازل سے بس ایک ہی اولاد لکھی تھی۔ کئی لوگوں نے سجاول کو دوسری شادی کا مشورہ دیا مگر اس نے نہیں کی، وہ جانتا تھا یہ اس کے جرم کی سزا تھی جو اسے ہزار شادیوں کے بعد بھی بھگتنی تھی۔ پھر ان کے پاس بختاں تھی۔ ان کی شہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئی لاڈلی بختاں جس کا نصیب باہر سے

آئے یوسف علی سے جڑا تھا جو شادی کے چند دن بعد ہی بختاں کو لیے ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ اسے ان کی جایداد سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ان کے جیسی کئی جایدادیں کھڑے کھڑے خرید سکتا تھا۔

"خوش رہنا اور ہمیں یاد مت کرنا۔ دیکھنا وہاں دل لگانے کی کوشش کرنا۔ نئے لوگ نیا گھر نیا ملک ہے بہت دھیان سے رہنا۔ اللہ تمھارا حامی و ناصر ہو۔" نوری نے بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے ڈھیروں نصیحتوں کے بعد دعا دی تو بختاں مسکرا دی۔

"ارے اماں کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ میں کوئی بچی تھوڑی ہوں۔ ویسے بھی ہم نے کب کسی کے ساتھ برا کیا ہے جو ہمارے ساتھ برا ہوگا۔" بختاں نے مسکراتے ہوئے کہا تو نوری کے جھریوں زدہ چہرے پہ ایک آنسو آ ٹکا۔ دل و روح میں لگی پچھتاوے کی آگ کچھ اور دہک اٹھی۔ دل چاہا اماں میراں کی طرح چیخ چیخ کے سارا گھر سر پہ اٹھا لے اور اعتراف کرے کہ اس نے ماروی پہ بہتان لگا کے جہنم کمایا ہے۔ پھر ڈر گئی گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ ایک لمحے کی جذباتیت اس کا برسوں کا بھرم چور چور کر سکتی تھی۔ نوری نے پلکیں جھکانے پہ اکتفا کیا۔ پھر وقت رخصت بیٹی سے ملتے ہوئے برستی آنکھوں سے دل میں اعتراف کرتے ہوئے وہ رب سے مخاطب تھی۔

"اللہ ہمارے کیے کی سزا ہماری بیٹی کو مت دینا۔ تُو تو جانتا ہے یہ معصوم اور بے قصور ہے۔" برستی آنکھوں سے کی گئی التجا کو دماغ نے لمحوں میں رد کیا تھا۔

"وہ بھی تو بے قصور تھی۔" دماغ کی اس دلیل پہ سجدے میں جھکا دل کانپ گیا۔

"پر رب تو رحمت اللعالمین ہے۔ وہ ہم انسانوں کی طرح بے قصوروں کو سزا نہیں دیتا۔" دماغ کی دلیل کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے اس نے سوچا تو دل میں سکون کی ایک لہر موجزن ہوئی تھی۔

"اے مالک ارض و سما! تو دلوں کے حال سے بخوبی واقف ہے۔ ہم نے ظلم کیا ہے تو بے شک ہمیں سزا دے۔ آج تک اپنے جرم کی ہر سزا ہم لب سیے سہہ رہے ہیں آیندہ بھی جو تیرا حکم ہوگا وہ ہی ہماری رضا ہوگی۔ تو بس میری بختاں کی حفاظت کر۔ اپنی بچی کو میں نے تیری امان میں دیا یا رب۔" ادھر بختاں نے گھر سے قدم نکالا ادھر سجدے میں گری نوری اور مسجد میں گڑگڑاتے سجاول کے دلوں سے التجا نکلی... اور نیتوں کے حال جانتا رب مسکرایا تھا۔ وہ اپنے بندوں کو بھٹکا کے اپنی طرف لاتا ہے جانے کس مصلحت کے تحت مگر جب کوئی پورے دل سے پلٹ کر پہلے سے زیادہ مطیع اور فرمانبردار بن جاتا ہے تو رب اسے مکافات عمل کی بھٹی میں جلا کر کندن بنا دیتا ہے۔ پھر اسے اپنا کے سرخرو کر دیتا ہے۔ نوری اور سجاول بھی کئی سال سے پلٹنے کے عمل میں تھے... اور وہ تو رب تھا جس کے دروازے پلٹنے والوں کے لیے چوپٹ کھلے رہتے ہیں۔

جہاں سب عزتوں کے مالک رب نے ان کی بیٹی کو خوش رکھ کر ان کو عزت بخشی تھی۔ وہیں سجاول اور نوری نے بھی سزا کے ہر شکوے کا ایک حرف لب پہ لائے قبول کیا تھا۔ سجاول کے بوڑھے بازوؤں میں زمینداری سنبھالنے کا دم خم ختم ہوا تو وسائی کے بیٹوں نے اس زمین پہ قبضہ جمایا تھا۔ جس کی ملکیت کے کاغذات پہ ماروی کے خون سے اپنا نام لکھنے پہ بھی وہ ان کی نہ رہی۔ زمین پہ قبضہ جمانے والے شناور اور اس کے بھائی اپنے بیوی بچوں کو بھی حویلی لے آئے تھے۔ ساکت آنکھوں سے دیکھتے سجاول اور نوری کے لب خاموش تھے۔ یہ ان کی سزا تھی جسے انہوں نے مسکرا کے جھیلنے کا وعدہ رب سے کیا تھا۔ گزرتے وقت نے یہ ثابت کیا تھا کہ شناور اور اس کی بیوی کے لیے جتنے ناقابل برداشت یہ بیمار بڈھا بڈھی تھے۔ اس سے کہیں زیادہ ناقابل برداشت وسائی تھی... کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ وسائی کے بتائے تیسرے راستے نے ہی ماروی کی جان لی تھی۔ یہ ماروی کے مرنے کے کچھ دن بعد کی بات تھی جب وسائی نیند میں اعتراف جرم کر رہی تھی۔ تب ہی فجر پڑھ کے کسی کام سے اس کے کمرے میں آتے شناور نے سب سن لیا۔ اس کی آنکھوں میں کروٹ لیتی نفرت نے کب دل کا رخ کیا وہ خود نہ جان سکا۔ جانتا تھا تو بس یہ کہ اسے وسائی سے نفرت تھی۔ دو چار سال میں چکر لگاتی بختاں ماں باپ کی حالت پہ کڑھتی تھی جو ادا شناور اور ان کی بیوی کے سامنے اپنی ذرا ذرا سی ضرورت کے لیے سوال کرتے۔ بختاں کئی بار کہتی اپنی زمین ان سے واپس لیں اور اچھی زندگی گزاریں جس پہ وہ دونوں ٹال جاتے کہ واپس لے کے بھی کیا کریں۔ ان کے پاس شناور کے علاوہ سہارا ہی کون سا ہے، درحقیقت وہ مکافات عمل سے گزر کر کندن بن رہے تھے وہ وقت دور نہیں تھا جب رب انہیں معاف کر کے اپنانے والا تھا۔



ڈراپ سین

محترم معراج رسول
السلام علیکم
میں اپنا نام بدل کر مکمل کہانی بھیج رہی ہوں۔ یہ شب میری سناتہ ہوا ہے۔ میں کوئی کہانی کار نہیں ہوں اس لیے جملوں میں غلطیاں بھی ہوں گی۔ کہانی میں جو روانی ہوتی ہے۔ وہ بھی متاثر ہوئی ہو گی۔ ان غلطیوں کو درست کر کے اسے سرگزشت کی زینت بنا دیں تو میں احسان مند رہوں گی۔
ثانیہ
(کراچی)



مجھے بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے تقریباً آدھ گھنٹا ہو گیا تھا لیکن بس کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔ اس دوران ویگنیں آئیں لیکن وہ مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ عورتوں والے حصے میں بھی مرد گیٹ پہ لٹکے ہوئے تھے۔ ان بسوں میں سوار ہونا کسی بھی طرح ممکن نہ تھا چنانچہ میں بے بسی کی تصویر بنی اس بس کا انتظار کرتی رہی جس میں مجھے کم از کم کھڑے ہونے کی جگہ مل جائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور میں بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔

دراصل مجھے ایک جگہ انٹرویو کے لیے نو بجے پہنچنا تھا

اور آٹھ بج چکے تھے۔ مجبوراً میں نے رکشا کرنے کے بارے میں سوچا لیکن کوئی بھی رکشا ڈرائیور وہاں جانے پر تیار نہیں ہوا۔ وہ دفتر مین کلفٹن روڈ پر تین تلوار کے قریب تھا۔ میں ناامید ہو کر گھر واپس جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اچانک ایک گاڑی میرے پاس آکر رکی۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹی تو دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر آصف بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر مجھے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر اس میں بیٹھ گئی۔

اس وقت آصف میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آیا تھا۔ وہ میرا پھوپی زاد ہے اور اس کا اپارٹمنٹ ہمارے بلاک سے چند بلاک کے فاصلے پر ہے۔ میں نے گھڑی دیکھی تو نو بجنے میں تیس منٹ تھے۔ اب میں با آسانی وقت پر پہنچ سکتی تھی لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے لیکن اس کی گاڑی کا رخ شاہراہ فیصل کی طرف تھا۔ ڈرگ روڈ پر پہنچ کر اس نے پوچھا۔

"کہاں جاؤ گی ثانیہ؟"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو لال کوٹھی جاؤں گا۔ شاید تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ میرا دفتر بھی وہیں ہے۔"

"اوہ۔" میں نے مایوس ہوتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے مجھے وہیں اتار دیں۔ میں وہاں سے رکشا کرلوں گی۔"

"اس وقت تو رکشا ملنا مشکل ہے۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے تم وہاں کس سلسلے میں جا رہی ہو؟" اس نے میرے ہاتھ میں فائل دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جاب کے سلسلے میں۔" میں نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی۔ "آج میرا انٹرویو ہے نو بجے۔"

"نو بجنے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ چلو میں تمہیں وہاں تک چھوڑ دیتا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ کو دیر ہو جائے گی۔"

"تم میری فکر نہ کرو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے پوچھنے والا کوئی نہیں، میں خود ہی اپنا باس ہوں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"بھئی میرا اپنا ذاتی کاروبار ہے۔ ایک چھوٹا سا دفتر بنا رکھا ہے۔ وہاں بیٹھ کر چند لوگوں کی مدد سے کام چلا رہا ہوں۔"

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ پھوپا مرحوم کوئی کاروبار کرتے تھے لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ اب آصف اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے کیونکہ جب پھوپا کا انتقال ہوا تو اس وقت وہ ایم بی اے کا طالب علم تھا۔ اس سے چھوٹی بہن علینہ یونیورسٹی اور بھائی واصف میڈیکل کالج میں پڑھ رہا تھا۔ دراصل دونوں گھرانوں میں زیادہ آنا جانا نہیں تھا اور ابو کے انتقال کے بعد یہ تعلق بالکل رسمی سا رہ گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابو کے بہن بھائیوں نے امی کو دل سے قبول نہیں کیا تھا کیونکہ وہ ابو کی پسند تھیں اور غیر برادری سے تعلق رکھتی تھیں۔ میرے پٹھان نانا [illegible] تاجر تھے اور ان کا کاروبار کراچی سے پشاور تک پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی اپنے بچوں کے ساتھ مردان میں رہتی تھی۔ نانا نے دوسری شادی کراچی میں کی۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ نانی کو انہوں نے کب اور کہاں دیکھا اور یہ شادی کن حالات میں ہوئی بس یہ جانتی ہوں کہ ان سے ایک ہی بیٹی یعنی میری والدہ پیدا ہوئیں اور نانا نے انہیں کراچی میں ہی رکھا۔ وہ خود اپنی پہلی بیوی اور بچوں سے ملنے مہینا میں ایک مرتبہ مردان چلے جاتے تھے۔ میری نانی کا ان کے خاندان والوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

امی اور ابو کی ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی۔ دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ یہ تعلق رنگ لایا اور آہستہ آہستہ ان کے بیچ محبت کا پودا پروان چڑھنے لگا اور فائنل ایئر کے امتحانات سے قبل ہی ابو نے انہیں پرپوز کر دیا۔ نانا کو تو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن ابو کے گھر والوں نے اس کی مخالفت کی کیونکہ خاندان کی کئی لڑکیاں ان کی دلہن بننے کی آرزومند تھیں جب کہ پھوپی عزیز ترین سہیلی راحیلہ کو اپنی بھابی بنانا چاہ رہی تھیں۔ انہوں نے ابو سے صاف کہہ دیا کہ جہاں وہ شادی کرنا چاہ رہے ہیں وہ ممکن نہیں۔

"وجہ؟" ابو نے پوچھا۔

"پہلی بات تو یہ کہ ہم سید اور وہ پٹھان۔ ان سے ہمارا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ دوسری بات یہ کہ اس لڑکی کی ماں خان صاحب کی دوسری بیوی ہے جس سے ان کے خاندان والوں نے لاتعلقی اختیار کر رکھی ہے۔ آج تک ان کے خاندان کا کوئی فرد اس سے ملنے نہیں آیا اور نہ ہی کبھی خان صاحب اسے اپنے گھر والوں سے ملوانے لے کر گئے۔ آج اگر خان صاحب کی آنکھیں بند ہو جائیں تو دونوں ماں بیٹی در در کی ٹھوکریں کھاتی پھریں گی۔ تم ایک ایسی لڑکی سے

شادی کرنا چاہ رہے ہو جس کا ماں باپ کے مرنے کے بعد کوئی میکہ نہیں ہوگا اور تمہارے بچے نانا، نانی، ماموں اور خالہ کے رشتوں سے ناآشنا ہوں گے۔"

"آپ کی ساری دلیلیں بودی اور بوگس ہیں۔" ابو نے کہا۔ "میں زبان، رنگ، نسل اور ذات پات پر یقین نہیں رکھتا۔ میرے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ پڑھی لکھی سلیقہ مند اور باشعور ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اسے پسند کرتا ہوں اور چاہے کوئی کچھ بھی کہتا رہے لیکن میں اسی سے شادی کروں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

دادا اور دادی غیر جانبدار تھے۔ انہوں نے ابو کے فیصلے کی مخالفت نہیں کی اور رشتہ لے کر خان صاحب کے گھر پہنچ گئے لیکن ابو کے دوسرے بہن بھائی آخر وقت تک اس رشتے کی مخالفت کرتے رہے اور انہوں نے شادی میں بھی بے دلی سے شرکت کی۔ امی دلہن بن کر اس گھر میں آگئیں لیکن انہیں نند اور دیوروں کی جانب سے وہ پذیرائی اور عزت نہیں ملی جو ملنی چاہیے تھی۔ سب ان سے کھنچے کھنچے رہتے جیسے وہ کوئی اچھوت ہوں۔ ساس کا رویہ قدرے بہتر تھا اور وہ بہو سے سیدھے منہ بات کر لیتی تھیں۔ البتہ ابو نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ امی کا بہت خیال رکھتے اور ہر ہفتہ انہیں والدین سے ملوانے لے جاتے۔

[illegible] ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے۔ پہلے پھوپی کی شادی ہوئی پھر دونوں چچا بھی ملک سے باہر چلے گئے پھر وقفہ وقفہ سے دادا، دادی، نانا نانی بھی اس دنیا سے چلے گئے۔ اب پھوپی کے علاوہ پاکستان میں ہمارا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں تھا۔ امی کو اس بات کا شدید قلق تھا کہ ان کا کوئی سگا بہن بھائی نہیں البتہ چار سوتیلے بھائی اور دو بہنیں موجود تھیں لیکن وہ سب امی کے لیے اجنبی تھے اور ان کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

اس تنہائی سے گھبرا کر امی نے پھوپی سے [illegible] جوڑنے کی کوشش کی۔ انہوں نے بھی یہ سوچ کر اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کر لی کہ اب یہی میکہ تھا۔ باقی دونوں بھائی تو امریکا میں اپنی دنیا بسا چکے تھے۔ کبھی کبھار ان سے ٹیلی فون پر بات ہو جاتی اور بس۔ پھوپی مہینے میں ایک دو مرتبہ بھائی سے ملنے آجاتیں لیکن بچے ساتھ نہ ہوتے۔ ان کے پاس پڑھائی کا بہانہ تھا۔ دراصل وہ ددھیال سے زیادہ قریب تھے۔ ان کے بھی دو چچا اور ایک پھوپی تھیں جہاں وہ باقاعدگی سے جاتے تھے۔

ابو کے انتقال کے بعد ایک بار [illegible] لوگوں سے دوری اختیار کر لی۔ [illegible] سے ملنے آتی تھیں جب [illegible] کر دیا۔ دنیا دکھاوے کے [illegible] میں ایک چکر لگا لیتیں۔ حالانکہ ابو کے انتقال کے [illegible] ان کی زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی [illegible] میں رہیں، تمام معاملات مجھے ہی دیکھنا [illegible] مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ ابو کا چھوڑا ہوا [illegible] ہمارا ساتھ نہ دے سکے گا چنانچہ گھر کی گاڑی چلانے کے لیے [illegible] میں نے ملازمت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

گھر سے نکل کر معلوم ہوا کہ ملازمت ملنا اتنا آسان نہیں ہے۔ میں ہر اتوار کو اخبار میں ضرورت [illegible] دیکھتی اور اپنی تعلیمی قابلیت کے لحاظ سے [illegible] لیے درخواست بھیج دیتی۔ زیادہ تر [illegible] نہیں آیا اور جہاں سے انٹرویو کا بلاوا آیا [illegible] کے بارے میں کیا گیا۔ سوال [illegible] تھی کہ جب میں نے کہیں کام ہی نہیں کیا [illegible] آئے گا۔

آصف نے تین تلوار [illegible] ہوئے بولا۔ "ابھی تو نو بجنے میں [illegible] خیال ہے کہ تم وقت پر پہنچ جاؤ گی؟"

"ضرور۔" میں نے [illegible] جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کا بہت بہت [illegible] کریں کہ انٹرویو میں کامیاب ہو جاؤں۔"

"پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ [illegible] تمہیں کامیابی ہوگی۔"

[illegible] میں دھڑکتے دل کے ساتھ [illegible] دفتر میں داخل ہوئی۔ دروازے کے بالکل سامنے [illegible] کاؤنٹر تھا جس پر ایک فیشن ایبل [illegible] تھی۔ میں نے اسے کال لیٹر دکھایا [illegible] رکھی ہوئی فہرست میں میرے نام [illegible] واپس کرتے ہوئے بولی۔ [illegible]

میں [illegible] سے بیٹھی ہوئی تھیں [illegible] اور اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں [illegible] آئی تھیں۔ انہوں نے قیمتی ملبوسات زیب تن کر رکھے تھے۔

چہرے پر بے تحاشا میک اپ جیسے کسی بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آئی ہوں۔ اس کے برعکس میرا لباس بے حد سادہ اور معمولی تھا۔ میک اپ کے نام پر میں نے گھر سے نکلتے وقت ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک لگائی تھی لیکن ان لڑکیوں کو دیکھ کر مجھے کم مائیگی کا احساس ہونے لگا اور میں سمجھنے پر مجبور ہو گئی کہ شاید اب دفتروں میں ایسی ہی لڑکیوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ان حسین تتلیوں کے ہوتے ہوئے مجھے کون پوچھے گا۔

اس خیال کے آتے ہی مجھ پر ناامیدی طاری ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ واپس چلی جاؤں لیکن عین اسی وقت انٹر کام کی گھنٹی بجی۔ استقبالیہ کلرک نے ریسیور اٹھایا اور سامنے بیٹھی ہوئی لڑکیوں میں سے ایک کا نام لے کر اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے ایک ادا سے اپنے تراشیدہ بالوں پر ہاتھ پھیرا، فائل سنبھالی اور مٹکتی ہوئی اندر چلی گئی جیسے ریمپ واک کر رہی ہو۔

انٹرویو شروع ہوتے ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مجھے جتنی دعائیں یاد تھیں وہ سب میں نے پڑھ ڈالیں۔ وہ لڑکی تقریباً دس منٹ بعد باہر آئی تو اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی جیسے اس کو تقرری کا پروانہ مل گیا ہو۔ اس کے بعد دوسری لڑکی کا نام پکارا گیا وہ بھی دس بارہ منٹ بعد واپس آ گئی۔ اس کے چہرے پر بھی اطمینان تھا۔ میں اس کی وجہ نہ جان سکی۔ تیسری اور چوتھی لڑکی کے ساتھ بھی یہی ہوا کیا ہر ایک کو کوئی یقین دہانی کروائی جا رہی تھی۔

میرا نمبر سب سے آخر میں آیا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ اس وقت تک میری گھبراہٹ بالکل دور ہو چکی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر بری خبر سننے کے لیے تیار کر لیا تھا اور صرف رسم پوری کرنے کے لیے انٹرویو دے رہی تھی۔ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کمرے میں قدم رکھا۔ میرے سامنے ایک تیس پینتیس سال کا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ شکل وصورت تو اچھی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کے چہرے پر کرختگی کی جھلک نظر آئی۔ اس نے فائل پر سے نظر اٹھا کر مجھے یوں دیکھا جیسے قسائی جانور کو ذبح کرنے سے پہلے دیکھتا ہے۔ اس نے مجھے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”آپ کا تعلیمی ریکارڈ تو بہت اچھا ہے لیکن کسی دفتر میں کام کرنے کا تجربہ بالکل نہیں ہے۔ آپ کو شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ بھی نہیں آتی اور نہ ہی کمپیوٹر سے واقفیت ہے۔“

مجھے اس کی بات سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے ابھی تک کہیں ملازمت نہیں کی۔ پہلی بار گھر سے نکلی ہوں اور تجربہ تو کام کرنے سے آتا ہے۔“

”کچھ لڑکیاں شوقیہ ملازمت کرتی ہیں اور کچھ ضرورتاً۔ آپ کا شمار کس کیٹیگری میں کیا جائے؟“

”پہلی بات تو یہ کہ میں گھر بیٹھ کر اپنی صلاحیتوں کو زنگ لگانا نہیں چاہتی اور دوسری بات یہ کہ مجھے واقعی ملازمت کی ضرورت ہے۔“

”آپ سے پہلے میں نے چار لڑکیوں کا انٹرویو کیا ہے۔ وہ سب کھاتے پیتے گھروں سے تعلق رکھتی ہیں اور محض شوقیہ ملازمت کرنا چاہتی ہیں۔ ایسے لوگ کام کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوتے اور نہ ان میں کچھ سیکھنے یا آگے بڑھنے کی لگن ہوتی ہے اسی لیے میں ضرورت مند لوگوں کو ترجیح دیتا ہوں۔ میری آفس سیکریٹری ایک ماہ بعد جا رہی ہے۔ آپ اس کی جگہ لے سکتی ہیں۔ اس دوران آپ کام کو سمجھ لیں۔ تنخواہ وہی ہو گی جو میں مناسب سمجھوں گا بہرحال وہ آپ کی توقع سے کچھ زیادہ ہی ہو گی۔“

میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا جیسے کچھ پوچھنا چاہ رہی ہوں۔ وہ میرا مطلب سمجھ گیا اور بولا۔ ”آپ کل صبح سے کام پر آ جائیں۔ کل ہی آپ کو لیٹر بھی مل جائے گا۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”آپ کو اپنا حلیہ تھوڑا سا تبدیل کرنا ہو گا۔ میرا مطلب ہے آج کل کے فیشن کے مطابق۔ دفتر میں کام کرنے والی لڑکی کا گیٹ اپ ذرا مختلف ہونا چاہیے۔“

یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جی میں آیا کہ اسی وقت اس ملازمت کو ٹھکرا دوں لیکن اپنی مجبوریوں کا خیال کر کے خاموش رہی لیکن مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ یہ شخص اچھے کردار کا مالک نہیں۔ پورے انٹرویو کے دوران اس کی نظریں میرے جسم کا جائزہ لیتی رہیں اور ان کی تپش محسوس کرتے ہوئے مجھے بار بار اپنا دوپٹا ٹھیک کرنا پڑ رہا تھا۔

میں راستے بھر یہی سوچتی رہی کہ حلیہ ٹھیک کرنے سے اس کی کیا مراد ہے۔ میں کوئی ان پڑھ دیہاتی لڑکی نہیں تھی۔

میں نے یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور میں جدید فیشن کے مطابق کپڑے پہنتی تھی اگر وہ یہ چاہ رہا تھا کہ میں اسکرٹ، بلاؤز یا جینز پہن کر دفتر آؤں یا ایکٹرسوں کی طرح میک اپ کروں تو یہ میرے لیے ناممکن تھا اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ چاہے کچھ بھی کہتا رہے میں وہی کروں گی جو میرے لیے مناسب ہو گا۔

گھر پہنچ کر امی کو ملازمت ملنے کی خبر سنائی تو ان کے ذہن میں کئی اندیشے ابھر آئے اور وہ مجھ سے مختلف سوالات کرنے لگیں۔ انہیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ مجھے دفتر آنے جانے کے لیے تین بسیں بدلنا ہوں گی۔ میں نے یہ کہہ کر انہیں مطمئن کر دیا کہ اس کے لیے کوئی وین لگا لوں گی۔ آج کل سب لوگ اسی طرح کام پر آتے جاتے ہیں۔ انہیں یہ بھی پریشانی تھی کہ مجھے مردوں کے ساتھ کام کرنا پڑے گا۔ خدا جانے وہاں کا ماحول کیسا ہو گا۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اس بارے میں پہلے سے کیا کہہ سکتی تھی پھر بھی میں نے ان کی تسلی کے لیے کہہ دیا کہ میں یونیورسٹی میں بھی لڑکوں کے ساتھ پڑھتی رہی ہوں اس لیے مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہو گا اور میں اپنے آپ کو نئے ماحول میں ایڈجسٹ کر لوں گی۔

دوسرے دن میں دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلی تو پہلے سے سوچ لیا تھا کہ اگر بس کے آنے میں دیر ہوئی تو رکشا [illegible] میں نہیں چاہتی تھی کہ پہلے ہی دن دیر سے پہنچ کر باس کو [illegible] کا موقع دوں۔ اس روز میں نے باس کی خواہش کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے گیٹ اپ میں معمولی تبدیلی کی تھی۔ [illegible] کے سوٹ کی مناسبت سے ہونٹوں پر ہلکے گلابی رنگ کی لپ اسٹک لگائی اور بالوں کو شانوں پر کھلا چھوڑ دیا۔ البتہ عادت کے مطابق سر پر دوپٹا لینا نہ بھولی۔ میں نے آئینہ میں اپنا جائزہ لیا تو گزشتہ روز کے مقابلے میں کافی پرکشش اور اسمارٹ [illegible]

[illegible] بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے بیس منٹ ہو گئے تھے لیکن دور دور تک بس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ابھی میں رکشا کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ ایک بار پھر آصف رحمت کا فرشتہ بن کر آ گیا۔ اس نے بالکل قریب آ کر گاڑی روکی اور میرے لیے پسنجر سیٹ والا دروازہ کھول دیا۔ میں ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”تھینک یو آصف بھائی، آپ بڑے وقت پر آئے ورنہ میں رکشا کرنے ہی والی تھی۔“

اس نے میرے سراپے [illegible]
ہوئے بولا۔ ”آج بھی کہیں انٹرویو [illegible]
”جی نہیں۔“ میں [illegible]
جہاں انٹرویو دیا تھا انہوں نے مجھے اپائنٹ کر لیا [illegible]
جا رہی ہوں۔“
”اوہ! یہ تو بڑی خوشی کی بات [illegible]
سے بولا۔ ”لیکن وہ جگہ تو یہاں سے بہت دور [illegible]
کس طرح جاؤ گی؟“
”جی ہاں یہ مسئلہ تو ہے۔ [illegible]
سے بات کرتی ہوں۔ امید ہے کہ کوئی نہ کوئی [illegible]
ہی جائے گا۔“
اس نے ڈیش بورڈ پر سے ایک کارڈ [illegible]
دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ کارڈ رکھ لو [illegible]
مجھے فون کر دینا، میں تمہیں پک کر لوں گا [illegible]
”اس کی ضرورت نہیں [illegible]
بولی۔ ”ایک دو روز میں کوئی نہ کوئی انتظام [illegible]
”پھر بھی احتیاطاً رکھ لو [illegible]
بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے [illegible]
اس کے بعد میں [illegible]
اپنے پرس میں رکھ لیا۔ [illegible]
خیال تھا کہ وہ مجھ سے جاب کے بارے میں [illegible]
کمپنی کا نام، کام کی نوعیت اور تنخواہ [illegible]
ضروری گفتگو کرنے کا عادی نہیں تھا [illegible]
کے بارے میں جاننے کا شوق تھا لیکن [illegible]
گاڑی چلاتے وقت وہ بار بار [illegible]
دیکھتا رہا۔ ایک دو بار یوں لگا جیسے وہ [illegible]
اس کی ہمت نہیں کر پا رہا [illegible]
اس نے کار روکی اور بولا۔
تین تلوار کے پاس پہنچ کر [illegible]
[illegible] آ گئی۔ [illegible]
”لو بھئی تمہاری منزل آ گئی [illegible]
وقت تمہارے گھر مٹھائی کھانے [illegible] ہوئے کہا۔ ”میں
[illegible] ویلکم۔“ [illegible]
”موسٹ ویلکم [illegible]
آپ کا انتظار کروں گی۔“ اس نے چلتے چلتے کہا اور گاڑی
”اپنا خیال رکھنا۔“ [illegible]
اسٹارٹ کر دی۔ [illegible] میں پانچ منٹ تھے۔
میں نے گھڑی دیکھی تو بجنے میں پانچ منٹ تھے۔
میں تیز قدم اٹھاتی عمارت کی طرف بڑھی اور لفٹ کے ذریعے وقت سے کچھ پہلے ہی دفتر پہنچ گئی۔ استقبالیہ کلرک

نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا اور بولی۔ ''آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا۔ سر آنے ہی والے ہیں۔''

میں اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر ایک میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔ ساڑھے نو بجے عرفان کی آمد ہوئی۔ اس نے مجھے فوراً ہی اپنے کمرے میں بلا لیا اور ایک لیٹر مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ''اسے اچھی طرح پڑھ لیجیے اگر اس میں لکھی ہوئی شرائط منظور ہیں تو دستخط کر کے ایک کاپی مجھے واپس کردیں۔''

میں نے اپائنٹمنٹ لیٹر پر ایک نظر ڈالی۔ اس میں کوئی ایسی شرط نہیں تھی جس پر مجھے اعتراض ہوتا۔ ویسے بھی مجھے شرائط سے زیادہ تنخواہ سے دلچسپی تھی اور اس نے اپنے کہے ہوئے پر عمل کرتے ہوئے میری توقع سے زیادہ تنخواہ مقرر کی تھی۔ چھ مہینے کا آزمائشی پیریڈ تھا اور اس کے بعد میری کارکردگی کو دیکھتے ہوئے اس میں اضافہ ہوسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے دستخط کرنے میں دیر نہیں لگائی اور لیٹر کی ایک کاپی اس کے حوالے کردی۔

''گڈ!'' اس نے میرے دستخطوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا جیسے اس میں بھی تنقید کا کوئی پہلو تلاش کر رہا ہو، اس دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو زبان سے کچھ کہیں نہ کہیں لیکن ان کی حرکات و سکنات اور بدن بولی سے شخصیت کے سارے پرت ایک ایک کر کے اترتے چلے جاتے ہیں۔

اس نے انٹرکام پر استقبالیہ کلرک سے کچھ کہا اور تھوڑی دیر بعد ہی ایک اسمارٹ سی خاتون مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی میری سمجھ میں آگیا کہ باس مجھ میں کس قسم کی تبدیلی چاہ رہا تھا۔ اس عورت نے انتہائی جدید طرز کا چست لباس پہن رکھا تھا جس میں اس کے جسم کا انگ انگ نمایاں ہو رہا تھا۔ دوپٹا گلے میں رسی کی طرح جھول رہا تھا اور ترشے ہوئے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ باس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''مس شائستہ! یہ ہماری نئی کولیگ مس ثانیہ ہیں۔ اب آپ کی جگہ یہی کام کریں گی۔ آپ کے پاس ایک مہینا ہے۔ اس دوران انہیں ہر بات اچھی طرح سمجھا دیں۔''

''جی بہتر۔'' اس نے کرسی سے اٹھ کر مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور اپنے کیبن میں لے گئی۔ وہاں ایک چھوٹی میز کے علاوہ تین کرسیاں اور کونے میں فائل کیبنٹ کے علاوہ داہنی جانب سائیڈ ٹیبل پر ٹیلی فون، انٹرکام اور کمپیوٹر رکھا ہوا تھا جس کے ساتھ ایک پرنٹر بھی منسلک تھا۔ اس سارے ساز و سامان کو دیکھتے ہوئے مجھے وہ کمرا کافی چھوٹا لگا لیکن شائستہ شاید اس کی عادی ہو چکی تھی۔

وہ بڑے آرام سے اپنی کرسی پر براجمان ہوگئی اور مجھے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''پہلے چائے پی لیں پھر کام شروع کریں گے۔''

چائے پینے کے دوران اس نے اپنے جانے کی وجہ بھی بتا دی۔ اس کے شوہر کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا تھا اور وہ اس کے ساتھ ہی وہاں جا رہی تھی۔ اس نے کام کے حوالے سے بریفنگ دیتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''تم میری جگہ آفس سیکریٹری کے طور پر کام کروگی۔ سارا ریکارڈ، فائلیں تمہاری تحویل میں ہوں گی۔ کمپنی کی طرف سے خط و کتابت اور دستاویزات کی تیاری بھی تمہاری ذمہ داری ہوگی۔ البتہ خط کا مضمون باس کی طرف سے مل جائے گا۔ تمہیں صرف ٹائپ کر کے اسے بھیجنا ہوگا۔ کمپیوٹر چلانا آتا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ''کوئی بات نہیں، میں سکھا دوں گی۔ بلکہ تم ابھی سے کمپیوٹر پر بیٹھ جاؤ اور جو میں بتاؤں وہی کرتی جاؤ۔''

شائستہ بہت ہی ہمدرد اور تعاون کرنے والی عورت تھی۔ اس نے مجھے پہلے دن ہی کمپیوٹر کے بارے میں بنیادی باتیں بتا دیں اور مجھ سے دو تین صفحات ٹائپ بھی کروائے۔ ظاہر ہے کہ میرے لیے یہ ایک نئی چیز تھی۔ میں کی بورڈ پر حروف اور ہندسے تلاش کر کے انہیں ٹائپ کرتی رہی۔ اس کام میں مجھے کافی الجھن ہو رہی تھی لیکن وہ مسلسل میرا حوصلہ بڑھاتی رہی اور یہی کہا کہ میں جتنا زیادہ کمپیوٹر پر کام کروں گی اتنی ہی میری اسپیڈ بہتر ہوتی جائے گی۔

اس کے علاوہ وہ مجھے دیگر کاموں کے بارے میں سمجھاتی رہی۔ اس کے پاس جو بھی کاغذ آتا، اس کے بارے میں بتاتی کہ اسے کس فائل میں لگانا ہے۔ اس نے ایسی تمام فائلوں کی فہرست عنوانات کے ساتھ تیار کر رکھی تھی۔ اس نے مجھے باری باری وہ فائلیں پڑھنے کے لیے کہا تاکہ معلوم ہوسکے کہ ان میں کس نوعیت کے کاغذات رکھے جاتے ہیں۔ انہی فائلوں سے مجھے معلوم ہوا کہ عارف کی کمپنی باہر کے ملکوں سے مختلف اشیاء درآمد کرنے کے علاوہ سرکاری محکموں اور کارپوریشنوں میں مقامی مارکیٹ سے خرید کر کئی اشیاء سپلائی کرتی ہے۔

ہم دونوں نے لنچ بھی ایک ساتھ ہی کیا۔ کھانے کے دوران اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''شائستہ تمہاری رہائش کہاں ہے؟''

''گلستان جوہر۔'' میں نے اسے بلاک نمبر اور [illegible] بتا دی تو وہ بولی۔ ''وہاں سے تو کوئی بس براہ راست نہیں آتی۔ شاید تمہیں دو تین بسیں بدلنا پڑیں پھر صبح کے وقت بسوں میں رش بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات پائیدان پر بھی کھڑے ہونے کی جگہ نہیں ملتی۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' میں نے بجھے ہوئے دل سے کہا۔ [illegible] گاڑی والے سے بات کرنا ہوگی اگر وہ تیار ہو جائے۔''

''تم چھٹی کے بعد میرے ساتھ چلنا۔ میں گلشن جاتی ہوں۔ اُمید ہے کہ میری گاڑی میں تمہارے لیے جگہ بن جائے گی۔''

''اس طرح میرا جانا ٹھیک نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر اس نے انکار کردیا تو بڑی سبکی ہوگی میرا خیال ہے کہ پہلے تم اس سے بات کر کے دیکھ لو۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''اول تو وہ انکار نہیں کرے گا اور اگر ایسا ہوا تو تم کوئی دوسرا انتظام کرلینا۔''

اس کا خیال درست نکلا۔ ڈرائیور نے مجھے لے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ وہ شاید دل میں خوش ہو رہا تھا کہ شائستہ کے جانے سے پہلے ہی اس کی جگہ سواری مل گئی اس [illegible] روز ہی میرے آنے جانے کا مسئلہ حل ہو گیا۔

میں نے بڑی [illegible] کام کرنا شروع کردیا۔ شائستہ میرے ساتھ بہت تعاون کر رہی تھی۔ اس نے مجھے کام سے متعلق ایک ایک بات اچھی طرح سمجھا دی۔ میری پوری توجہ کمپیوٹر سیکھنے پر تھی اور میں [illegible] تھی کہ جلد از جلد اپنی اسپیڈ بہتر کرلوں تاکہ شائستہ کے جانے کے بعد مجھے آزادانہ طور پر ٹائپ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ ابھی مجھے ملازمت کرتے ہوئے ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ باس نے مجھے بلا بھیجا۔ میں اس روز بھی اپنے روایتی حلیے میں تھی۔ بند گلے، پوری آستین اور گھٹنوں تک لمبی قمیص، ڈھیلا پاجامہ اور سر پر دوپٹا۔ البتہ میں نے اپنے ذوق کے مطابق ہلکا سا میک اپ کر رکھا تھا۔

میں نے اپنے سامنے رکھا ہوا پیڈ اٹھایا اور جھجکتے ہوئے باس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے سر سے پاؤں تک میرا تنقیدی جائزہ لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی نظریں میرے جسم کے آر پار ہو رہی ہیں پھر اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''کام کیسا چل رہا ہے؟ کوئی مشکل تو نہیں ہو رہی؟''

''جی نہیں۔'' میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''مس شائستہ نے مجھے سب سمجھا دیا ہے اور اب میں کمپیوٹر پر اپنی اسپیڈ بڑھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

''گڈ!'' اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''میں شائستہ سے کہہ دوں گا کہ وہ آپ سے لیٹر ٹائپ کروانا شروع کردیں۔ اس طرح آپ کی اسپیڈ تیزی سے بڑھ جائے گی۔''

''جی بہتر۔'' میں نے کہا۔

''اور کوئی مسئلہ تو نہیں۔'' اس نے ایک بار پھر اپنی نظریں میرے جسم میں گاڑ دیں۔

میرا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ کہوں [illegible] کہ اچھی طرح دیکھ لو جو تم دیکھنا چاہ رہے ہو لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ اس لیے اپنا رخ تھوڑا سا تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ''جی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر میں کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔ ''اب میں جاؤں؟''

اس کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا اور وہ تیز آواز میں بولا۔ ''بیٹھ جائیں ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی ہے۔''

مجھے مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ اس نے وہی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اس سے پہلے کسی دفتر میں کام نہیں کیا اس لیے یہاں کے طور طریقوں سے ناواقف ہیں اور اسی وجہ سے میں اس غلطی کو درگزر کر رہا ہوں لیکن آئندہ خیال رکھیں جب تک میں نہ کہوں آپ چپ چاپ بیٹھی میری باتیں سنتی رہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''اب آپ جاسکتی ہیں۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کہنا تو بہت کچھ تھا لیکن پھر کبھی سہی۔''

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے کیبن میں چلی آئی۔ جب یہ بات شائستہ کو بتائی تو وہ بولی۔ ''تم سے واقعی غلطی ہوئی۔ آئندہ خیال رکھنا۔ وہ بہت خود پسند اور انا پرست شخص ہے اور اپنے مقابلے میں دوسروں کو بہت حقیر سمجھتا ہے۔ ایک بات اور بتا دوں اسے نہ سننے کی عادت نہیں ہے اس لیے وہ جو کہے وہی کرنا... ورنہ تمہاری

شامت آجائے گی۔"

"اور اگر اس نے ناجائز بات کہہ دی تو......؟"

"پھر تمہیں اختیار ہے جو چاہو فیصلہ کرو لیکن تم نے ایسا کیوں سوچا؟"

"آج میری اس سے تیسری ملاقات تھی اور ہر بار میں نے یہ محسوس کیا کہ اس کی نظریں مسلسل میرے جسم کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ مجھے تو وہ انتہائی بدنظر اور ہوس پرست انسان معلوم ہوتا ہے۔"

"یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔" شائستہ بولی۔ "سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تم اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دو ورنہ گھر سے نکلنا دوبھر ہو جائے گا۔ یہاں تو قدم قدم پر بھوکی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

میں شائستہ کی بات سے سو فیصد متفق نہیں تھی۔ میں نے بھی یونیورسٹی میں دو سال لڑکوں کے ساتھ پڑھا تھا۔ ان میں ہر طرح کے لڑکے تھے۔ شریف، بدمعاش، پڑھاکو، آوارہ گرد، لڑکیوں کا مذاق اڑانے والے، ان پر جملے کسنے والے وغیرہ وغیرہ لیکن میں نے کسی کی آنکھوں میں ایسی خباثت نہیں دیکھی۔ مجھے اس کے ارادے کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

چند روز سکون سے گزر گئے۔ اس دوران کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا، میں نے تقریباً سارا کام سنبھال لیا تھا اور شائستہ ایک طرح سے فارغ ہی تھی۔ باس کے کہنے پر شائستہ نے خطوط ٹائپ کرنے کی ذمے داری بھی مجھے سونپ دی تھی۔ البتہ ان پر دستخط کروانے وہی باس کے پاس جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شائستہ کے جانے کے بعد یہ ناگوار فریضہ بھی مجھ کو ہی انجام دینا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے متلی ہونے لگی۔

ایک مہینا پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ شائستہ نے جانے سے پہلے مجھے کچھ ایسی باتیں بتائیں جو اب تک میری نظروں سے اوجھل تھیں۔ اس نے کہا۔ "تم واقعی بہت محنتی ہو، تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اتنی جلدی نہ سیکھ پاتی لیکن افسوس یہاں محنت کی کوئی قدر نہیں۔ صرف وہی لوگ کامیاب ہیں جو منافقت اور چاپلوسی سے کام لینا جانتے ہیں۔ باس کا دل جیتنے کے لیے تمہیں بھی یہی کرنا ہوگا ورنہ تم کبھی کامیاب نہ ہوسکو گی۔"

میں سمجھ تو گئی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے پھر بھی میں نے اسے کریدنے کی خاطر پوچھا۔ "مثلاً مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"سب سے پہلے تو تمہیں اپنا حلیہ تبدیل کرنا ہوگا۔ پہلے میں بھی تمہاری طرح سیدھی سادی گھریلو عورت ہوا کرتی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے، سر سے پاؤں تک جسم شال میں لپٹا ہوا اور میک اپ سے بے نیاز چہرہ لیکن باس کے کہنے پر مجھے یہ روپ دھارنا پڑا۔ سچ پوچھو تو یہ یہاں کی ضرورت بھی ہے۔ اس دفتر میں ہمارے کئی کلائنٹ آتے ہیں ان سے ڈیل کرنے کے لیے تمہیں اپنی شخصیت میں نکھار لانا ہوگا۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی تمہیں باس کے ساتھ میٹنگوں اور پارٹیوں میں بھی جانے کی ضرورت پیش آئے گی۔ کیا تم وہاں بھی اسی حلیے میں جاؤ گی؟"

"میں آفس سیکریٹری ہوں اور میرا کام دفتر تک محدود ہے۔ اس کے علاوہ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"جانا تو تمہیں پڑے گا۔" وہ [illegible] انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ باس کو نہ سننے کی عادت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے تو نکال دے۔" میں نے اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں اپنی روش تبدیل نہیں کروں گی اور نہ ہی اس کے ساتھ کہیں جاؤں گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ "میرا کام سمجھانا تھا، البتہ اتنا ضرور کہوں گی کہ آج کل دوسری ملازمت ملنا آسان نہیں اس لیے سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا۔"

"تم میری فکر نہ کرو۔ میں اپنا برا بھلا اچھی طرح سمجھتی ہوں۔"

شائستہ کے جانے کے بعد تین دن سکون سے گزرے۔ اس دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی اس نے مجھے بلایا اور نہ ہی مجھے کسی سلسلے میں اس کے پاس جانا پڑا۔ میرے پاس بھی کوئی خاص کام نہیں تھا۔ ڈاک میں جو کاغذات آتے وہ میں متعلقہ فائلوں میں لگا دیتی۔ بقیہ وقت میں نے ریکارڈ میں رکھی ہوئی فائلیں پڑھنے میں گزارا۔ خاص طور پر ٹینڈر فائل میری توجہ کا مرکز تھی۔ میں جاننا چاہ رہی تھی کہ ٹینڈر کس طرح بھرا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کون سے کاغذات منسلک کیے جاتے ہیں۔

اس فائل کے مطالعے سے مجھ پر ایک حیرت انگیز انکشاف یہ ہوا کہ گزشتہ چھ ماہ کے دوران ہماری کمپنی کا کوئی

ٹینڈر منظور نہیں ہوا تھا جب کہ اس سے پہلے ہمیں باقاعدگی سے آرڈر مل رہے تھے۔ فوری طور پر اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی لیکن مجھے ایک کرید ضرور لگ گئی۔ اگر شائستہ کے سامنے یہ فائل پڑھ لی ہوتی تو اس سے وجہ پوچھی جاسکتی تھی۔

چوتھے روز میرا بلاوا آگیا۔ باس کا رویہ بہت عجیب تھا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور نہ ہی کام کے بارے میں کوئی بات پوچھی۔ بس میز پر سے چار پانچ کاغذ اٹھائے اور [illegible] ہوئے لہجے میں بولا۔ "کوشش کریں کہ یہ خطوط آج ہی ٹائپ ہو جائیں۔ یہ بہت ارجنٹ ہیں۔"

میں نے وہ کاغذ پکڑے اور کچھ کہے بغیر اپنے کیبن میں چلی آئی۔ مجھے اس کے رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ یوں لگا جیسے اس نے میری اور شائستہ کی ساری باتیں سن لی تھیں یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شائستہ نے ہی اسے پوری رپورٹ دے دی ہو۔ میں نے چھت اور دیواروں کو غور سے دیکھا۔ مجھے وہاں کوئی خفیہ مائیکروفون نظر نہیں آیا اس لیے شائستہ پر میرا شک یقین میں بدل گیا۔ ضرور اس نے باس کے کہنے پر مجھ سے وہ باتیں کی تھیں اور میں نے جواب میں جو کچھ کہا وہ اس تک پہنچا دیا ہوگا۔

میں نے سر جھٹک کر اپنے ذہن کو تمام خدشات سے آزاد کیا اور لیٹر ٹائپ کرنے بیٹھ گئی۔ میں اسے کام کے حوالے سے کچھ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی اور میری کوشش تھی کہ لنچ سے پہلے یہ خطوط ٹائپ کر کے اس کے منہ پر ماردوں۔ اس کی ہینڈ رائٹنگ بہت خراب تھی۔ اس کے علاوہ کئی الفاظ کے ہجے غلط تھے اور گرامر کی بھی غلطیاں تھیں۔ پہلے سوچا کہ جوں کا توں ٹائپ کردوں لیکن دل نے گوارا نہیں کیا اور میں ٹائپ کے ساتھ ساتھ مسودہ کی تصحیح بھی کرتی گئی۔

میں نے لنچ سے پہلے اپنا کام مکمل کیا اور اسے دینے چلی گئی۔ شاید اسے اتنی جلدی کی توقع نہیں تھی۔ اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "غلطیاں تو نہیں ہیں؟"

"آپ خود ہی دیکھ لیجیے۔"

اس نے باری باری وہ چاروں خطوط پڑھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے کام کی تعریف کرے گا لیکن وہ بہت ہی عجیب فطرت کا انسان تھا اور اسے دوسروں کو نیچا دکھانے میں مزہ آتا تھا۔ اس نے وہ چاروں کاغذ میز پر رکھے اور مجھ پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "دراصل میں نے جان بوجھ کر غلط انگریزی لکھی تھی، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ جوں کا توں ٹائپ کرتی ہیں یا اس کی تصحیح بھی کریں گی؟"

"اگر ایسا نہ کرتی تو وقت ہی ضائع ہوتا۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "پہلے آپ غلطیاں نکالتے پھر مجھے ان خطوط کو دوبارہ ٹائپ کرنا پڑتا اس طرح میں نے ایک ہی دفعہ میں کام نمٹا دیا۔"

"اچھا کیا۔" اس نے کہا اور ان میں سے ایک خط پر دستخط کر کے مجھے دیتے ہوئے بولا۔ "اسے آج ہی ڈسپیچ کردیں اور ٹینڈر فائل اچھی طرح اسٹڈی کرلیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دو دن میں ٹینڈر بھرنا پڑے۔"

میں اپنے کیبن میں واپس آگئی۔ اس کا دستخط شدہ [illegible] ڈسپیچ کیا اور سوچنے لگی کہ اگر اسے ایک ہی لیٹر بھیجنا تھا تو مجھ سے چار خطوط کیوں ٹائپ کروائے۔ کیا وہ مجھے مصروف رکھنا چاہ رہا تھا یا اسے توقع تھی کہ میں ٹائپنگ میں غلطیاں کروں گی اور اسے بولنے کا موقع مل جائے گا لیکن میں نے اس کی سازش ناکام بنادی۔ اس کی جگہ اگر کوئی شریف انسان ہوتا تو میری اس کاوش کو سراہتا لیکن اس نے [illegible] جتادیا۔

دوسرے دن اس نے پھر مجھ سے چار خط ٹائپ کروائے لیکن پہلے کی طرح ان میں سے ایک ہی [illegible] ہوا۔ باقی تین خط اس نے اپنے پاس رکھ لیے۔ اس کے علاوہ بھی اس نے دن میں کئی بار مختلف بہانوں سے مجھے اپنے پاس بلایا پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے پاس مجھے تنگ کرنے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں ہے۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ دیر تک اپنے پاس بٹھائے۔ البتہ اس کا رویہ کافی حد تک بدل گیا تھا۔ وہ مجھ سے بہت نرمی سے پیش آتا اور دھیمے لہجے میں بات کرتا لیکن اس کی نظریں مسلسل میرے چہرے اور جسم پر جمی رہتیں۔ اس کی یہی حرکت مجھے بہت ناگوار گزرتی اور میرا وہاں بیٹھنا محال ہو جاتا۔

دو دن بعد اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کچھ کاغذات مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "انہیں اچھی طرح دیکھ لیں۔ لنچ کے بعد میرے ساتھ بیٹھ کر یہ ٹینڈر تیار کرنا ہوگا۔ ہمارے لیے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے اگر یہ آرڈر ہمیں مل گیا تو سمجھ لیں کہ وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

ٹینڈر فائل کو پڑھنے کے بعد میں جان گئی تھی کہ ہمیں گزشتہ چند ماہ سے آرڈر کیوں نہیں مل رہے کیونکہ دوسری

پارٹیاں بالخصوص انٹرنیشنل ٹریڈرز ہمارے مقابلے میں کم ریٹ دے کر آرڈر پکڑ رہی تھیں۔ اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں ٹینڈر بھرنے سے پہلے مارکیٹ سروے کرلینا چاہیے تا کہ ہمیں آئٹم کی موجودہ قیمت کا اندازہ ہوجائے۔“

”اتنا وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔“ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”یہ امپورٹڈ آئٹم ہے۔ ہم صرف انہی کمپنیوں سے ریٹ لے سکتے ہیں جو پہلے سے منظور شدہ ہیں۔ آپ آج فیکس کریں گی تو جواب آنے میں بھی تین چار دن لگ جائیں گے اور کل اس ٹینڈر کی آخری تاریخ ہے۔ آپ پرانے ریٹ میں دس فیصد اضافہ کرکے نئی قیمت ڈال دیں۔“

میں نے اس سے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہ کاغذات لے کر اپنے کیبن میں آگئی لیکن مجھے یہ اندازہ ضرور ہوگیا کہ وہ کام کے معاملے میں بالکل بھی سنجیدہ نہیں ہے۔ میں نے ٹینڈر فائل کھول کر پرانا ریٹ دیکھا اور باس کی ہدایت کے مطابق اس میں دس فیصد اضافہ کرکے نئی قیمت ڈال دی لیکن مجھے شک تھا کہ اس بار بھی ہمیں یہ آرڈر نہیں ملے گا اور کوئی دوسری کمپنی کم ریٹ لگا کر یہ بازی جیت لے گی اور ایسا ہی ہوا۔

اس بار بھی انٹرنیشنل ٹریڈرز کو ہی آرڈر ملا۔ اس روز باس کا موڈ بہت خراب تھا۔ اس نے آتے ہی مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ اتنی کم قیمت پر کس طرح مال سپلائی کرسکیں گے۔ اس میں ضرور کوئی ہیرا پھیری ہوگی۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ میں نے کہا۔ ”کیا اس مال کی انسپکشن نہیں ہوتی ہوگی؟“

”جب چور اور چوکیدار مل جائیں تو سب کچھ ممکن ہے اور یہاں ایسا ہی ہورہا ہے۔ لگتا ہے کہ انٹرنیشنل والوں کا کوئی بندوبست کرنا ہوگا۔“

مجھے اس کی سوچ پر ہنسی آگئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی کمپنی کی وجہ سے اسے ہر بار منہ کی کھانی پڑ رہی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو عقل کل سمجھتا تھا اگر وہ میری بات مان کر مارکیٹ سروے کرلیتا تو اسے صحیح ریٹ مل جاتے اور اسے ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

اس واقعے کے بعد چند روز سکون سے گزر گئے اور کوئی غیر معمولی بات دیکھنے میں نہیں آئی تاہم وہ اپنی روش سے باز نہیں آیا، دن میں کئی بار مختلف بہانوں سے مجھے اپنے کمرے میں بلاتا اور بلاوجہ بٹھائے رکھتا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا کہ شاید اس نے مجھے اسی کام کے لیے رکھا ہے کہ میں اس کے سامنے بیٹھی رہوں اور وہ فضول باتیں کرکے میرا وقت ضائع کرتا رہے۔ رفتہ رفتہ اس نے کام کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی گفتگو شروع کردی پھر وہ ذاتیات پر اتر آیا۔ اس نے باتوں باتوں میں میرے خاندان، ماحول اور دیگر سرگرمیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرلیں پھر اس کی ہمت اور بڑھی۔ اس نے میرے لباس [illegible] اور رکھ رکھاؤ کی تعریفیں کرنا شروع کردیں [illegible] رہا تھا کہ وہ مجھ سے فلرٹ کررہا ہے۔ اس کا خیال تھا [illegible] میں پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں گر جاؤں گی۔

میں اس صورتِ حال [illegible] آچکی تھی اور میں نے سنجیدگی سے دوسری ملازمت [illegible] کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔ میرا خیال تھا [illegible] آصف سے بھی مشورہ کروں شاید وہ میری کچھ مدد کر [illegible] فون کرنے ہی والی تھی کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا [illegible] میری زندگی کا رخ ہی تبدیل کردیا۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ میں نے ناشتا کرنے کے فوراً بعد ہی مشین لگالی اور اپنے کپڑے دھونے بیٹھ گئی۔ ابھی میں اس کام سے فارغ ہوئی تھی کہ پھوپی کا فون آگیا۔ وہ اپنی بیٹی علینہ کے ساتھ ہم سے ملنے آرہی تھیں۔ ان کی غیر متوقع آمد کا سن کر میں چونک گئی اور سوچنے لگی کہ آج انہیں ہماری یاد کیسے آگئی۔ میں سارے کام چھوڑ کر ان کے استقبال کی تیاری میں لگ گئی۔ پہلے پورے گھر کی صفائی کی، بستروں کی چادریں بدلیں اور کھانا بنانے کچن میں گھس گئی۔ ان کے آنے تک میں تمام کاموں سے فارغ ہوچکی تھی اور لباس تبدیل کرکے اپنا حلیہ بھی ٹھیک کرلیا تھا۔

پھوپی بڑے تپاک سے ملیں۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ہماری وہی رشتے دار ہیں جنہوں نے ابو کے انتقال کے بعد ہمیں ایک دفعہ بھی پلٹ کر نہیں پوچھا کہ ہم ماں بیٹی زندہ ہیں یا مر کھپ گئیں۔ پہلا خیال تو یہی آیا کہ شاید آصف نے انہیں ہماری خبر گیری کے لیے بھیجا ہوگا لیکن بہت جلد ان کے آنے کی وجہ معلوم ہوگئی۔ کھانے کے بعد وہ امی کے ساتھ ان کے کمرے میں چلی گئیں اور میں علینہ کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہ بہت ہنس مکھ اور باتونی لڑکی تھی۔ مزے لے لے

[illegible] کے قصے سناتی رہی۔ جاتے وقت پھوپی نے [illegible] سے لگایا اور امی کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز [illegible] بولیں۔ ”بھابی! میں آپ کے فون کا انتظار کروں [illegible]

[illegible] نے چونک کر ان کی طرف دیکھا لیکن فوری طور [illegible] میں نہیں آیا کہ انہیں کس بات کا جواب چاہیے تھا۔ [illegible] جانے کے بعد میں نے امی سے پوچھا۔ ”پھوپی کیا [illegible] تھیں، انہوں نے ایسی کیا بات کہہ دی جس کے جواب کا وہ انتظار کریں گی؟“

”جوان بیٹوں کی مائیں ایسی ہی باتیں کیا کرتی ہیں۔“ امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کا جواب میں نہیں بلکہ تم دو گی۔“

”کیا مطلب؟“ میں چونکتے ہوئے بولی۔ ”ایسی کیا بات ہے جس کا جواب مجھے دینا ہے؟“

”بالکل ہی کوڑھ مغز ہو۔“ امی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”وہ تمہارے لیے آصف کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ میں نے کہہ دیا کہ تم سے پوچھ کر جواب دوں گی۔“

”اچھا کیا۔“ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میرا شادی کرنے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”یہ کیا فضول باتیں کررہی ہو۔“ امی تھوڑا سا ناراض [illegible] ہوتے ہوئے بولیں۔ [illegible]

”[illegible] کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔“

”دیکھو [illegible] لڑکے قسمت والوں کو ملتے ہیں۔ تم صرف میری تنہائی [illegible] رشتے سے انکار مت کرو۔ میں اپنا کوئی نہ کوئی بندوبست کرلوں گی اور آصف کا گھر کون سا دور ہے۔ تم روزانہ مجھ سے ملنے آسکتی ہو۔“

”اچھا مجھے سوچنے کے لیے [illegible] دیں۔“ میں نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

”اچھی طرح سوچ لو، مجھے اُمید ہے کہ تمہارا جواب ہاں میں ہوگا۔“

[illegible] سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس انکار کرنے کی کوئی وجہ [illegible] تھی۔ آصف ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل شخص تھا۔ پڑھا [illegible] خوب صورت، ذاتی گھر، کاروبار اور سب سے بڑھ کر [illegible] بھالا اور قریبی رشتہ دار۔ مجھے یقین تھا کہ میں اور [illegible] کر امی کی تنہائی کا کوئی حل نکال لیں گے چنانچہ میں [illegible] دوسرے روز امی کو اپنی رضامندی سے آگاہ کردیا۔

پھر سب کچھ بڑی تیزی سے ہوا۔ پھوپی کو شاید بہت جلدی تھی۔ امی کی طرف سے ہاں ہوتے [illegible] منگنی کے لیے اصرار کیا اور چند [illegible] کے نام کی انگوٹھی پہن لی۔ وہ تو شادی [illegible] لیکن امی نے تیاری کے لیے کچھ مہلت [illegible] شادی چھ ماہ بعد ہوگی۔

میں نہیں چاہتی تھی کہ دفتر [illegible] ہو۔ خاص طور پر باس کو تو بالکل ہی [illegible] وہ الٹے سیدھے سوال کرکے میرا دماغ [illegible] بھی میں نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ [illegible] شادی تک کچھ پیسے جمع ہوجائیں تو ان سے [illegible] چیزیں آجائیں گی۔

امی نے زور و شور سے شادی کی تیاری شروع کردی تھی حالانکہ پھوپی نے انہیں منع کردیا تھا [illegible] بارے میں فکرمند نہ ہوں۔ انہیں [illegible] اپنی خوشی اور شوق سے میرے لیے [illegible] تھیں۔

میں سالگرہ نہیں مناتی۔ اس روز [illegible] نے مجھے فوراً ہی بلا لیا اور میری طرف [illegible] بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”سالگرہ مبارک [illegible]

میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے [illegible] سالگرہ کی تاریخ کیسے معلوم ہوئی [illegible] مجھے اس سوال کا جواب مل گیا [illegible] فائل دیکھی ہوگی۔ میں نے رسماً اس کا شکریہ [illegible] بولی۔ ”اس کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو ویسے [illegible] مناتی۔“

”کیوں؟ اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”میری نظر میں یہ ایک فضول رسم ہے [illegible] کوئی بات ہوئی کہ آپ کی زندگی کا ایک سال کم ہوگیا اور اس کی خوشی منائی جارہی ہے۔“

”مجھے آپ کی سوچ پر حیرت ہورہی ہے [illegible] کل تو اسی سال کے بوڑھے بھی بڑے جوش و خروش سے اپنی سالگرہ مناتے ہیں۔“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ کوئی کیا کرتا ہے [illegible]“ میں نے بے رخی سے کہا۔ ”میں اپنی مرضی کی [illegible] اپنے حساب سے چلتی ہوں۔“

”خیر، اس بحث کو چھوڑیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں آج کے دن کو خاص بنانا چاہتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے

کہ جو کچھ کہوں گا۔ اس پر آپ سنجیدگی سے غور کریں گی۔"

"جی فرمائیے۔ میں سن رہی ہوں۔"

"آپ جانتی ہیں کہ میں نے اب تک شادی نہیں کی۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی تو یہ کہ ماں باپ بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ ماموں نے میری پرورش کی پھر وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے میں نے سیلف میڈ زندگی گزاری ہے۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے مجھے بہت محنت اور جدوجہد کرنا پڑی اس دوران کئی لڑکیاں میری زندگی میں آئیں لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے معیار پر پوری نہ اتری۔"

"لیکن یہ سب آپ مجھے کیوں سنا رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ اب جو کچھ کہنے والا ہوں اس کا تعلق آپ کی ذات سے ہے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ "آپ پہلی لڑکی ہیں جس نے مجھے ہر لحاظ سے متاثر کیا اس لیے میں نے آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"سوری۔" میں نے سپاٹ انداز میں کہا۔ "میری منگنی ہوچکی ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "منگنی ٹوٹ بھی سکتی ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "آپ کو میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔"

"اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔" وہ اپنی خبیث مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولا۔ "آرام سے بیٹھ جاؤ اور میری بات غور سے سنو۔" وہ ایک دم آپ سے تم پر آگیا۔ "اب یہ معاملہ صرف تمہارا نہیں میرا بھی ہے۔ مجھے انکار سننے کی عادت نہیں اس لیے تمہیں سوچنے کے لیے وقت دے رہا ہوں تاکہ بعد میں تمہیں پچھتانا نہ پڑے۔"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" میں نے تڑخ کر کہا۔ "اور نہ ہی مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت ہے میں اس رشتہ سے خوش اور مطمئن ہوں۔ براہ کرم آپ اس بات کو یہیں ختم کردیں ورنہ میں جاب چھوڑنے پر مجبور ہوجاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں کچھ نہیں کہوں گا لیکن مجھے یقین ہے کہ وقت اور حالات تمہیں یہ فیصلہ بدلنے پر مجبور کردیں گے۔"

اس مرحلے پر جاب چھوڑنا میرے لیے نقصان دہ ہوتا اس لیے مجبوری کے عالم میں اپنی مٹھیاں بھینچنے کے علاوہ کچھ نہ کرسکی تاہم میں نے اس سے حتی الامکان دور رہنے کا فیصلہ کرلیا اور اس کے سامنے جانے سے گریز کرنے لگی۔ اس کے دس دفعہ بلانے پر میں ایک دفعہ جاتی اور مختصر بات کرکے واپس آجاتی کیونکہ اب میرے دل سے اس کا ڈر خوف نکل چکا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتا تھا کہ نوکری سے نکال دے۔ اس کے لیے میں ذہنی طور پر تیار تھی۔

ایک ہفتہ سکون سے گزر گیا اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ہفتے کی شام میں گھر آئی تو امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ان کے سینے میں درد ہو رہا تھا۔ میں نے فوراً ٹیکسی منگوائی اور انہیں اسپتال لے گئی۔ ان کا بلڈ پریشر بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے ایکسرے اور ای سی جی لینے کے بعد انہیں ایڈمٹ کرلیا۔ میں نے اسپتال سے فون کرکے پھوپی کو امی کے بارے میں بتایا تو وہ فوراً ہی آصف کے ہمراہ اسپتال پہنچ گئیں۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ صبح امی کی انجیو گرافی ہوگی۔ اس کے بعد ہی ان کا علاج شروع ہوگا۔



تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد پھوپی اور آصف واپس چلے گئے اور میں امی کے پاس ہی رک گئی۔ [illegible] بلڈ پریشر کم کرنے کی دوا دے گئی جس کے بعد وہ گہری نیند سو گئیں۔ میں بارہ بجے تک جاگتی رہی۔ اس کے بعد کمر سیدھی کرنے کے لیے کاؤچ پر لیٹ گئی۔ صبح فجر کے وقت میری آنکھ کھلی تب بھی امی بے سدھ سو رہی تھیں۔ میں واش روم سے واپس آئی تو ڈیوٹی نرس ان کا بلڈ پریشر لینے آگئی۔ اس نے جیسے ہی ان کی نبض دیکھی اسے ایک زور کا جھٹکا لگا اور وہ دوڑتی ہوئی ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی جس نے امی کے دل کی دھڑکن چیک کرنے کے بعد مایوسی سے سر ہلایا اور بولا۔ "مجھے افسوس ہے کچھ دیر پہلے انہیں ایک اور دورہ پڑا اور وہ جانبر نہ ہوسکیں۔"



میں نے بمشکل تمام اپنے آپ پر قابو پایا اور جیسے تیسے کرکے پھوپی کو فون پر اطلاع دی تھوڑی دیر بعد سب لوگ وہاں پہنچ گئے۔ میں پھوپی سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ آصف نے ہی تمام معاملات نمٹائے اور ضروری کارروائی کے بعد ہم لوگ امی کا جسد خاکی لے کر گھر آگئے۔



پھوپی سوئم تک میرے پاس رہیں۔ دوسرے دن میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے دفتر فون کرکے باس کو امی کی موت کے بارے میں بتایا۔ اس نے رسماً افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ میں جتنے دن چاہوں چھٹی کرسکتی ہوں۔ وہ مجھ سے تعزیت کرنے گھر آنا چاہ رہا تھا لیکن میں

نے اسے منع کر دیا اور کہا کہ اس کا آنا بے سود ہوگا کیونکہ میرے گھر میں اس سے بات کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ دراصل میں نہیں چاہتی تھی کہ آصف سے اس کا سامنا ہو اور بعد میں وہ اس کے بارے میں الٹے سیدھے تبصرے کرے اس کے باوجود وہ سوئم والے روز آ گیا اور آصف سے اس کی ملاقات بھی ہوگئی۔

امی کے انتقال کے بعد میں بالکل تنہا ہوگئی اس لیے پھوپی مجھے اپنے گھر لے گئیں ان کے علاوہ اس شہر میں میرا کوئی اور قریبی عزیز نہیں تھا۔ گھر کے سب افراد میری دلجوئی میں لگے رہتے لیکن امی سے بچھڑنے کا غم ایسا نہ تھا کہ آسانی سے بھلا دیا جاتا پھر ایک روز باس کا فون آ گیا۔ اس نے مجھے دفتر آنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ اس طرح میرا دھیان بٹ جائے گا لیکن پھوپی اور آصف اس کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اب مجھے نوکری کرنے کی ضرورت نہیں اس لیے ڈاک سے استعفیٰ بھیج دوں۔

ملازمت کی شرائط کے مطابق ایک ماہ کا نوٹس دینا ضروری تھا ورنہ مجھے ایک ماہ کی تنخواہ دینا پڑتی۔ میں یہ نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھی اس لیے میں نے بڑی مشکل سے پھوپی کو اس پر راضی کیا کہ وہ مجھے مزید ایک ماہ کام کرنے کی اجازت دے دیں، وہ مجھ پر زبردستی کرنا نہیں چاہتی تھیں اس لیے خاموش ہوگئیں۔

امی کے دسویں کے بعد میں نے کام پر جانا شروع کر دیا۔ دفتر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد باس نے بلایا اور میری دل جوئی کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہی روایتی گھسے پٹے جملے کہ کسی کے جانے سے دنیا کے کام نہیں رکتے۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ تمہارے سامنے ایک پہاڑ سی زندگی پڑی ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں بے دلی سے اس کی باتیں سنتی رہی جب وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا تو میں نے اپنے پرس میں سے استعفیٰ نکال کر اسے پکڑا دیا۔

"میں ایک ماہ کا نوٹس دے رہی ہوں۔ اس دوران آپ کسی دوسری سیکریٹری کا بندوبست کر لیں۔"

اس نے پڑھے بغیر وہ کاغذ میز کی دراز میں رکھ لیا اور بولا۔ "اس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ فی الحال تم اپنا کام دیکھو۔ تمہاری میز پر کافی کاغذ جمع ہوگئے ہیں۔"

مجھے اس کے رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے میرے استعفے کو بالکل اہمیت نہیں دی اور ایک عام کاغذ سمجھ کر رکھ لیا جب کہ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھے سمجھانے اور ملازمت جاری رکھنے کے لیے کہے گا۔ میں یہی کچھ سوچتی ہوئی کام کرنے بیٹھ گئی۔ شام تک میں تمام کاغذات متعلقہ فائلوں میں لگا چکی تھی اور ضروری خطوط بھی ٹائپ کر لیے تھے۔

تین دن سکون سے گزر گئے۔ چوتھے روز اس نے صبح ہی مجھے بلا لیا اور بولا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم یہ ملازمت چھوڑ کر جاؤ بہتر ہوگا کہ تم یہ کاغذ اپنے ہاتھ سے پھاڑ دو۔" اس نے استعفیٰ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"سوری، ان حالات میں میرے لیے یہ ملازمت جاری رکھنا ممکن نہیں۔"

"کھل کر بات کرو۔ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" اس نے بار... لہجے میں کہا۔

"جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں اپنی امی کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد میں بالکل تنہا ہوگئی ہوں۔ پھوپی مجھے اپنے گھر لے گئی ہیں۔ ان کے علاوہ اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ وہ میری سرپرست اور ہونے والی ساس ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اب مجھے نوکری کرنے کی ضرورت نہیں۔ شادی کے بعد میں آصف کی ذمہ داری بن جاؤں گی۔"

"آصف؟" وہ چونکتے ہوئے بولا۔ "تمہاری منگنی آصف سے ہوئی ہے؟"

"ہاں، وہ میرا پھوپی زاد ہے لیکن آپ اتنا حیران کیوں ہو رہے ہیں؟ کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"بہت اچھی طرح۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "تم آصف کے بارے میں اور کیا جانتی ہو؟"

"مجھے کچھ جاننے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے بچپن سے دیکھتی آئی ہوں اور میرے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ وہ میری ذمے داری اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم واقعی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ اچھا ہوا کہ مجھے وقت پر معلوم ہوگیا ورنہ تم تو اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگانے والی تھیں۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" میں نے غصے سے کہا۔ "آپ نے مجھ سے نوکری چھوڑنے کی وجہ پوچھی وہ میں نے بتا دی۔ اب اس بات کو یہیں ختم کر دیں۔"

"یہ بات اتنی آسانی سے ختم ہونے والی نہیں۔" اس نے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں اس کی حقیقت بتانا چاہتا ہوں تاکہ تمہاری زندگی برباد ہونے سے بچ جائے۔ وہ انٹرنیشنل ٹریڈرز کا مالک ہے جو پچھلے کئی ماہ سے

...والہ چھین رہی ہے۔"

...مجھے معلوم نہیں تھی کہ آصف ہی انٹرنیشنل ... ہے۔ بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ... اپنا ہوتا رہتا ہے۔"

...کے باوجود وہ ایک ناکام شخص ہے۔ اس میں ...بوجھ کی کمی ہے۔ وہ کم ریٹ دے کر آرڈر تو ...بعد میں اسے نقصان ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ...وہ ان لوگوں کا بھی مقروض ہے جن سے مال ...ئی کرتا ہے اگر یہی حال رہا تو بہت جلد وہ ...یہ ہو جائے گا۔"

"آپ کو اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟" میں نے تنگ کر کہا۔ "وہ خود اپنا برا بھلا سوچ سکتا ہے۔"

"میں مارکیٹ میں بیٹھا ہوں اس لیے کاروباری ...لیں پر نظر رکھنا میری مجبوری ہے۔ میں نے یہ سب تمہیں اس لیے بتائی ہیں کہ ایک بار پھر اچھی طرح سوچ لو۔ ایک ایسے شخص کے ساتھ مستقبل وابستہ کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ جس کا اپنا کوئی مستقبل نہ ہو۔"

"مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے تیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "کاروبار میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔

کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ اگر آج اسے نقصان ہو رہا ہے تو کل فائدہ بھی ہو سکتا ہے انسان کو ہمیشہ اچھی امید رکھنی چاہیے۔"

"لیکن میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔" وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔ "یہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ جو چیز مجھے پسند آ جائے اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے چھوڑتا ہوں۔ تم پر پہلا حق میرا ہے اس لیے تمہیں مجھ سے ہی شادی کرنا ہوگی۔"

"پہلی بات تو یہ کہ میں کوئی چیز نہیں بلکہ جیتی جاگتی لڑکی ہوں جو اپنی عقل، شعور اور مرضی کے مطابق فیصلہ کر سکتی ہے دوسری بات یہ کہ آپ سے اجازت کون مانگ رہا ہے۔ آپ کو میری ذاتی زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ وقت اور حالات تمہیں اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیں گے۔ سو اب وہ وقت آ گیا ہے میں ایسا چکر چلاؤں گا کہ تم آصف اور اس کے گھر والوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔ وہ تمہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیں گے۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے تین دن کا وقت دے رہا ہوں۔ اس کے بعد جو بھی ہوگا اس کی ذمے

دار تم خود ہو گی۔ اب تم جا سکتی ہو۔"

میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ باس کی باتیں میرے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں۔ اب وہ کھلم کھلا بلیک میلنگ پر اتر آیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے اس کا دماغ شیطان کی طرح چلتا تھا۔ آج کل جعل سازی عام ہے۔ جعلی تصویریں، جعلی ویڈیوز، جعلی خطوط اور جعلی فیس بک اکاؤنٹ۔ وہ کوئی بھی طریقہ اختیار کر کے میرے لیے مشکل کھڑی کر سکتا تھا۔

رات بھر میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے لیکن اس مشکل کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آیا۔ پہلے سوچا کہ پولیس کو اطلاع کر دوں لیکن وہ بھی کیا کر لیتی میرے پاس اس کی کہی ہوئی زبانی باتوں کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ وہ صاف مکر جاتا اور الٹا مجھے لینے کے دینے پڑ جاتے۔ جس بدنامی سے بچنے کے لیے میں پولیس کا سہارا لے رہی تھی وہ میرے گلے کا ہار بن جاتی۔

ایک خیال یہ بھی آیا کہ پھوپی اور آصف کو پوری بات بتا دوں لیکن اس میں بھی ایک قباحت تھی۔ وہ مجھے فوری طور پر دفتر جانے سے منع کر دیتے اور اس کے نتیجے میں باس کوئی ایسی حرکت کرتا جو میرے لیے بدنامی کا سبب بن جاتی۔ ایک بار مرد کے دل میں شک کا بال آجائے تو وہ ساری عمر نہیں جاتا۔ چنانچہ میں نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ ضرور میری مدد کرے گا۔

صبح اٹھ کر میں نے نماز پڑھی اور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ اللہ مجھے اس شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔ اس کے بعد میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ دفتر کے لیے روانہ ہو گئی۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔

میرے دفتر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ایک فیشن ایبل عورت میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ باس اس وقت تک نہیں آیا تھا۔ اس عورت نے کھڑے کھڑے نخوت بھرے انداز میں پوچھا۔ "عرفان ہے؟"

میں اس کے انداز تخاطب پر حیران رہ گئی۔ وہ کتنی بدتمیزی سے باس کا نام لے رہی تھی جیسے وہ اس کا زرخرید غلام ہو۔ بہر حال میں نے مؤدبانہ انداز میں کھڑے ہوتے کہا۔ "جی وہ ابھی تشریف نہیں لائے۔"

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور کہنے لگی۔

"کمال ہے۔ ساڑھے نو بج رہے ہیں اور وہ ابھی تک غائب ہے۔ خیر میں اندر جا رہی ہوں تم میرے لیے چائے بنواؤ۔" یہ کہہ کر وہ باس کے کمرے میں چلی گئی۔ میں اسے روکنے کے ارادے سے اس کے پیچھے گئی تو وہ باس کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کون ہیں اور باس کی کرسی پر کیوں بیٹھ گئیں؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم شاید نئی آئی ہو اس لیے مجھے نہیں جانتیں بھئی میں تمہارے باس کی بیوی ہوں اور اس کمپنی کی مالکن بھی۔"

"لیکن میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" میں نے [illegible] ہوئے کہا۔

"[illegible] اپنے والدین کے پاس امریکا گئی ہوئی تھی۔ تین ماہ بعد واپس [illegible] ہوں [illegible] ہے ویسے بھی میں بہت کم آفس آتی ہوں۔ عرفان ہی سارا کام [illegible] سکتا ہے۔ حالانکہ میں نے اسے آنے کی اطلاع دے د[illegible] کے باوجود وہ مجھے لینے ایئر پورٹ نہیں آیا۔ پہلے میں [illegible] بھی نہیں تھا۔ میں سامان رکھ کر یہاں چلی آئی [illegible] یہاں کا حال احوال دیکھ لوں۔ اب تو تمہیں معلوم ہو گیا [illegible] کون ہوں۔ اسی بات پر جلدی سے چائے بھجوا دو۔"

میں اپنے کمرے میں واپس آئی۔ آفس بوائے [illegible] کو چائے بنانے کے لیے کہا اور خود جاء نماز بچھا کر شکرانے کے نفل ادا کرنے لگی۔ میری دعا قبول ہو گئی تھی۔ باس کی بیوی کی بروقت آمد میرے لیے نجات کا سبب بن گئی۔

دوسرے دن میں دفتر نہیں گئی۔ میں نے عرفان کو فون کر کے کہا۔ "اگر آپ اپنی بیوی سے دوسری شادی کی اجازت لے لیں تو میں تیار ہوں کیونکہ یہ قانونی تقاضا ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ "بھول جاؤ کہ میں نے تم سے ایسی کوئی بات کہی تھی۔"

"کیسے بھول جاؤں۔ تم نے مجھے جو اذیت پہنچائی ہے اس کا بدلہ تو ضرور لوں گی۔ سوچ رہی ہوں کہ تمہاری بیوی کو ساری کہانی مکالموں کے ساتھ سنا دوں۔"

"خدا کے واسطے ایسا غضب نہ کرنا۔" وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔"

میں نے فون بند کر کے زوردار قہقہہ لگایا اور ایک بار پھر رب کے حضور سجدہ ریز ہو گئی۔

[illegible] اپنی گاڑی مہ رخ کی کوٹھی کے پورچ میں [illegible] دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ محل نما عالیشان [illegible] کے ذہن میں بے شمار سوالات اٹھ کھڑے [illegible] اونچی چھلانگ لگائے گا اس کے وہم و گمان [illegible] تھا۔ ماں کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر [illegible] انداز میں کہا۔ "مما آپ کچھ پریشان [illegible]"

[illegible] نے ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "[illegible] میرے بچے ایسی کوئی بات نہیں۔" دونوں بہنیں انعم اور صنم نے بھی بھانپ لیا تھا۔ انعم تو خاموش رہی لیکن صنم فوراً بول پڑی۔ "بھائی [illegible] قریب میں جھانک رہی ہیں۔ اتنی قد آور [illegible] کے در و دیوار تو بلند کرنے ہوں گے ناں۔"

[illegible] کے والد ناصر شیخ نے تائیدی انداز میں [illegible] ہوئے کہا۔ "سو فیصد درست کہہ رہی ہے ہماری [illegible] متفق ہوں۔"

انعم نے باپ اور بہن کی مکالمہ بازی [illegible] چڑھاتے ہوئے ناگوار لہجے میں کہا۔ "آپ لوگ [illegible] انداز میں سوچتے ہیں ارے یہ تو ہماری خوش [illegible] ہمارے بھائی نے اتنے امیر کبیر گھر کی لڑکی پسند کی [illegible]"

پسِ نقاب

جناب ایڈیٹر سرگزشت

سلام مسنون

ایک اور جگ بیتی حاضرِ خدمت ہے۔ یہ صبوحی کی سرگزشت ہے جسے میں نے الفاظ کا پیرہن دیا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ سچ بیانی قارئین کو پسند آئے گی۔

آصفہ ضیاء احمد

(حیدر آباد)



ہائے بھائی یہاں شادی ہو جائے تو سارا خاندان جل مرے گا۔"

مدثر نے چڑ...کر کہا۔ "اب اترو بھی، کیا سارے مذاکرات گاڑی میں ہی ہو جائیں گے۔"

گھر کے ایک ملازم نے انہیں ریسیو کیا اور ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں بولا۔ "آپ لوگ یہاں تشریف رکھیے، صاحب اور بیگم صاحبہ تو باہر گئے ہوئے ہیں، چھوٹی بی بی کو آپ لوگوں کی آمد کی اطلاع دیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ چلا گیا۔

باہر کی جہنم زدہ گرمی کے تھپیڑے کھاتے ہوئے وہ لوگ یہاں پہنچے تھے۔ پُرتعیش اور پُرسکون ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا، گویا بہشت میں سانس لے رہے ہوں۔ مدثر درِ جاناں پر حاضری دینے کے لیے اتنا بے قرار تھا کہ اس نے سورج ڈھلنے کا بھی انتظار نہیں کیا، اس کے علاوہ یہ بات بھی اس کے علم میں تھی کہ مہ رخ کی اکثر شامیں گھر سے باہر اپنی دوستوں کے ساتھ گزرتی ہیں اور آج وہ اپنی فیملی کو جس مقصد سے لے کر آیا تھا اس کے لیے مہ رخ کی موجودگی اشد ضروری تھی۔ دروازے پر آہٹ سی ہوئی اور سب نے بیک وقت نظریں اٹھا کر دیکھا تو بلیو جینز اور سلیولیس ہاف بلیک شرٹ میں ملبوس وہ شعلہ رو کھڑی تھی جس کا نام مہ رخ تھا۔ قیامت خیز حسن اور جاذبِ نظر شخصیت کی مالک مہ رخ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے کمرا جگمگا اٹھا۔ تیکھے نقوش اور سانولی سلونی رنگت والی انعم اور صنم اسے دیکھ کر پلکیں جھپکانا ہی بھول گئیں۔ جب کہ صبوحی اور ناصر دونوں میاں بیوی نے اس کے لباس کو دیکھ کر ناگواری سے منہ بنایا۔ مہ رخ نے ایک ادائے ناز سے اپنا نرم و نازک ہاتھ ہلا کر انہیں ہیلو کیا۔ ناصر نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔ مہ رخ ایک صوفہ چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میں معذرت خواہ ہوں کہ ماما پاپا گھر پر موجود نہیں ہیں۔ میں نے انہیں فون کر دیا ہے بس آتے ہی ہوں گے۔ آپ لوگوں کو انتظار کی زحمت اٹھانی ہوں گی۔"

صبوحی نے مشفقانہ لہجے میں جواب دیا۔ "کوئی بات نہیں بیٹا، تھوڑی دیر بیٹھ کر انتظار کرنے میں ایسی کون سی مصیبت آجائے گی۔"

مدثر نے نہایت مناسب الفاظ میں اپنے والدین اور بہنوں کا تعارف کروایا۔ مہ رخ مسکرا مسکرا کر سب سے ملی۔

اس کا انداز گفتگو اور وقفے وقفے سے بالوں کو جھٹکنے کے انداز پر مدثر تو ریشہ خطمی ہو رہا تھا۔ ساتھ انعم اور صنم کو بھی وہ بہت اچھی لگ رہی تھی لیکن ناصر اور صبوحی کے چہروں کے تاثرات میں ناپسندیدگی نمایاں تھی۔ اسی اثناء میں ملازم نے ٹی ٹیبل پر انواع و اقسام کی فوڈز آئٹم سجا دیں۔ سب نے تکلفاً تھوڑا بہت کھایا اور ٹھنڈے مشروب سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ مہ رخ نے کھڑکی کا پردہ سرکایا اور باہر جھانکتے ہوئے بولی۔ [illegible] اور پاپا بھی آگئے۔"

[illegible] نگاہوں میں شوق تجسس تھا اور آنکھیں دروازے [illegible] تھیں۔

قیمتی اور [illegible] شلوار کرتے میں ملبوس ایک پختہ العمر مرد اور اس کے عقب میں [illegible] ہوئی خوش شکل اور ساڑی زیب تن کیے ہوئے ایک [illegible] داخل ہوئی، دونوں بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو [illegible] لیکن آثار بتا رہے تھے کہ اپنے زمانے کی خوب صورت [illegible] رہی ہوگی۔ جیسے ہی دونوں نے ڈرائنگ روم میں قدم [illegible] صبوحی میکانکی انداز میں کھڑی ہو گئی۔ وہ منہ [illegible] آنکھوں سے دونوں کو تک رہی تھی۔ مہ رخ کے ماما اور [illegible] بھی اپنی جگہ تھم گئے تھے اور دونوں کی ساکن نظریں صبوحی کے چہرے پر منجمد ہو گئی تھیں۔ صبوحی برسوں کی نیند سے جاگی تھی۔ وہ ساکن اور استعجاب انگیز نظروں سے ان دونوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ آہستہ سے اس کے ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی اور وہ سرسراتی آواز میں بولی۔ "آپ......آپ مہ رخ کے پیرنٹس ہیں۔ میرے وہم و گمان میں یہ بات نہیں تھی کہ آپ لوگوں سے یوں ملاقات ہو جائے گی۔"

دوسری جانب وہ دونوں میاں بیوی بھی حیرت کے سمندر میں غرق صبوحی کے سامنے کھڑے تھے۔ بالکل ساکت و جامد، بغیر پلکیں جھپکائے صبوحی کو تک رہے تھے۔ چند ثانیے بعد مہ رخ کی ماں نورینہ نے آگے بڑھ کر صبوحی کو والہانہ انداز میں گلے لگایا اور کہا۔ "ہائے صبوحی میں مرگ نہ ہو جاؤں۔ اچانک برسوں کے بچھڑے یوں پل میں مل جائیں گے۔ کبھی میں نے بھی نہیں سوچا تھا۔" لمحاتی توقف کے بعد اس نے شوہر کی طرف اشارہ کیا اور استفسارانہ انداز میں بولی۔ "انہیں پہچانا۔"

صبوحی نے تھوک نگلتے ہوئے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "ارے واہ کیوں نہیں پہچانوں

[illegible] بھائی ہیں ناں۔ ایک طویل عرصے ہم ایک [illegible] پڑوسی رہے ہیں اور آپ لوگ کوئی بھولنے والی [illegible] آپ لوگوں کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ

[illegible] نے بھی ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سے [illegible] لیا تھا کہ صبوحی اور مہ رخ کے والدین ایک [illegible] کے لیے اجنبی نہیں ہیں بلکہ کافی پرانے اور گہرے [illegible] ایں آپس میں۔ صبوحی نے اپنے شوہر ناصر شیخ اور [illegible] بچوں کا تعارف کروایا۔ مدثر کا چہرہ خوشی اور مسرت سے دمک رہا تھا۔ دل میں آرزوئیں اور امنگیں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ اسے اپنی منزل مقصود بہت قریب نظر آرہی تھی۔ اس کی ماں کے اس خاندان سے اتنے قریبی تعلقات [illegible] یہ اس کے لیے پلس پوائنٹ تھا۔ وہ چشم تصور میں اپنے [illegible] کو دولہا اور مہ رخ کو دلہن بنے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ چونکا تو وہ اس وقت جب اس کی ماں صبوحی نورینہ اور شاہ نواز سے واپسی کے لیے اجازت طلب کر رہی تھی جب کہ شاہ نواز اور نورینہ ان سب کو اپنے ساتھ رات کے کھانے کی دعوت [illegible] رہے تھے لیکن صبوحی نے سفید جھوٹ بولا کہ انہیں آج [illegible] عزیز کی شادی میں شرکت کرنی ہے۔ مدثر اپنی [illegible] کر رہ گیا۔ دونوں لڑکیاں تحیر آمیز نظروں سے [illegible] ماں کو [illegible] ناصر شیخ صبوحی کی حکمت عملی کو سمجھ گئے کہ وہ یہاں مزید [illegible] چاہتی ہے اس لیے واپسی کے لیے پر تول رہی ہے۔ انہوں نے تائیدی انداز میں [illegible] ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہم [illegible] خواہ ہیں کہ آپ لوگوں کو زیادہ وقت نہیں دے سکے۔ ان شاء اللہ پھر کبھی حاضر ہوں گے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے [illegible] کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ مدثر دل ہی دل میں دانت پیس [illegible] واپسی پر گاڑی میں مکمل خاموشی چھائی [illegible] کے دل و دماغ میں ان گنت سوالات مچل رہے [illegible] مگر کسی سے کچھ پوچھنے کا کسی میں حوصلہ نہیں تھا کیونکہ نہ صرف ناصر شیخ کو بلکہ مدثر اور دونوں لڑکیوں کو بھی اچھی طرح علم تھا کہ صبوحی جب مکمل طور پر خاموشی اختیار کرتی ہے تو کوئی نہ کوئی اہم مسئلے پر سوچ رہی ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پر عجیب سی بے کلی اور بے قراری تھی۔ اپنی سیٹ پر بیٹھی وہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ آتے ہوئے جوش و جذبے سے [illegible] چہرہ جو تمتما رہا تھا لیکن اب موڈ یکدم مختلف تھا۔ گھر پہنچ کر بھی نہ کسی نے مہ رخ کے حسن پر قصیدے پڑھے اور نہ ہی صبوحی

[illegible] سے یہ دریافت کیا کہ اس خاندان کو وہ کب سے جانتی [illegible] سب خاموشی سے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے لیکن صبوحی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی ماضی کی بھول بھلیوں میں گم [illegible] ہونٹوں پر ابھی بھی سنگین خاموشی تھی۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر مدثر نے بولنے سے پہلے [illegible] کام لے کر ماں سے استفسار کیا۔ "امی مہ رخ آپ کو کیسی لگی؟"

صبوحی نے بھرپور نظروں سے بیٹے کو دیکھا اور کہا۔ [illegible] اچھی لگی لیکن......لیکن میں اسے بہو ہرگز نہیں بناؤں گی۔

[illegible] یک وقت انعم اور صنم کی زبان سے نکلا۔ [illegible] اتنی حسین اور دولت مند لڑکی پھر بھلا کہاں ملے گی؟

صبوحی نے دونوں بیٹیوں کو تیز نگاہوں سے [illegible] دونوں وہیں دبک گئیں اور جلدی جلدی چائے کے بڑے گھونٹ لینے لگیں پھر پیالی خالی کر کے [illegible] کھسک گئیں۔ مدثر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا [illegible] تحاشا بیٹے پر پیار آیا جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور [illegible] کے باوجود ماں باپ کا اتنا فرماں بردار [illegible] بات نہیں کرتا تھا۔ اپنی شادی کی بات بھی اس [illegible] بلکہ جب انعم اور صنم منگنی شدہ ہو [illegible] خود اس سے کہا کہ وہ دونوں لڑکیوں کی شادی [illegible] لانا چاہتی ہے اور اس سلسلے میں [illegible] ہے۔ تمہاری نظر میں اگر کوئی لڑکی ہے تو [illegible] کو ترجیح دیں گے۔

مدثر کے دل کی کلی کھل اٹھی اور [illegible] کے ساتھ مہ رخ کے گھر سب کو لے کر [illegible] کے ماں باپ کو دیکھ کر صبوحی کے بدلے [illegible] ٹی گم کر دی۔ ناصر شیخ کا جذبہ [illegible] طرفداری کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں [illegible] ٹھوس لہجے میں کہا۔ "صبوحی ایک ہی [illegible] نے کبھی کسی چیز کے لیے ضد نہیں کی [illegible] تو تمہیں کیا اعتراض [illegible] [illegible] ساتھی بنانا چاہتا ہے۔" [illegible] لمبے سانس لینے کے لیے ناصر شیخ رکے اور [illegible] بولے۔ "یقیناً تمہیں اس کا لباس اچھا نہیں [illegible] کوئی ٹھیک نہیں، عجیب بے ہودہ اور [illegible] ہوئے تھی مگر اس میں اس کا کوئی قصور [illegible] کی تربیت ہوئی ہے اور جس ماحول میں [illegible] ہے وہاں اس قسم کی [illegible] پسندیدہ اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ تم دل [illegible]

چھوٹا کرو، جب یہ لڑکی ہمارے گھر آجائے گی پھر ہم خود ہی اسے اپنے ڈھب پر لے آئیں گے۔ اپنی بات میں مزید زور پیدا کرنے کے لیے انہوں نے بلند آواز میں کہا۔ ”ارے بھئی ہمارا مدثر کوئی کم ہے۔ دیکھنا یہ اپنے رنگ میں اسے ایسا رنگے گا کہ تم شناخت نہیں کرسکو گی کہ یہ وہی لڑکی ہے جو کبھی جینز اور شرٹ پہنتی تھی۔ کیوں بیٹا ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔“ انہوں نے تصدیق طلب نظروں سے بیٹے کی جانب دیکھا۔

باپ نے سائیڈ لی تو مدثر کی جان میں جان آئی۔ اس کے حوصلے بلند ہوگئے اور اس نے چہکتے ہوئے کہا۔ ”امی، ابو بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ ہم اسے اپنے مطابق ڈھال لیں گے۔ جس طرح آپ چاہیں گی اسی طرح۔“

صبوحی نے سرعت کے ساتھ قطع کلامی کی اور حتمی لہجے میں بولی۔ ”تم دونوں باپ بیٹے غلط سوچ رہے ہو۔ مجھے مہ رخ کے لباس اور اس کے ماحول سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ تمہیں نہیں پتا ان لوگوں سے ملنے کے بعد میں رات بھر جاگتی رہی ہوں۔ اپنے آپ سے جنگ کرتی رہی کہ سب کچھ صفحہ ذہن سے مٹا کر تمہاری خواہش پوری کردوں لیکن بالآخر نماز فجر کے بعد میرے دل و دماغ نے جو فیصلہ سنایا اسے ندائے الٰہی سمجھ کر میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ میں تمہیں کبھی بھی مہ رخ سے شادی نہیں کرنے دوں گی لیکن پھر بھی تم اپنی ضد پر قائم ہو تو میں روکوں گی بھی نہیں... کیونکہ قانون شرع تمہیں اجازت دیتا ہے لیکن مہ رخ ہمارے ساتھ نہیں رہے گی۔ تمہیں اس کے لیے علیحدگی اختیار کرنی ہوگی۔“

ناصر شیخ نے استعجاب انگیز نظروں سے بیوی کو دیکھا اور بولے۔ ”ارے اتنی کڑی شرط...... تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ اپنے بیٹے کو اپنے سے جدا کردو گی۔ خدارا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ کیا اس کے بغیر ہم دونوں اور اس کی بہنیں چین سے رہ سکیں گی؟“

مدثر سے بھی چپ نہ رہا گیا۔ اس نے دبنگ آواز میں کہا۔ ”امی میں ہمیشہ کے لیے مہ رخ کا خیال دل سے نکال دوں گا۔ بشرطیکہ کوئی ٹھوس وجہ ہو اور آپ کی اطلاع کے لیے میں ایک بات اور عرض کردوں کہ اس لڑکی سے نہ میرا کوئی افیئر چل رہا ہے اور نہ ہم دونوں گھنٹوں موبائل پر سر پھوڑتے ہیں۔ میں نے مہ رخ کو پہلی بار ایک دوست کی سالگرہ پارٹی میں دیکھا تھا۔ وہاں دوستوں کے اصرار پر میں نے مہدی حسن کا گایا ہوا ایک گیت سنایا۔ مہ رخ میری آواز سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے فوراً اس دوست سے میرا نمبر مانگ لیا اور اس کے بعد اکثر ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ آپ یقین کریں ہم دونوں جب بھی ملتے ہیں دو اچھے دوستوں کی طرح ملتے ہیں۔ صرف اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہیں۔“ پھر وہ سانس لے کر بولا۔ ”بس یہیں تک ہماری دوستی اور شناسائی ہے۔ وہ مجھے اچھی لگی اور آپ نے میرا انتخاب پوچھا تو میں نے ملوادیا لیکن کسی خاص سبب کی بنا پر آپ اسے میرے قابل نہیں سمجھتی ہیں تو یقین کیجیے میں اپنے قدم فوراً روک لوں گا لیکن حقیقت کیا ہے، آپ کو بتانا ہوگا۔“

ناصر شیخ نے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بالکل، تمہیں بتانا ہوگا کہ [illegible] کی شادی مہ رخ سے کیوں نہیں ہوسکتی۔“

صبوحی کے چہرے پر کشمکش کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ کھوئی کھوئی نگاہوں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ انعم اور صنم بھی واپس آکر اپنی اپنی نشستوں پر براجمان ہوگئی تھیں اور پُراشتیاق اور پُرتجسس نظروں سے ماں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جب کہ صبوحی پر گومگو کی کیفیت طاری تھی۔ وہ ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔ کیا کہے کیا نہ کہے۔ وہ فیصلہ نہیں کر پارہی تھی جب کہ سب ہمہ تن گوش تھے۔ کمرے میں مکمل سناٹا طاری تھا۔ اس خاموشی کو صنم کی آواز نے توڑا اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”امی جو بھی بات ہے آپ کھلے دل سے وضاحت کردیں، ماشاء اللہ بھائی خود سمجھ دار ہیں۔ وہ آپ کا فیصلہ بخوشی تسلیم کرلیں گے۔“

صبوحی نے بیٹی کی بات سن کر ایک طویل سانس لی اور سب پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں اس راز کو اپنے ساتھ قبر میں لے جانا چاہتی تھی لیکن حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اب مجھے یہ راز آشکار کرنا پڑے گا لیکن تم لوگ صدق دل سے میرے سامنے یہ عہد کرو کہ ساری بات ہمارے گھر کی چہار دیواری میں ہی رہے گی۔ کسی اور کی سماعت تک یہ بات نہ پہنچنے پائے۔“ پھر اس نے شوہر کو مخاطب کرکے کہا۔ ”اور آپ کو بھی وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ کسی سے بھی اس کا تذکرہ نہیں کریں گے۔ ورنہ گرفت میں ہم لوگ بھی آسکتے ہیں۔“

ناصر بیوی کو عمیق نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ معاملہ انتہائی گھمبیر اور سنگین ہے ورنہ صبوحی اتنا

[illegible]ے کام نہیں لیتی۔ اس کا ظاہر و باطن ایک جیسا [illegible] میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا۔ دونوں کا برسوں کا [illegible] وہ اپنی بیوی کے رگ رگ سے واقف تھے۔ [illegible] کی جنبش سے بیوی کو یقین دہانی کروائی اور [illegible] سے مخاطب ہو کر کہا۔ بچو! ”تم لوگ بھی احتیاط [illegible]ہاری زبان سے کچھ نکلنے نہ پائے۔“ اس کے بعد [illegible] تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”میری طرف سے تو تم [illegible] رہو۔“

صبوحی نے ایک تسکین آمیز گہری سانس لی اور کہا ”آج میں تمہیں ایک نہیں بلکہ دو کہانیاں سناؤں گی۔ دونوں داستانوں میں کیا مماثلت ہے اور کون سی چیز مشترک ہے۔ یہ تم لوگ مجھے بتاؤ گے۔ پہلی داستان نہایت مختصر ہے اور لوک کہانی ہے۔ صدیوں سے لوگ ایک دوسرے کو سناتے آرہے ہیں۔ جب کہ دوسری کہانی کافی طویل اور جیتے جاگتے انسانوں کی ہے۔ اس کہانی کا ایک کردار میں خود بھی ہوں۔ سب کچھ سنانے کے بعد فیصلہ تم لوگوں پر چھوڑ دوں گی کہ مہ رخ کو اس گھر میں دلہن بنا کر ہمیں لانا چاہیے یا نہیں اور میں تم لوگوں کو ایک اہم بات یہ بتادوں کہ میری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ سچائی اور حقیقت پر مبنی ہے۔“

ناصر اور ان کے تینوں بچوں کی سماعتیں منتظر تھیں کہ صبوحی کب تمہید کے بعد اصل قصہ انہیں سنائیں۔ ان سب کا [illegible] تھا سب کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ صبوحی نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔ ایک گلاس پانی پیا اور پھر کہنا شروع کیا۔ ”چھوٹا سا واقعہ سنا رہی ہوں۔ سبق آموز تو ہے لیکن من گھڑت [illegible] زمانہ قدیم میں جب لوگ قبیلوں کی شکل میں رہتے تھے تو صرف ان کی محبتیں بلکہ نفرتیں بھی اتنی گہری اور دیرپا ہوتی تھیں کہ نسل در نسل چلتی تھیں۔ انتقام اور بدلے کی آگ بھی سرد نہیں ہوتی تھی۔ ایسے ہی دو قبیلوں میں جب نفرت اور دشمنی کی آگ بھڑک اٹھی تو دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے۔ [illegible] سب سے زیادہ دکھی قبیلے کا وہ نوجوان تھا جو مخالف قبیلے کی ایک لڑکی کو دل و جان سے چاہتا تھا اور اس سے شادی کا خواہاں تھا۔ دوسری جانب لڑکی بھی اسی آگ میں جل رہی تھی۔ دونوں اپنے بڑوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چھپ چھپا کر ملتے تھے۔ بالآخر دونوں نے ایک دن فیصلہ کیا کہ وہ اپنی دنیا الگ بسائیں گے اور اپنے قبیلے والوں کو ڈاج دے کر رات کی تاریکی میں کہیں دور نکل جائیں گے...... اور پھر ایک [illegible] طے شدہ مقام پر ملے۔ وہاں پر ایک شخص [illegible] تھا۔ اس نے لڑکے سے کہا۔ ”جناب [illegible] نہایت تیز رفتار گھوڑے کے لیے [illegible] نہیں مل سکا۔ البتہ یہ جو گھوڑی لایا ہوں [illegible] کرتی ہے۔ یوں سرپٹ دوڑتی ہے کہ [illegible] بس اس میں ایک خامی ہے۔“

”وہ کیا؟“ لڑکے نے استفسار کیا۔

اس شخص نے جواب دیا۔ ”دراصل [illegible] خصلت یہ ہے کہ یہ جہاں پانی [illegible] روک لیتی ہے اور زور زور سے ہنہنانے لگتی ہے [illegible] سر پٹخیں یہ آگے نہیں بڑھتی۔ اس کی [illegible] پہلے اس کی جو ماں تھی ان تمام [illegible] بات مشترک تھی کہ وہ پانی کو دیکھ کر [illegible] بیابان سب پار کرلیتی تھیں [illegible] روند ڈالتی تھیں لیکن جہاں پانی نظر آیا [illegible] ہٹ جاتی تھیں۔“ اس شخص کی باتیں [illegible] چہرے پر تفکرات کے سائے لہرانے [illegible]

میں ڈوب گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے اس شخص سے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تم اپنی گھوڑی واپس لے جاؤ۔ ہم لوگوں کو یہ سفر اب کرنا ہی نہیں۔''

گھوڑی کا مالک اپنی گھوڑی لے کر چلا گیا تو لڑکی جو اوڑھنی لپٹی کھڑی ہوئی تھی اس نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ تم نے کیا کیا۔ کیا ہم اتنی طویل مسافت پیدل طے کریں گے۔''

لڑکے نے سخت اور حتمی لہجے میں کہا۔ ''اب ہمیں کہیں نہیں جانا تم اپنے قبیلے میں واپس چلی جاؤ اور میں اپنے گھر کا راستہ لیتا ہوں۔''

لڑکی نے متعجب نگاہوں سے اپنے محبوب کی طرف دیکھا اور گھبرا کر بولی۔ ''ایسا کیا ہوا کہ تم نے اپنا فیصلہ ہی بدل ڈالا۔''

لڑکے نے اداس نظروں سے اس حسین قیامت کو دیکھا اور بولا۔ ''انسان ہو یا جانور خوبیاں اور خامیاں خالق کائنات ایک نسل سے دوسری نسل میں ضرور منتقل کرتا ہے۔ ہمارا آج کا کیا دھرا آنے والی نسل ضرور دہراتی ہے۔ یہ ایک قرض ہے جو ہر حال میں اتارنا پڑتا ہے۔ آج ہم دونوں اپنے بڑوں کی، اپنے قبیلے کی عزت و ناموس کو پیروں تلے کچلتے ہوئے جا رہے ہیں۔ کل بھی سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہماری اولاد کرے گی اور پھر ان کی آنے والی نسل ان کے ساتھ کرے گی کیونکہ بے حیائی بے غیرتی خون میں رچ بس جاتی ہے، جس طرح اس گھوڑی کی نسل اپنی فطرت نہیں تبدیل کر سکی اسی طرح ہماری آنے والی نسلوں کی فطرت میں یہ سب کچھ شامل ہوگا۔ بدنامی کا طوق ہمارے خاندان کی پہچان بن جائے گا۔''

لڑکی کی سمجھ میں فوراً ساری بات آ گئی اور پھر دونوں واپس اپنے اپنے قبیلوں میں چلے گئے۔ یہ قصہ سنانے کے بعد صبوحی دم لینے کے لیے رکی اور پھر گویا ہوئی۔ ''اب میں چلتے پھرتے انسانوں پر گزرنے والی ایک عبرتناک اور خونچکاں داستان سناؤں گی۔'' گھر کے سب افراد پوری توجہ اور دلچسپی سے صبوحی کو سن رہے تھے۔

☆......☆

''خالہ ہاجرہ ہمارے محلے کی سب سے دولت مند اور متمول خاتون تھیں۔ میرے والدین اس خاندان کے پڑوسی تھے جس لیے لڑکپن سے ہی میں اس گھر سے مانوس تھی۔ خالہ ہاجرہ ان کے بیٹے سجاد بھائی اور بیٹی الماس آپی بھی مجھے آنکھوں کا تارا بنا کر رکھتے تھے کیوں کہ ان کے گھر میں بھی کوئی بچہ نہیں تھا۔ خالہ ہاجرہ بیوگی کی زندگی گزار رہی تھیں۔ ان کے میاں ان کے لیے کافی دولت چھوڑ کر مرے تھے۔ شہر میں ان کے کئی مکانات اور دکانیں تھیں جن کا ماہانہ کرایہ ٹھیک ٹھاک تھا اس کے علاوہ گارمنٹس کا وسیع کاروبار شہر میں پھیلا ہوا تھا جو سجاد بھائی سنبھالے ہوئے تھے۔ غرض یہ کہ خالہ کے گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ گھر میں جو چیز الماس آپی کے لیے آتی وہ میرے لیے بھی ضرور آتی کیونکہ اس گھر کی اگر بڑی بیٹی الماس آپی تھیں تو چھوٹی بیٹی میں تھی۔ سجاد بھائی بھی ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے۔ دولت کی فراوانی، فارغ البالی اور خوش حالی نے دونوں بہن بھائی کو آرام طلب بنا دیا تھا۔ نہ آپی ہل کر پانی پیتی نہ سجاد بھائی اپنی جگہ سے حرکت کرتے۔ ہاں البتہ وہ ایک اچھے بزنس مین ضرور تھے۔ ان کا کاروبار روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ اب اپنے شہر کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی اپنی دکانیں کھولنا شروع کر دی تھیں۔ دونوں بھائی بہن کی متحرک لائف نہ ہونے کی وجہ سے جسمانی جغرافیہ بغیر کسی مزاحمت کے تیزی سے پھیل رہا تھا۔ آپی الماس نے انٹر کے بعد خیر سے تعلیم کو الوداع کہہ دیا تھا۔ اب راوی نے ان کے لیے چین ہی چین لکھا تھا لیکن آپی کے اس چین نے خالہ کو بے چین کر رکھا تھا۔ بیٹی کا بڑھتا ہوا وزن اور ڈیل ڈول دیکھ کر انہیں ہول آنے لگے تھے۔ سجاد بھائی بھی بہن کے رشتے کے لیے خاصے متفکر اور پریشان تھے کیونکہ آہستہ آہستہ آپی کی تمام سہیلیاں اور ہم جولیاں یکے بعد دیگرے پیا گھر سدھار رہی تھیں لیکن آپی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی تھیں۔ خالہ بیٹی کی طرف سے مایوس ہو کر اب بہو کی تلاش میں سرگرداں تھیں، بیٹے کے سر سہرا سجانے کا ارمان وہ برسوں سے دل میں لیے بیٹھی تھیں لیکن فی الحال سجاد بھائی بالکل رضامند نہیں تھے۔ وہ اپنی شادی سے پہلے آپی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے لیکن پھر ماں کے بے پناہ اصرار پر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ خالہ بڑے چاؤ سے اپنی سہیلی کی بھتیجی بیاہ لائیں۔ لڑکی کے ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ پھوپی نے ہی بن ماں باپ کی لڑکی کو پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ غریب اور تنگدست گھرانا تھا اس لیے خالہ نے ہی لڑکی والوں کے بھی شادی کے اخراجات برداشت کیے۔ شادی کے ہر کام میں الماس آپی کے ساتھ میں پیش پیش تھی۔ سجاد بھائی نے بھی دل کھول کر خرچ کیا جو نیگ وہ آپی کو دیتے وہی مجھے بھی کھلے ہاتھ سے دیتے۔ جس وقت بھابی

[illegible] کر گھر میں داخل ہوئیں تو یوں محسوس ہوا گھر میں [illegible] یا ہو۔ بھابی کا بے پناہ حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا [illegible] حسین دلہن میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ خاص طور [illegible] والے دن تو ان کا حسن غضب ڈھا رہا تھا۔ خالہ، [illegible] اور آپی مبارک بادیاں وصول کر رہے تھے۔ سب [illegible] اور مسرور تھے۔ موہنی صورت اور دلکش انداز و اطوار [illegible] بھابی مجھے بھی بہت اچھی لگی۔ نہ صرف شکلاً بلکہ عقلاً [illegible] بہت سمجھدار اور تیز طرار تھیں۔ پہلے ہی دن میری [illegible] کی دوستی پکی ہو گئی۔ جب بھی خالہ کے گھر جاتی الماس آپی کے ساتھ بھابی سے بھی ملاقات کر کے آتی۔ ان دنوں میں میٹرک کر چکی تھی۔ اب تعلیمی مصروفیات بڑھ گئی تھیں لیکن پھر بھی جب تک خالہ کے گھر کا پھیرا نہ لگاتی دل نہیں مانتا۔ بھابی نے آتے ہی گھر کا تمام نظام بحسن و خوبی سنبھال لیا تھا۔ گھر کے نوکر چاکر بھی ان سے بہت خوش تھے۔ اپنے پرائے جو بھی بھابی کو دیکھتے تعریف کیے بنا نہیں رہتے۔ میری امی کو بھی بھابی بہت پسند آئی تھیں۔ وہ ہمیشہ کہتیں ''دولت کے بل بوتے پر ہی ہاجرہ کو ایسی من موہنی بہو مل گئی ہے ورنہ سجاد کا اس لڑکی سے کوئی جوڑ ہی نہیں بنتا۔ غریب لوگ تھے، دولت پر مر مٹے۔'' امی کی بات میں کافی حد تک صداقت تھی لیکن سجاد بھائی طبعاً نہایت شریف النفس اور [illegible] انسان تھے۔ ہر طرح سے بیوی کا خیال رکھتے۔ خالہ بھی دل و جان سے بہو پر وارے صدقے ہوتیں لیکن اچانک حالات نے پلٹا کھایا، خالہ کے ہنستے کھیلتے گھر کو نا جانے کس کی نظر کھا گئی۔ [illegible] کے لیے اب خالہ کا گھر ایک [illegible] سسرال بن گیا تھا۔ [illegible] کھنچی کھنچی اور روٹھی روٹھی نظر آتیں۔ بلکہ بہو کے نام [illegible] بھوت چڑھا کر اس [illegible] وقت کو کوستی جب وہ بھابی کو بیاہ کر لائی تھیں۔ الماس آپی بھی [illegible] اپنے کمرے میں پڑی رہتیں [illegible] ماحول میں حد درجہ کشیدگی اور تناؤ آ گیا تھا لیکن [illegible] اطمینان تھا کہ بھابی کا ساتھ سارا زمانہ چھوڑ دے لیکن سجاد [illegible] کا دم ان کے لیے ایک گھنا اور شاداب سایہ ہے۔ وہ [illegible] بھابی پر آنچ نہیں آنے دیں گے لیکن یہ میری خام خیالی [illegible] گرمیوں کی ایک چلچلاتی ہوئی دوپہر میں، میں خالہ کے [illegible] تھی۔ سب اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے [illegible] گھر میں سناٹے کا عالم طاری تھا۔ میں الٹے پیروں [illegible] ہونا چاہتی تھی کہ معاً سجاد بھائی کے کمرے سے ان کے چیخنے کی آواز آئی۔ وہ انتہائی اشتعال انگیز لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ''تو کیا سمجھتی ہے تیرے کرتوتوں [illegible] تجھے میں اچھی طرح جان گیا ہوں۔''

جواب میں بھابی کے رونے کی آواز [illegible] سے ٹکرائی۔ وہ رندھے گلے سے کچھ کہہ [illegible] میرے پلے کچھ نہ پڑا۔ میرا سارا بدن [illegible] تھا۔ دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ میں [illegible] بھاگ کھڑی ہوئی۔ بھاگتی ہوئی گھر میں داخل [illegible] نے میری اڑی اڑی رنگت اور پھولتی [illegible] روک لیا اور وجہ پوچھی۔ میں نے گھبرا [illegible] انہیں سب کچھ من و عن سنا دی، یوں [illegible] بوجھ بنا ہوا تھا۔ امی نے حسب سابق خالہ [illegible] اولاد کو صلواتیں سنائیں۔ [illegible] ''پھولوں میں تولنے کے قابل [illegible] بات کا احساس ہی نہیں۔ مٹی پلید کر [illegible] دل ہی دل میں، میں نے [illegible]

امی مجھے خالہ کے گھر جانے کے [illegible] تھیں۔ انہیں یہ خوف تھا کہ گھر کے [illegible] لوگ مجھے نہ ملوث کر دیں لیکن میرا [illegible] گھر جائے بنا قرار نہ تھا وہاں جا کر [illegible] گھر کا ہر فرد ذہنی الجھنوں کا شکار [illegible] رہنے لگی تھیں۔ دنیا بھر کے پرہیز اور [illegible] ان کا گزارہ تھا۔ آپی کا بھی ہنسنا بولنا ختم ہو [illegible] بھی زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتیں۔ [illegible] ماحول ہوتا اس لیے میں جاتی ضرور لیکن [illegible] پھر اچانک اس بے رنگ اور بے جان ماحول میں [illegible] کے خوب صورت رنگ بکھر گئے۔ خالہ کے گھر شانی بھائی کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ شانی بھائی سجاد بھائی کے دوست تھے۔ نہایت ہنس مکھ، خوش اخلاق اور جاذب نظر شخصیت کے مالک۔ بے چارے گریجویٹ تھے لیکن بے روزگاری کا عفریت انہیں جکڑے ہوئے تھا۔ خالہ کی عیادت کے لیے گاہے بگاہے آتے رہتے۔ ان کے آنے سے گھر کی فضا کچھ لمحوں کے لیے بدل سی جاتی۔ وہ ایسی پُرلطف اور مزاح سے بھرپور باتیں کرتے کہ سب کے چہروں پر ہنسی مسکراہٹ کے پھول کھل جاتے۔ بیمار خالہ بھی سنبھل کر تکیوں کا سہارا لے کر اپنے بیڈ پر بیٹھ جاتیں۔ بھابی بھی میز پر [illegible] لگاتے ہوئے ان کی باتوں میں دلچسپی لیتیں۔ آپی الماس بھی خالہ کے بیڈ پر ٹک جاتیں اور گرما گرم کافی یا چائے کی ایک نہیں

بلکہ دو دو پیالیاں اڑا جاتیں۔ ایسے میں اگر سجاد بھائی آجاتے تو محفل فوراً تتر بتر ہو جاتی... کیونکہ سجاد بھائی گھر میں کسی غیر مرد کی آمد کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ شانی بھائی فوراً خالہ کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے۔ ایک شام شانی بھائی حسبِ سابق گھر میں ہنستے بولتے داخل ہوئے تو سب سے پہلے ان کا استقبال الماس آپی نے کیا۔ بھابی اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ خالہ کی طبیعت بھی بہتر نہیں تھی۔ شانی بھائی، آپی اور میں ہم تینوں خالہ کے بیڈ کے پاس پڑے صوفے پر براجمان ہو گئے۔ شانی بھائی نے خالہ کی مزاج پرسی کی تو خالہ نے نقاہت بھری آواز میں ان کے سلام کا جواب دیا اور کہا۔ ”بس بیٹا! اب تو مجھے گور پکار رہی ہے۔ میں بھی اس کے بلاوے پر لبیک کہنا چاہتی ہوں لیکن الماس میرے پیروں کی زنجیر بنی ہوئی ہے۔“

شانی بھائی نے حیران کن نظروں سے خالہ کو دیکھا اور اپنے مخصوص اسٹائل میں استفسار کیا۔ ”لو یہ تو اچھی خاصی گوشت پوست سے بنی ہوئی لڑکی ہے۔ آپ اسے زنجیر اور ہتھکڑی سے کیوں تشبیہ دے رہی ہیں۔“

خالہ نے تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔ ”ارے بچے تو تو ہر بات میں مزاح کا پہلو نکال لیتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے یہ اپنے گھر بار کی ہو جائے تو میں آرام سے مر سکوں گی ورنہ قبر میں بھی مجھے چین نہ آئے گا۔“ یہ کہہ کر خالہ رونے لگیں۔

ان کے گال آنسوؤں سے تر ہو گئے شانی بھائی بے قرار ہو کر اٹھے اور ٹشو پیپر سے خالہ کے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”خالہ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کو اور آپ کے خاندان کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں آپ کا بیٹا بننے کے لیے تیار ہوں لیکن میری معاشی حالت آپ سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔“

آپی نے جیسے ہی شانی بھائی کی بات سنی وہ فوراً وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئیں لیکن میں نے دیکھا آپی کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ قدم رکھ کہیں رہی تھیں اور پڑ کہیں اور رہے تھے۔ میں نے بھانپ لیا کہ یہ شادی ہر حال میں ہو کر رہے گی۔ حالانکہ شانی بھائی نہ صرف بے روزگار بلکہ بے گھر بھی تھے۔ جس کرائے کے کمرے میں رہائش پذیر تھے۔ اس کا کرایہ ادا کرنا بھی ان کے لیے کچھ کم مشکل نہیں تھا لیکن پہلی بار آپی کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار کا یہ جھونکا آیا تھا۔ پہلی بار کسی نے ان کا ہاتھ طلب کیا تھا اس لیے ان کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ خالہ اور سجاد بھائی کو بھی بن مانگے من کی مراد مل گئی تھی۔ ادھر شانی بھائی کے بھی وارے نیارے ہو گئے۔ الماس آپی کے ساتھ نکاح ہوتے ہی وہ آدھی جائیداد کے حقدار قرار پائے۔ وہ تو سجاد بھائی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے حصے کی پراپرٹی بھی بہن بہنوئی کو بطور تحفہ پیش کر دیتے۔ ماں اور بیوی کا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ یہ بھی کر گزرتے۔ شادی کے چند ہفتوں پہلے ہی سجاد بھائی نے بنگلے کی بالائی منزل کو رنگ و روغن کروانے کے بعد آپی کی پسند کے فرنیچر اور بیش قیمت ساز و سامان سے آراستہ کروا دیا تھا۔ آپی کے دلہن بننے سے پہلے ہی بالائی منزل کے ہر کمرے کو دلہن بنا دیا گیا تا کہ نو بیاہتا جوڑے کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو۔ شادی سے پہلے آپی نے جم جوائن کر کے اپنے تھل تھل کرتے ہوئے جسم کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اپنی زبان کو لگام دے کر کھانے میں بھی احتیاط کی تھی اس لیے دلہن بنی ہوئی وہ کوئی بری نہیں لگ رہی تھیں۔ مہنگے ترین پارلر سے تیار ہو کر آئی تھیں اس لیے سب ہی دیکھنے والے صرف ایک ہی جملہ کہہ رہے تھے کہ ہائے کیا نور اترا ہے دلہن پر، اور آپی کی خوشی یہ سن کر مزید بڑھ جاتی۔ اس روز شانی بھائی بھی کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہے تھے۔

دونوں نے ہنی مون ٹرپ سے آنے کے بعد اپنی شادی شدہ زندگی کا آغاز کیا۔ سجاد بھائی نے انہیں بھی اپنے دفتر میں نوکری دے دی تھی۔ اقتدار اور دولت کی خو بو ان پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ اب وہ پہلے والے مسکین اور منکسر المزاج شانی بھائی نہیں رہے تھے۔ شاہانہ زندگی گزارنے والی آپی شوہر کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتیں۔ ان کی پسندیدہ ڈش بنانے کے لیے اپنا پورا دن کچن کے نذر کر دیتیں۔ شانی بھائی اگر کھانے کی تعریف کر دیتے تو وہ خوشی سے پھولے نہ سماتیں اور جس روز وہ یہ کہہ دیتے کہ میں تو باہر سے کھانا کھا کر آ رہا ہوں تو آپی کا رونا ہی شروع ہو جاتا۔ اس روز وہ بھی کچھ نہیں کھاتیں اور یونہی بھوکی پیاسی سو جاتیں۔ وہ شوہر کو دیوانگی کی حد تک چاہتی تھیں۔ خالہ اور سجاد بھائی کے چہروں پر بھی اب سکون اور طمانیت کی دھوپ کھلی رہتی... کیونکہ آپی کی شادی سے ان کے کندھے ہلکے ہو گئے تھے۔ میں ان دنوں گریجویشن کی تیاری میں مصروف تھی اس لیے پچھلے کئی دنوں سے میں خالہ کی طرف نہیں جا سکی تھی۔ حالانکہ اس عرصے میں وہ کافی بیمار بھی

رہیں۔ دو روز پیشتر ہی اسپتال سے ڈسچارج ہوئی تھیں۔ امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد امی سے اجازت لے کر میں فوراً خالہ کے گھر جا پہنچی اس روز تمام فیملی ممبران خالہ کے کمرے میں ہی جمع تھے۔ سب نے نہایت خوش دلی کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا۔ میں جا کر ایک صوفہ چیئر پر ٹک گئی۔ سب اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے۔ خالہ کی طبیعت بھی پہلے سے بہتر تھی اس لیے وہ بھی شریک گفتگو تھیں۔ اسی اثناء میں اچانک سجاد بھائی تنتنا کر اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے اور شدید اشتعال کے عالم میں انہوں نے بھابی کو دیکھا اور باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے تھے کہ بھابی نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے کچھ کہنا چاہا لیکن ان کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے سجاد بھائی کا ہاتھ اٹھا اور ایک بھرپور طمانچہ بھابی کے گال پر پڑا۔ بھابی کی ایک دلخراش چیخ ابھری اور وہ وہیں بیٹھ ہوگئیں۔ کمرے میں موجود افراد سمجھ نہ سکے کہ معاملہ کیا ہے۔ خالہ ساکت و جامد نگاہوں سے بیٹے بہو کو دیکھتی رہیں اور پھر ایک سرد آہ بھر کر اپنے بیڈ پر دراز ہو گئیں۔ سجاد بھائی لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کمرے سے جا چکے تھے۔ شانی بھائی نے احتجاجاً فقط اتنا کہا۔ ”اس شخص کا یہی رویہ دفتر میں بھی ہے۔ عجیب چڑچڑا اور خرد ماغ آدمی ہے۔ عورت کا احترام کسے کہتے ہیں انہیں پتا ہی نہیں۔“ وہ سجاد بھائی کو برا بھلا کہتے رہے اور بھابی کے قریب بیٹھ کر ان کی دلجوئی کرنے لگے۔ جگ میں سے پانی گلاس میں انڈیلا اور سہارا دے کر بھابی کو پلانے لگے۔ میں نے اور الماس آپی نے وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔ کیونکہ بھابی اب باقاعدہ آواز کے ساتھ رو رہی تھیں اور اپنے پھوٹے نصیب کو کوس رہی تھیں۔ الماس آپی کے کمرے میں پہنچ کر میں نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پایا اور خوفزدہ لہجے میں استفسار کیا۔ ”آپی آخر سجاد بھائی کو ہو کیا گیا ہے۔ پہلے تو ایسے نہ تھے۔ بیوی کو سب کے سامنے ذلیل کر دیا۔ ان کے [illegible] کوئی نہیں ہے ناں اس لیے اور بھی شیر ہو رہے ہیں لیکن [illegible] کہتے۔“ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چانٹا سجاد بھائی نے بھابی کو نہیں بلکہ تمام صنفِ نازک کے منہ پر مارا ہے۔ نسوانی حقوق کو اپنے پیروں تلے روندا ہے۔ بھابی پر تو جو گزری سو گزری۔ اس واقعے نے میرے دل کو لہولہان کر دیا تھا۔ میں نے اپنے گھر میں کبھی اس قسم کی لڑائیاں نہیں دیکھی تھیں۔ بابا امی سے انتہائی محبت کے ساتھ دائرہ تہذیب میں رہ کر بات کرتے۔ کبھی چھوٹی موٹی بات پر کوئی نرمی گرمی ہو بھی جاتی تو فریقین نہایت شائستگی کے ساتھ سارا معاملہ نمٹا لیتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو چہ جائیکہ مار پیٹ......! اف میرے اللہ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ آپی الماس نے میری یہ حالت دیکھی تو میرے قریب آکر بیٹھیں اور مجھے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیتے ہوئے میری پیشانی پر بوسا دیا اور شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ ”یہ سارا ناٹک تم نے آج دیکھا ہے۔ ہم لوگ تو عادی ہو گئے ہیں اس داستان کل کے۔ تم تصویر کا ایک ہی رخ دیکھ رہی ہو۔ اس لیے تمہارے اوسان خطا ہو گئے جب میں تمہیں دوسرا رخ دکھاؤں گی تو تم دل تھام کر رہ جاؤ گی۔“

میں نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ”کون سا دوسرا رخ؟“

میرے مسلسل اصرار پر آپی نے زبان کھولی۔ ”بھابی عورت نہیں ایک ناگن ہیں جس کا کاٹا پانی بھی نہ مانگے۔“

بھابی پر اتنا بڑا، اتنا سنگین الزام ان کی نند لگا رہی تھیں۔ میں یوں اچھل پڑی جیسے میرے کانوں میں صورِ اسرافیل پھونکا گیا ہو اور قیامت برپا ہو چکی ہو۔ بڑی مشکل

میر ضمیر اور ان کے معاصرین نے مرثیے کو ایک مستقل فن کی صورت دے کر تمام شعری محاسن اس میں جمع کر دیئے۔ ان کی تخلیقی کوششوں کے بعد انیس و دبیر کا کام صرف اتنا رہ گیا کہ وہ ہیئت کی پرداخت پر توجہ دیئے بغیر مضامین میں تنوع اور وسعت پیدا کریں۔ یہ حقیقت ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیے میں اتنا تنوع اور وسعت پیدا کی کہ مرثیے کو رونے رلانے کی حدود سے آگے بڑھا کر فن کی بلندیوں کا مظہر بنا دیا۔ اوّل الذکر نے تمام ادبی روایات کو نچوڑ کر ترقی کے تمام امکانات اپنے مرثیے میں اس طرح سمو دیئے کہ اس میں تازگی، وسعت اور عظمت پیدا ہو گئی۔ اب انیس کی تخلیقات کا جواب اس وقت تک کوئی پیدا نہیں کر سکتا جب تک اردو زبان کا مزاج نہ بدل جائے۔

مرسلہ: زاہد حسین بھٹ۔ میر پور آزاد کشمیر

سے میں نے اپنے غیظ وغضب کو دبایا اور طیش آمیز لہجے میں بولی۔ ''اس معصوم اور مظلوم عورت کے لیے جو الفاظ استعمال کررہی ہیں اس سے آپ کا دل نہیں تھرایا۔ آپ کو ذرا سا بھی خوف خدا نہیں۔''

آپی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور گلوگیر آواز میں کہا۔ ''تمہارے شدید اصرار پر ہی تو ہونٹوں کی گرہ کھولی ہے۔ ورنہ گھر میں ہونے والے ایسے واقعات کو کون آشکارا کرتا ہے۔ اب تو ہم سب پچھتاوے کی آگ میں جل رہے ہیں۔ بھائی کی اور امی کی ایک عرصے سے سرد جنگ جاری ہے۔ بھابی کی پھوپی نے امی کو اس وقت خبردار کردیا تھا جب امی نے رشتہ ڈالا تھا۔''

یہ سن کر میری پیشانی کے بل مزید گہرے ہوگئے۔ میں نے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔ ''آپی میں کچھ سمجھ نہیں پارہی ہوں۔ مجھے ذرا تفصیل سے بتائیے۔ بھابی کی پھوپو نے کس بات سے خبردار کیا تھا۔''

آپی نے مجھ پر نظریں جما کر سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ ''صبوحی ساری باتیں اپنی حد تک ہی محدود رکھنا۔ بھابی کا ننھیال مشکوک کردار کا حامل ہے۔ بھابی کی ماں کا کردار بھی کچھ صحیح نہیں تھا۔ ان کے والدین کی کبھی نہیں بنی۔ آخر طلاق پر تان ٹوٹی۔ انہوں نے اپنی شیرخوار بیٹی کی بھی پروا نہیں کی اور طلاق کی عدت پوری کیے بغیر دوسرا نکاح کرلیا۔ ان تمام حالات کا بھابی کے والد پر نہایت خراب اثر پڑا اور وہ جانبر نہ ہوسکے۔ ان کے پھوپی پھوپا نے ہی انہیں پال پوس کر بڑا کیا۔ بھابی کی خالہ کا ریکارڈ بھی ان ہی الٹی سیدھی باتوں سے بھرا پڑا ہے۔ سنا ہے انہوں نے تو اپنے شوہر کو زہر دے کر مارا ہے۔ پھوپو نے امی سے کچھ نہیں چھپایا۔ ہر بات گوش گزار کردی لیکن ہماری امی بھابی کے حسن پر ایسی فریفتہ ہوئیں کہ انہوں نے بھابی کی ذات سے جڑی ان تمام باتوں کو افواہ قرار دیتے ہوئے بھائی کا رشتہ وہاں کردیا۔ امی نے ساری بات مجھے بھی بتائیں تھیں لیکن میں نے بھی سب باتوں پر خاک ڈالی اور بھابی کو اپنے گھر کی عزت بنا کر لے آئی لیکن بھائی کو ان تمام باتوں کی سن گن باہر سے مل گئی ہے۔ اس لیے وہ امی سے خفا خفا سے ہیں اور بھابی کو تو نہایت خونخوار نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔ آج کی صورت حال تو میں بھی نہیں سمجھ سکی کہ میاں بیوی کس بات پر الجھ پڑے اور بات مار پیٹ تک پہنچ گئی۔

بھابی جیسی فرشتہ صفت عورت کے لیے آپی نے جو زہر اگلا تھا۔ اس سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میری سمجھ میں ساری بات آگئی۔ پل ہی بھر میں سب کچھ روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا۔ خالہ اور آپی بھابی کے حسن و جمال کی تپش نہیں برداشت کرسکیں۔ دونوں نفسیاتی مریض بن گئی ہیں۔ دونوں کی ملی بھگت سے ایسے حالات ترتیب دیئے جاتے ہیں کہ بھابی سجاد بھائی کے عتاب کا شکار بن جائیں اور پھر دونوں ماں بیٹی کے دلوں میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ بھابی کو ذلیل وخوار کرکے دونوں تسکین پاتی ہیں۔ گھر میں کیا کھچڑی پک رہی ہے مجھ پر اچھی طرح واضح ہو چکا تھا۔ میں ا[illegible] چکی تھی کہ بھابی کا میکہ تو پہلے ہی ختم ہو چکا ہے اور سسرال [illegible] کے لیے ایک ایسا دلدل بن گیا ہے جس میں وہ دھنستی [illegible]۔ ان کی بے بسی اور بیچارگی پر میرا دل لہولہان [illegible]۔ وہاں [illegible] سے اٹھ کر میں خاموشی سے گھر چلی آئی۔ امی نے [illegible] طبیعت کا بہانہ کر کے چپ چاپ آکر اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔ [illegible] کا اجلا اجلا ٹھنڈا سراپا نظروں کے سامنے تھا اور آپی کی بہتان [illegible] نے دل ودماغ میں طوفان مچا رکھا تھا۔ میرے اعصاب [illegible] لگے تھے۔ جسم بالکل بے جان ہو چکا تھا۔ کب غفلت کی نیند آئی مجھے محسوس ہی نہیں ہوا۔ جب سو کر اٹھی تو میں ایک فیصلہ کر چکی تھی کہ میں ہر حال میں بھابی کی مدد کروں گی۔ اپنے آپ میں ہمت حوصلہ پیدا کر کے بھابی کی حمایت میں ان سب سے لڑ جاؤں گی۔ اس فیصلے کے بعد میرے دل کو یک گونہ سکون نصیب ہوگیا۔ اسی ذہنی اذیت سے نجات مل چکی تھی جو کچھ دیر پہلے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ ان دنوں اپنی تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے میں خالہ ہاجرہ کی طرف نہیں جا سکی۔ ایک دن صبح سو کر اٹھی تو امی نے بتایا کہ خالہ کے گھر سے ان کی ملازمہ آئی تھی۔ الماس نے تمہیں فوری بلایا ہے۔ ناشتے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا اور ہلکا پھلکا میک اپ کر کے خالہ کے گھر جا پہنچی۔

آج بھی سب خالہ کے کمرے میں ہی جمع تھے۔ ماسوائے بھابی کے، سب کے موڈ خوشگوار تھے۔ بھابی گم صم ضرور تھیں لیکن سب کے درمیان بیٹھی ہوئی مسکرا بھی رہی تھیں اور باتوں میں بھی حصہ لے رہی تھیں۔ سب افراد نے مجھے خوش دلی کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ سجاد بھائی نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''لو بھئی آگئی ہماری چھوٹی بہنا، بس اب نکلنے کی تیاری کرو۔''

میں نے دروازے میں ہی اپنے قدم روک لیے اور



حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا کہیں جارہے ہیں آپ لوگ۔''

آپی نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور اپنے مخصوص لب ولہجے میں بولیں۔ ''صرف ہم نہیں جارہے ہیں بلکہ جناب آپ کو بھی لے جارہے ہیں۔ دراصل ہمارے میاں نے آج گڈانی کے ساحل پر ایک پکنک پارٹی رکھی ہے۔ امی کے علاوہ ہم سب ہی جارہے ہیں۔ کچھ ہمارے ملنے جلنے والے بھی ہوں گے۔ بہرحال آج تمہارا کوئی بہانہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ بس تمہیں چلنا ہے۔''

میں نے بھی بغیر کسی حیل وحجت کے ہامی بھرلی۔ خالہ کے پاس ان کی خاص ملازمہ کو چھوڑ کر گاڑیوں میں بھر کر ہمارا قافلہ گڈانی روانہ ہوا۔ راستے میں بھی سب ہنستے بولتے رہے۔ گڈانی کا وسیع وعریض سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اونچی نیچی سنگلاخ پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ موسم بھی جزوی طور پر ابر آلود تھا۔ گاڑیوں سے اترنے کے بعد سب ٹولیوں کی شکل میں بٹ گئے۔ سجاد بھائی کے دوست کی دو بہنیں بھی اس گروپ میں شامل تھیں۔ میں نے ان کے ساتھ کمپنی بنالی دونوں بہنیں باتونی اور خوش مزاج تھیں اس لیے میری فوراً ان سے دوستی ہوگئی اور پکنک کا مزہ دوبالا ہو گیا۔ سب اپنی اپنی جگہ بہت خوش وخرم تھے۔ ہلہ گلہ موج مستی کے بعد خوشگوار ماحول میں کھانا پینا ہوا۔ اس کے بعد سب [illegible] چڑھ کر سمندر کا نظارہ کرنے لگے۔ میں بھی اپنی دونوں سہیلیوں کے ہمراہ ایک ٹیلے پر چڑھی ان خوب صورت نظاروں سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ مجھے ایک نسوانی چیخ سنائی [illegible] چیخ دوبارہ سنائی دی۔ اس بار آواز بلند اور واضح تھی اور [illegible] مردانہ بھی۔ وہ دلخراش چیخیں قریب کے ٹیلے کے عقب سے آرہی تھیں۔ خوش فیلیوں میں مصروف سب ہی لوگ چوکنا ہو گئے اور [illegible] نے ادھر دوڑ لگا دی۔ جو منظر ہم لوگوں نے دیکھا وہ انتہائی [illegible] نے والا اور اندوہناک تھا۔ سجاد بھائی اور آپی [illegible] کے بال نظر آرہے تھے اور سمندر انہیں پوری طرح نگل چکا تھا تیز بہاؤ انہیں دور لیے جارہا تھا۔ پکنک پارٹی میں شریک تمام خواتین، بچے اور مرد حضرات کے چہرے خوف اور دہشت سے پیلے پڑ گئے تھے۔ میں باقاعدہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ بھابی ہوش وحواس سے بیگانہ نیم مردہ ایک جانب پڑی ہوئی تھی۔ شانی بھائی کی چرب زبانی اور بذلہ سنجی کو تالا لگ گیا تھا۔ وہ خاموش اور ساکت سمندر کو گھورے جارہے تھے۔ بھابی کو لے کر کچھ لوگ اسپتال دوڑے تاکہ انہیں بروقت طبی امداد فراہم کی جائے۔ شانی بھائی مرد تھے۔ انہوں نے حوصلے وہمت سے کام لے کر اچانک رونما ہونے والے اس سانحے کا مقابلہ کیا۔ پولیس اور ریسکیو نے سمندر کو کھنگال کر دونوں کی لاشیں برآمد کیں۔ پولیس نے مکمل طور پر ہر بات کا جائزہ لیا۔ مکمل تفتیش اور پوچھ گچھ کے بعد جب واپسی ہوئی تو پوری پارٹی میں دو افراد ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ ان کی لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے پہنچا دی گئی تھیں۔ شام تک دونوں لاشیں گھر لائی گئیں جہاں ایک ضعیف اور بیمار ماں ان لاشوں کو دیکھ کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی۔ وہ روح فرسا اور قیامت خیز منظر میں آج بھی نہیں بھولی ہوں۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہتے تھے دونوں کے جنازے ساتھ ہی اٹھے۔ ڈاکٹر کی لاکھ کوششوں کے باوجود نہ خالہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی اتری، نہ آہ وفغاں کی آواز بلند ہوئی بلکہ چند روز بعد ہی وہ یوں ہی چپ چاپ اور خاموش اپنے بچوں سے جا ملیں۔

خالہ کا بڑا سا بارونق گھر آسیب زدہ کھنڈر میں تبدیل ہوگیا تھا۔ ہمہ وقت گھر میں وحشت اور سوگواریت طاری رہتی۔ شانی بھائی اداس ''خاموش'' مضمحل سے رہنے لگے تھے ہر چیز سے بے نیاز اور آدم بیزار ہو کر اپنے کمرے میں بند ہوگئے تھے۔ وہ نیچے بہت کم آتے۔ کیونکہ بھابی کی عدت شروع ہو چکی تھی۔ گھر میں نوکر چاکر موجود تھے اس لیے بھابی بہت سخت ضرورت کے تحت ہی کمرے سے نکلتی تھیں۔ میں بھی اب اس گھر کا راستہ بھول چکی تھی۔ ان دنوں اپنے والدین کے لیے میں خود ایک مسئلہ بن چکی تھی۔ رات میں سوتے سوتے اچانک میں چیخ مار کر نیند سے بیدار ہو جاتی اور میری زبان پر ایک ہی جملہ ہوتا بچاؤ...... بچاؤ...... وہ ڈوب رہے ہیں۔ غرق ہو رہے ہیں۔ آپی...... سجاد بھائی...... میں آپ کو نہیں ڈوبنے دوں گی۔ اس طرح کے بے ربط جملے میں بولے چلی جاتی۔

امی ابو کو مجھے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ دونوں میری بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر خاصے ہراساں اور پریشان تھے۔ یونیورسٹی جانا بھی قریب قریب ختم ہوگیا تھا۔ ابو چونکہ محکمہ زراعت میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اس لیے اپنی افسری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے ٹرانسفر کی ایپلی کیشن ہیڈ آفس روانہ کردی۔ قسمت سے وہ فوراً منظور بھی ہو گئی۔ اس ساری پریشان کن صورت حال کا حل ابو کو یہی نظر

آیا کہ مجھے اس ماحول سے اس جگہ سے ہٹا لیا جائے تاکہ گزرتے ہوئے واقعات میرے لیے فقط ایک بھولی بسری یاد بن جائے۔ جانے سے پہلے میں امی کے ساتھ بھابی اور شانی بھائی سے ملنے مرحومہ خالہ ہاجرہ کے دروازے پر جا پہنچی۔ کمال ضبط اور صبر کے ساتھ میں نے بھابی کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں۔ ہر چیز بے ترتیب اور بکھری ہوئی تھی۔ خود ان کا اپنا حلیہ بھی عجیب سا ہو رہا تھا۔ ملگجے کپڑے، سونی کلائیاں، الجھے الجھے سے بکھرے بال اور ہاتھوں میں ایک پرانا فوٹو البم لیے بیٹھی تھیں۔ البم میں تمام تصاویر ان کی اپنی اور سجاد بھائی کی تھیں۔ وہ ہر تصویر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتیں اور پھر صفحہ الٹ دیتیں۔ ان کی وحشت اور دیوانگی دیکھ کر میں بری طرح سہم گئی۔ امی نے آگے بڑھ کر گلے لگایا تو بھابی کی آنکھوں کے سوتے پھوٹ پڑے اور نینوں میں ایسی برسات اتری کہ میں اور امی بھی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے۔ بھابی کا کمرا پھر سے ماتم کدہ بن گیا۔ امی نے بمشکل نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ مجھے اور بھابی کو بھی سنبھالا، انہیں پانی پلایا اور پھر مناسب الفاظ میں ابو کے ٹرانسفر کی خبر سنائی۔ بھابی اس اطلاع پر بھونچکا رہ گئیں۔ چند ثانیے توقف کے بعد ایک گہری سانس لی اور اشکبار آواز میں بولی۔ ”آنٹی مجھے صبوحی سے بہت سہارا تھا۔ مانا اس نے بھی آمد و رفت کم کردی ہے لیکن کم از کم میرے بلاوے پر... آ تو جاتی ہے۔ اب یہ بھی مجھ سے جدا ہو جائے گی۔“ امی نے ایک بار پھر انہیں گلے سے لگایا اور دلاسہ تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”بس بیٹا دلوں میں فاصلے نہیں ہونا چاہیے۔ راستوں کے فاصلے اور دوریاں تو طے ہو جاتی ہیں۔ کبھی تم ملنے چلی آنا کبھی یہ تمہارے پاس آجائے گی۔“

ہم لوگ کافی دیر بھابی کے پاس بیٹھے تھے اس لیے ان سے اجازت لے کر بالائی منزل پر شانی بھائی کے کمرے پر دستک دی۔ ان کا بھی حال بھابی سے جدا نہیں تھا۔ الماس آپی کی جدائی میں وہ مجنوں بنے ہوئے تھے۔ آنکھیں خشک اداس اور وحشت زدہ سی تھیں۔ چہرے کے ارد گرد بالوں کا بے ترتیب جھاڑ جھنکاڑ اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ چہرے کے نقوش ہی چھپ گئے تھے۔ ہینڈسم اور خوبرو شانی بھائی بہت ہی بیمار اور نحیف کمزور لگ رہے تھے۔ ان کے پاس بیٹھ کر امی نے انہیں بھی حوصلے سے جینے کی تلقین کی۔ بہت ساری دعائیں دیں اور یہ بھی بتایا کہ اب ہم لوگ یہاں صرف چند دن کے مہمان ہیں۔ یہ خبر سن کر شانی بھائی کو بھی دکھ ہوا۔ ان سے ملنے کے بعد ہم دونوں ماں بیٹی نے اپنے گھر کا راستہ لیا۔ بھابی اور شانی بھائی سے ملنے کے بعد امی بھی حزن و ملال کی تصویر بن گئیں۔ گھر آکر انہوں نے کوئی کام نہیں کیا بلکہ خاموش اور اداس اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔ اس رات وہ سو بھی نہیں سکیں۔ بے سکونی کی وجہ سے اگلے دن انہیں حرارت ہو گئی اس لیے میں نے سامان کی پیکنگ اپنے سر لی اور ملازمہ کی مدد سے کام کا آغاز کردیا کیونکہ تین دن کے بعد [illegible] ہمیں یہ گھر بلکہ یہ شہر بھی چھوڑنا تھا۔ دوسرے دن امی کی طبیعت بہتر ہوئی تو انہوں نے بھی میرا ہاتھ بٹانا شروع کر [illegible] دن سمیٹا سمیٹی مکمل کرنے کے بعد میں نے آخری [illegible] نہ نظر گھر پر ڈالی تو ایک تسکین آمیز سانس لی کہ سارا کام [illegible] نمٹ چکا تھا۔ میں نے تھکن سے چور اپنے جسم کو صو[illegible] یا اور ایک بھرپور انگڑائی لی۔ اچانک امی کمرے میں [illegible] ان کے ہاتھ میں ڈارک بلو کلر کی قیمتی زنانہ شال [illegible] میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے انہوں نے استفسارانہ انداز میں کہا۔ ”یہ شال نہ تو تمہاری ہے اور نہ میری لیکن اسٹور روم میں کپڑوں کی الماری میں پڑی ہوئی تھی۔ تمہیں علم ہے یہ شال کس کی ہے؟“

شال پر نظر پڑتے ہی مجھے سردیوں کی ایک یخ ٹھنڈی شام یاد آگئی جب آپی الماس اور بھابی نے مل کر باربی کیو کا انتظام کیا تھا۔ سجاد بھائی اور شانی بھائی کے ساتھ بیٹھ کر میں نے کام کم کیا تھا اور کھانے پر زیادہ ہاتھ مارا تھا۔ گرما گرم کافی پی کر جب میں گھر واپسی کے لیے اٹھی تو سردی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا اس لیے سجاد بھائی نے بھابی کو حکم دیا، تمہارے پاس کوئی گرم شال ہو تو صبوحی کو دو تاکہ وہ اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر گھر تک جا سکے۔ بھابی نے اپنے کمرے سے شال لا کر میرے کندھوں پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”تم سے یہ شال لیتے ہوئے مجھے اچھا تو نہیں لگے گا لیکن دراصل یہ مجھے میری ایک دوست نے تحفتاً دی تھی اس لیے......“

ان کی بات ختم ہونے سے پہلے میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ اطمینان رکھیے، آپ کی شال بحفاظت آپ تک پہنچا دوں گی۔“ لیکن میں اپنا وعدہ وفا نہ کر سکی۔ اتنے عرصے بعد جب شال پر نظر پڑی تو سارا منظر آنکھوں میں گھوم گیا۔ میں نے فوراً امی کے ہاتھ سے وہ شال لے کر تہہ بنائی اور اجازت طلب نظروں سے ان کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”امی یہ شال بھابی کی ہے۔ میں جلدی سے جا کر دے آتی ہوں۔“

امی نے حیران آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”کیا بالکل ہی بولا گئی ہو، وقت دیکھ رہی ہو، اب اس وقت جاؤ گی۔“

میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ”امی صبح چار بجے تو ہم لوگ گھر سے نکل چکے ہوں گے۔ پھر پتا نہیں کب ان لوگوں سے ملاقات ہو۔ اپنا محلہ ہے۔ اپنے لوگ ہیں۔ ڈر کس بات کا میں یوں گئی اور یوں آئی۔“ بادل نخواستہ امی نے اجازت دے دی۔

گھر سے نکل کر میں تیز تیز قدم اٹھاتی خالہ ہاجرہ کے گھر کی طرف بڑھی لیکن مین گیٹ بند تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو صلواتیں سنائیں کہ فضول ہی ادھر آ نکلی لیکن پھر خیال آیا کہ شال واپس کرنا بھی ضروری ہے۔ گیٹ کے پاس رک کر سوچ کے گھوڑے دوڑائے تو معاً دماغ میں بجلی سی چمکی کہ عقبی دروازہ پر دستک دیتی ہوں۔ ملازم کا کمرا ادھر ہی تھا۔ شاید وہ جاگ رہا ہو۔ سرعت کے ساتھ میں مڑی اور تیز رفتاری سے چلتی ہوئی پچھلی گلی میں داخل ہو گئی۔ گلی میں ہو کا عالم طاری تھا میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ملازم شاید اسے مقفل کرنا بھول گیا تھا۔ میں نے ایک نظر وسیع اور کشادہ صحن پر ڈالی تو وہاں کم طاقت کا بلب لگا ہوا تھا اس لیے الٹے ہاتھ پر جزوی طور پر تاریکی [illegible] ہوئی تھی۔ میں نے صحن عبور کر کے قدم بھابی کے کمرے کی طرف بڑھائے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن وہ [illegible] میں نہیں تھیں۔ میں نے سوچا کہ بھابی کہیں گئی ہوئی ہوں [illegible] وہ موجود ہوتیں۔ وقت کم ہے ایسا کرتے ہیں کہ شانی بھائی کو شال دے دیتی ہوں۔ یہ سوچ کر میں سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ اوپر پہنچتے ہی مجھے شانی بھائی کے کمرے سے سر[illegible] سنائی دیں تو میں اپنی جگہ ٹھٹک گئی۔ پھر بلی کے قدموں [illegible] ہوئی میں نے پچھلی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ مجھے حیرت [illegible] اکیلے رہتے ہیں اس وقت ان کے کمرے میں کون [illegible] ہے وہ سرگوشی میں بات کر رہے ہیں۔

اندر کا منظر دیکھتے ہی حیرت اور خوف سے میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ میرے سامنے ایک ناقابل یقین اور شرمناک منظر تھا۔ بھابی کے ریشمی بال شانی بھائی کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں گم تھے۔ میں زبردست شاک کا شکار تھی لیکن یہ بات میری سمجھ میں اچھی طرح آگئی تھی کہ میری ہلکی سی آہٹ پر دونوں چوکنا ہو جائیں گے اور پھر آگے کا سوچ کر مجھ پر کپکپاہٹ سی طاری ہو گئی۔ میں سنگی مجسمہ بنی اپنی جگہ پر جمی رہی۔ میرا دماغ سن ہو رہا تھا لیکن ہوش و حواس برقرار تھے۔ پہلے دونوں سرگوشیانہ انداز میں کھسر پھسر کر رہے تھے لیکن اب آواز واضح تھی۔ میری سماعت سے شانی بھائی کی آواز ٹکرائی۔ ”دیکھا سارا گیم ہم نے کس چابکدستی اور ہوشیاری سے کھیلا ہے۔ تم یوں ہی ڈر کے مارے مری جا رہی تھیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور سارا معاملہ نمٹ گیا۔“

بھابی نے کھنک دار آواز میں جواباً کہا۔ ”ہاں جناب مان گئے آپ کو، اس غضب کی منصوبہ بندی تھی کہ سارے واقعے کا نہ کوئی نام و نشان ہے اور نہ گواہ نہ ثبوت۔“

شانی بھائی نے شوخ و شنگ انداز میں اپنا ہاتھ بھابی کے سامنے لہرایا اور استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”محترمہ! اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ گذائی مرڈرز کا کوئی گواہ اور ثبوت نہیں ہے۔ مابدولت چشم دید گواہ ہیں۔“

بھابی نے ایک شگفتہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ”اچھا بھلا بتاؤ کیا دیکھا تھا مسٹر جاسوس۔“

شانی بھائی نے اٹھ کر صندوق کا ڈھکن اٹھایا اس میں سے چھوٹا سا ہینڈی کیم نکال کر کہا۔ ”جو دیکھا وہ اس میں قید کر لیا تاکہ وقت ضرورت کام آسکے۔“

شانی بھائی نے کیمرے کے ویو فائنڈر میں مووی کلپ دکھائی۔ جسے دیکھتے ہی بھابی کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ بھابی نے کیمرا جھپٹنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی کوشش میں ناکام رہیں۔ بھابی نے دہشت زدہ آواز میں کہا۔ ”یہ تصویر کب بنائی مجھے تو علم ہی نہیں کہ تم میرے اتنے قریب ہو۔ اس مووی میں تو میں دونوں کو دھکا دیتی ہوئی صاف نظر آرہی ہوں۔ یہ آخر تم نے کب کیا؟“

شانی بھائی نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ ”جانِ من تم اپنا کام کر رہی تھیں ہم اپنا کام کر رہے تھے۔ مان گئیں ناں کہ ہم استادوں کے استاد ہیں۔“

بھابی نے فوراً پینترا بدلا اور شانی بھائی کے گلے میں اپنی بانہوں کا ہار ڈالتے ہوئے ادائے ناز سے کہا۔ ”پلیز اسے ڈیلیٹ کردو۔“

ان کا لہجہ انتہائی لجاجت آمیز تھا۔ شانی بھائی نے فوراً کیمرا ایک طرف رکھا اور ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”ہرگز نہیں، یہ تصویر

ہی تو وہ ہتھیار ہے۔ جس کی وجہ سے تم ہمیشہ میرے انڈر پریشر رہو گی۔ بیٹا ہے جانی اگلا گرتا ہے تو پچھلا ہوشیار ہوتا ہے۔''

''بھابی کے چہرے پر تاریک سائے لہرا رہے تھے۔ وہ شانی بھائی کے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔ منت سماجت کر رہی تھی لیکن شانی بھائی نے اپنے ترکش سے اسے ایک اور تیر کھینچ مارا کہ مووی کی کئی کاپیز نکال کر وہ الگ الگ کیسٹ میں محفوظ کر چکے ہیں۔ بھابی ہچکیوں سسکیوں سے رو رہی تھیں۔ اس وقت ان کے آنسو حقیقت میں اصلی تھے۔ ورنہ تین دن پہلے ان دونوں نے اپنی شاندار پرفارمنس سے مجھے اور میری امی کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ امی ان کے غم میں بیمار پڑ گئیں اور میں نے اپنا غم غلط کرنے کے لیے گھر میں بکھری مصروفیات کا سہارا لیا تھا۔ دونوں کی اداکاری حقیقتاً سراہے جانے کے قابل تھی۔ اس وقت مجھے آپی الماس کی کہی ہوئی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی جو انہوں نے بھابی کے متعلق کہی تھی لیکن شانی بھائی کو وہ بھی نہ پہچان سکیں۔ دونوں میں کب ناجائز مراسم استوار ہوئے اور دونوں کب سے یہ بے حیائی کا کھیل کھیل رہے تھے۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس وقت میں نے دل کی گہرائیوں سے ایک دعا مانگی کہ اے اللہ ان پر اپنا غضب نازل کرے لیکن میری التجا بارگاہ الٰہی میں شاید قبول نہ ہوئی۔ تب ہی تو اتنا سب کرنے کے باوجود دونوں معاشرے میں عزت و توقیر کے ساتھ سر اٹھا کر جی رہے ہیں۔''

یہ طویل سرگزشت سناتے ہوئے صبوحی کی آواز آنسوؤں سے بھیگ چکی تھی۔ ناصر شیخ نے صبوحی کو پانی پلایا اور کہا۔ ''صبوحی وقت کا انتظار کرو۔ اس عظیم المرتبہ جج کی عدالت میں جب دونوں کی پیشی ہوگی تو انشاء اللہ زمین ان پر تنگ ہو جائے گی۔''

باپ کے خاموش ہوتے ہی صنم بول پڑی۔ ''امی اس وقت آپ ہمت حوصلے سے کام لیتے ہوئے خاموشی کی مہر توڑ کر اگر قانون کا دروازہ کھٹکھٹاتیں تو یقیناً دونوں اپنے انجام کو پہنچ چکے ہوتے۔''

صبوحی نے ایک پھیکی اور اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''بچی! قانون مکڑی کا وہ جالا ہے جس میں حشرات الارض تو پھنس جاتے ہیں لیکن بڑے جانور اسے توڑتے ہوئے باہر نکل جاتے ہیں۔''

مدثر نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ درست کہہ رہی ہیں۔ امی ایسے شیطان صفت لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ وہ نانا ابو کے سارے خاندان کے دشمن بن جاتے اور آپ لوگوں کا جینا دوبھر کر دیتے۔ ان لوگوں کا حساب تو مالک حقیقی ہی لے گا۔''

صبوحی نے تائید آمیز لہجے میں آہستہ سے کہا۔ ''مجھے بھی یقین کامل ہے کہ خالہ ہاجرہ، آپی الماس اور سجاد بھائی کا خون ایک دن ضرور رنگ لائے گا۔ دنیا والوں کی نظروں میں یقیناً دونوں دھول جھونکنے میں کامیاب ہو گئے ہوں لیکن اس کی آنکھوں ... طرح بچ پائیں گے جو نہ کبھی سوتا ہے اور نہ اونگھتا ہے جو ... خیر ضائع کرے گا اور نہ ذرہ برابر شر کو نظر انداز کرے ... انسان گناہ کرتے وقت اس حی القیوم کو بھول جاتا ہے۔'' اتنا ... کے بعد صبوحی نے پشت پر رکھے تکیے سے ٹیک لگائی اور آ... لیں۔ آنسو ابھی بھی رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ ... کیونکہ خالہ ہاجرہ، آپی الماس اور سجاد بھائی انہیں کچھ شدت ... تھے۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہر ... اپنی جگہ یہی سوچ رہا تھا کہ کیا انسان اتنا گر سکتا ہے؟

ابھی وہ لوگ صبوحی کی سنائی کہانی کے سحر سے آزاد بھی نہیں ہوئے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ناصر شیخ نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تھا کہ دوسری جانب سے مہ رخ کی آواز آئی۔ ''میں مہ رخ بول رہی ہوں۔ آپ لوگوں کے جاتے ہی یہاں ایک بڑا حادثہ ہو گیا ہے۔ ذکر جا چکے تھے کہ ڈیڈی نے چائے کی فرمائش کر دی۔ یہاں کبھی کبھی گیس کی شورٹیج ہو جاتی ہے اس لیے کچن میں سلینڈر رکھا رہتا ہے۔ ممی نے چولہا جلایا ہی تھا کہ سلینڈر نے آگ پکڑ لی۔ ڈیڈی ادھر دوڑے تھے کہ سلینڈر پھٹ گیا۔ دھماکے سے کچن کے ساتھ پورے گھر میں آگ پھیل گئی۔ ممی ڈیڈی دونوں......''

ناصر شیخ نے جلدی سے پوچھا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟''

ادھر سے جواب آیا کہ اسپتال میں۔

انسانیت کے ناتے وہ سب کو لے کر اسپتال جا پہنچے۔ مہ رخ بھی آتشزدگی کا شکار ہوئی تھی مگر زیادہ جلی نہیں تھی۔

مہ رخ کا کوئی رشتے دار تھا نہیں اس لیے اسپتال سے دل پر جبر کر کے صبوحی اسے اپنے ہاں لے آئی پھر کچھ عرصے بعد رحم کھا کر اسے بہو بنا لیا۔

مہ رخ کے اب دو بچے ہیں پھر بھی گھر کا ہر فرد اس پر نگاہیں رکھے ہوئے ہے کہ کہیں موروثی فریب اس میں بھی نہ آ گیا ہو۔

آگ

جناب معراج رسول

السلام علیکم!

میں نے اپنی ایک غلطی کو الفاظ کا پیرہن دے کر، لفظوں کو سجا کر کہانی کی شکل دی ہے لیکن پلیز اسے میرے نام سے نہ چھاپیں۔ میرے اندر کا درد مجھے اکسا رہا ہے، اپنی گاتھا میں کسی کو سنانا چاہتا ہوں۔ دل میں رکھے رکھے دماغ بوجھل ہو رہا ہے لیکن افسوس میں یہ بات کسی کو سنا نہیں سکتا، اسی لیے کاغذ پر لکھا ہے۔ اگر آپ اسے شائع کر دیں گے تو بہت سے لوگ اپنی ہی نظروں سے پھسل کر گرنے سے بچ جائیں گے۔

نصرت بٹ

(کراچی)

برسوں کے بعد میں نے اس کو دیکھا تھا۔ اور جب اس نے سب کچھ بتایا تو میرے وجود میں اک آگ سی لگ گئی۔

میں اس دن سے تڑپ رہا ہوں، ہے کوئی اس آگ کو بجھانے والا؟ کوئی ہے؟ کیا کروں میں؟ یہ تپش لے کر کہاں جاؤں؟

یہ تپش تو برسوں پہلے میرے وجود میں جاگی تھی۔ میں اپنے فلیٹ میں اکیلا رہتا تھا جب وہ پہلی بار میرے فلیٹ کے دروازے پر آئی تھی۔ میں نے اس کی دستک کے جواب میں جب دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔



ایک نازک سی لڑکی۔ جس کا رنگ بھی دمکتا ہوا تھا۔

میں اس کو نہیں جانتا تھا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا نام پروین ہے صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے مقبول صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

مقبول صاحب میری ہی بلڈنگ میں رہتے تھے۔ میں نے یوں ہی ایک دن ان سے ذکر کر دیا تھا کہ مجھے اپنے فلیٹ میں کوئی کام کرنے والی چاہیے اور کام ہی کیا تھا۔ دو چار برتن ہوا کرتے ان کو دھونا تھا۔ دوسرے تیسرے دن ڈسٹنگ کر دینی تھی، بس۔

لیکن یہ لڑکی کام والی تو نہیں معلوم ہوتی تھی۔

''کیوں بھیجا ہے تم کو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کو کام والی کی ضرورت ہے نا؟'' اس نے کہا۔ ''تو میں اسی لیے آئی ہوں۔''

''کام والی؟'' میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ ''تم کام کرو گی؟''

''ہاں جی اپنا تو کام ہی یہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں بہت کم گھروں میں کام کرتی ہوں۔ ہر ایک کے یہاں نہیں جاتی۔''

''تم کو جانا بھی نہیں چاہیے۔'' میں زیرِ لب بولتے ہوئے ایک طرف ہٹ گیا۔ ''آؤ اندر آ جاؤ۔''

وہ اندر آ گئی۔ اس کے رکھ رکھاؤ سے بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کوئی ملازمہ ہے لیکن وہ تھی اور قدرت کی اس ستم ظریفی کو کیا نام دیا جائے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ نیچے بیٹھنے لگی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''نیچے نہیں اوپر بیٹھ جاؤ۔''

میرے کہنے پر وہ اوپر بیٹھ گئی۔ اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی اس پذیرائی پر حیران ہو رہی ہو۔ میں نے بات کا آغاز کیا۔ ''دیکھو میں ایک اکیلا انسان ہوں، اسی لیے میرے گھر کا کام بھی بہت کم ہوتا ہے پھر بھی میں یہ چاہوں گا کہ تم میرے یہاں کام کرو۔''

''مہربانی صاحب جی۔'' اس کا لہجہ بھی شائستہ تھا۔ نہ جانے کون سی مجبوری اس جیسی لڑکی کو در در لیے پھر رہی تھی۔

''بس کل سے کام پر آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''تم کو تین ہزار ملیں گے، ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہے صاحب۔'' وہ خوش ہو گئی تھی۔ ''میں کل سے صبح آیا کروں گی۔ آپ کس وقت اٹھتے ہیں؟''

''میری فکر مت کرو۔ میں تمہاری وجہ سے جلدی اٹھ جایا کروں گا۔''

یہ میں نے ذومعنی بات کہی تھی۔ پتا نہیں اس نے سمجھی یا نہیں لیکن مسکراتی ہوئی چلی گئی تھی۔ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میرا ریکارڈ ہی ایسا تھا لیکن میں نے اپنی خرابیوں کو ہمیشہ پردے میں رکھا ہے۔ میں ہمیشہ ایسی پتنگ کی طرح رہا ہوں جو کٹے تو ایک بار لیکن بہت سی چھتوں پہ جا اترے۔ بہت سی لڑکیاں میری زندگی میں آئیں اور ہوا کے جھونکوں کی طرح گزر گئیں۔ اب تو ان کے نام بھی یاد نہیں رہے۔

میری جاب ایسی تھی کہ مجھے اس قسم کے مواقع ملتے ہی رہے اور میں نے ان کا فائدہ بھی اٹھایا۔ والدین تھے نہیں۔ بھائی بہن اپنی اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ شادی نہیں کی تھی اسی لیے اندر ایک آگ سی لگی رہتی تھی۔ پچھلے ایک سال سے میری زندگی میں کوئی نہیں آئی تھی اسی لیے میں اس لڑکی کو دیکھ کر بھڑک اٹھا تھا۔

اس نے دوسرے دن سے کام شروع کر دیا۔ اس میں ایسی کئی خوبیاں تھیں جنہوں نے میرے لیے آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔

وہ مقررہ کاموں کے علاوہ بھی بہت کچھ کر دیا کرتی۔ جیسے کپڑے دھونے کا کام اس کا نہیں تھا لیکن وہ میرے کپڑے بھی دھو دیا کرتی۔ ایک بار اس نے میری ایسی خدمت کی کہ میں اس کا گرویدہ ہو گیا۔

میں اس رات بخار میں مبتلا تھا۔ سر میں بھی شدید درد تھا۔ یہ موقع ایسا ہوتا ہے جب احساس ہوتا ہے کہ کوئی اپنا ہو جو خدمت کر سکے۔ اس نے یہ فریضہ بھی انجام دیا تھا۔

اس نے جب مجھے بخار اور سر درد میں مبتلا پایا تو بہت دیر تک میرا سر دباتی رہی تھی۔ میرے منع کرنے کے باوجود۔

''صفیہ اب رہنے دے۔'' میں نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔

''نہیں صاحب تھوڑا سا اور دبانے دیں۔ کیسا لگ رہا ہے؟''

''پتا نہیں تم سمجھو گی یا نہیں لیکن کہنے دو کہ تم نے جلتی ہوئی پیشانی پر جو ہاتھ رکھا...... روح تک پھیل گئی تاثیر مسیحائی کی۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا صاحب؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

میں نے جب مطلب بتایا تو وہ شرما گئی تھی۔ ایک دن اس نے پوچھ لیا۔ ''صاحب جی آپ کے پاس تو سب کچھ ہے۔ آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

''کیا بتایا جائے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا مزاج ذرا الگ ہے۔ میں شادی کر کے بندھنوں میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ اس کے علاوہ میرا کون ہے جو میری شادی کی فکر کرے۔'' وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

پھر میں نے سوال کیا۔ ''صفیہ! ایک بات بتا۔ تو نے شادی کیوں نہیں کی؟''

وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ''صاحب! ہماری برادری میں بہت سے ہیں جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ وہ کیسے ہوتے ہیں۔ کوئی کام تو ان سے ہوتا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان کے حلیے کیسے ہوتے ہیں۔''

''یہ بات تو ہے تو اپنی برادری والوں سے بہت الگ ہے۔''

''بس جی یہی تو ہوا ہے میرے ساتھ۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''خدا نے بنایا ایسا اور برادری کیسی دے دی۔''

اس کی باتیں بھی بہت مناسب تھیں۔ بالکل تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح باتیں کیا کرتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ مجھ سے بے تکلف ہو گئی تھی۔ ایک دن میں نے اسے پانچ ہزار روپے دیے۔ ''صفیہ! بازار جا کر اپنے لیے اچھے اچھے ماڈرن ڈیزائن کے کپڑے خرید لو۔''

''لیکن ان کا کروں گی کیا صاحب؟'' اس نے پوچھا۔

''کیوں؟''

''صاحب! آپ کو تو معلوم ہے کہ میری برادری کیسی ہے۔ میرا حلیہ کیسا ہے۔ میں جب ایسے کپڑے پہن کر نکلوں گی تو مذاق بن جاؤں گی۔''

''یہ تو ہے، پھر ایک کام کرنا۔ وہ کپڑے یہاں لا کر رکھ دینا۔'' میں نے کہا..... ''گھر سے اپنے کپڑوں میں آنا اور یہاں آ کر کپڑے تبدیل کر لینا۔''

''اس سے کیا ہوگا صاحب؟'' اس نے پوچھا۔

''ارے بھائی! میں اپنی خوشی کے لیے تمہیں ایسے

لباس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ شرما کر رہ گئی اور پھر ایک دن بازار سے ماڈرن ڈیزائن کے جوڑے لے آئی۔ اس نے جب واش روم میں جاکر وہ کپڑے پہنے اور میرے سامنے آئی تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ گھروں میں کام کرنے والی ماسی ہے۔

اچھی اچھی ماڈرن لڑکیاں اس کے سامنے شرمندہ ہو کر رہ جاتیں اور اس وقت میرے وجود میں ایک آگ سی بھڑک اٹھتی۔ وہی آگ جو جلا کر خاکستر کردیتی ہے جو آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیتی ہے۔

میں بھول گیا کہ میں کون ہوں، وہ کون ہے۔ ہمارے درمیان کیا تعلق ہے۔ بس ایک آگ تھی جس میں ہم جل رہے تھے اور جلتے ہی چلے گئے۔ جب ہوش آیا تو بہت کچھ ہو چکا تھا۔ ذرا سی دیر میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ وہ روتی رہی تھی اور میں اسے مناتا رہا تھا۔ میں اس کی دل جوئی کرتا رہا۔

کہا جاتا ہے کہ بس ایک بار یہ دھند ذہن پر چھا جائے تو پھر پھیلتی ہی جاتی ہے۔

اس کے بعد بھی یہ آگ جلتی رہی۔ ایک بار اس نے کہا۔ ''صاحب! اب یہ کھیل ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ گناہ کب تک چلے گا کیوں نہ ہم...... میرا مطلب ہے کہ یہ سب ختم کر کے ایک ہو جائیں۔''

مجھے یہی ڈر تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اس قسم کی کوئی بات کرے گی اور اس نے کردی۔ اس کا اشارہ تھا کہ میں اس سے شادی کرلوں۔ اس وقت میں نے اسے سمجھایا۔ ''دیکھو صفیہ۔ ہم جس طرح ہیں اسی طرح ٹھیک ہیں۔ میرے اور تمہارے درمیان بہت فرق ہے۔ ہماری برادری الگ، خاندان الگ، زندگی الگ۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ اسی طرح رہ سکتے ہیں۔ ہاں یہ میرا وعدہ ہے کہ جب تک زندگی ہے میں تیرا خیال رکھوں گا۔''

اس نے کچھ نہیں کہا سر جھکا لیا لیکن اس دن اس نے ایک اور ایسی بات کی جس نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے ساتھ وہ مرحلہ شروع ہو گیا ہے جو ہوا کرتا ہے یعنی وہ ماں بننے والی ہے۔

میں یہ خبر سن کر بوکھلا گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کے حادثات ہوتے رہے تھے لیکن کسی نہ کسی طرح معاملہ ختم ہو جاتا تھا۔ میں نے اسے دس ہزار روپے دیے کہ وہ اپنی جان چھڑا لے۔

پتا نہیں کیا ہوا وہ غائب ہو گئی۔ بالکل غائب ہو گئی۔ محلے کے جس شخص نے اسے میرے پاس رکھوایا تھا وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں غائب ہو گئی ہے۔ کچھ دنوں تک وہ مجھے یاد آتی رہی پھر اتنی معروفیات میں کون کہاں یاد رہتا ہے۔

پھر ایک خبر آئی کہ وہ اب بہت جلد ماں بننے جا رہی ہے۔ یعنی میں باپ بننے والا ہوں۔ میں نے کہا۔ ''صفیہ! ابھی بھی وقت ہے۔ تم اس جھنجٹ کو اور پیسے لے لے بلکہ میرے ساتھ چل میں تجھے نجات دلوا دوں گا۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا صاحب! اس کو جنم دوں گی اور اس کی پرورش بھی کروں گی کیونکہ وہ میری زندگی ہوگا۔ میں نے اس کی اپنے اندر پرورش کی ہے۔ وہ میرا ہی حصہ ہے۔ میں ماں ہوں۔ آپ جیسا باپ نہیں جو اتنی آسانی سے یہ بات کہہ دے۔''

میں سمجھاتا رہ گیا لیکن اس کی ضد تھی کہ وہ بچے کو ہر حال میں جنم دے گی۔

بہر حال وہ جانے اس کی زندگی جانے۔ مجھے کیا کرنا تھا۔ میں ڈھول گلے میں ڈال کر گھومنے کا قائل نہیں رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک دو بار ایسی سچویشن ہوئی تھی لیکن مجھ پر کوئی بوجھ نہیں ہوا تھا۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔

اس کے بعد وہ کہیں غائب ہو گئی۔ پہلے بھی وہ کچھ دنوں کے لیے غائب تو ہوئی تھی لیکن واپس آگئی تھی۔ اس بار نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔

برسوں بیت گئے۔ میں اس کو بھول گیا تھا۔ اب اتنی فرصت کس کے پاس ہوتی ہے کہ وہ کسی کو یاد کرتا رہے۔ اس کے بعد میں نے شادی کرلی تھی۔ میری بیوی ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی تھی۔

اس کے گھر والے مجھے جانتے تھے اسی لیے جب میں نے اپنا رشتہ بھیجا تو قبول کرلیا گیا۔

اس زمانے میں خود میری پوزیشن بھی مستحکم ہو چکی تھی۔ میں ایک بڑی فرم کا جنرل منیجر تھا۔ وہ فلیٹ میں نے چھوڑ دیا تھا۔ اب میرا اپنا مکان تھا۔ راحیلہ بہت اچھی تھی۔ اس نے مجھے بھرپور پیار دیا۔ میرا ہر طرح خیال رکھا۔ اس کو پاکر میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا تھا۔

وہ اپنے ساتھ ایک کام کرنے والی لے کر آئی تھی۔ شادی کے ایک ہفتے تک تو کچھ پتا نہیں چلا۔ ایک ہفتے کے

بعد جب فرصت ملی اور مہمان رخصت ہو گئے تو ایک صبح وہی ماسی میرے لیے چائے لے کر آگئی۔ اس نے بتایا کہ بیگم صاحبہ کے سر میں درد ہو رہا ہے اسی لیے وہ چائے لے کر آئی ہے۔ اس وقت میں لاؤنج میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ یہ میرا معمول تھا۔

راحیلہ میرے لیے چائے لے کر آجاتی تھی لیکن اس صبح اس نے ماسی کو بھیجا تھا۔

اس کو دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ صفیہ ہی تھی۔ وہی صفیہ جس کے ساتھ میرے تعلقات رہے تھے۔ وہی تھی...... لیکن نہیں وہ کیسے ہو سکتی تھی؟ اس کو تو گئے ہوئے بھی پندرہ سولہ سال ہو گئے تھے۔

یہ تو ایک جوان لڑکی تھی۔ وہ کیسے ہو سکتی تھی لیکن سب کچھ وہی۔ ویسا ہی قد۔ ویسا ہی چہرہ۔ بولنے کا انداز۔ سب کچھ صفیہ جیسا۔

''کون ہو تم؟'' میں نے ایک بے خودی کے عالم میں اس سے پوچھا۔

''میں ریشماں ہوں صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ کے یہاں کام کرتی ہوں۔''

''اوہ خدا! یہ تو کوئی اور تھی۔'' پھر مجھے ایسا کیوں لگا کہ صفیہ سامنے آکر کھڑی ہو گئی ہو۔ کس بلا کی مشابہت تھی دونوں میں۔ وہ زمانہ یاد آگیا تھا جب میں اور صفیہ اسی مکان میں ساتھ ہوا کرتے تھے۔ اس نے کسی اور جگہ کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ صرف میرے لیے ہو گئی تھی۔

ایک دن جب راحیلہ کمرے میں تھی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''ریشماں۔ تو بتا تیری ماں کا کیا نام ہے؟''

''میری ماں کا نام صفیہ ہے صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''بس...... بس یوں ہی۔'' میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔

میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ بہت کچھ جاننا چاہتا تھا لیکن کیا بتاتا۔ بس دل دھڑک کر رہ گیا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ریشماں جلدی کام پر آگئی۔ اس وقت میں اور راحیلہ ناشتے کی میز پر تھے۔ ناشتا راحیلہ ہی بنایا کرتی تھی۔

راحیلہ نے ایک پلیٹ میں سلائس اور ایک فرائی انڈا ریشماں کو دیا۔ ''یہ لو ریشماں۔ ناشتا کرلو۔''

ریشماں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے پلیٹ لے لی اور ایک طرف بیٹھ کر ناشتا کرنے لگی۔ اچانک میں نے ایک چیز نوٹ کی۔

ریشماں زردی اور سفیدی الگ کر کے کھا رہی تھی بالکل یہی۔ یہی عادت میری تھی۔ میں بھی ایسا ہی کرتا تھا۔ تو کیا یہ لڑکی...... یہ وہی تھی جس کو اس کی ماں جنم دینے والی تھی اور جو...... لکھتے ہوئے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا کہ جو میری ہی اولاد تھی۔ میرا خون تھی۔ چاہے وہ کسی انداز سے بھی تھی تو میری ہی اولاد۔ خدایا یہ کیسی آگ تھی جس کا اظہار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

ایک دن میں گھر پر ہی تھا کہ ایک آدمی ریشماں کو بلانے کے لیے گیٹ پر آگیا۔ یہ اتفاق تھا کہ میں اس وقت گیٹ پر ہی موجود تھا۔ میں اپنی گاڑی باہر نکال رہا تھا کہ میں نے اس کو گیٹ پر کھڑا دیکھ لیا۔

وہ عجیب میلا سا بندہ تھا۔ دیکھنے ہی سے چرسی موالی معلوم ہو رہا تھا۔ میل کھائے ہوئے کپڑے، میلی سی چپل، عجیب سی صورت۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''کس سے ملنا ہے؟''

''صاحب! آپ کے یہاں جو کام کرتی ہے نا ریشماں اسی سے ملنا ہے۔''

میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ ریشماں سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔ کیا تعلق ہے اس کا ریشماں سے۔ اس وقت میں ایک باپ بن کر سوچنے لگا تھا۔ قدرت کے بھی کیا کھیل ہوا کرتے ہیں۔ وہ کس طرح جذبوں کو بیدار کردیتی ہے۔

''کیا کام ہے ریشماں سے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر جواب دیا۔ ''وہ میری ہونے والی بیوی ہے صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''اگلے مہینے ہماری شادی ہونے والی ہے۔''

ایسا لگا جیسے میرے پیروں تلے زمین نکل گئی ہو۔ ریشماں تو میری...... میرا مطلب ہے کہ میری اولاد تھی۔ ایک پڑھے لکھے مہذب خاندان کے فرد کی بیٹی۔ اس کی شادی ایسے شخص سے کیسے ہو سکتی تھی۔

ایک آگ سی نکلی اور میرے پورے وجود پر حاوی ہوتی چلی گئی۔ پتا نہیں کس احساس کی آگ تھی۔ میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ ریشماں کون ہے۔ میں اس کا کیا لگتا ہوں۔

میں نے اندر جا کر ریشماں سے کہا۔ ''ریشماں! کوئی عجیب سا آدمی تمہیں بلا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری اس

سے شادی ہونے والی ہے۔''

''صاحب! وہ شیرا ہوگا۔'' ریشماں نے بتایا۔ ''وہ میرا منگیتر ہے۔ اگلے مہینے اس سے میری شادی ہونے والی ہے۔''

''ریشماں! میں تمہاری ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''بلکہ ایسا کرو۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ کہاں رہتی ہو تم لوگ؟''

''جھونپڑپٹی میں صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن آپ وہاں کیسے جائیں گے؟''

''تم اس کی پروا مت کرو۔ میں چلا جاؤں گا بلکہ ایسا کرو، اس آدمی سے مل کر آؤ۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے صاحب۔''

راحیلہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ اس وقت کمرے میں سو رہی تھی۔ میں ایک اضطراب کے عالم میں ٹہلتا رہا تھا۔

یہ سب کیسے ہوسکتا تھا۔ کیا میری غیرت یہ گوارہ کرسکتی تھی؟

ریشماں کچھ ہی دیر میں اس آدمی کو نمٹا کر میرے پاس آگئی تھی۔ ''جی صاحب وہ چلا گیا ہے۔ اب کیا کرنا ہے؟''

''اب میرے ساتھ چلو۔'' میں نے کہا۔

اس نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن خاموش رہی تھی۔ البتہ حیرت اس کے چہرے پر تھی۔

میں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور اس جھونپڑپٹی کی طرف چل دیا جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس طرف کسی گاڑی والے کا جانا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بہت سے لوگ ماسیوں کی تلاش میں جاتے رہتے ہیں۔ مجھے بھی یہی سمجھا جاتا۔

چھوٹا سا ایک کمرے کا کچا مکان تھا۔ میں نے اپنی گاڑی کچھ دور کھڑی کی تھی۔ ریشماں نے دروازے پر دستک دی اور صفیہ نے دروازہ کھول دیا۔ وہ صفیہ ہی تھی۔

ہم نے ایک ہی نظر میں ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ وقت نے اگرچہ اس کے خدوخال مدھم کر دیئے تھے۔ اس کے باوجود اس میں وہی طرح داری تھی وہی دل کشی تھی جس کو دیکھ کر میں پاگل ہو جاتا تھا۔

کچھ دیر تک یہی حالت رہی کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے پھر میں نے ہی اس سے پوچھا۔ ''صفیہ! کیسی ہو تم؟''

''ٹھیک ہوں صاحب۔'' اس نے جواب دیا۔ پھر مسکرا کر بولی۔ ''صاحب! آپ نے اپنی بیٹی کو پہچان لیا؟''

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ یعنی میرا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا۔ ریشماں میری ہی بچی تھی۔ میرا ہی خون تھی۔ چاہے وہ کسی بھی انداز سے دنیا میں آئی ہو لیکن اس میں، میں ہی تھا اسی لیے اس کی عادتیں میری طرح تھیں۔ (اس کے نقوش تو ماں والے تھے) اس کی جین میری تھی لیکن کیا ہوگیا تھا۔ وہ ایسی تھی کہ میں اعلان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ لڑکی میری ہے۔ میرا خون ہے۔ میرے خاندان کی ہے۔ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

بہت اٹکتے اٹکتے میں نے پوچھا۔ ''صفیہ...... کیا تم اس کی شادی کر رہی ہو؟''

''ہاں!'' اس نے کہا۔ ''آپ نے شاید اس کے منگیتر کو دیکھا ہوگا۔''

''ہاں! دیکھا ہے لیکن وہ...... ہماری میرا مطلب ہے تمہاری ریشماں کے لیے مناسب نہیں ہے۔''

''صاحب! ایک بات بتاؤں ہم لوگوں میں اسی قسم کے رشتے ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ریشماں ہو یا کوئی اور ہو بہت سے ایسے ہیں صاحب بہت سے ایسے ہیں۔ صرف ریشماں ہی نہیں ہے۔ آپ جیسے لوگوں کی بہت سی بیٹیاں اسی طرح کسی نہ کسی چرسی موالی کے پلے باندھ دی جاتی ہے۔ ایک بات بتائیں کیا آپ یہ اعلان کر سکتے ہیں کہ ریشماں آپ کی اولاد ہے؟ بتائیں؟ کسی کو بتا سکتے ہیں اسی لیے صاحب اس کو اسی حال میں رہنے دیں جو اس کا نصیب ہو، ایک بات اور یہ ٹھیک ہے کہ میں بھی بہک گئی تھی لیکن کم از کم آپ تو سنبھل جاتے صاحب۔''

مجھ سے کچھ نہیں بولا گیا۔ میں واپس آگیا۔

لیکن میں خالی ہاتھ کہاں آیا تھا۔ اپنے ساتھ آگ لے کر آیا تھا۔ وہ آگ جو میرے تن بدن میں لگی ہوئی تھی جس نے مجھے جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ وہ آگ ابھی تک لگی ہوئی ہے میں نہیں جانتا، میری...... میرا مطلب ہے کہ ریشماں کہاں ہے کس حال میں ہے۔ کیوں کہ میں راحیلہ کو لے کر دوسرے شہر آگیا ہوں۔

لیکن کیا شہر بدل لینے سے یادیں بدل جائیں گی۔ کیا یہ آگ سرد ہو جائے گی۔ میری یہ کہانی پڑھنے والوں کے ساتھ اگر خدا نہ کرے اس قسم کا کوئی مرحلہ ہو تو خدارا اپنے قدموں کو مضبوط رکھیں، ورنہ پچھتاوے کی آگ زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑتی۔

مکافاتِ عمل

محترم مدیر سرگزشت

السلام علیکم

یہ دنیا کی ریت ہے، یہی رواج ہے یہی ہوتا آیا ہے کہ جو جیسا کرے گا اس کا پھل بھی اسے ویسا ہی ملے گا۔ یعنی کہ جو انسان بوتا ہے وہی کاٹتا ہے، بے شک انسان خسارے میں ہے پھر بھی سنبھلتا نہیں ہے۔ یہ سچ بیانی میرے ایک جاننے والے گھر کی ہے۔ سرگزشت میں سبق آموز کہانیاں لگتی ہیں اس لیے میں چاہتی ہوں کہ یہ روداد سرگزشت میں ہی لگے۔

تہمینہ اشفاق
(کراچی)



امجد علی دن بھر کے تھکے ہارے دفتر سے گھر واپس آئے تو اپنے سب سے چھوٹے داماد ندیم کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کی حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ ندیم تنہا آیا تھا۔ ان کی بیٹی ثمینہ اور ندا اس کے ہمراہ نہیں آئی تھیں جب کہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ پوری فیملی ہمیشہ ایک ساتھ ہی آتی تھی۔ انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے اپنی بیوی راشدہ خاتون کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں، ندیم خود ہی بول پڑا۔

''آپ مجھے اکیلے دیکھ کر حیران ہو رہے ہوں گے۔ دراصل میں دفتر سے سیدھا ہی یہاں آگیا اگر ثمینہ کو لینے گھر

جاتا تو یہاں آتے آتے رات ہو جاتی۔“

”چلو اچھا کیا۔“ امجد علی بولے۔ ”میں ذرا کپڑے تبدیل کرلوں پھر آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

”جی بہتر، آپ فریش ہو جائیں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔“ ندیم بولا۔

امجد علی کے جانے کے بعد راشدہ بیگم بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور داماد کو اخبار پکڑاتے ہوئے بولیں۔ ”تم اخبار پڑھو، میں چائے بناتی ہوں۔“

”آنٹی کوئی تکلف نہ کریں۔ میں نے چائے دفتر میں پی لی تھی۔“

”کوئی بات نہیں بیٹا۔ ایک پیالی ہمارے ساتھ بھی سہی۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور چائے بنانے کچن میں چلی گئیں۔

امجد علی اور راشدہ کی تینوں بیٹیاں شادی شدہ تھیں۔ بڑی بیٹی صائمہ نے گریجویشن کیا تھا اور وہ شادی کے بعد گھر گرہستی میں لگ گئی تھی۔ اس کا شوہر شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی دبئی چلا گیا تھا۔ شروع میں اس کی ملازمت ایسی نہ تھی کہ وہ بیوی کو اپنے پاس بلا سکتا پھر بچوں کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اوپر تلے چار بچے ہوئے، جب تک بچے چھوٹے تھے تو وہ بیچ بیچ میں دو تین مہینے کے لیے دبئی چلی جاتی لیکن جب بچوں کی پڑھائی شروع ہو گئی تو ان کے لیے بار بار جانا ممکن نہ رہا البتہ اس کا شوہر ہر سال چھٹیوں میں ایک ماہ کے لیے ضرور آتا۔ بہر حال وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھی اور اس کی پوری توجہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر تھی۔

دوسری بیٹی فائزہ نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا تھا۔ اس نے کچھ عرصہ دواؤں کی ایک کمپنی میں ملازمت کی لیکن شادی کے بعد گھر بیٹھ گئی۔ اس کا شوہر عورتوں کی ملازمت کے حق میں نہیں تھا اور ویسے بھی اسے ملازمت کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ راشد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر تھا، ذاتی مکان، گاڑی گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ شادی کے ایک سال بعد ان کے یہاں بیٹا ہوا پھر وقفہ وقفہ سے دو بیٹیاں پھر فائزہ کو کسی بات کا ہوش نہ رہا اور وہ پوری طرح بچوں کی پرورش اور گھر داری میں لگ گئی۔

البتہ تیسری بیٹی ثمینہ کے حالات قدرے مختلف تھے۔ اس نے بھی کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا تھا اور ایک دواؤں کی کمپنی میں کام کر رہی تھی۔ اس نے شادی کے بعد بھی ملازمت جاری رکھی گو کہ اس کا شوہر ندیم ایم بی اے تھا لیکن اس نے کبھی ایک جگہ ٹک کر ملازمت نہیں کی اور ہر دو چار مہینے بعد کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر گھر بیٹھ جاتا۔ دراصل وہ مزاج کا تیز تھا اور اس کی کسی سے نہیں بنتی تھی۔ اسے یہ زعم تھا کہ وہ پورے خلوص، نیک نیتی اور محنت سے کام کرتا ہے اس لیے کسی کو اسے ٹوکنے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں۔

افسرانِ بالا اس کے کام سے خوش تھے لیکن اس کا رویہ انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ ہر افسر کے مزاج میں یہ بات شامل ہوتی [illegible] وہ اپنے ماتحت کے کام میں کوئی نہ کوئی مین میخ نکالتا [illegible] اپنے راستے پر چلانے کی کوشش کرتا ہے جب [illegible] بات سے چڑ تھی۔ وہ اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھتا تھا [illegible] کی کہی ہوئی بات اسے زہر لگتی تھی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی افسر [illegible] سے سمجھانا چاہا یا اپنے طریقے پر کام کروانے کی کوشش کی تو [illegible] فائل اس کی میز پر پھینک دیتا کہ جب میرا کام پسند نہیں تو [illegible] کرلیں۔

ثمینہ نے اسے بہت سمجھایا کہ نوکری میں نخرہ کیسا، وہ جیسا کہتے ہیں تم وہی کرو لیکن ندیم کی عقل میں یہ بات نہیں آتی تھی۔ وہ جواب میں یہی کہتا کہ میں اپنے کام کو خوب سمجھتا ہوں۔ وہ مجھ سے زیادہ قابل نہیں ہیں۔ افسر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ میرے کام میں خامیاں نکالیں۔

اس کے اس رویے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کسی بھی جگہ تین چار مہینے سے زیادہ نہیں ٹکتا تھا۔ البتہ موجودہ ملازمت پر کام کرتے ہوئے اسے دو سال ہو گئے تھے اور اس کے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بچی کی پیدائش کے بعد اس نے اپنے رویے میں لچک پیدا کرلی تھی۔ گو کہ ثمینہ نے اسے تمام فکروں سے آزاد کر رکھا تھا۔ بچی کی تمام ضرورتیں وہ خود ہی پوری کرتی۔ اسی طرح اس نے اپنے اخراجات کے لیے بھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ کپڑے، جوتے، ٹرانسپورٹ، میڈ کی تنخواہ اور بچی کے دیگر اخراجات وہ خود ہی پورے کرتی۔ اس نے کبھی پیسوں کے لیے ندیم کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا... کیونکہ ندیم کی تنخواہ بہت کم تھی۔ اس سے وہ اپنے اخراجات اور پلاٹ کی قسط ہی دے سکتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی تنخواہ کم ہونے کا شدت سے احساس ہونے لگا، اس کے کلاس فیلوز ترقی کرتے کرتے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ چکے تھے اور وہ ابھی

تک منیجر کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ اس نے کئی بار اپنے مالک سے تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کیا لیکن وہ ہمیشہ ٹال دیتا۔ اگر پہلے جیسا وقت ہوتا تو وہ کب سے یہ ملازمت چھوڑ چکا ہوتا لیکن بیٹی کی پیدائش کے بعد اخراجات بڑھ گئے تھے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ گھر بیٹھ کر ثمینہ پر بوجھ بن جائے۔

ثمینہ بھی اس صورتِ حال کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے کئی بار ندیم کو مشورہ دیا کہ وہ کوئی دوسری ملازمت تلاش کرے لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ ندیم کی عمر زیادہ ہو گئی تھی اس لیے اسے سرکاری ملازمت تو ملتی نہیں اور پرائیویٹ کمپنیوں میں پیسے کم ملتے تھے۔ اس کے باوجود وہ ہر اتوار کے اخبار میں ضرورت ہے کے اشتہارات بڑی باقاعدگی سے دیکھتا اور جہاں اسے اپنے مطلب کی جاب نظر آتی وہاں درخواست بھیج دیتا۔ چند ایک جگہ اس نے انٹرویو بھی دیئے لیکن بات نہیں بنی۔

بہت سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے اپنا کوئی کام شروع کرنا چاہیے آخر وہ کب تک دوسروں کے لیے کام کرتا رہے گا اگر اتنی محنت وہ اپنے لیے کرے تو تھوڑے ہی عرصے میں کہاں سے کہاں پہنچ سکتا ہے۔ اس نے ثمینہ سے مشورہ کیا تو اس نے سختی سے اس خیال کی مخالفت کی اور بولی۔ ”آج کل دو چار لاکھ سے تو کوئی کاروبار شروع نہیں ہوتا۔ اس کے لیے لمبی رقم چاہیے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ کاروباری خیال دل سے نکال دو اور بہتر ملازمت کی تلاش جاری رکھو۔ اللہ نے چاہا تو ایک نہ ایک دن [illegible] مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔“

اسے ثمینہ [illegible] کی عقل پر بہت غصہ آیا۔ سب کچھ اس کے سامنے تھا۔ وہ دو سال [illegible] اچھی ملازمت تلاش کر رہا تھا لیکن ابھی تک اسے کامیابی نہیں ملی تھی۔ دراصل کاروبار مندا ہونے کی وجہ سے مارکیٹ [illegible] تھی، اس کی پہلی ترجیح ملٹی نیشنل کمپنیاں تھیں جہاں لوگ [illegible] چپکے بیٹھے ہوئے تھے۔ کبھی کبھار ایک دو سال میں [illegible] نے یا ریٹائر ہونے پر کوئی جگہ خالی ہوتی تو اسے پُر کرنے [illegible] لیے اس سے کہیں زیادہ قابل اور تجربہ کار لوگ پہنچ جاتے [illegible] اس کے علاوہ اس کا سابقہ ریکارڈ بھی کچھ متاثر کن نہیں تھا۔ ماضی میں اس نے کئی جگہ دو چار مہینے بعد ہی ملازمت چھوڑ دی تھی اور جب انٹرویو کے دوران اس سے اس کی وجہ پوچھی جاتی تو وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے پاتا۔

انہی سب باتوں کے پیشِ نظر ندیم نے اپنا کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس سلسلے میں اس نے سب سے پہلے ثمینہ سے ہی مشورہ کیا لیکن اس نے اس خیال کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ کاروبار شروع کرنے کے لیے خطیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے جو ظاہر ہے کہ اس کے پاس نہیں ہے اس لیے اسے کاروبار کے بارے میں سوچنے کی بجائے اپنی توجہ بہتر ملازمت کی تلاش پر مرکوز کر دینی چاہیے۔

یہ تو وہ بھی جانتا تھا کہ کاروبار شروع کرنے کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے لیکن اس نے یہ سوچ کر ثمینہ سے بات کی تھی کہ شاید وہ اسے سرمایہ کے حصول کا کوئی ذریعہ بتائے۔ ویسے تو ان کے بڑے بھائی بھی بینک میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ وہ ان سے بھی بینک سے قرضہ لینے کی بات کر سکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے لیے اسے اپنی کوئی چیز بینک کے پاس رہن رکھوانی ہو گی مثلاً زمین، مکان، انعامی بانڈز یا شیئرز وغیرہ۔ ان میں سے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ لے دے کر ثمینہ کے پاس تھوڑا سا زیور تھا جس کی قیمت زیادہ سے زیادہ دس لاکھ ہو گی۔ اس سے کیا بنتا۔

اگلے چند روز تک وہ اپنے دوستوں، جاننے والوں اور کچھ قریبی رشتہ داروں سے یہی جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کرنے کے لیے کم از کم کتنا سرمایہ درکار ہے۔ بہت سے لوگ تو یہ سمجھ ہی نہ سکے کہ چھوٹے کاروبار سے اس کی کیا مراد ہے اور سچ تو یہ ہے کہ خود اس کے اپنے ذہن میں اس کا کوئی واضح تصور نہیں تھا۔

”کیا تم کوئی دکان کھولنا چاہ رہے ہو؟“ اس کے دوست ارشد نے پوچھا۔

”یہی سمجھ لو۔“

”سب سے پہلا مسئلہ تو دکان خریدنے کا ہے۔ کسی کاروباری مرکز میں تو ایک کروڑ سے کم میں دکان نہیں ملے گی بلکہ آج کل تو مضافاتی علاقوں شاہ فیصل اور ماڈل کالونی وغیرہ میں بھی دکان کی قیمت پچاس ساٹھ لاکھ تک پہنچ گئی ہے پھر اس کے لیے فرنیچر، شوکیس اور ریک وغیرہ بنوانے ہوں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم اس میں کیا سامان ڈالو گے لیکن وہ بھی پندرہ بیس لاکھ سے کم میں نہیں آئے گا۔ میرے حساب سے ایک کروڑ کا خرچا ہے۔“

”کرایہ پر بھی تو دکان مل جاتی ہے؟“ ندیم نے دبی زبان سے کہا۔

”ہاں لیکن میں اس کا قائل نہیں۔ اس میں بڑے

جھنجٹ ہیں۔ اوّل تو کرایہ پر دکان بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ شروع کے چند ماہ دکان کی آمدنی کم ہوتی ہے۔ اس لیے کرایہ اپنے پاس سے دینا پڑتا ہے پھر ہر سال دس فی صد کرایہ بڑھ جاتا ہے اور دو تین سال بعد مالک کو دکان خالی کرنے کی فکر پڑ جاتی ہے اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر دکان کرنی ہے تو اپنی خریدو۔ ہوسکتا ہے کہ کسی علاقے میں سستی دکان مل جائے۔"

ارشد سے مشورہ کرنے کے بعد اسے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ ایک کروڑ روپوں سے ایک معقول قسم کا کاروبار شروع کیا جاسکتا ہے اور اگر کسی پس ماندہ علاقے میں دکان کھولی جائے تو کم پیسوں میں بھی دکان مل جائے گی۔ اس کا ارادہ میڈیکل اسٹور کھولنے کا تھا۔ کچی آبادیوں اور مضافاتی علاقوں میں لوگ زیادہ بیمار ہوتے ہیں۔ اس لیے وہاں میڈیکل اسٹور کا چلنا یقینی تھا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ دکان کھولنے کے لیے پیسا کہاں سے آئے گا۔ اس نے دماغ پر بہت زور دیا لیکن سرمایہ کی فراہمی کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ وہ کئی روز تک یہی سوچتا رہا اس نے کئی امکانات پر غور کیا لیکن ان میں سے کوئی بھی قابلِ عمل نہیں تھا۔ بالآخر بہت سوچ بچار کے بعد اس کے ذہن میں ایک ترکیب آہی گئی۔ اس کی سسرال آمد اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

راشدہ بیگم نے چائے اور لوازمات اس کے سامنے لا کر رکھے۔ امجد علی بھی لباس تبدیل کر کے آچکے تھے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "ہاں بھئی شروع ہو جاؤ، پہلے کچھ پیٹ بھر، چلا جائے پھر باتیں کریں گے۔"

ندیم نے تکلفاً ایک بسکٹ منہ میں رکھا اور چائے کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے گھر جانے کی جلدی تھی... کیونکہ وہ ثمینہ کو بتائے بغیر آگیا تھا۔

امجد علی نے اس کی بے چینی بھانپ لی اور کہنے لگے۔ "میرا خیال ہے کہ تم ثمینہ کو فون کر کے بتادو کہ یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔ ورنہ وہ خوامخواہ پریشان ہوتی رہے گی۔"

"نہیں انکل۔" وہ جلدی سے بولا۔ "اس کی ضرورت نہیں، میں نے جان بوجھ کر اسے یہاں آنے کے بارے میں نہیں بتایا۔ میں نے سوچا کہ پہلے آپ سے بات کرلوں۔"

امجد علی چونکتے ہوئے بولے۔ "ایسی کیا بات ہے جو تم اپنی بیوی سے بھی چھپا رہے ہو۔"

"یہ چھپنے والی بات نہیں ہے۔ میں نے سوچا، پہلے آپ سے بات کرلوں پھر اسے بھی بتادوں گا۔"

"اچھا کہو، کیا بات ہے؟"

"جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ میں اپنی موجودہ ملازمت سے مطمئن نہیں ہوں، اتنی کم تنخواہ ہے کہ کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، اگر ثمینہ ملازمت نہ کرے تو ہمارا گزارہ بہت مشکل ہے۔ میں اس پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا اور میری خواہش ہے کہ وہ بھی اپنی بہنوں کی طرح گھر میں بیٹھ کر بچی کی پرورش کرے اس لیے میں نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ ملازمت چھوڑ کر اپنا کام شروع کردوں۔"

"بہت اچھا خیال ہے۔" امجد علی بولے۔ "کاروبار میں بڑی برکت ہوتی ہے لیکن اس کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا؟"

"اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔" ندیم جھجکتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ میری کچھ مدد کرسکیں۔"

"میں!" امجد علی چونکتے ہوئے بولے۔ "میں بھلا تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔ میرے حالات سے تو تم اچھی طرح واقف ہو۔ دو چار ہزار کی بات ہوتی تو دے دیتا۔"

"میں جانتا ہوں کہ آپ کو اپنی گزر اوقات کے لیے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ملازمت کرنا پڑ رہی ہے اور آپ کے لیے اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا ممکن نہیں۔ دراصل میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے۔"

"وہ کیا؟" امجد علی پہلو بدلتے ہوئے بولے۔

"میری بات ٹھنڈے دل سے سنیں۔" ندیم کا لہجہ اچانک بدل گیا جیسے وہ اپنی بات منوانے پر اصرار کر رہا ہو۔ "اس میں آپ کا بھی فائدہ ہے اور میرا کام بھی بن جائے گا۔"

"میاں کھل کر بات کرو، کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ یہ مکان بیچ دیں، آج کل مارکیٹ چڑھی ہوئی ہے۔ اچھے دام مل جائیں گے۔"

امجد علی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ انہوں نے اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا اور مکان بیچ کر ہم کہاں جائیں گے۔"

"آپ میری پوری بات سن لیں۔" ندیم بولا۔ "آپ اس مکان کو فروخت کر کے ثمینہ کا حصہ مجھے دے

دیں اور باقی رقم بینک میں رکھوا دیں۔ وہاں سے آپ کو معقول منافع ملتا رہے گا، اس سے آپ ایک چھوٹا مکان کرائے پر لے لیں، پھر آپ کو یہ معمولی سی ملازمت بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ ویسے بھی یہ مکان آپ کی ضرورت کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔"

امجد علی کو یوں لگا جیسے کسی نے انہیں بیچ بازار میں گالی دے دی ہو۔ یہ مکان انہوں نے پائی پائی جوڑ کر بنایا تھا اور اس سے ان کی جذباتی وابستگی تھی۔ یہ صرف وہ ہی جانتے تھے کہ اس مکان کو بنانے میں انہیں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ والد سرکاری ملازم تھے۔ انہوں نے ساری زندگی سرکاری مکانوں میں گزار دی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں کرائے کے مکان میں شفٹ ہونا پڑا۔ امجد علی کی نئی نئی ملازمت تھی۔ چھوٹا بھائی بے روزگار تھا اس لیے ہر ماہ کرایہ دینا مشکل ہو رہا تھا۔ انہیں بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ ساری زندگی کرایہ کے مکان میں نہیں گزاری جاسکتی اور وہ اپنا مکان بنانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ انہوں نے پارٹ ٹائم ملازمت کر کے کمیٹی ڈالی اور ایک پلاٹ خرید لیا۔ انہی دنوں مالک مکان نے مکان خالی کرنے کا تقاضا شروع کردیا۔ وہ اسے ٹالتے رہے پھر اچانک ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ مالک مکان نے چہلم کے بعد پھر تقاضا شروع کردیا۔ مجبوراً انہیں دوسرے مکان میں شفٹ ہونا پڑا جس کا کرایہ پہلے کے مقابلے میں دگنا تھا۔

اس واقعے کے بعد امجد علی پر مکان بنانے کی دھن سوار ہوگئی۔ انہوں نے دوڑ دھوپ کر کے ہاؤس بلڈنگ سے قرضہ لیا اور مکان کی تعمیر شروع کردی لیکن یہ قرضہ ناکافی تھا۔ مجبوراً انہیں اپنی بیوی کا زیور بینک میں گروی رکھنا پڑا اور ان پیسوں سے مکان میں اتنا کام ہوگیا کہ وہ اس میں فوری طور پر شفٹ ہوسکیں۔ انہوں نے کمیٹی ڈال کر بینک کا قرضہ ادا کیا اور آہستہ آہستہ مکان کا بقیہ کام کرواتے رہے پھر انہوں نے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لے کر اوپر کی منزل تعمیر کروائی اور اس سے ہاؤس بلڈنگ کی قسط جانے لگی۔

یہ مکان ان کی بیس سالہ جدوجہد کا ثمر تھا۔ اس دوران ان کے بیوی بچوں نے بہت ساتھ دیا۔ کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کی اور تنگی ترشی میں گزارہ کرتے رہے پھر آہستہ آہستہ حالات بہتر ہونا شروع ہوئے۔ ان کی ترقی ہوئی، مکان کا قرضہ اتر گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لڑکیوں کی تعلیم مکمل ہوگئی اور ان کے رشتے آنا شروع ہوگئے۔

مکان بنانے کے چکر میں کچھ بچت کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ بڑی بیٹی کا رشتہ طے ہوا تو ان کی جیب خالی تھی۔ بھائی بہنوں نے مکان بیچنے کا مشورہ دیا لیکن انہوں نے اسے رد کر دیا۔ لڑکے والوں سے ایک سال کی مہلت لی۔ دو کمیٹیاں ڈالیں دفتر سے ایک بار پھر قرض لیا اور بیٹی کی شادی کردی۔

دوسری بیٹی کی شادی پر بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کے پاس ہال بک کروانے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ ایک بار پھر انہیں مکان بیچنے کا مشورہ دیا گیا۔ اس مرتبہ وہ بھی ڈانوا ڈول ہوگئے کیونکہ مہنگائی بہت بڑھ گئی تھی اور دفتر سے ملنے والا قرضہ شادی کے اخراجات کے لیے ناکافی ہوتا۔ لہٰذا انہوں نے گھبرا کر ایک اسٹیٹ ایجنٹ سے بات کی اور گاہک آنا شروع ہوگئے لیکن ان کی بیوی نے سب کو منع کردیا اور اپنے بھائی سے ایک لاکھ روپے لا کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس طرح ان کا مکان بچ گیا اور بیٹی کی شادی بھی ہو گئی۔

اگلے دو سال انہوں نے بہت تنگی میں گزارے۔ ان کی آدھی تنخواہ قرضوں میں چلی جاتی بہرحال جیسے تیسے وہ وقت بھی گزر گیا۔ البتہ تیسری بیٹی کی شادی پر انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اس وقت تک وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ ریٹائرمنٹ پر جو پیسا ملا، اس سے انہوں نے شادی کردی اور جو پیسے بچ گئے وہ بینک میں رکھ کر کھاتے رہے اور ایک وقت ایسا آیا کہ انہیں گزر اوقات کے لیے ملازمت کرنا پڑی۔ تنخواہ اگرچہ پہلے کے مقابلے میں کم تھی پھر بھی کچھ نہ ہونے سے بہتر تھا۔ اب مکان کے کرایہ اور اس تنخواہ سے ان کا گھر چل رہا تھا۔

جن مشکل حالات میں انہوں نے یہ مکان بنایا اور انتہائی اشد ضرورت میں بھی اسے بیچنے سے گریز کیا۔ اب ندیم ان کو محض اپنی غرض کی خاطر اسے فروخت کرنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ اگر وہ داماد نہ ہوتا تو اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیتے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اسے کوئی سخت جواب بھی نہیں دے سکتے تھے پھر بھی انہوں نے اسے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"تمہارا مشورہ کسی طرح بھی قابل عمل نہیں ہے۔ یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ میں اپنا مکان بیچ کر کرایہ کے گھر میں چلا جاؤں جب کہ اوپر کی منزل سے مجھے معقول کرایہ مل رہا ہے جس سے مجھے کافی سپورٹ ہے۔ تم چاہتے ہو کہ اس

سے محروم ہو جاؤں اور اپنے اوپر کرایہ کا بوجھ ڈال لوں، تم جانتے ہو کہ آج کل کرایہ کے مکان میں رہنا کتنا مشکل ہے۔ پہلے ایک لمبی رقم ایڈوانس کے طور پر دو پھر ہر سال مالک مکان دس فی صد کرایہ بڑھا دیتے ہیں یا زیادہ کرایہ کے لالچ میں کسی بہانے مکان خالی کروالیتے ہیں۔ کرایہ دار کی زندگی بالکل خانہ بدوشوں جیسی ہوتی ہے اور تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ تمہارا حصہ دینے کے بعد باقی رقم بینک میں جمع کروادوں اور اس کے سود سے اپنا گزارہ کروں۔ میں نے ساری زندگی سودی اکاؤنٹ نہیں کھلوایا۔ اب آخری عمر میں یہ گناہ کیوں کروانا چاہتے ہو۔"

"آپ یہ رقم بلاسودی بینک میں جمع کرواسکتے ہیں۔ وہاں سے ملنے والا منافع جائز ہے۔" ندیم نے کہا۔

"میں نہیں مانتا۔" امجد علی بولے۔ "آدھ فی صد منافع کی شرح اوپر نیچے کردینے سے وہ جائز نہیں ہوجاتا، یہ بھی سود ہی کی ایک شکل ہے۔ ایک بات اور اگر دوسری بیٹیوں نے بھی اپنے اپنے حصے کا مطالبہ کردیا تو میرے پاس کچھ نہیں بچے گا پھر کہاں کا منافع اور کیسا کرایہ؟"

"اگر انہیں آپ سے ذرا سی بھی ہمدردی ہوگی تو وہ کبھی ایسا مطالبہ نہیں کریں گی۔"

"بہرحال اتنا بڑا فیصلہ میں تنہا نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے مجھے اپنی بیٹیوں اور دوسرے دامادوں سے مشورہ کرنا ہوگا۔"

"بے شک آپ ان سے مشورہ کرلیں لیکن آپ کو یہ مکان بہرحال فروخت کرنا ہوگا۔ ایسی جایداد کس کام کی جس سے اولاد کو فائدہ نہ ہو۔"

"چاہے ماں باپ سڑک پر آجائیں۔" امجد علی نے کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔" ندیم بولا۔ "آپ بلاوجہ ڈر رہے ہیں بلکہ آپ پہلے سے بہتر زندگی گزاریں گے۔"

"کیا ثمینہ کو تمہارے اس منصوبہ کا علم ہے؟"

"نہیں، ابھی میں نے اسے کچھ نہیں بتایا لیکن ظاہر ہے کہ وہ میرے خلاف کیسے جاسکتی ہے۔ اسے وہی کرنا ہوگا جو میں چاہوں گا۔" ندیم نے دھمکی آمیز لہجہ میں کہا۔

اس کے جانے کے بعد امجد علی اور راشد بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ ندیم کی ضدی طبیعت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ ایک بار جو بات اس کے دماغ میں آجائے وہ اسے کرکے ہی چھوڑتا ہے لیکن وہ اس کی طفلانہ خواہش کے آگے سر بھی نہیں جھکا سکتے تھے۔ بالفرض محال اگر اس کا مطالبہ پورا کردیا جائے تب بھی کاروبار کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ اسے دکان چلانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ میڈیکل اسٹور کھولنا چاہ رہا تھا۔ جہاں اسے صبح دس بجے سے رات بارہ بجے تک بیٹھنا پڑتا۔ وہ اتنی لمبی ڈیوٹی نہیں کرسکتا تھا اور اگر دکان سیلزمینوں پر چھوڑ دی جاتی تو سا... منافع وہی ہڑپ کرجاتے پھر کاروبار چلانے کے لیے ... اور برداشت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس میں بالکل نہیں ... کی وجہ سے آئے دن گاہکوں اور مال لانے والے سیلزمینوں سے جھگڑے ہوتے اور دکان کی ساکھ خراب ہوجاتی۔

سب سے زیادہ فکر انہیں ثمینہ کی طرف سے تھی۔ اگر ندیم کا مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو وہ ... اس کا جینا حرام کردے گا۔ ویسے ہی وہ بڑی مشکل ... تھی۔ شادی کے بعد ندیم نے کبھی اس کے ہاتھ پر ... پیسا نہیں رکھا۔ نہ ہی کبھی کوئی چیز لاکردی۔ بس پیار کے دو ... بول سے ہی اسے بہلاتا رہا۔ ثمینہ اس کی مالی حیثیت سے واقف تھی اس لیے اس نے کبھی کوئی تقاضا یا فرمائش نہیں کی بلکہ اپنی تنخواہ سے ہی گزارا کرتی رہی۔ بچی کا سارا خرچ بھی اسی کے ذمے تھا۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ ندیم کا حوصلہ بڑھاتی اور اسے اُمید دلاتی کہ وہ بہت جلد اچھی ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

☆......☆

ندیم گھر پہنچا تو اس کا موڈ بہت بگڑا ہوا تھا۔ وہ کپڑے تبدیل کیے بغیر بستر پر لیٹ گیا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ثمینہ نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ کپڑے بدلے بغیر ہی لیٹ گئے۔ کھانا نہیں کھاؤ گے؟"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ کہیں کھالیا تھا اور آج تمہیں آنے میں دیر کیوں ہوگئی؟"

"یہ کیا تم تھانیداروں کی طرح سوال جواب کررہی ہو۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کسی لڑکی سے ملنے نہیں گیا تھا۔"

"اگر یہ بات ہے تو بتا کیوں نہیں دیتے کہ کہاں گئے تھے؟"

"افوہ! تم تو ایک بات کے پیچھے ہی پڑجاتی ہو۔ بھئی

میں سسرال شریف چلا گیا تھا ساس سسر کو سلام کرنے۔"

"آج ان کی محبت کیوں ٹوٹ پڑی؟ اس سے پہلے تو کبھی اکیلے نہیں گئے، ہمیشہ میرے ساتھ ہی جاتے ہو۔"

"ان سے ایک کام تھا۔" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اپنا کام شروع کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اسی سلسلے میں گیا تھا۔"

"مشورہ کرنے؟" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "یقیناً انہوں نے اس حماقت سے باز رہنے کے لیے کہا ہوگا؟"

"میں مشورہ کرنے نہیں بلکہ پیسے مانگنے گیا تھا۔" وہ جھنجلاتے ہوئے بولا۔

"پیسے مانگنے؟" وہ چونکتے ہوئے بولی۔ "ان کے پاس کون سا خزانہ رکھا ہوا ہے، پوری بات بتاؤ۔ قصہ کیا ہے؟"

ندیم نے سسر سے ہونے والی گفتگو من وعن دہرادی جسے سن کر ثمینہ نے اپنا سر پیٹ لیا اور بولی۔ "یہ تم نے کیا حماقت کردی۔ تم اپنی ایک فضول سی خواہش کی خاطر ان سے چھت چھیننا چاہ رہے ہو۔"

ندیم کو اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "تم کیسی بیوی ہو، شوہر کا ساتھ دینے کی بجائے مخالفت کررہی ہو حالانکہ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔"

"میرا کیا فائدہ ہے؟"

"دیکھو نا اگر کاروبار چل پڑا تو تمہیں نوکری کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں کماؤں گا اور تم عیش کرنا۔"

"میں کبھی نوکری نہیں چھوڑوں گی۔ تمہارا کیا بھروسا۔ کسی وقت بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر بیٹھ سکتے ہو پھر میں کیا کروں ... اب آئندہ ان سے کوئی بات نہ کرنا۔ بلاوجہ انہیں پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اٹھو کپڑے بدلو، میں کھانا لگاتی ہوں۔"

رات کو وہ انڈے ڈبل روٹی لینے باہر گیا تو ثمینہ نے گھر فون کرکے باپ سے بات کی اور کہا کہ ندیم کی بات کو بالکل اہمیت نہ دیں اور نہ ہی گھر بیچنے کے بارے میں سوچیں۔

"لیکن بیٹی!" امجد علی نے کہا۔ "مجھے اس کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے۔ اس کا لہجہ کافی دھمکی آمیز تھا۔"

"کیا اس نے کوئی دھمکی دی ہے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"صاف صاف تو نہیں کہا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اگر اس کا مطالبہ نہ مانا گیا تو وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔"

"وہ کچھ نہیں کرسکتا۔" ثمینہ تڑخ کر بولی۔ "زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ وہ مجھے چھوڑ دے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں لیکن میں آپ کا گھر نہیں بکنے دوں گی۔"

"ایسی باتیں منہ سے مت نکالو بیٹی، برا وقت کہہ کر نہیں آتا اگر اس نے زیادہ دباؤ ڈالا تو مجھے مجبوراً مکان بیچنا پڑے گا۔"

"بالکل نہیں، مکان کے بکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ثمینہ نے کہا۔ "اور آپ میری بالکل فکر نہ کریں۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میرے بغیر اس کا گزارہ نہیں۔"

امجد علی وقتی طور پر مطمئن ہوگئے لیکن ان کے دل میں ایک کانٹا چبھ گیا تھا۔ انہوں نے دنیا دیکھی ہوئی تھی۔ وہ ندیم جیسے لوگوں کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھے ایسے لوگ اپنی غرض کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں اور ان کا اندیشہ درست ثابت ہوا جب ایک ہفتے بعد ندیم دوبارہ آن دھمکا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ نے سب لوگوں سے مشورہ کرلیا ہوگا؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔" امجد علی نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"اس میں نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے جب مجھے مکان ہی نہیں بیچنا تو مشورہ کس بات کا کروں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ کچھ پریشان ہوگیا۔ "اس دن تو آپ تیار ہوگئے تھے۔"

"بالکل نہیں تم سے سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ بچوں سے مشورہ کرلوں لیکن تمہارے جانے کے بعد میں نے اس بارے میں بہت سوچا۔ ہر پہلو سے غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مکان بیچنا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ میرا تمہیں بھی یہی مشورہ ہے کہ کاروبار کا خیال دل سے نکال دو اور اپنی ملازمت پر توجہ دو، اللہ بہتر کرے گا۔"

"آپ نے تو مجھے سیڑھی پر سے دھکا دے دیا۔ میرے سارے خواب چکنا چور ہوگئے۔ مجھے آپ سے یہ اُمید نہیں تھی۔"

"معاف کرنا، میں نے تم سے کوئی وعدہ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی اُمید دلائی تھی۔ تم خود ہی خیالی پلاؤ پکاتے رہے تو اس میں میرا کیا قصور؟"

ندیم غصے میں پیر پٹختا ہوا چلا گیا اور گھر جاکر بیوی پر غصہ اتارا۔ اسے پہلے ہی فون پر اطلاع مل چکی تھی کہ ندیم اس کے میکے گیا تھا اور وہاں جو بات ہوئی وہ بھی امجد علی نے مختصراً بتادی تھی اسی لیے وہ ذہنی طور پر ندیم کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی۔

ندیم نے گھر پہنچتے ہی ثمینہ پر چڑھائی کردی اور بولا۔ "تمہارے والدین نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اس دن وہ نیم رضامند تھے لیکن آج انہوں نے مکان بیچنے سے صاف انکار کردیا۔ لگتا ہے کہ کسی نے ان کے کان بھر دیئے ہیں، کہیں تم نے تو ان سے کچھ نہیں کہا؟"

"اس سوال کا جواب میں بعد میں دوں گی۔" ثمینہ نے دبنگ لہجے میں کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ تم وہاں کیوں گئے تھے جب کہ میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ مکان کے بارے میں ان سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"صرف یہ پوچھنے کہ انہوں نے دوسری بیٹیوں اور دامادوں سے بات کی یا نہیں لیکن آج تو وہاں منظر ہی بدلا ہوا تھا۔"

"بس تو تم بھی خاموشی اختیار کرلو۔ ہم انہیں مجبور تو نہیں کرسکتے۔ ان کی چیز ہے چاہے وہ اس میں رہیں یا بیچ دیں۔"

"لیکن مجھے کاروبار شروع کرنے کے لیے پیسا چاہیے۔ وہ کہاں سے آئے گا؟"

"اگر تم پر کاروبار کرنے کی دھن سوار ہوگئی ہے تو اپنے بھائی سے کہو وہ بینک سے قرضہ دلوادیں۔"

"پاگل ہوگئی ہو تم۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "بینک سے قرض لینے کے لیے کچھ گروی رکھنا پڑتا ہے اور میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں۔"

"شاید تم بھول رہے ہو۔ تمہارے مرحوم باپ نے ورثے میں کافی پراپرٹی چھوڑی ہے۔ دو مکان تین چار پلاٹ، دکانیں وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے کوئی ایک چیز گروی رکھی جاسکتی ہے۔"

"بے وقوفوں جیسی باتیں مت کرو۔" وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ "وہ پراپرٹی ہم سب بہن بھائیوں کی مشترکہ ملکیت ہے اور ابھی امی زندہ ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے میں کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔"

"بہت خوب اپنی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتے اور دوسرے کی چیز پر نظر جما رکھی ہے یہ میں پہلی بار سن رہی ہوں۔"

"اس لیے کہ تمہارے پاس عقل کی کمی ہے۔" ندیم نے چڑتے ہوئے کہا۔ "مکانوں اور دکانوں کا کرایہ آتا ہے۔ انہیں کیسے گروی رکھ دیں اور نہ ہی امی اس کی اجازت دیں گی۔"

"خیر یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ میں تو [illegible] چاہتی ہوں کہ اس مقصد کو ختم کرو اور مستقبل کے بارے میں [illegible]"

"مستقبل [illegible] میں ہی تو سوچ رہا ہوں۔" ندیم نے جل کر کہا۔ "لیکن تمہارے گھر والے میرے راستے کی رکاوٹ بن گئے ہیں۔ انہیں [illegible] مشکلات کا ذرا بھی احساس نہیں۔ ثمینہ انکل کو سمجھاؤ۔ میرا مستقبل اسی پلاننگ سے وابستہ ہے۔ انہیں چاہیے کہ میری مدد کریں۔"

"سوری۔" ثمینہ نے ترخ کر کہا۔ "اس عمر میں والدین کو اولاد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابا کا کوئی لڑکا نہیں۔ لڑکیوں میں صرف میں ہی برسر روزگار ہوں لیکن میں ان کی کوئی مدد نہیں کرسکتی کیونکہ میرے پاس کچھ بچتا ہی نہیں۔ ہم اگر کچھ دے نہیں سکتے تو کم از کم ان کا واحد اثاثہ تو نہ چھینیں۔"

"وہ وقت زیادہ دور نہیں۔" ندیم نے چاپلوسی کے انداز میں کہا۔ "بس ایک دفعہ میرا کاروبار جم جائے پھر ہم ہر مہینے انہیں کچھ نہ کچھ دیتے رہیں گے۔"

"مجھے جاگتے میں خواب دیکھنے کی عادت نہیں۔" ثمینہ تیز لہجے میں بولی۔ "میں انہیں مجبور نہیں کرسکتی اور صرف میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میری دو بہنیں بھی اس مکان میں حصہ دار ہیں۔"

"تم اگر انہیں مجبوری بتاؤ گی تو وہ مان جائیں گی۔"

"لیکن مجھے تو کوئی مجبوری نہیں۔"

"یعنی میرے مسئلے کو تم اپنا نہیں سمجھتیں۔"

"بالکل نہیں، کیونکہ یہ تمہارا خودساختہ مسئلہ ہے۔"

"خیر تم کچھ بھی کہو ثمینہ بیگم، کاروبار تو میں ضرور کروں گا اور وہ بھی تمہارے ابا کے پیسوں سے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر بولا۔ "ایک بات اچھی طرح کان کھول کر سن لو ثمینہ اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے تو مجھے دوسرے طریقے بھی آتے ہیں۔"

ثمینہ تن کر بولی۔ "ذرا میں بھی تو سنوں وہ کون سے طریقے ہیں؟"

"گھبراؤ نہیں۔ بہت جلد پتا چل جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ثمینہ نے اس کی گیدڑ بھبکی پر کوئی توجہ نہیں دی اور اسے ایک بڑک سمجھ کر نظر انداز کردیا۔ یہ شاید اس کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خوداعتمادی تھی یا میاں بیوی کے رشتے کی مضبوطی پر بھروسا کہ اس نے ندیم کے بدلے ہوئے رویّے کو بالکل محسوس نہیں کیا لیکن اگلے دن سے ہی اسے حالات میں نمایاں تبدیلی نظر آئی۔ شادی کے بعد سے اب تک ان کے درمیان کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا لیکن اس واقعے کے دوسرے روز ہی ایک زوردار جھڑپ ہوگئی۔

ثمینہ صبح کے وقت بہت مصروف ہوتی تھی۔ پہلے خود تیار ہوتی پھر بچی کو تیار کرتی۔ اس کے لیے لنچ بناتی، ندیم کو ناشتا دیتی اور خود بھی بھاگتے دوڑتے چائے کے ساتھ ایک سلائس لے لیتی۔ ندیم اپنے سارے کام خود ہی کرتا لیکن نہ جانے اس روز کیا ہوا کہ اس نے لباس تبدیل کیا اور ثمینہ کو آوازیں دینے لگا۔ وہ اس وقت کچن میں ناشتا بنا رہی تھی اور اس کی نظریں گھڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی گاڑی آنے میں صرف آدھ گھنٹا رہ گیا تھا اور اسے ابھی اپنی اور بچی کی تیاری بھی کرنی تھی۔ وہ دوڑی دوڑی کمرے میں آئی اور بولی۔ "کیا بات ہے، صبح صبح کیوں [illegible] رہے ہو؟"

"میری [illegible] کہاں ہے؟" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

"مجھے کیا معلوم [illegible] جہاں رکھی تھی وہیں ہوگی۔"

"وہاں نہیں ہے۔"

"تو پھر ڈھونڈ لو، مل جائے گی۔ میرا وقت کیوں خراب کررہے ہو؟"

"آخر تمہارا بھی کوئی فرض ہے یا نہیں۔" وہ [illegible] کر بولا۔

"میرے جو فرائض ہیں وہ میں بخوبی ادا کررہی ہوں اور ان میں تمہاری گھڑی ڈھونڈنا شامل نہیں ہے۔"

"بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

"میں ہمیشہ سے ہی ایسی ہوں۔ تمہیں آج معلوم ہوا۔" یہ کہہ کر وہ کچن میں چلی گئی۔

دوسری جھڑپ شام کو ہوئی۔ وہ دونوں تقریباً ایک ساتھ ہی گھر واپس آتے تھے ندیم کو فوراً ہی چائے کی طلب ہوتی تھی۔ جب تک وہ لباس تبدیل کرتا ثمینہ اس کے لیے چائے بنا لیتی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ ثمینہ نے اپنے اور اس کے لیے دو کپ چائے بنائی اور ڈرائنگ ٹیبل پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ وہ لباس تبدیل کرکے آیا اور اخبار پڑھنے بیٹھ گیا۔ ثمینہ نے اپنی چائے ختم کی اور کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو ندیم کی چائے اسی طرح رکھی ہوئی تھی۔ ثمینہ نے کہا۔ "چائے ٹھنڈی ہورہی ہے۔"

ندیم نے اخبار پر سے نظریں ہٹائے بغیر پیالی ہونٹوں سے لگائی اور منہ بناتے ہوئے بولا۔ "یہ چائے ہے یا شربت؟"

ثمینہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "پندرہ منٹ سے رکھی ہوئی ہے۔ ٹھنڈی ہوگئی تو اس میں میرا کیا قصور؟"

"بہت بولنے لگی ہو۔" ندیم تیز آواز میں بولا۔

"بولنا یا نہ بولنا میرے اختیار میں ہے۔ تم مجھے بولنے سے نہیں روک سکتے۔" ثمینہ نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا اچھا بحث مت کرو، جاؤ دوسری چائے بنا کر لاؤ۔"

ثمینہ غصے میں بڑبڑاتی چلی گئی اور دوبارہ چائے بنا کر لائی۔ اس نے پیالی ندیم کے سامنے رکھی اور بولی۔ "میں دیکھ رہی ہوں کہ کل سے تمہارا رویّہ بدلا ہوا ہے اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اس طرح دباؤ ڈال کر تم اپنی بات منوالو گے تو یہ تمہاری بھول ہے جو تم چاہ رہے ہو وہ کبھی نہیں ہوسکتا۔"

"میں نے بھی پیچھے ہٹنا نہیں سیکھا۔" ندیم کی آواز اور تیز ہوگئی۔ "میرے دماغ میں جو بات آجائے وہ پوری کرکے چھوڑتا ہوں۔ میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔ ثمینہ ضد چھوڑ دو۔ اپنے ابا کو سمجھاؤ کہ وہ مکان بیچ کر ہمارا حصہ دے دیں۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں کسی صورت میں بھی ان سے یہ بات نہیں کہہ سکتی اور اگر انہوں نے تمہارے کہنے میں آکر ایسا کوئی فیصلہ کیا تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت میں کروں گی۔"

"تم جانتی ہو کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟" وہ ایک بار پھر دھمکی پر اتر آیا۔

"دھمکی مت دو۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ مردوں کے پاس ایک ہی حربہ ہوتا ہے عورتوں کو دبانے کا لیکن میں اس دباؤ میں نہیں آؤں گی۔ تمہارا جو دل چاہے کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ تو میرا فیصلہ بھی سن لو۔ تم کل ہی اپنے ابا کے گھر چلی جاؤ اور اب تم اسی وقت واپس آؤ گی جب میرا مطالبہ پورا ہو جائے گا۔"

"سوچ لو اگر ایک بار چلی گئی تو کبھی واپس نہیں آؤں گی۔"

"مت آنا۔ میں تمہارے بغیر بھی رہ سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی تمہارے بغیر رہ لوں گی لیکن جو تم چاہ رہے ہو۔ وہ کبھی نہیں ہوگا۔"

دوسرے دن صبح ثمینہ نے دفتر سے چھٹی کی۔ اپنا سوٹ کیس تیار کیا اور اپنا سارا زیور ساس کے حوالے کرتے ہوئے بولی۔ "اسے میری امانت سمجھ کر رکھ لیجیے۔ آپ کے بیٹے نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ میں صرف پہننے کے کپڑے ساتھ لے جا رہی ہوں۔"

اس کی ساس یہ سن کر ہکا بکا رہ گئیں اور بولی۔ "میاں بیوی میں چھوٹی موٹی لڑائیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔ اتنی ذرا سی بات پر گھر چھوڑ کر نہیں جایا کرتے۔ آنے دو اسے۔ میں اس کا دماغ ٹھیک کرتی ہوں۔"

"میں گھر چھوڑ کر نہیں جا رہی بلکہ انہوں نے مجھے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد یہاں رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وجہ آپ ان سے ہی پوچھ لیجیے۔ میرے پاس تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے۔"

پھر وہ بھابی سے مخاطب ہوئی۔ "آپ میرے ساتھ کمرے میں چل کر سوٹ کیس چیک کر لیں ورنہ کل کو مجھ پر چوری کا الزام بھی لگ سکتا ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو ثمینہ۔" بھابی رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔ "تمہیں چور سمجھنے والا خود چور ہوگا۔ اس گھر کی ہر چیز پر تمہارا حق ہے جو چاہو لے جاؤ۔"

ساس بولیں۔ "میں تو کہہ رہی تھی کہ تم شام تک رک جاتیں۔ ایک دفعہ میں تمہاری موجودگی میں اس سے بات تو کرلوں پھر تمہارا جو جی چاہے وہ کرنا۔"

"کوئی فائدہ نہیں امی۔ میں تو رات ہی چلی جاتی لیکن دیر بہت ہو گئی تھی۔ بہرحال انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اب میرا فیصلہ بھی سن لیجیے جب تک وہ خود مجھے لینے نہیں آئیں گے میں واپس نہیں آؤں گی اور اگر انہوں نے مزید کوئی حماقت کی تو پھر ہماری ملاقات عدالت میں ہوگی۔"

اس کے بعد اس نے ٹیکسی منگوائی اور بیٹی کو لے کر میکے چلی گئی۔ اس وقت گھر پر صرف اس کی ماں تھیں۔ اس نے انہیں پوری تفصیل نہیں بتائی بس اتنا کہا کہ ندیم سے جھگڑا ہو گیا ہے اس لیے وہ کچھ دن یہاں رہے گی۔ راشدہ بیگم بچی نہیں تھیں۔ وہ فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گئیں اور بولیں۔ "میں جھگڑے کی وجہ جان گئی ہوں۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ [illegible] ڈالنے کے لیے کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی حرکت ضرور کرے گا۔ تم فکر نہ کرو، ہم اس کی بلیک میلنگ کے آگے سر نہیں جھکائیں گے۔"

"مجھے تو ابا کی فکر ہے۔" ثمینہ بولی۔ "وہ بلڈ پریشر کے مریض ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس بات کو دل پر لے لیں۔"

"کچھ نہیں ہوگا اگر تم نے ثابت قدمی دکھائی تو وہ بھی اپنی جگہ پر ڈٹ جائیں گے۔"

شام کو امجد علی گھر آئے تو ثمینہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے لیکن ان کے لیے ثمینہ کی آمد غیر متوقع نہیں تھی [illegible] انہوں نے اسے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا بس اتنا ہی کہا۔ "ایسے آدمی کا علاج ہی یہ ہے کہ اسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا جائے جب اسے اپنی بے وقعتی کا احساس ہوگا تو خود ہی دوڑا چلا آئے گا۔"

"ابا جی! میں جانتی ہوں کہ اس کی گاڑی میرے بغیر نہیں چل سکتی۔ میں اس کی محتاج نہیں بلکہ وہ میرا محتاج ہے۔"

ثمینہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو اپنا گھر بگڑنے کے خوف سے شوہر کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیتی ہیں اور اس کی ہر جائز و ناجائز بات ماننے پر تیار ہو جاتی ہیں وہ عورتوں کی آزادی اور خود مختاری کی حامی تھی اور مردوں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنا جانتی تھی۔ معاشی خود مختاری نے اسے بے حد مضبوط بنا دیا تھا۔ اس کی تنخواہ ندیم سے تین گنا زیادہ تھی اور جن دنوں وہ بے روزگار ہوتا تو اس کی ساری ضرورتیں وہی پوری کرتی تھی۔ اس لحاظ سے اسے ایک طرح سے ندیم پر برتری حاصل تھی اور وہ اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ندیم کو راہ راست پر لانا چاہ رہی تھی۔

دوسری طرف ندیم شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے ثمینہ کو اس کے والدین کے گھر بھیج کر اس نے زبردست چال چلی ہے۔ ثمینہ بے شک کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو لیکن اس کے والدین پرانے زمانہ کے لوگ تھے۔ بیٹی کا اس طرح گھر آ کر بیٹھ جانا، ان کے لیے باعث تشویش ہو سکتا تھا اور اگر اس کا قیام زیادہ طویل ہو جاتا تو انہیں یہ خدشہ ہو سکتا تھا کہ کہیں بات بہت زیادہ نہ بگڑ جائے اس لیے وہ گھبراہٹ میں ندیم کا مطالبہ ماننے پر مجبور ہو جائے لیکن یہ محض ندیم کی سوچ تھی جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ امجد علی دباؤ میں تو نہیں آئے البتہ انہوں نے ندیم کے بڑے بھائی کو فون کر کے ساری بات بتادی۔ وہ یہ سن کر حیران رہ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ندیم ایسی گھٹیا حرکت کر سکتا ہے۔ انہوں نے امجد علی سے معافی مانگی اور کہا کہ وہ خود ندیم کو ساتھ لے کر ثمینہ سے ملنے آئیں گے اور اگر وہ ساتھ چلنے پر راضی ہوئی تو اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے لیکن جب انہوں نے ندیم سے اس سلسلے میں بات کی تو اس نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی کچھ دن رک جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ ثمینہ کے رویے میں کچھ لچک آ جائے۔

ادھر ثمینہ یہ سمجھ رہی تھی کہ ندیم کی ناراضی وقتی ہے اور چند روز بعد ہی اسے لینے آ جائے گا کیونکہ ثمینہ کے بغیر اس کا گزارہ نہیں تھا اور وہ کئی معاملات میں ثمینہ کا محتاج تھا۔ خاص طور پر [illegible] تاریخ کو اسے ثمینہ کی بہت ضرورت محسوس ہوتی جب وہ اس کے اے ٹی ایم کارڈ سے اپنے لیے کچھ پیسے نکالتا کیونکہ اس کی اپنی تنخواہ اس کے اخراجات کے لیے ناکافی تھی۔

اگلا مہینا شروع ہونے میں چند روز باقی تھے کہ ندیم کے بڑے بہنوئی اشرف نے ایک دھماکا کر دیا۔ اس کی نظر بڑے عرصے سے اپنے سسر کی چھوڑی ہوئی جایداد پر تھی۔ انہوں نے ترکہ میں دو مکان، تین پلاٹ اور [illegible] دکانیں چھوڑی تھیں۔ اصولاً تو ان کی وفات کے بعد ہی یہ جایداد ان کے وارثوں میں تقسیم ہو جانی چاہیے تھی جن میں ایک بیوہ، چار بیٹے اور تین بیٹیاں شامل تھے لیکن مشترکہ خاندانی نظام تھا۔ سب بھائی ماں کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں لہٰذا کسی نے اس جانب توجہ نہیں دی۔ جایداد سے جو کرایہ آتا وہ ان کی ماں کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتا جس سے وہ گھر کا خرچ چلا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ بیٹے بھی حسب توفیق اس میں اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔

سسر کی وفات کے ایک سال بعد ہی اشرف نے اپنی بیوی نائلہ سے دبے لفظوں میں کہنا شروع کر دیا کہ وہ بھائیوں سے جایداد میں اپنے حصے کا مطالبہ کرے لیکن وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتی۔ اشرف نے بھی زیادہ زور نہیں دیا کہ وقت آنے پر جایداد کا بٹوارہ ہو جائے گا لیکن کئی سال گزر جانے کے بعد بھی وہ وقت نہیں آیا۔ وہ کرایہ کے مکان میں رہتا تھا۔ بچے بڑے ہو رہے تھے اور اس کے دل میں ذاتی مکان کی خواہش جڑ پکڑتی جا رہی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے شادی کے بعد سے ہی ہر مہینے کچھ نہ کچھ بچانا شروع کر دیا تھا لیکن جیسے جیسے بچے بڑے ہوتے گئے، اخراجات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اور دس سال گزر جانے کے باوجود بھی وہ اس قابل نہ ہو سکا کہ اپنے لیے ذاتی مکان کا بندوبست کر سکے۔

اشرف نے محسوس کیا کہ اگر یہی حالات رہے تو اس کا خواب کبھی پورا نہ ہو سکے گا چنانچہ اس نے اپنی بیوی کو ساری صورتِ حال سمجھائی اور اسے مجبور کیا کہ وہ بھائیوں سے اپنے حصے کا مطالبہ کرے۔ نائلہ بھی دل سے چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد اپنے ذاتی مکان میں شفٹ ہو جائے چنانچہ وہ اس کی باتوں میں آگئی...... ایک اتوار کو جب وہ ماں سے ملنے آئی تو اس نے بڑے بھائی کے سامنے یہ مطالبہ رکھ دیا۔

"بھائی صاحب! ہمیں کرایہ کے مکان میں بہت مشکل ہو رہی ہے۔ ہر مہینا ایک بڑی رقم کرایہ کی مد میں چلی جاتی ہے پھر بچوں کی تعلیم اور دیگر اخراجات بھی ہیں۔ بہت مشکل سے گزارہ ہو رہا ہے اس لیے ہم سوچ رہے ہیں کہ اپنے لیے ذاتی مکان کا بندوبست کر لیں۔"

"بہت اچھا خیال ہے۔" بڑے بھائی نے کہا۔ "یہ کام تو تمہیں بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اشرف نے پائی پائی جوڑ کر کچھ رقم پس انداز کی ہے لیکن وہ مکان خریدنے کے لیے ناکافی ہے اس لیے میں سوچ رہی تھی کہ اگر......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں ہاں بولو۔ رک کیوں گئیں۔" ندیم بولا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ اگر ابا کی چھوڑی ہوئی جایداد میں سے میرا حصہ مجھے مل جائے تو ہمیں مکان خریدنے میں آسانی رہے گی۔"

"تم چاہتی ہو کہ بٹوارہ ہو جائے۔" بڑے بھائی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"یہی سمجھ لیں۔ ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی ہے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" بڑے بھائی نے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ جائیداد کے کرایہ سے ہمارے گھر کا خرچ پورا ہوتا ہے۔ میری ایک تنخواہ ان اخراجات کے لیے ناکافی ہے۔"

"پلاٹ بھی تو ہیں، وہ بیچ دیں۔ اسی میں سے میرا حصہ نکل آئے گا۔"

"تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ان میں سے ایک پلاٹ کو گروی رکھ کر تمہاری شادی پر قرض لیا گیا تھا۔ ہم ابھی تک اس کی قسطیں ادا کر رہے ہیں۔ بقیہ دو پلاٹوں کی ابھی لیز نہیں ہوئی ہے اس لیے ان کی اچھی قیمت نہیں ملے گی۔" پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "ویسے بھی ہمارے یہاں لڑکیوں کو جائیداد میں حصہ دینے کا رواج نہیں ہے۔ یوں سمجھ لو کہ تمہاری شادی پر جو خرچ ہوا، وہی تمہارا حصہ ہے۔"

نائلہ مایوس ہو کر واپس چلی گئی اور شوہر کو ساری بات بتا دی جسے سن کر وہ غصے سے پاگل ہو گیا اور اس نے اپنے سسرال والوں کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ ان دنوں اسکولوں میں گرمی کی چھٹیاں تھیں۔ اس نے بیوی کو اعتماد میں لے کر ایک منصوبہ بنایا اور کہا کہ وہ بچوں کو لے کر میکے چلی جائے اور بھائیوں سے کہہ دے کہ شوہر نے اسے گھر سے نکال دیا ہے اور کہا ہے کہ جب تک اسے اپنا حصہ نہ مل جائے وہ وہیں رہے۔

نائلہ اس پر تیار نہیں تھی لیکن شوہر کے سمجھانے پر راضی ہو گئی۔ وہ بھی جانتی تھی کہ بھائیوں پر دباؤ ڈالنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ اس نے اپنا سامان تیار کیا اور بچوں کو لے کر میکے پہنچ گئی۔ وہ ماں کے گلے لگ کر روئی اور اپنے آنے کی وجہ بتا دی۔ یہ سن کر سب کی سٹی گم ہو گئی تھی۔ انہیں اشرف جیسے صلح جو انسان سے اس اقدام کی توقع نہیں تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس بار وہ واقعی بہت سنجیدہ ہے اور اگر اس کا مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو بات اس سے بھی آگے جا سکتی ہے۔

نائلہ نے ماں کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا کہ خدا کے واسطے اس کا گھر ٹوٹنے سے بچا لو۔ ماں کا دل بھی پسیج گیا۔ انہوں نے بیٹوں سے کہا کہ وہ اس مسئلے کا حل تلاش کریں چاروں بھائی سر جوڑ کر بیٹھے۔ بڑے بھائی نے ایک پراپرٹی ڈیلر سے تمام جائیداد کی مارکیٹ ویلیو لگوائی جو لگ بھگ دس کروڑ بنتی تھی اور اس میں نائلہ کا حصہ پچاسی لاکھ تھا، اتنی رقم کسی کے اکاؤنٹ میں نہیں تھی چنانچہ فیصلہ ہوا کہ سرجانی کا ایک چھوٹا پلاٹ بیچ کر اس کا حصہ ادا کر دیا جائے۔



ثمینہ کو بھابی کے ذریعے پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ اسے اپنی نند سے تو ہمدردی تھی لیکن وہ ندیم کی [illegible] کیفیت کو محسوس کر کے بھی خوش ہو رہی تھی۔ اب [illegible] ہو گیا ہو گا کہ جسم کے کسی حصے میں پھانس چبھ جائے [illegible] کیا ہوتی ہے۔ وہ ندیم کو فون کر کے بتانا چاہتی تھی [illegible] ہے مکافاتِ عمل۔ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ دنیا میں ہی اس [illegible] آ جاتا ہے۔

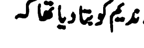
ندیم نے ایک [illegible] کی آڑ لے کر اسے گھر سے نکال دیا تھا جس کا نتیجہ [illegible] آ گیا۔ شاید اس نے کبھی سوچا بھی نہ ہو گا کہ یہی [illegible] اس کی بہنوں کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ ندیم نے اس [illegible] باپ کو بڑھاپے میں دربدر کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن [illegible] پلاٹ سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہی قدرت کا انصاف ہے [illegible] لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔

اب ندیم کو شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا منہ لے کر ثمینہ کے سامنے جائے۔ اس کی یہ مشکل بھابی نے آسان کر دی اور اسے سمجھا بجھا کر ثمینہ کے پاس بھیج دیا۔ دیورانی کو وہ پہلے ہی فون کر چکی تھیں۔ ندیم شرمندہ شرمندہ سا سسرال آیا اور ثمینہ سے کہا۔ "تمہاری یہی شرط تھی کہ میں خود تمہیں لینے آؤں، وہ میں نے پوری کر دی۔ اب گھر چلنے کی تیاری کرو۔"

"میری ایک اور شرط بھی ہے۔" ثمینہ نے کہا۔ "وعدہ کرو کہ اب کبھی میرے ماں باپ کو تنگ نہیں کرو گے۔"

"بالکل نہیں کیونکہ اب مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں رہی، میں نے کاروبار کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔"

ثمینہ مسکراتی ہوئی اٹھی اور اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ وہ اشرف کی شکر گزار تھی جس نے ندیم کو بتا دیا تھا کہ جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔





پشیمان

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم
یہ روداد شمیم اور اس کے شوہر کی ہے لیکن بغور دیکھیں تو یہ روداد پورے معاشرے کی نظر آئے گی۔ مفاد کی خاطر لوگ کس طرح ایک دوسرے کا گھر تباہ کرتے ہیں، یہ سب آپ کو اس سچی کہانی میں نظر آ جائے گا۔

خلیل جبار
(حیدرآباد)



میں جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا سیما کو گم صم پایا، سیما خاموش بیٹھی کسی سوچ میں گم تھی۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگنا تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ وہ چہکنے والی تھی۔ وہ کچھ نہ کچھ بولتی رہتی تھی۔ ڈرائنگ روم میں بیگم بھی موجود تھیں۔ وہ بھی خاموشی سے ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔

"آج بڑی خاموشی ہے۔" میں نے کہا۔

"خاموشی کہاں ٹی وی پر پروگرام دیکھا جا رہا ہے۔" بیگم نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے کہ ہماری بیٹی بڑی خاموش خاموش سی کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔"

"ارے واقعی میں نے غور ہی نہیں کیا۔ یہ جب سے بازار سے آئی ہے چپ چپ سی ہے۔" بیگم نے بتایا۔

"بازار کس کے ساتھ گئی تھی؟"

"اپنی سہیلی کاشفہ کے ساتھ۔"

"کیوں بھئی سیما، کیا سہیلی سے کوئی لڑائی وغیرہ تو نہیں ہو گئی۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں میری کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ کاشفہ میری بہت اچھی سہیلی ہے۔"

"یہ خاموشی اس کے اچھے ہونے پر ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر تم خاموش کیوں ہو۔"
"میں کچھ سوچ رہی ہوں۔" سیما نے بتایا۔
"اچھا تم سوچ بھی سکتی ہو۔" میں نے کہا۔
میں ابھی اس سے یہ پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے کہ وہ خود ہی بول پڑی۔ "ابا جان! کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ صورتیں آپس میں ایسی مل جائیں کہ ایک دوسرے کی کاپی کا گمان ہو؟" سیما نے پوچھا۔
"اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔ انسانی صورتیں مل بھی جاتی ہیں۔ کیا تم نے پاکستانی اور انڈین اداکاروں کو نہیں دیکھا۔ اکثر اداکاروں کی مشابہت نظر آجاتی ہے۔" میں نے کہا۔
"ہلکی پھلکی مشابہت ہو سکتی ہے مگر مکمل طور پر صورت مل جانا پریشان کن بات ہے نا۔" سیما نے کہا۔ "میں آج کاشفہ کے ساتھ بازار گئی تھی۔ وہاں ایک دکان سے نکلتے ہوئے میں نے ایک خاتون کو اپنی طرف متوجہ پایا مگر جب اس شکل پر غور کیا تو چونک گئی۔ حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ اس کی شکل مجھ میں مل رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ میں اس کی کاربن کاپی ہوں۔"
"تمہاری ہم شکل۔" میں چونکا۔
"ہاں وہ میری ہمشکل تھی۔" سیما نے کہا۔
"ایسا کیسے ہو سکتا ہے تمہیں وہم ہوا ہوگا۔" میں نے کہا۔
اس کی بات سن کر میں فکرمند ہو گیا تھا کہ کوئی خاتون میری بیٹی کی ہمشکل ہے۔ "اس کی عمر اندازاً کتنی ہو گی۔" میں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔
"عمر اس کی چالیس سے پینتالیس کے درمیان ہو گی۔" سیما نے جواب دیا۔
اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔ کہیں وہ سیما کی ماں شمیم نہ ہو۔ میں نے سوچا۔ سیما اپنی ماں کی ہمشکل تھی۔ شمیم جوانی میں بالکل سیما کی طرح ہی تھی۔ میں نے شمیم کے ساتھ اپنی کھینچی ہوئی تصاویر جلا دی تھیں پھر بھی پچھلے دنوں صفائی کے دوران چند تصاویر نکل آئیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ شمیم اور سیما میں ذرا برابر بھی فرق نہیں ہے۔ میں نے وہ تصویریں اس جگہ چھپا دیں تھیں کہ ان پر سیما کی نظر نہ پڑے۔
میں شمیم کو بھلا چکا تھا۔ میرے لیے اسے بھلا دینا ہی بہتر تھا۔ تلخ یادوں کو یاد رکھنے سے انسان کا زخم ہر وقت ہرا ہی رہتا ہے۔ شمیم سے میری ملاقات ایک حادثہ کی مرہون منت تھی۔ وہ حادثاتی طور پر میری زندگی میں آئی تھی۔ شمیم میرے دوست نعیم کی بہن تھی۔ وہ میرے آفس میں کلرک تھا۔ ان کے والدین کی موجودگی میں میرا ان کے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ وہ بہت اچھے لوگ تھے۔ میرا ان کے یہاں آنا جانا تھا۔ ان دنوں نعیم کی والدہ بیمار تھیں وہ انہیں دوائی دلانے اسپتال لے کر گیا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد وہ ہر طرح سے والدہ کی خدمت میں لگا رہتا تھا۔ نعیم کی اسپتال سے آتے ہوئے موٹر سائیکل ایک بس سے ٹکرا گئی۔ اس حادثے میں نعیم اور اس کی والدہ دونوں ہی موقع پر ہلاک ہو گئے تھے۔ ان کے عزیز و اقارب پنجاب میں رہتے تھے۔ اطلاع ملنے پر وہ آئے اور تدفین کے بعد چلے گئے۔ نعیم کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس کا کوئی چھوٹا بھائی تھا اس لیے شمیم اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ کسی بھی عزیز نے جھوٹے سے بھی یہ نہیں کہا کہ ہمارے پاس چل کر رہ لو۔ میں نے شمیم کو دیکھا تو حیران رہ گیا کیونکہ پہلے وہ مجھ سے پردہ کرتی تھی۔ وہ اس قدر حسین ہے میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ مجھے بہت پسند آ گئی تھی دل میں ایک تمنا جاگی کہ کاش یہ میری بیوی بن جائے۔ ان کا مکان کرائے کا تھا۔ مکان مالک نے ایک ماہ بعد ہی مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دیا۔ والدہ کے علاج معالجے میں نعیم کی خاصی رقم خرچ ہو گئی تھی اس لیے وہ تین ماہ سے کرایہ ادا نہ کر سکا تھا۔ نعیم اور اس کی والدہ کی تدفین کا خرچا بھی عزیز و رشتہ داروں نے مل کر اٹھایا تھا۔ وہ جاتے ہوئے کچھ رقم دے گئے تھے خرچ کی غرض سے لیکن وہ رقم کب تک چلتی۔ وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ شمیم نے جب مجھے موبائل پر موجودہ صورت حال سے آگاہ کیا تو میں بھی پریشان ہو گیا۔ ایک لڑکی کا تنہا گھر میں رہنا آسان کام نہ تھا۔ میں نے عزیز و رشتہ داروں کے منہ پھیر لینے پر اسے اپنے گھر رہنے کی پیشکش کی تھی مگر اس کی خودداری آڑے آ گئی اور اس نے مجھے منع کر دیا۔ اس دوران شمیم نے نوکری تلاش کرنے کی بھی کوشش کی مگر ملک میں ویسے ہی بے روزگاری بہت ہے۔ لوگ ڈگریاں لیے پھرتے ہیں پھر بھی انہیں نوکریاں نہیں ملتیں ایسے میں کم پڑھی لکھی شمیم کو کیسے کسی دفتر میں نوکری مل جاتی۔ مالک مکان اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ معاشی طور پر مستحکم ہو کر کرایہ دے سکے۔ مالک مکان کو ایک اچھا کرایہ دینے والا مل گیا تھا اور وہ اس سنہری موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا، اس لیے مالک مکان نے شمیم پر زور دینا شروع کر دیا تھا کہ کرایہ

باقاعدگی سے ادا کرو ورنہ مکان خالی کر دو۔ میں نے امی جان کو اس صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ امی جان نے بھی شمیم کے حق میں کہا کہ میں اسے اپنے گھر لے آؤں پھر سوچیں گے کہ شمیم کے لیے کیا کرنا بہتر رہے گا۔
اس طرح شمیم ہمارے گھر آ گئی، وہ گھر پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے اس نے گھر کے کاموں کی ذمہ داری اپنے ذمے لے لی تھی۔ وہ ملازمت کرنا چاہتی تھی مگر امی نے منع کر دیا اور اس سے کہا۔ "شمیم میں تمہیں اپنی بیٹی بنا کر گھر لائی ہوں۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کا ملازمت کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ تم گھر کے کاموں میں ہمارا ہاتھ بٹاتی رہو، میں سمجھتی ہوں کہ تمہارے لیے یہی کافی ہے۔"
چند ماہ میں ہی شمیم نے امی جان کی اتنی خدمت کی کہ وہ یہ بات سوچنے پر مجبور ہو گئیں کہ اتنا خیال آج کل سگی بیٹی بھی نہیں کرتی جتنا وہ کرتی ہے۔ کافی سوچ بچار کر امی جان نے اسے اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب امی جان نے اپنی اس خواہش کا اظہار مجھ سے کیا تو میں خوش ہو گیا۔ میری تو خواہش یہی تھی کہ شمیم سے شادی ہو جائے اس لیے میں نے فوراً رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "امی جان آپ مجھ سے زیادہ جانتی اور سمجھتی ہیں۔ آپ جو کریں گی وہ میرے حق میں بہتر ہوگا۔"
امی میری سعادت مندی پر بہت خوش ہوئیں اور سادہ سی تقریب میں ہم دونوں کا نکاح پڑھا دیا گیا۔
شادی کے بعد ہمارے دن بڑے خوشگوار گزر رہے تھے کہ ہماری زندگی میں سیما آ گئی۔ اسے دیکھ کر ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس کی معصوم حرکتیں ہمیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ سیما اپنی ماں کا عکس دکھائی دیتی تھی۔
وقت گزر رہا تھا کہ اچانک ساری خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی۔ مجھ پر غبن کا الزام لگا کر مجھے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ میری اصول پسندی میرے آڑے آ گئی تھی۔ میں اپنے آفیسر کا کوئی بھی غلط کام کرنے سے انکار کر دیا کرتا تھا۔ اس بات سے ان کے دل میں میرے لیے نفرت پیدا ہو گئی تھی اور وہ موقع کی تلاش میں تھے کہ مجھے کس طرح سزا دیں۔ اسی لیے میرے خلاف ایک اسکیم تیار کی گئی اور اسکیم کے تحت مجھے غبن کے مقدمے میں پھنسا کر جیل بھجوا دیا گیا۔
کاشف میرا اچھا دوست تھا۔ اسے میرے جیل جانے کا بہت دکھ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں ایسا نہیں ہوں اور مجھ پر یہ جھوٹا الزام ہے۔ اس نے میرے بچاؤ کے لیے خوب بھاگ دوڑ کی۔ شمیم کو ملوانے بھی لاتا رہتا تھا۔ مجھے بھی یقین دلاتا رہا تھا کہ مقدمہ جھوٹا ہے جلد ختم ہو جائے گا اور میں آزاد ہو جاؤں گا۔
وقت گزرتا رہا، پیشیوں پر پیشیاں بھگتارہا پھر میں نے محسوس کیا کہ کاشف کی آمد کم ہو گئی ہے۔ اب ان میں پہلے جو گرم جوشی تھی وہ سرد مہری میں تبدیل ہو گئی ہے، ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مایوس ہو گئے ہیں اور انہیں پکا یقین ہو گیا ہے کہ مجھے سزا ہو جائے گی۔
میں ابھی غبن کے مقدمے سے چھٹکارا نہیں پا سکا تھا کہ مجھ پر ایک اور مقدمہ بن گیا۔ شمیم نے عدالت سے خلع مانگ لی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا۔ سول کورٹ میں جب میرا شمیم سے سامنا ہوا تو میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"شمیم تم یہ کیا کر رہی ہو؟"
"میں جو کچھ کر رہی ہوں وہ بہت سوچ سمجھ کر کر رہی ہوں۔ تم پر مقدمہ ایسا بن گیا ہے کہ بغیر سزا کے جان نہیں چھوٹے گی۔ تمہیں طویل سزا ہو سکتی ہے اور میں تمہارا انتظار نہیں کر سکتی۔ میری اپنی زندگی ہے۔ میں تمہاری خاطر اپنی زندگی کو خراب نہیں کر سکتی۔"
"تمہارے اس اقدام سے ہماری فیملی ڈسٹرب ہو جائے گی۔ سیما کا کیا بنے گا۔" میں نے کہا۔
"سیما کو تمہاری والدہ سنبھال لیں گی، جب مقدمے سے رہائی مل جائے پھر تم اس کی دیکھ بھال کر لینا۔" شمیم نے کہا۔
"تم یہ کیا کر رہی ہو کیا سیما کی فکر نہیں کہ وہ تمہاری کچھ لگتی ہے۔ تم کیسی ماں ہو۔"
"تمہیں باپ ہو کر بیٹی کی فکر نہیں پھر میں ماں ہو کر اس کی کیسے فکر کروں، اگر تمہیں بیٹی کی اتنی فکر ہوتی تو ایسا کام نہ کرتے کہ جیل ہو جائے۔"
"تمہارے کہنے کا مقصد ہے میں نے غبن کیا ہے؟" میں نے غصے سے کہا۔
"یہ میں نہیں زمانہ کہہ رہا ہے۔ اس میں جھوٹ کی کیا بات ہے۔ چھ ماہ سے زیادہ عرصہ بیت گیا ہے، ابھی تک تمہاری ضمانت تک نہیں ہو سکی۔ اس سے بڑا کیا ثبوت ہوگا۔"
"شمیم! میری بات کو ٹھنڈے دل سے سوچو تم مجھ سے خلع لے کر کہاں جاؤ گی، کون تمہیں سہارا دے گا؟"
"میرے بھائی اور والدہ کے حادثے کے بعد بھی تم

میرا سہارا بن گئے تھے ایسے ہی کوئی اور میرا سہارا بن جائے گا۔“ شمیم نے کہا۔

”شمیم تم خلع لے کر بہت پچھتاؤ گی۔“

”یہ میرا مسئلہ ہے کہ میں پچھتاؤں یا نہ پچھتاؤں تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ یہ وہ نہیں بول رہی اس سے یہ باتیں کوئی اور کہلوا رہا ہے۔ میری پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ میں اسے اپنی رہائی کا بھرپور یقین دلا سکوں۔ میں نے ایک شوہر کی حیثیت سے اسے خوب سمجھایا مگر وہ خلع لینے پر بضد رہی۔ کورٹ نے خلع کی درخواست منظور کر لی۔ اس نے سیما کو اپنی کفالت میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ امی جان پہلے ہی میری وجہ سے صدمے میں تھیں۔ شمیم کے خلع لینے سے انہیں مزید ذہنی صدمہ پہنچا اور وہ بیمار پڑ گئیں۔ جب وہ مجھ سے ملنے آئیں تو میں نے انہیں سمجھایا کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب خود کو سنبھالیں خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو جاتا ہے تو سیما کو کون سنبھالے گا؟ میری بات ان کے دل کو لگی اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ خود کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کریں گی۔ جاتے ہوئے امی جان کے ساتھ آئے ماموں نے بتایا کہ وہ میرے وکیل سے مطمئن نہیں ہیں۔ اس لیے دوسرا وکیل کر لیا ہے۔ نئے وکیل سراج الدین ایڈووکیٹ نے دو تین سماعت پر ہی میری ضمانت کرا دی۔ ضمانت ہونے پر مجھ پر انکشاف ہوا کہ کاشف نے جو وکیل کیا تھا وہ میری وکالت کے لیے نہیں بلکہ میرے مقدمے کو طول دینے کے لیے کیا تھا۔ اس کا مقصد صرف اور صرف شمیم کو حاصل کرنا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ اس نے شمیم کے خلع لیتے ہی اس سے شادی کر لی تھی۔

کاشف ہمارا رشتہ دار نہ تھا۔ محلے میں رہنے کی وجہ سے دوستی ہو گئی تھی۔ اس نے جب شمیم کو میری بیوی کے روپ میں دیکھا تو وہ اس پر مرمٹا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شمیم سے نکاح کے وقت کاشف نے میرے کان میں کہا تھا۔ ”تم بڑی قسمت والے ہو جو ایسی خوب صورت بیوی ملی ہے۔“

میں نے اس کی بات کو مذاق سمجھا تھا اور نظر انداز کر دیا تھا۔ اب اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور میری قید کو طول دلا کر شمیم کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ میری رہائی اب ممکن نہیں ہے اس لیے اسے اب میری فکر کرنے کی بجائے اپنے کیریئر کی فکر کرنی چاہیے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔

سانپ گزر چکا تھا اب لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میری ضمانت ہو چکی تھی۔ اب مجھے پہلے اپنے اوپر لگائے غبن کے مقدمے کو ختم کرا کے اپنی نوکری بحال کرانا تھا۔ سیما کے مستقبل کی بھی فکر کرنی تھی۔ غبن کا مقدمہ ختم ہونے اور نوکری بحال ہونے میں ایک سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ کاشف شادی کے بعد ہمارا علاقہ چھوڑ گیا تھا۔ وہ کہاں چلا گیا کسی کو علم نہ تھا۔ کاشف کو وکیل بدلنے پر اندازہ ہو گیا تھا کہ میری ضمانت یقینی ہے اس لیے کاشف نے محلے میں کسی کو یہ بات نہیں بتائی وہ کہاں جا رہا ہے۔ شمیم نے مجھے برے وقت میں چھوڑا تھا اس لیے مجھے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ میں اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے ملازمت کی بحالی کے لیے ایک طویل جدوجہد کی تھی اس لیے مجھے اندازہ تھا کہ جن لوگوں نے مجھے غبن کے مقدمے میں پھنسایا تھا ان کی [illegible] اور وہ مجھے دوبارہ کسی اور مقدمے میں پھنسا سکتے تھے اس لیے میں نے اپنا ٹرانسفر راولپنڈی کرا لیا۔ راولپنڈی سے میرا ٹرانسفر ایبٹ آباد پھر مانسہرہ، پھر اسلام آباد اور پھر واپس لاہور ہو گیا۔ لاہور کے افسران میرے کام سے اتنا خوش ہوئے کہ کئی بار میرا ٹرانسفر ہوا مگر انہوں نے ٹرانسفر رکوا دیا۔ میں بھی اب لاہور میں رہ کر خوش تھا۔

میں نے شمیم کے خلع لینے پر سوچا تھا کہ میں اب کسی صورت میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔ مجھے عورت کے نام سے ہی چڑ ہو گئی تھی مگر میری قسمت میں دوسری بیوی کا آنا لکھا تھا۔ راولپنڈی میں میری اچانک طبیعت خراب ہو گئی۔ طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ مجھے اسپتال منتقل ہونا پڑا۔ امی جان کے لیے یہ بڑی پریشانی تھی کہ وہ گھر اور سیما کو دیکھیں یا اسپتال میں میری دیکھ بھال کریں۔ ایسے میں اسپتال کی نرس نوشابہ نے دن رات میرا خیال رکھا۔ امی جان کبھی صبح اور کبھی شام میں مجھے دیکھنے آتی تھیں۔ میں اسپتال میں پندرہ دن زیر علاج رہا۔ ان پندرہ دنوں میں ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ میں نے جو زندگی بھر دوسری شادی نہ کرنے کا سوچا تھا۔ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ نوشابہ میں ایک اچھی بیوی ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس طرح میری نوشابہ سے شادی ہو گئی۔ نوشابہ سے میرے دو بیٹے کاظم اور شعیب ہوئے تھے۔ نوشابہ نے کبھی سیما اور اپنے بیٹوں میں فرق محسوس نہیں کیا۔

سیما بھی نوشابہ کو اپنی سگی ماں سمجھتی تھی۔ میں نے بھی سیما پر کبھی ظاہر کیا تھا کہ نوشابہ ہی اس کی اصل ماں ہے۔

☆......☆

شمیم کی لاہور میں موجودگی نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے اپنی بیٹی کی یاد آئی ہو گی اس لیے وہ معلومات کرتی ہوئی سیما کو ڈھونڈنے کی غرض سے لاہور آئی ہے۔ انسان کی فطرت ہے وہ جوانی کی مستی میں اپنے جن بچوں کو بھلا دیتا ہے وہ بڑھاپے میں ان کی قربت کو بے چین ہو جاتا ہے۔

مجھے سو فیصد یقین تھا کہ شمیم سیما سے ملاقات کرنے آئی ہے اور اس سے ملاقات کر کے وہ میرے خلاف سیما کو بدظن کرے گی اور خود کو مظلوم ثابت کرنا چاہے گی۔ کچھ بھی ہو میں پوری کوشش کروں گا کہ سیما سے اسے نہ ملنے دیا جائے۔ وہ سامنے بھی آ جائے پھر بھی میں اسے پہچاننے سے ہی انکار کر دوں گا۔ سیما سے کہہ دوں گا کہ یہ عورت محض صورت کے مل جانے کا فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ یہ فراڈی عورت ہے اور ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

رات جب میں سونے کو لیٹا تو نوشابہ نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔ ”وہ عورت تمہاری سابقہ بیوی شمیم تو نہیں ہے؟“

”وہ چاہے میری سابقہ بیوی ہو یا نہ ہو، میں اس عورت کے سامنے آنے پر پہچاننے سے انکار کر دوں گا۔“

”وہ عورت کہیں سیما کو بہلا پھسلا کر ہم سے چھین لینے کی کوشش نہ کرے۔“ نوشابہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

”تم بے [illegible] میں ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ سیما کو ہم نے پال پوس کر جوان کیا ہے اتنی آسانی سے کیسے اس کے حوالے کر دیں گے اور ویسے بھی جب سیما کو اس کے بارے میں پتا چلے گا وہ خود اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دے گی۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ وہ اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دے۔“ نوشابہ نے کہا۔

دوسرے دن سیما گھر لوٹنے پر بڑی خوش [illegible] تھی۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔ ”ابو وہ خاتون آج یونیورسٹی آئی تھی۔ میرا اچانک اس سے سامنا ہو گیا۔ میرے سلام کرنے پر وہ خوش ہو گئی۔ ہم دونوں کی خاصی دیر کینٹین میں گپ شپ رہی۔ وہ بڑی اچھی خاتون ہیں۔ ایک این جی اوز میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ان کی تنظیم مختلف موضوعات پر مختلف شہروں میں سیمینار منعقد

کرتی رہتی ہے۔ ان دنوں ہماری یونیورسٹی میں وہ ایک سیمینار کرنا چاہتی ہیں اس سلسلے میں وہ آج یونیورسٹی آئی تھیں۔‘‘
شمیم کا کسی این جی اوز سے کیا تعلق یقیناً وہ کوئی اور ہی خاتون ہے۔‘‘ میں نے سوچا۔ انسانی صورتوں میں مشابہت پائی جا سکتی ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے اس لیے مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

’’وہ خاتون کن موضوعات پر سیمینار کرنا چاہتی ہیں۔‘‘ میں نے پوچھا۔

’’طالبات کے مسائل پر وہ سیمینار کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔‘‘ سیما نے بتایا۔

’’ان خاتون کا کچھ نام بھی ہے یا بے نام ہیں۔‘‘ میں نے اپنی تسلی کو پوچھا۔

’’ان کا نام شمیم ہے اور ان کا تعلق کراچی سے ہے۔‘‘

’’شمیم!‘‘ میں حیرت سے چونکا۔

مجھے حیرت زدہ دیکھ کر سیما بھی چونکی۔

’’ابو کیا آپ ان خاتون کو جانتے ہیں؟‘‘

’’نن...... نہیں...... میں بھلا کیسے ان خاتون کو جان سکتا ہوں۔ انہیں وہی جان سکتا ہے جو کسی این جی اوز میں کام کرتا ہو۔ ان لوگوں کے آپس میں رابطے ہوتے ہیں۔‘‘ میں نے بات بنائی۔

’’ابو آپ کا تعلق کراچی سے ہے، ممکن ہے کہ ان خاتون سے ملاقات ہونے پر واقفیت نکل آئے۔‘‘ سیما نے کہا۔

’’اچھا اچھا۔‘‘ میں نے یہ کہتے ہوئے بات ٹال دی۔

میں بات کو طول دینے کے حق میں نہیں تھا۔ زیادہ باتیں کرنے سے بات کھل سکتی تھی اس لیے مجھے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ وہ واقعی شمیم ہے تو وہ این جی اوز میں کیسے کام کر رہی ہے۔ وہ ایک گھریلو خاتون ہے، کاشف کس طرح چاہے گا کہ اس کی بیوی این جی اوز میں کام کرے۔ اس کی خوب صورتی کو دیکھ کر کوئی اور مرد کاشف سے اسے چھین سکتا ہے۔ وہ ضرور کوئی اور شمیم ہے۔ میں نے اپنے دل کو جھوٹی تسلی دی۔

اتوار کو میں تیار ہو کر جیسے ہی باہر جانے کو ڈرائنگ روم میں گیا۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ شمیم میری بیٹی سیما سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ مجھے ڈرائنگ روم میں آتا دیکھ کر سیما بول پڑی۔ ’’یہ میرے ابو ہیں۔‘‘

شمیم کی مجھ پر نظر پڑتے ہی اسے بھی حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ مجھے پہچان گئی تھی۔ کیسے نہ پہچانتی۔ ہم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے ساتھ رہے تھے۔ میرے چہرے میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی تھی اس لیے وہ آسانی سے پہچان گئی تھی۔

’’سیما بیٹی تم بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں ان کی صورت تم سے بہت ملتی ہے۔‘‘ میں نے انجان بننے کی اداکاری کی۔

’’میں نے کبھی آپ سے جھوٹ بولا ہے۔‘‘ سیما نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’ہاں ہماری بیٹی نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’ابو آپ کہیں جا رہے ہیں۔‘‘

’’ہاں میں اپنے ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’کچھ دیر رک جائیں آنٹی آئی ہیں۔‘‘

’’آپ لوگ باتیں کریں۔‘‘

’’لیکن ابو میں نے آپ سے اور امی جان سے ملاقات کرانے کو آنٹی کو بلایا ہے۔‘‘

’’اچھا بھئی تمہارے کہنے پر میں تھوڑی دیر کو بیٹھ جاتا ہوں۔‘‘ میں نے اپنے دل پر جبر کر کے کہا۔

شمیم کو اپنے گھر میں دیکھ کر بہت غصہ آرہا تھا۔ میں اسے اپنے گھر سے بھگا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ سیما کی مہمان بن کر آئی تھی اور گھر آئے مہمان کو بے عزت کر کے نکالنا ہماری شان کے بھی خلاف تھا اس لیے مجبوراً بیٹھنا پڑ گیا۔

نوشابہ بھی اس دوران شمیم کی خاطر تواضع کے لیے ٹرالی میں کچھ لے آئی تھی۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا تھا مگر میری کوشش یہی تھی کہ کسی طرح میری نظریں شمیم کی نظروں سے نہ مل پائیں ورنہ ممکن تھا میرے دل میں اس کے لیے جو تلخی تھی وہ زبان پر آجاتی اور جو راز ہم نے سیما سے چھپایا ہوا تھا وہ اس پر آشکار ہو جاتا۔

’’سیما بہت اچھی بچی ہے اور بہت ہی ذہین بھی ہے۔‘‘ شمیم نے سیما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’یہ بالکل اپنے باپ پر گئی ہے۔ اس کے ابو بھی پڑھنے لکھنے میں بہت ذہین تھے طالب علمی کے زمانے میں۔‘‘ نوشابہ نے کہا۔

’’تھے سے کیا مراد ہے اب ذہین نہیں ہیں۔‘‘ شمیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’میرا مطلب نو عمری سے ہے ویسے تو اب بھی ذہین ہیں جبھی اچھے عہدے پر فائز ہیں۔‘‘ نوشابہ نے جواباً کہا۔

’’این جی اوز میں کب سے کام کر رہی ہیں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’مجھے پندرہ سال ہو چکے ہیں۔‘‘ شمیم نے بتایا۔

’’آپ کے شوہر کو این جی اوز کے لیے کام کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔‘‘

’’شوہر ہی نہیں ہے۔‘‘

’’کیا آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی۔‘‘ نوشابہ بیگم نے چونک کر پوچھا۔

’’شادی میں نے ایک نہیں دو کی تھیں مگر دونوں ناکام ثابت ہوئیں، اس کے بعد تیسری کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔‘‘ شمیم نے کہا۔

’’بہت افسوس ہوا یہ سن کر دونوں شادیاں ناکام رہیں۔‘‘ نوشابہ نے کہا۔

’’یہ زندگی ہے اس میں ایسا ہوتا رہتا ہے، کسی کی کئی شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں اور کسی کی ایک شادی ہوتی ہے اور وہ کامیاب خوشگوار زندگی گزارتے رہتے ہیں۔‘‘ شمیم نے کہا۔

وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ سیما اسے مزید کچھ دیر اور روکنا چاہتی تھی مگر اسے کوئی کام تھا اس لیے رک نہ سکی۔

شام کو میرے موبائل پر کسی نامعلوم نمبر سے کال آئی ہے۔ میں نے کال او کے کر دی۔

’’میں شمیم بات کر رہی ہوں، دیکھو پلیز کال مت کاٹنا۔‘‘ میں بولنے پر وہ بولی۔

’’ٹھیک ہے میں کال نہیں کاٹ رہا۔ بولو کیا کہنا چاہتی ہو۔‘‘

’’میں آج شام تم سے ایک ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔‘‘ شمیم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

’’ایک ملاقات ہماری آج ہو چکی ہے۔‘‘ میں نے اسے یاد دلایا۔

’’ہاں مجھے یاد ہے، اس لیے میں چاہتی ہوں کہ کراچی جانے سے پہلے تم سے آخری ملاقات کر لوں۔‘‘ شمیم نے کہا۔

’’خیریت ہے ناں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں خیریت ہی ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے میں شام میں ملاقات کر لیتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہاں ملنا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ شمیم کے ہوٹل کا نام بتانے پر میں نے کال کاٹ دی۔

وہ مجھے کیوں ہوٹل پر بلا رہی تھی جب کہ میری اس سے دن میں ملاقات ہو چکی تھی، ضرور کوئی چکر ہے۔ وہ شاید ایک بار پھر میری زندگی میں زہر گھولنا چاہتی ہے۔ سیما سے رابطہ بڑھانا، گھر آنا اور اب مجھ سے ملاقات کرنے کو کہنا ضرور اس کے ذہن میں کوئی پلان بن چکا تھا اور وہ پلان اس کے ذہن میں کیا ہے یہ شام کو ملاقات ہونے پر معلوم ہو سکتا تھا۔

میں جب ہوٹل پہنچا تو وہ مجھ سے پہلے ہی ٹیبل پر موجود تھی۔ میں ایک کرسی پر اس کے مدمقابل بیٹھ گیا۔

’’کیسی ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’بس جیسی بھی ہوں تمہارے سامنے ہوں۔‘‘ وہ بولی۔

’’بظاہر ٹھیک لگ رہی ہو۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میں نے تمہیں بہت تلاش کیا مگر تمہارا پتا ہی نہیں چل سکا کہ تم کہاں ہو اور کیسے ہو، کیسی زندگی گزار رہے ہو۔‘‘ شمیم نے کہا۔

’’سرکاری نوکری میں ٹرانسفر کا ہونا سروس کا حصہ ہوتا ہے۔ کبھی کہاں، کبھی کہاں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’یہ بات درست ہے۔ ٹرانسفر ہوتے رہتے ہیں مگر ان ٹرانسفر کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کو تلاش کرنا چاہے تو بھی اس تک نہیں پہنچ پاتا، میں نے تمہیں بہت تلاش کیا مگر ناکام رہی۔‘‘

’’لیکن تم مجھے کیوں تلاش کر رہی تھیں؟‘‘ میں چونکا۔

’’میں تم سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ میں نے کاشف کے بہکانے میں آکر بہت غلط کیا تھا۔ تم سے خلع لے کر میں بہت پچھتائی۔ وہ بہت چالاک اور مکار انسان تھا۔ اس نے مجھے جو سہانے خواب دکھائے وہ سب جھوٹے ثابت ہوئے۔‘‘

’’شمیم وہ ہم دونوں کا تلخ ماضی تھا، اس لیے اس کا بھول جانا ہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میں ماضی کو بھول جانا چاہتی ہوں مگر کمبخت ماضی میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں نے بڑی مشکل سے ماضی سے چھٹکارا پایا تھا کہ سیما سے ملاقات ہو گئی اور ماضی پھر سے یاد آگیا ہے۔‘‘

’’یہ بھی خوب اتفاق ہے تمہاری سیما سے ملاقات ہو گئی، تم این جی اوز میں کیسے آگئی ہو۔‘‘

’’این جی او میں آنا بھی محض اتفاق ہے، میں نے

کاشف سے شادی کر کے دھوکا کھایا تھا اس دھوکے باز نے چند سال مجھے نکاح میں رکھا، جب اس کا مجھ سے دل بھر گیا، طلاق نامہ تھما دیا۔ میں نے طلاق مل جانے پر نوکری کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی۔ ایسے میں میری ملاقات شبانہ باجی سے ہوگئی اور اس نے مجھے این جی او میں کام کرنے کی آفر کردی۔ مجھے ویسے بھی کام کی تلاش تھی اس لیے این جی او میں کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ کام مجھے اتنا اچھا لگا کہ اب تک اس سے وابستہ ہوں، این جی او میں کام کرتے ہوئے اچھا وقت گزر جاتا ہے۔"

"کام میں وقت کا پتا نہیں چلتا۔ اچھا ہے انسان کام میں مصروف رہے۔ اس طرح وہ تلخ یادوں سے بھی محفوظ رہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم نے یہ اچھا کیا میرے بارے میں سیما کو نہیں بتایا۔" شمیم نے کہا۔

"تم نے خود ہی سیما کی زندگی سے خود کو الگ کرلیا تھا۔"

"میں مجبور تھی، کاشف نے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ اس شرط پر شادی کرے گا کہ میں سیما اور تم سے ہر طرح کا تعلق ختم کرلوں۔"

"لوگ اپنے بچوں کی خاطر کیا کچھ نہیں کرتے اپنی خواہشیں مار لیتے ہیں۔"

"اس کی مجھے سزا مل چکی ہے جس کی خاطر میں نے سیما کو چھوڑا تھا اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں سیما کے سامنے آجانے پر بھی اس کو اپنی بیٹی نہیں کہہ سکتی۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے کیا سزا ہوگی۔"

"میرا خیال تھا کہ تم اپنی بیٹی کو مجھ سے چھین لینے کو آئی ہو۔" میں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"سیما کا تم نے جتنا خیال رکھا ہے یقین جانو میں بھی اس کا اتنا بھرپور خیال نہیں رکھ سکتی۔ مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں میاں بیوی نے سیما کا بہت خیال رکھا ہے۔ میں اس قابل نہیں ہوں پھر بھی تم سے ایک درخواست کر رہی ہوں اگر درخواست منظور کرلو گے تو میرا دل رہ جائے گا۔"

"کیسی درخواست؟" میں چونکا۔

"یہی کہ جب سیما کے حوالے سے گھر میں کوئی خوشی کی تقریب ہو اس محفل میں مجھے ضرور آنٹی کی حیثیت سے مدعو کرلینا۔"

"آنٹی کیوں امی کیوں نہیں؟"

"میں گزرے ماضی کو دوبارہ یاد نہیں کرنا چاہتی اور نہ ہی میں سیما کی زندگی میں کوئی تلخی لانا چاہتی ہوں اس لیے میں جب بھی سیما سے ملاقات کروں گی، آنٹی بن کر کروں گی۔ ہم دونوں جانتے ہیں کہ سیما ہماری اولاد ہے بس اتنا کافی ہے۔" شمیم نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری بات کو سمجھ رہا ہوں تمہارا مقصد یہی ہے کہ سیما کو یہ صدمہ نہ پہنچے کہ جس کو وہ اپنی ماں سمجھتی رہی ہے درحقیقت وہ اس کی ماں نہیں سوتیلی ماں ہے۔ اس کی سگی ماں اس کو اس وقت چھوڑ کر چلی گئی جب اس کی اسے ضرورت تھی۔ یہ سوچ کر سیما کو زیادہ تکلیف ہوگی اور تم جب بھی اس کے سامنے آؤ گی اس کا یہ زخم ہرا ہو جائے گا۔"

"میں سیما کو ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتی ہوں اسی لیے میں یہ قربانی دے رہی ہوں کہ اسے کبھی بتانہ سکوں کہ میں اس کی ماں ہوں۔ سیما کے منہ سے خود کو آنٹی کہلانا مجھے اچھا لگے گا۔ میں آئندہ بھی اس سے آنٹی ہی کہلواؤں گی۔"

شمیم کی یہ ایسی درخواست تھی کہ میں اسے مسترد نہیں کرسکتا تھا۔ اگر وہ خود کو اس کی ماں بھی کہلاتی پھر بھی مجھے اعتراض نہ ہوتا کیونکہ شمیم اپنی غلطی پر پشیمان تھی اور سیما کو مجھ سے چھیننا یا مجھ سے بدظن کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سیما کی ماں تھی میں اسے سیما کی خوشیوں میں شریک ہونے سے بھلا کیسے روک سکتا تھا۔

میں نے اس دن شمیم سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا ہر تقریب میں شمیم کو مدعو کیا حتیٰ کہ سیما کی شادی میں بھی شریک کیا۔ شادی کی تقریب میں اس راز سے پردہ اٹھا دینا چاہتا تھا لیکن شمیم نے مجھے قسم دے کر مجبور کر دیا کہ میں اس راز سے پردہ نہ اٹھاؤں۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ شمیم اس کی آنٹی نہیں اس کی سگی ماں ہے لیکن پھر بھی شادی میں شریک لوگ دونوں ماں بیٹی میں اس قدر مشابہت دیکھ کر سوچے بنا نہ رہ سکے تھے۔ شمیم مجھے قسم نہ دیتی تو میرا اس دن لوگوں پر یہ راز افشاں کر دینا یقینی تھا۔

ہم سب اپنی اپنی زندگیوں میں خوش ہیں۔ کسی تقریب میں شمیم کی آمد سے ماضی پھر سے یاد آجاتا ہے۔ جب وہ چلی جاتی ہے ہم پھر ماضی کو بھول کر حال میں آجاتے ہیں۔

ناشکرے

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

ایک بہت سچی، بہت اچھی اور سبق آموز روداد بھیج رہا ہوں۔ یہ میری اپنی روداد ہے۔ میں نے اس سازش کو جھیلا ہے۔ دیگر احباب بھی اس سے سبق حاصل کریں اسی لیے سرگزشت میں بھیج رہا ہوں۔

خورشید علی خان

(لاہور)



بہت پہلے کی بات ہے کہ میرا گزر ایک گاؤں سے ہوا۔ میرے دفتر کا ایک شخص جمال اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ گاؤں کا ذکر سن کر ہمارے ذہنوں میں جو خیالات آتے ہیں وہ کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ کچے پکے مکانات ہوں گے، ایک چھوٹا سا بازار ہوگا اور چاروں طرف کھیت پھیلے ہوں گے لیکن وہ گاؤں اچھے خاصے قصبے کی طرح تھا۔ بہت سے پکے مکانات تھے۔ ان میں سے کچھ دو منزلہ بھی تھے۔ میں جس سے ملنے گیا تھا یعنی جمال۔ اس کا مکان بھی ایک دو منزلہ بڑا مکان تھا۔

جمال ایماندار اور نیک انسان تھا۔ کئی مہینوں سے وہ بیمار چلا آرہا تھا۔ اس نے دفتر سے بھی چھٹی لے رکھی تھی۔

جمعہ کا دن تھا جب میری بس چار گھنٹوں کی مسافت طے کر کے اس جگہ پہنچی تھی۔ یہاں صرف ایک آدمی سے جمال کا گھر معلوم کیا۔ اس نے مجھے وہاں پہنچا دیا تھا۔

جمال کی طبیعت اب پہلے سے بہت بہتر ہو چکی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش اور حیران ہوا تھا۔ "ارے ناظم صاحب آپ! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ مجھے دیکھنے کے لیے

یہاں تک آجائیں گے۔"

وہ مجھے گھر کے اندر لے گیا۔ جمعہ کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے میرے لیے پہلے چائے کا بندوبست کیا پھر غسل خانے کی طرف رہنمائی کی۔

غسل اور وضو سے فارغ ہونے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ سفر کی تھکان بہت حد تک اتر چکی تھی۔ اس دوران پہلی اذان ہو گئی تھی۔

"چلیں مسجد چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "میں پڑوس والی مسجد میں نہیں جاتا، جمعہ کی نماز امام حنیفہ مسجد میں ادا کرتا ہوں۔ کچھ دور پیدل چلنا پڑتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، پیدل چل لوں گا لیکن وہاں کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"آپ چلیں تو سہی۔ امام صاحب کا بیان سن کر آپ خوش ہو جائیں گے۔"

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مسجد کچھ فاصلے پر تھی لیکن میں گاؤں کے مناظر وغیرہ سے محظوظ ہوتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

مسجد زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن نمازی پہلے سے بھرے ہوئے تھے۔ جمال نے بتایا۔ "ناظم صاحب یہ سب لوگ دور دور سے امام صاحب کا بیان سننے کے لیے آتے ہیں۔"

پھر جب امام صاحب نے اپنا بیان دیا ہے، اس سے واقعی روح تک خوش ہو گئی۔ امام مجھے کوئی عام نہیں بلکہ اسکالر معلوم ہو رہے تھے۔ وہ اس وقت جہدِ مسلسل کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان میں بہت صلاحیت ہے۔

نماز ختم کر کے ہم مسجد سے باہر آئے اور ہم پھر جمال کے گھر کی طرف چل پڑے تھے۔

"کیوں نظام صاحب، کیسے لگے ہمارے امام؟" جمال نے چلتے چلتے پوچھا۔

"بہت زبردست۔" میں نے کہا۔ "ان میں بہت صلاحیتیں ہیں۔ علم ہے ان کے پاس، مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ ایسا پڑھا لکھا دانشور قسم کا امام ایک دور دراز کے گاؤں کی چھوٹی سی مسجد میں کیا کر رہا ہے۔"

"یہی تو میں بھی سوچتا ہوں ناظم صاحب۔" جمال جلدی سے بولا۔ "امام صاحب ہمارے ادارے کے لیے بہت مفید ہو سکتے ہیں۔"

اب میں یہاں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں تحقیق اور تصنیف کے ایک بڑے ادارے سے تعلق رکھتا ہوں، جہاں ساٹھ ستّر کے قریب اسکالر کام کرتے ہیں۔ ہم سالانہ کئی موضوعات پر کتابیں شائع کرتے ہیں۔ میرا نام ناظم نہیں ہے بلکہ خورشید علی خان ہے۔ چونکہ میں ہی اس ادارے کا ناظم ہوں، اس لیے سب ناظم ناظم کہتے ہیں۔

"تم نے وہی کہا ہے جمال جو میرے دل میں تھا۔" میں نے کہا۔ "امام صاحب کے حالات یہاں کیسے ہیں؟"

"بہت خستہ اور خراب۔" اس نے بتایا۔ "چار ہزار روپے مہینے کے ملتے ہیں۔ مسجد کے برابر ایک چھوٹا سا کمرا بنایا ہوا ہے۔ ان کی رہائش [illegible] ہے۔ بے چارے اکثر پریشان رہتے ہیں۔"

"ظاہر ہے۔ آج کل چار ہزار روپوں میں کیا ہوتا ہے۔ تم ان سے میری میٹنگ کا بندوبست کرواؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ میرے ادارے میں کام کریں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔ چلیں آج عصر [illegible] مسجد میں پڑھتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "عصر سے مغرب تک [illegible] کے پاس وقت ہوتا ہے۔ ہم ان سے بات کر سکیں گے۔"

مجھے دوسری صبح اس گاؤں سے واپس بھی جانا تھا۔ میں صرف جمال کی علالت کا سن کر آیا تھا لیکن وہ ماشاءاللہ صحت مند ہو چکا تھا، تھوڑی بہت کمزوری تھی۔ اسے بھی ختم ہو جانا تھا۔

ہم نے جمال کے گھر جا کر کھانا کھایا۔ کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر عصر کے وقت مسجد کی طرف چل پڑے۔ عصر کی نماز کے بعد جب جمال نے میرا ان سے تعارف کروایا تو بہت گرم جوشی سے ملے۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود اپنے کمرے میں جا کر ہمارے لیے چائے بنائی اور کچھ بسکٹ وغیرہ لے کر آگئے۔

اس شخص کی انکساری نے بھی مجھے متاثر کیا تھا پھر جب میں نے ادارے میں جاب کی بات کی تو وہ کہہ اٹھے۔ "ارے صاحب آپ نے تو مجھے گویا خرید لیا ہے۔ برسوں کی تمنا تھی کہ اس ادارے کے لیے کوئی کام کروں، لیکن کوئی راستہ ہی نہیں مل رہا تھا۔"

"بہت خوب، یہ تو اچھی بات ہے کہ آپ ہمارے ادارے سے واقف ہیں۔"

"کیوں نہیں جناب، میرے پاس آپ کے ادارے کی کئی کتابیں ہیں۔" اس نے بتایا۔

"چلیں تو پھر ہمارے یہاں آجائیں، آپ کی تنخواہ پچیس ہزار ہوگی، فی الحال۔ بعد میں خدا نے چاہا تو اور بہت کچھ ملتا رہے گا۔"

امام صاحب کی خوشی ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ کہاں چار ہزار اور کہاں پچیس ہزار، آسمان زمین کا فرق تھا۔

"میں حاضر ہوں جناب! یہاں کے معاملات میں اپنے شاگرد کے حوالے کر جاؤں گا۔ وہ حافظ قرآن ہے اور میری جگہ امامت کر سکتا ہے۔"

"بس تو پھر بسم اللہ کر کے تشریف لے آئیں۔" میں نے کہا۔

میں تو اسی شام کو جمال کے گاؤں سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا تھا جب کہ جمال دوسرے دن آیا تھا اور امام صاحب چار پانچ دنوں کے بعد آئے تھے۔

میں نے ان کی سہولت کے لیے ایک کام یہ کیا کہ انہیں ایک مہینے کی تنخواہ ایڈوانس میں دلا دی تھی جس کے لیے وہ بے حد شکر گزار ہوئے تھے۔

ہمارے ادارے کی باؤنڈری وال بہت وسیع و عریض تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ کچھ کمرے بھی بنے ہوئے تھے جن کے ساتھ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

یہ کمرے ان ریسرچ کرنے والوں کے لیے بنائے گئے تھے جو دوسرے شہروں سے آیا کرتے اور ریسرچ کا کام بھی کیا کرتے۔

امام صاحب کے لیے ایک کمرا مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ انہیں تھوڑا بہت فرنیچر بھی مہیا کر دیا گیا۔ یہ سب ادارے کی جانب سے تھا۔

امام صاحب نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ وہ محنتی آدمی تھے۔ امام صاحب کا نام انور حسین تھا۔ ان میں قابلیت تو پہلے سے موجود تھی، ہمارے ادارے میں آ کر ان کی علمیت منظم بھی ہو گئی تھی۔ وہ اس بات کے پابند تھے کہ دن بھر جو کام بھی کریں، اس کی رپورٹ مجھے پیش کریں۔

دس پندرہ دنوں تک یہی ہوتا رہا۔ ان کے کاموں میں ریسرچ کے ساتھ ساتھ ان کے حواشی اور تبصرے بھی شامل ہوا کرتے جو بہت پُر مغز ہوتے اور اندازہ ہو جاتا کہ اس شخص کی سوچ میں کتنی گہرائی ہے۔

ایک شام میں یوں ہی امام صاحب کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ ان سے یہ معلوم کروں کہ یہاں انہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔

امام صاحب کے کمرے میں چار پانچ آدمی بیٹھے تھے جن کا تعلق ہمارے ادارے سے نہیں تھا وہ باہر کے لوگ تھے۔

امام صاحب نے ان لوگوں سے میرا تعارف کروایا۔ "یہ سب میرے رشتے دار ہیں، یہیں شہر میں رہتے ہیں انہیں جب معلوم ہوا کہ میں یہاں آ گیا ہوں تو سب ملنے آئے ہیں۔"

"چلیں یہ تو اچھی بات ہے۔ اس طرح یہاں بھی آپ کا دل لگا رہے گا۔"

ادارے کے سربراہ سکندر حیات صاحب بیرونِ ملک کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ وہ جب واپس آئے تو میں امام صاحب کو ان کے پاس لے گیا۔ میں ان سے امام صاحب کی تعریف پہلے ہی کر چکا تھا۔

سربراہ نے مجھ سے کہا۔ "ناظم صاحب! جب آپ نے انتخاب کیا ہے تو سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔"

"جی جناب۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ "ایک اچھا اسکالر اور وسیع سوچ رکھنے والا شخص ہے۔"

سربراہ بھی امام صاحب سے مل کر اور ان سے باتیں کر کے خوش ہوئے تھے۔

کئی مہینے گزر گئے۔ ایک دن جمال نے مجھے ایک عجیب بات بتائی۔ "ناظم صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ امام صاحب اکثر چیف کے پاس جاتے رہتے ہیں۔" (سربراہ کو ہم چیف ہی کہا کرتے تھے۔)

"یہ تو مجھے نہیں معلوم تھا لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ کام کرنے والوں کا واسطہ تو چیف سے پڑتا ہی رہتا ہے۔"

"وہ تو ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے کچھ گڑبڑ سی لگ رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"ارے کس بات کی گڑبڑ؟"

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا لیکن کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ آپ دھیان رکھیے گا۔"

ان دنوں ہمارے ادارے میں سوچ بچار کے موضوع پر جون پال منڈا کی کتاب The Psycology of Thinking کا ترجمہ ہو رہا تھا۔ یہ ترجمہ میں ہی کر رہا تھا کیونکہ یہ ایک پیچیدہ اور مشکل کتاب ہے۔

مسودہ تقریباً تیار تھا لیکن جب نظرِ ثانی کی تو اندازہ ہوا کہ اس میں تھوڑی بہت غلطیاں رہ گئی ہیں۔ یہ غلطیاں اصطلاحات کی تھیں۔ میں نے انہیں نشان زد کر کے مسودہ ایک طرف رکھ دیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ فرصت ملی تو ان کو دیکھ لوں گا۔

اس دن فرصت تھی اس لیے میں نے مسودہ میز کی دراز سے نکالنا چاہا لیکن وہ مسودہ میز کی دراز میں نہیں تھا۔ میں نے دوسری دراز میں دیکھا، فائلیں دیکھیں لیکن کہیں بھی نہیں ملا۔ نہ

جانے کہاں چلا گیا تھا۔ مجھے اپنی ساری محنت اکارت جاتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے اپنے ماتحت عملے سے دریافت کیا لیکن کوئی بھی اس مسودے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس دوران چپراسی نے آ کر بتایا کہ چیف صاحب مجھے یاد کر رہے ہیں۔

میں جب ان کے کمرے میں پہنچا تو وہی مسودہ ان کی میز پر رکھا ہوا تھا۔

"تشریف رکھیے ناظم صاحب۔"

میں بیٹھ گیا۔ ویسے میں اس مسودے کو ان کے پاس دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

"ناظم صاحب یہ مسودہ آپ ہی کا ہے نا؟" سربراہ نے مسودے کی طرف اشارہ کیا۔

"جی ہاں! یہ میرا ہی ہے اس لیے میں آپ کے پاس دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔"

"ناظم صاحب! اگر آپ برا نہ مانیں تو یہ کہوں کہ اس میں اصطلاحات کی بے شمار غلطیاں ہیں۔"

"بے شمار تو نہیں کچھ غلطیاں ہیں جن کو درست کرنا تھا اس لیے میں نے نشان زد کر کے مسودہ ایک طرف رکھ دیا تھا۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ آپ کے پاس کہاں سے آ گیا اور کیوں آ گیا۔"

"اب اس بات کو چھوڑیں کہ کہاں سے آ گیا، بہر حال لے جائیں یہ ایک ضروری کتاب ہے اور اس ہفتے پریس جانا

میں بہت جھلاتے ہوئے ان کے کمرے سے باہر آ گیا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ حیرت تو یہ تھی کہ وہ مسودہ ان کے پاس کیسے چلا گیا۔ کون لے گیا تھا ان کے پاس۔

یہ راز اس دن کھل گیا۔ اس کی اطلاع جمال نے دی تھی۔ "ناظم صاحب! کیا آپ کو اندازہ ہے کہ وہ مسودہ چیف کے پاس کیسے چلا گیا تھا؟"

"نہیں تو، میں تو اس بات پر حیران ہو رہا ہوں۔"

"یہ آپ کے خلاف سازش ہے ناظم صاحب۔"

"سازش! میرے خلاف کون سازش کر رہا ہے۔"

"وہی امام صاحب جن کو میں نے اور آپ نے بہت اچھا سمجھا تھا۔" اس نے بتایا۔ "انہوں نے چیف کے پاس جا کر وہ ساری غلطیاں بتائی ہیں جن پر آپ نے نشانات لگائے تھے اور انہوں نے یہ بتایا کہ یہ ساری غلطیاں خود انہوں نے نشان زد کی ہیں۔"

"کیا!" میں حیران رہ گیا تھا۔ "لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"اس طرح کہ دلاور اس وقت اس کمرے میں تھا وہ چیف صاحب کے لیے چائے بنا رہا تھا۔ اس نے امام صاحب کی ساری باتیں سن لی تھیں۔"

دلاور، چیف صاحب کے چپراسی کا نام تھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ امام ایسا کیوں کر رہے ہیں۔"

"سیدھی سی بات ہے ناظم صاحب! وہ اس ادارے میں آپ کی جگہ لینا چاہتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ ایسا نہ ہو، یہ اتفاق ہو۔ ان کا ارادہ ایسا نہ ہو۔ ہم نے تو ان کے ساتھ نیکی ہی کی ہے۔"

"حضرت علیؓ کا یہ قول یاد رکھیں کہ جس کے ساتھ احسان کرو، اس کے شر سے بچو۔" جمال نے کہا۔

دل نہیں مانتا تھا کہ امام صاحب ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ وہ تو بہت خاکسار قسم کے دکھائی دیتے تھے۔ بہر حال میں نے فوری طور پر جمال کی باتوں میں آ کر کوئی کارروائی نہیں کی۔

دو چار دنوں کے بعد میں نے خود ایک ثبوت دیکھ لیا۔ وہ شخص واقعی میرے خلاف سازش کر رہا تھا۔ اس کی یہ سازش بہت گھناؤنی تھی۔

خدا کی پناہ انسان مقام، عہدے اور ذرا سے پیسوں کے لالچ میں اس حد تک بھی کر سکتا ہے، پہلی بار اندازہ ہوا کہ انسان کی کتنی پرتیں ہوتی ہیں۔ وہ پیاز کے چھلکے کی طرح اترتا ہی چلا جاتا ہے۔

میں کبھی کبھی شام کے وقت امام صاحب کے کمرے کی طرف چلا جاتا تھا۔ ان کے ہاتھ کی چائے پینے کے لیے۔ بس یوں ہی وقت گزارنے اور گپ شپ کے لیے سمجھ لیں۔

میرا معمول تھا کہ میں دروازے پر تین چار بار دستک دیتا۔ دروازہ چاہے بظاہر کھلا ہوا کیوں نہ ہو۔

اس شام بھی میں چلا گیا۔

مگر اس بار میرے جانے کا مقصد کچھ اور تھا۔

میں اسے کریدنا چاہتا تھا کہ آخر اس کے دل میں کیا ہے۔ وہ کیوں ایسی حرکتیں کر رہا ہے۔ میں اس سے براہ راست تو سوال نہیں کر سکتا تھا لیکن گھما پھرا کر اس سے معلوم کیا جا سکتا تھا۔

ہر انسان میں سامنے کی بھی کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ میں نے اس کی ایک کمزوری بھانپ لی تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ اپنی تعریف سن کر بہت خوش ہوتا تھا۔ اس کا یہ پہلو بہت کمزور تھا۔ بظاہر انکساری سے گردن جھکا دیتا لیکن اندر ہی اندر

خوش ہوتا رہتا۔ اس کی خوشی اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتی رہتی۔

میں اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اس سے کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے کمرے میں جانے کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں اور ان میں سب سے نمایاں آواز اس امام کی تھی۔

”نہیں نہیں مارنا نہیں ہے اس کو، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ دو چار مہینوں کے لیے بستر پر لیٹ جائے۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“ کسی کی آواز آئی۔

”ارے بھائی پھر یہ ہوگا کہ اس کی جگہ میں لے لوں گا۔ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بس دو چار فریکچر کرنا ہیں۔“

پھر آوازیں دھیمی پڑ گئیں۔ اب میں وہاں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرے چھانے لگے تھے۔

”میرے خدا! اتنی بڑی سازش، کیا بگاڑا تھا میں نے اس امام کا اور اس نے میرے خلاف جو سازش کی تھی وہ کتنی بھیانک تھی یعنی میں اس کا محسن تھا اور اس نے اپنے محسن کو معذور کرنے کی سازش کی تھی اگر میں اتفاقاً اس طرف نہیں آنکلتا اور ان کی باتیں نہیں سن لیتا تو پھر کسی بھی جگہ مجھ پر حملہ ہو جاتا اور خبر یہ آتی کہ نامعلوم افراد نے ناظم صاحب پر حملہ کر کے انہیں معذور کر دیا ہے، میرے خدا۔

ابھی بھی میرے اختیار میں بہت کچھ تھا۔ میں نے جمال کو یہ سب بتایا تو وہ حیرت سے سکتے میں رہ گیا پھر اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”ناظم صاحب خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔“

”کیوں بھائی تم نے کیا ہے جو تم معافی مانگ رہے ہو۔“

میں نے ہی تو اس آدمی کی طرف آپ کی توجہ دلائی تھی۔ اس کی سفارش کی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ اندر سے اتنا گھناؤنا نکلے گا۔“

”جمال! اس آدمی نے علم حاصل کیا ہے لیکن بدقسمتی سے اس کا علم اس کے حلق سے اتر کر اس کے سینے تک نہیں پہنچ سکا ہے اگر ایسا ہوتا تو اس کا سینہ روشن ہو چکا ہوتا۔ علم اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا ہے۔ افسوس ہے اس شخص پر۔“

”اب اس کے لیے کچھ سوچا ہے ناظم صاحب؟“

”کچھ نہیں، یہی کہ اس کو یہاں سے کسی بہانے رخصت کر دیا جائے۔ یہ میں اپنے لیے نہیں کہہ رہا بلکہ ادارے کی بھلائی کے لیے کہہ رہا ہوں جس ادارے میں سازشی ذہن موجود ہوں وہ ادارے کبھی پنپ نہیں سکتے۔“

پھر ادارے سے میں نے کسی بہانے سے اس کو فارغ کر دیا۔

یہاں سے جاتے ہوئے جب وہ مجھ سے ملنے آیا تو اس کے تیور کچھ عجیب سے ہو رہے تھے۔ ”میں یہاں سے جا رہا ہوں ناظم صاحب۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے کس کے کہنے پر ہٹایا جا رہا ہے۔“

”ایسا مت سوچو، یہاں کوئی تمہارا دشمن نہیں ہے۔ بس بات اتنی ہے کہ ادارہ اپنے اخراجات کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”ہاں ہاں میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اخراجات کیسے کم ہو رہے ہیں۔ بہرحال میں تو جا رہا ہوں آپ کو اپنی سیٹ مبارک ہو ناظم صاحب۔“ اس کا لہجہ بہت گستاخانہ تھا۔

وہ چلا گیا۔ میں ... اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

کئی دنوں کے بعد جمال پھر ... گاؤں گیا۔ اس نے واپس آکر جو خبر سنائی وہ بہت حیرت ... اس نے بتایا۔

”ناظم صاحب! امام صاحب جب گاؤں ... اپنا قبضہ لینے پہنچے تو ان کے شاگرد نے امامت چھوڑنے سے انکار کر دیا۔“

”اس شاگرد نے جس کو وہ اپنی جگہ بٹھا کر آئے تھے؟“

”ہاں اس نے۔“ جمال نے بتایا۔ ”شاید اس کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔“

”ہاں اسی کا نام مکافاتِ عمل ہے۔“ میں نے کہا۔

”افسوس کہ امام صاحب عالم تو ہیں لیکن قناعت پسند اور شکر گزار نہیں ہیں، اگر وہ ادارے میں قناعت کر کے بیٹھ جاتے اور اپنی باری کا انتظار کرتے تو ہو سکتا تھا کہ وہ ناظم بھی بن جاتے لیکن انہوں نے اپنی ترقی کے لیے غلط راستے کا انتخاب کیا اور یہ غلط راستہ انہیں برباد کر گیا۔ بہرحال اب وہ کیا کر رہے ہیں؟“

”وہ گاؤں سے بہت دور ایک چھوٹی سی بستی کی چھوٹی سی مسجد میں امامت کر رہے ہیں۔ مسجد کے باہر انہیں ایک کوٹھڑی مل گئی ہے جس پر ٹین کی چھت ہے۔ پندرہ سو روپے مہینا ملتا ہے اور گاؤں والوں کے یہاں سے دن اور رات کے وقت کھانے کے لیے کچھ آجاتا ہے۔“

افسوس کہ اس شخص نے لالچ کے لیے اپنا سب کچھ تباہ کر لیا۔

اذان شروع ہو گئی میں شکر گزاری اور خدا کے عتاب اور اس کی گرفت کے خوف سے مسجد کی طرف چل پڑا۔ جمال میرے ساتھ تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرے اللہ کو ناشکر گزاری کتنی ناپسند ہے۔





موہنی

محترمی مدیر اعلیٰ
السلام علیکم
بعض باتیں عقل کی کسوٹی پر پرکھی نہیں جاتیں مگر انہیں جھٹلایا بھی نہیں جاتا، یہ سچ بیانی بھی ایک ایسی ہی دلچسپ روداد ہے جو ارسالِ خدمت ہے۔ اگر پسند آجائے تو نزدیکی اشاعت میں شامل کرلیں۔

امجد اقبال خان

یہ ان دنوں کی بات ہے جب برصغیر تقسیم نہیں ہوا تھا۔ ہندو پاک ایک تھا۔ میرے دادا کے دوست ڈاکٹر احسن آسام کے شہر دارجلنگ میں رہ رہے تھے۔ دارجلنگ ایک سیاحتی شہر ہے۔ گرمیوں کی آمد سے قبل سیاح آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ سیاحوں میں بڑی تعداد انگریز، سول افسران کی ہوتی تھی اس لیے حکومت نے وہاں اسپتال بنا دیا تھا۔ کہنے کو وہ ایک اسپتال تھا مگر درحقیقت وہ ایک معمولی سا میڈیکل سینٹر تھا۔ ڈاکٹر احسن اس اسپتال کے اکلوتے ڈاکٹر تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ڈاکٹر احسن کی فیملی بھی پاکستان آگئی تھی۔ ہمارے گھرانے سے ان کے قریبی تعلقات

تھے اس لیے ہم اکثر ان کے گھر جایا کرتے تھے کیونکہ ڈاکٹر احسن کا نواسہ میرا کلاس فیلو تھا وہیں مجھے ڈاکٹر احسن کی ایک ڈائری ملی تھی جس میں درج واقعات کو میں نے کہانی کی شکل دے دی ہے۔ ڈائری میں وہ لکھتے ہیں۔

"ایسا بالکل بھی نہیں ہے کہ میں دل پھینک انسان ہوں میں نے اپنے پانچ سالہ میڈیکل کیریئر میں ان گنت خوبصورت بیمار لڑکیوں کا چیک اپ کیا ہے اور خلوص نیت سے کیا ہے، کبھی کسی کو غلط نظر سے نہیں دیکھا۔ پنج وقتہ پکا نمازی ہوں۔ دو خوب صورت، معصوم، ننھی منی بیٹیوں کا باپ اور ایک انتہائی متناسب، حسین عورت کا شوہر ہوں۔ آمنہ بیوی بننے سے پہلے میری محبوبہ تھی جو کہ اب بھی ہے۔

مگر اُس لڑکی میں کچھ اور بات تھی۔ وہ درمیانے قد کی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ وہ اٹھارہ انیس یا زیادہ سے زیادہ بیس سال کی تھی۔ وہ بطور مریضہ میرے اسپتال میں آئی تھی اور اب اپنی باری پر میرے سامنے بیٹھی تھی۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، بھرے بھرے گندمی عارض، بھورے بال اور تن پر میلی کچیلی شلوار قمیص۔ سر اور سینے پر پھیلا ہوا سرخ اور زرد پھولوں والا دوپٹا! اس میں کوئی ایسی بات تھی جس کی وجہ سے میں ہر مریض کی آمد پر دکھائی جانے والی روایتی حوصلہ افزائی اور گرمجوشی بھول کر..... اس کے حسن کی بھول بھلیوں میں کہیں کھو گیا تھا اور ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا، تبھی اس نے اپنی کھنکتی ہوئی آواز میں خود ہی بات کا آغاز کر دیا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ مجھے ٹھیک کردیں گے ناں؟"

میں چونک گیا۔ انہماک ٹوٹ گیا۔ عجب بات کی تھی اس نے صورت سے تو بھولپن جھلکتا ہی تھا، اس کی بات میں بھی غضب کی معصومیت تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کک کیا بیماری ہے...... تت...... تمہیں؟"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا جیسے میرے لفظوں کی لڑکھڑاہٹ اس کے لیے عین غیر متوقع ہو۔ بولی۔ "ڈاکٹر صاحب! انگریزی علاج نے بہت ترقی کرلی ہے ناں...... اب تو پیچیدہ سے پیچیدہ بیماری بھی قابل علاج ہو چکی ہے۔"

میں تندیدگی سے اس کے چہرے کے ناقابل فہم زاویوں میں کھویا ہوا تھا۔ حسن کیا ہے؟ اب سمجھ میں آیا تھا کہ حسین وہ نہیں ہوتا جس کی آنکھیں خوب صورت ہوں یا جس کے ہونٹ دلکش ہوں یا جس کے رخسار بار جوانی تلے دمک اٹھیں بلکہ حسین وہ ہوتا ہے جس کے حسن کا کوئی پیمانہ نہ ہو۔ جس کے حسن کا کوئی زاویہ عقل میں نہ سمائے۔ حسن اعضاء کے تناسب کا نام ہرگز نہیں بلکہ حسن تو ایسی غیر مرئی کشش کا نام ہے جو دیکھنے والے کو بلا اپنا اسرار عیاں کیے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

جی ہاں! اس لڑکی کو دیکھ کر حسن کی یہی تعریف میری محدود عقل میں آئی تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ استفسار کیا۔ "بیماری کیا ہے؟"

وہی معصومیت لب کشا تھی۔ "ڈاکٹر صاحب! میں زہریلی ہوگئی ہوں۔ آپ مجھے ٹھیک کردیں گے ناں؟"

نہ جانے کیوں میرے اعصاب کھنچ سے گئے تھے۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "کھل کر بتاؤ، کیا بیماری ہے؟"

اور اس نے کھل کر بتا دیا۔ "ڈاکٹر صاحب! میرے بدن میں زہر پھیلا ہوا ہے۔ میں زہریلی ہوں۔ سب مجھے وِش کنیا کہتے ہیں۔"

"وِش کنیا ماضی کے بادشاہان بنایا کرتے تھے۔ اب ایسا ممکن نہیں۔"

وہ بضد رہی۔ "ڈاکٹر صاحب! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے آپ مجھے ٹھیک کردیں گے۔ آپ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔"

"لیکن بیماری بھی تو پتا چلے نا...... یا ایسے ہی علاج شروع کردوں؟" میں نے چڑ کر کہا۔ نظریں بدستور اس کے چہرے پر مرتکز تھیں۔ میں کبھی مریضوں سے سخت لہجے میں گفتگو نہیں کرتا... کیوں کہ وہ بیچارے تو پہلے ہی تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن اس کے سامنے پتا نہیں کیوں میں چڑ گیا تھا۔

وہ میرے سخت لب و لہجے پر روہانسی ہوگئی۔ "ڈاکٹر صاحب! غصہ تو نہ کریں۔ میں علاج کروانے آئی ہوں آپ سے، میرے جسم میں زہر پھیلا ہوا ہے۔ مجھے ہر وقت ایسا لگتا ہے جیسے میرا جسم پھٹ جائے گا یا میری ہڈیاں پگھل جائیں گی۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ڈاکٹر صاحب! آپ مجھے ٹھیک کردیں گے ناں؟"

پھر وہی، آپ مجھے ٹھیک کردیں ناں؟ میرے اعصاب اکڑ گئے میں نے ایک لمبی سانس پھیپھڑوں میں اتاری، پھر کرسی پر بے چینی سے پہلو بدل کر پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"موہنی۔" اس نے مختصراً بتایا۔

موہنی عجیب لڑکی تھی۔ مجھے انگلینڈ سے تعلیم مکمل کر کے آئے پانچ سال ہو چکے تھے۔ مریضوں سے بھرے اس ملک میں ہزاروں بیماروں کا سامنا ہوا تھا مگر موہنی اپنی نوعیت کی واحد مریضہ تھی۔

میں نے زور زور سے چند سانسیں کھینچنے کے بعد اپنے آپ کو حتی المقدور پرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہوئے قدرے نرم لب و لہجے میں استفسار کیا۔ "موہنی! تمہارے ساتھ کون آیا ہے؟"

"کوئی بھی نہیں۔" وہ اپنی موٹی موٹی ساحر آنکھیں مجھ پر گاڑے بتانے لگی۔ "باپو کو کئی مہینوں سے کہہ رہی تھی کہ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں اندر ہی اندر پگھل رہی ہوں، مر رہی ہوں مگر وہ میری سنتا ہی نہیں۔ کیونکہ پہلے بھی کئی وید کئی حکیم سے مل چکی ہوں مگر سب نے انکار کیا تو میں خود ہی بڑے ڈاکٹر کا پوچھ پوچھ کر آپ کے پاس آئی ہوں آپ مجھے ٹھیک کردیں گے ناں؟"

پھر وہی گردان۔ میں نے اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا، کہا۔ "ہاں ہاں فکر مت کرو مگر......"

وہ میری بات سنے بغیر کھل اٹھی۔ اس کے گندمی چہرے پر رنگ ہویدا ہو گئے۔ "میں باپو کو کہتی تھی کہ انگریزوں نے بہت ترقی کرلی ہے۔ اب ہر بیماری کا علاج ہو جاتا ہے مگر وہ مانتا ہی نہیں تھا۔ کہتا تھا یہ کوئی بیماری ہی نہیں تو اس کا علاج کیا ہوگا؟"

اس وقت اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو سچ کہتا ہوں۔ اس کا بھی یہی حال ہوتا۔ مجھے پسینا آگیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "ڈاکٹر صاحب! میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں۔ یہ لیں۔" اس نے مڑے تڑے نوٹ پلو سے کھول کر میز پر رکھ دیے پھر امید بھرے انداز میں بولی۔ "بس ڈاکٹر صاحب! آپ مجھے ٹھیک کردیں۔ میں ساری عمر آپ کو دعائیں دوں گی۔"

میں نے اپنے سامنے بیٹھی اس بھولی بھالی لڑکی کو دیکھا، پھر میز پر پڑے نوٹوں، خدا کی قسم میں بیان نہیں کر سکتا وہ کیسی کیفیت تھی! ایک بار خیال آیا اس خطرناک مریضہ کو بھگا دوں مگر پھر اس کی مسکراہٹ نے میرے قدموں میں زنجیریں پہنا دیں۔ میرے ایک حوصلہ افزا جملے نے اس کی دلآویز مگر پیاس سے خشک لبوں پر جو مسکراہٹ دوڑائی تھی مجھ میں اس مسکراہٹ کو مسخ کرنے کا یارا نہ تھا۔

"میں ضرور تمہارا علاج کروں گا۔" میرے منہ سے نکلا۔

وہ مسرت و سرشاری سے والہانہ انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بہت دھیمی مگر بہت گہری مسکراہٹ رقصاں تھی۔

مریض کے چیک اپ کے لیے عموماً بہت کم وقت درکار ہوتا ہے مگر جب دیر تک موہنی باہر نہیں نکلی تو کمپاؤنڈر نے اندر جھانکا۔ "ڈاکٹر صاحب! باہر ابھی بہت سارے مریض انتظار میں ہیں۔"

میں نے کچھ سوچ کر موہنی سے کہا۔ "موہنی! تم باہر جا کر بیٹھ جاؤ۔ میں باقی مریضوں کو بھگتا لوں۔ پھر تمہارا تفصیلی معائنہ کروں گا۔"

موہنی کی آنکھوں میں امید و بیم کے چراغ روشن ہو چکے تھے۔ وہ اٹھی اور باہر چلی گئی۔ میں نے باقی مریضوں کا کسی قدر اضطراب اور بے دلی سے چیک اپ کیا...... آخر میں موہنی کو اندر بلوالیا۔ "ہاں تو موہنی! دوبارہ بتاؤ اپنی بیماری کے بارے میں۔"

وہ بولی۔ "میرے باپو کا کیا دھرا ہے یہ سب۔ بچپن سے مجھے سانپوں کا زہر چٹا رہا ہے۔"

حیران کر رہی تھی وہ مجھے۔ کہانیوں اور فلموں میں ایسا سنا تھا کہ انسانی جسم زہریلے ہو جاتے ہیں مگر موہنی کی صورت میں حقیقت میں ایسا ایک مریض اپنے روبرو دیکھ رہا تھا۔

"لیکن کیوں اور کیسے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

موہنی نے انگلیاں مروڑتے ہوئے بتایا۔ "میں نے جب سے آنکھ کھولی ہے، ہوش سنبھالا ہے، اپنے آپ کو اپنے باپو کے ساتھ جنگلوں میں بھٹکتے پایا ہے۔ باپو نایاب سانپوں کی تلاش میں رہا کرتا ہے۔"

میں انگشت بدنداں اس موہنی کی من موہنی صورت تک رہا تھا۔ کیا اس جدید دور میں بھی ایسا ہوتا ہے؟ وہ سپیرے کی بیٹی تھی میں نے پوچھ لیا۔ "اور تمہاری ماں؟"

"وہ میری پیدائش کے وقت مر گئی تھی۔" موہنی نے بدستور اپنی گود میں رکھے اپنے نرم و ملائم چھوٹے چھوٹے خوب صورت ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے بتایا۔ "باپو کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

"تمہارا باپو کہاں ہے؟" میں نے محویت کے عالم میں سوال کیا۔

"وہ شہاب نگر گاؤں والے جنگل میں ہے۔"

"یہ گاؤں یہاں سے کتنے کلومیٹر دور ہے؟"
"بس پر تین گھنٹے لگ جاتے ہیں۔"
میں نے کہا۔ "اگر تمہارے علاج پر زیادہ دن لگ گئے تو؟"
"تو بھی میں تیار ہوں۔" وہ فوراً بولی۔ "آپ بس علاج شروع کریں۔"
میں نے پیشانی مسلتے ہوئے اس کے صبیح چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ رہو گی کہاں؟ کوئی ٹھکانا وغیرہ ہے یہاں؟"
"میں کہیں بھی رہ لوں گی۔ یہ دھرتی بہت وسیع ہے۔ سڑک پر سو جاؤں گی رات کو۔" وہ بول رہی تھی۔ "آپ بس میرا علاج کردیں۔ مجھے ٹھیک کردیں۔"
میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ اس کے عقب میں بند دروازہ تھا اور دروازے پر ایک پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ اس تصویر میں ایک لڑکی مسکرا رہی تھی۔ مسکراہٹ دنیا کی سب سے خوب صورت سوغات ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے موہنی مسکرائی تھی تو یوں لگا تھا جیسے رگوں میں نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی ہو۔ میں نے بولنے کی سعی کی مگر لبوں کا ساتھ لفظوں نے چھوڑ دیا تھا۔ صرف آنکھیں ساتھ دے رہی تھیں اور وہ بھی جیسے موہنی کی سوہنی صورت کی غلام ہو کر رہ گئی تھیں۔ پھر میں میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے بولا۔ "موہنی! انسانی جسم میں زہر پھیل جائے تو انسان زندہ نہیں رہتا۔ پھر تم کیسے زندہ ہو؟"

وہ جیسے میری کم علمی پر محظوظ ہوئی تھی۔ پھر معلومات افزاء انداز میں مسکرا کر بولی۔ "ڈاکٹر صاحب! اگر تھوڑی تھوڑی مقدار میں زہر کسی کے جسم میں طویل عرصے تک اتارا جائے تو کوئی مرتا نہیں بلکہ زہر کا عادی ہو جاتا ہے۔ خون زہریلا ہو جاتا ہے، نس نس میں زہر پھیل جاتا ہے اور پھر نشہ بن جاتا ہے۔ اب تو میں کسی خطرناک ناگ سے بھی اپنے آپ کو ڈسوالوں تو کچھ نہیں ہوتا بلکہ سکون ملتا ہے۔" پھر وہ ہنسی۔ "آپ مجھے نشئی کہہ لیں لیکن میں اس نشے سے تنگ آگئی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا جسم پھٹ جائے گا یا پانی بن کر بہہ جائے گا۔"
میں دم بخود بیٹھا، اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔
"ڈاکٹر صاحب! آپ میرا علاج کب شروع کریں گے؟"
جی میں آئی کہ کہہ دوں کہ میں اس مرض کا علاج نہیں کرسکتا، اس مرض کا میرے پاس کوئی علاج نہیں مگر پھر میرا دل میرے خیالات کے سامنے مزاحم ہوگیا۔ نہیں اس لڑکی کی امیدوں کے چراغ بجھا کر اس کے ساحر لبوں سے میں مسکراہٹ چھیننے کا گناہ نہیں کروں گا۔
میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ آس بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے خاموش اور سوچوں کے بھنور میں غلطاں دیکھ کر اس کے لب پھڑکے۔ "ڈاکٹر صاحب! میں ٹھیک ہو جاؤں گی ناں؟"
میرا [illegible] میں آگیا۔ "آں...... ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں۔"
"پھر جلدی [illegible] شروع کردیں۔ کہیں میں مر ہی نہ جاؤں۔"
میں نے اس کی آنکھوں [illegible]، کیا یہ بدن خاک کا پیوند بن کر اپنے لازوال زاویوں [illegible] کشش سے محروم ہو جائے گا؟ کیا یہ آنکھیں مرجائیں گی [illegible]۔
"کیا ہوا ڈاکٹر صاحب۔" مجھے خاموش پا کر اس نے پوچھا۔
"کچھ نہیں کچھ بھی نہیں۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔ پھر اپنی کرسی چھوڑی اور سرنج لے کر میز کا چکر کاٹ کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ وہ سوالیہ انداز نگاہوں سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے کہا۔ "اپنا بازو ننگا کرو۔ میں ٹیسٹ کے لیے تمہارا خون لینا چاہتا ہوں۔"
اس کے بھرپور جسم کے قریب جا کر مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنی بڑی قیامت تھی۔ جی چاہا کہ اسے بھینچ کر سینے میں چھپالوں۔ اس زہریلی لڑکی کو اتنا بھینچوں کہ اس کے جسم میں سے زہر کا قطرہ قطرہ نکل جائے۔
وہ گھبرا گئی۔ بولی۔ "مگر ڈاکٹر صاحب! کتنا خون؟"
میں نے بتایا۔ "تھوڑا سا۔"
اس نے اپنے بازو کو ننگا کردیا۔ دل میں گدگدی سی ہوئی۔ میں نے سوئی اس کے بازو میں چبھوئی تو وہ بولی۔ "ڈاکٹر صاحب! میرا خون زہریلا ہے۔ اس کا ایک قطرہ بھی آپ کے ہاتھ پہ نہیں لگنا چاہیے ورنہ آپ کے بدن میں بھی زہر پھیل جائے گا۔"
میں چپ رہا۔ سرنج میں خون دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے مگر اس کے جسم سے جو خون سرنج میں نکلا تھا وہ گہرا کالا مگر سبزی مائل تھا۔ اب تو یقین ہوگیا کہ اس کے بدن میں واقعی زہر پھیلا ہوا ہے۔

مگر مجھے سمجھ نہ آئی کہ اس خون کا کیا کروں، اس زہر کا کیسے معائنہ کروں؟ خون کا تجزیہ صرف لکھنے میں ہوتا ہے۔ تجزیہ کرا بھی لوں تو فائدہ کیا؟ میں اس کا علاج نہیں کرسکتا تھا پھر بھی نجانے کیوں اس کو امید بندھا رہا تھا۔
کمپاؤنڈر نے اندر جھانکا۔ میں مدعا سمجھ گیا۔ "راشد! تم اب جاؤ۔"
اس نے بہ نظر تحیر باری باری مجھے اور موہنی کو دیکھا مگر چونکہ وہ مجھ جیسے انسان سے کسی غیر اخلاقی حرکت کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ لہٰذا مجھے اور نوجوان موہنی کو چھوڑ کر گھر چلا گیا۔
"ڈاکٹر صاحب! میرا علاج اس خون سے ہو گا؟" معصوم موہنی کا معصوم سوال مجھے ایک مرتبہ پھر خیالوں کی تلپٹ دنیا سے لمحہ موجود میں گھسیٹ لایا تھا۔
میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی کوئی جواب نہ بن پڑا تو میں چپ ہی رہا۔
میں اسی کشمکش میں گم تھا کہ فون کا بزر سنائی دیا۔ میں نے کریڈل سے ریسیور اٹھایا۔ آمنہ کی آواز سنتے ہی کہا۔
"ہیلو! ہاں آمنہ! مریضوں سے ابھی فارغ ہوا ہوں۔"
میری بیوی کہہ رہی تھی۔ "آج ہم نے ونی گارڈن کی طرف بھی جانا تھا ڈنر پر۔ جلدی آجائیں۔ تیاری پر کچھ وقت تو لگے گا نا۔"
"میں ابھی نکل رہا ہوں۔" میں نے کہا۔
پھر موہنی کی طرف دیکھا۔ وہ عام سے انداز میں دیکھا [illegible] کی طرح ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "موہنی! مجھے گھر جانا ہے۔ تمہارا علاج کل سے شروع ہوگا۔"
"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! ابھی میں جاؤں؟" وہ بولی۔
"کہاں جاؤ گی؟" [illegible] پوچھا۔
"یہیں کہیں سڑک کنارے [illegible] جاؤں گی۔ صبح کا انتظار کروں گی۔"
یہ ایک خطرناک بات ہوتی۔ اکیلی لڑکی کے ساتھ کوئی بھی حادثہ ہوسکتا ہے۔ میں نے کہا۔ "میں اسپتال باہر سے بند کر کے جا رہا ہوں۔ تم یہیں اندر سو جاؤ۔ صبح میں آجاؤں گا پھر دیکھیں گے۔ یہاں ہر سہولت موجود ہے۔"
میں باہر جانے لگا تو پھر کچھ سوچ کر مڑا۔ "تمہیں بھوک تو لگی ہوگی؟"
اس نے سادگی سے اثبات میں سر ہلایا تو میں باہر نکل گیا۔ بازار سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں خریدیں اور موہنی کے حوالے کیا اور دروازہ باہر سے بند کر کے گھر چلا آیا۔
میں اور آمنہ ونی گارڈن کی طرف گئے۔ بے تکلف ڈنر کے بعد واپس گھر آگئے۔ میری سوچیں بدستور موہنی میں الجھی ہوئی تھیں۔ آمنہ بیڈ پر نیم دراز تھی۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پٹ کھولے اور باہر دیکھنے لگا۔ نجانے کیوں میرا دل گھبرا رہا تھا۔ اپنے شانے پر لطیف لمس کا احساس پا کر مڑ کر دیکھا تو سامنے آمنہ کھڑی تھی۔ آنکھیں ملیں تو وہ محبت سے مسکرائی۔ "آپ ڈنر پر بھی گم صم تھے۔ کیا بات ہے؟"
میں جواب دینے کے بجائے آمنہ اور موہنی کی مسکراہٹوں کا تقابل کرنے لگا۔ میں ایسا کیوں کر رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم مگر آمنہ کی مسکراہٹ جو پہلے مجھے بہت دلآویز لگتی تھی، آج پھیکی سی لگ رہی تھی، آہ! مسکراہٹ ایسی ہونی چاہیے جو دل کو مٹھی میں لے لے اور ایسی مسکراہٹ آمنہ کے پاس نہیں تھی۔ ہاں! ایسی مسکراہٹ صرف موہنی کے پاس تھی۔
آمنہ مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔
"ساحر!" اس نے مجھے جھنجوڑا۔
"ہاں...... آں......" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔
"کوئی پریشانی ہے؟" وہ متفکر نظر آرہی تھی۔
"نہیں۔" میں نے گومگو انداز میں جواب دیا۔
"اگر آپ نے مجھے اصل بات نہیں بتائی تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔"
میں نے اس کے ایکدم بے کشش ہوتے چہرے کو دیکھا۔ موہنی کے تابدار حسن نے اس کی کشش کو زائل کردیا تھا۔ میں نے موضوع بدل دیا۔ "کاشفہ اور سلیمہ سو گئیں؟"
"ہاں کچھ دیر پہلے۔"
اس سے پہلے کہ وہ مجھے جذباتی چھیڑ کے لگاتی میں بادل نخواستہ اسے تھام کر بیڈ پر لایا اور ڈھے سا گیا مگر اس کے جسم کی لطافتیں بے اثر تھیں۔ ایکدم میرے ذہن میں آیا کہ اگر آمنہ کی جگہ موہنی ہوتی تو؟ میں تڑپ کر اس سے الگ ہوگیا جیسے موہنی کے جسم کا زہر قطرہ بہ قطرہ میری رگوں میں سرائیت کر جائے گا۔ آمنہ متعجب سی ہو کر مجھے گھورنے لگی۔ وہ غصہ ہوگئی۔ آخر آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ جب سے آئے ہیں اتنا عجیب سا رویّہ کیوں ظاہر کر رہے ہیں؟"

میں نے جھوٹی صفائی دینے کی کوشش کی۔ "پلیز آمنہ! میری طبیعت ٹھیک نہیں، مجھے سانس لینے میں دشواری ہورہی ہے۔"

"آپ خود ڈاکٹر ہیں۔" اس نے گویا یاد دہانی کروائی۔

میں چپ چاپ لیٹ کر گہری سانسیں لینے لگا۔ آنکھیں موندھ لیں۔ آمنہ میرے قریب ہوکر آہستہ آہستہ میرا سر دبانے لگی۔

رات بارہ بجے میں نے اپنے پہلو میں لیٹی آمنہ کو دیکھا جو گہری نیند سو رہی تھی۔ بلا سوچے سمجھے میں دبے قدموں کمرے سے باہر نکل آیا۔ طبیعت بے چین سی ہورہی تھی۔ شب خوابی ہی کے لباس میں اسپتال کی چابی اٹھا کر میں گاڑی باہر نکال کر اسپتال کی طرف روانہ ہوگیا جو پچیس منٹ کی مسافت پر تھا۔ نکلنے سے پہلے میں نے ملازم کو صرف اتنا بتایا کہ بی بی جاگ جائیں تو کہہ دینا کہ صاحب ایک ایمرجنسی کیس کو ہینڈل کرنے گئے ہیں۔

میں نے اسپتال کا دروازہ کھولا۔ سارے بلب جل رہے تھے۔ ہر چیز اسی طرح موجود تھی جیسے میں شام کو چھوڑ کر گیا تھا۔ اندر سے دروازہ بند کرنے کے بعد میں نے ادھر اُدھر کا جائزہ لیا تو موہنی کا ہوش گم کردینے والا سراپا لیے قیامت ...... دیوار کے ساتھ قالین پر پڑا ہوا نظر آیا۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ لہو کی گردش اور دل کی دھڑکن کئی گنا تیز ہوگئی۔ میرے ہاتھوں میں واضح لرزش پیدا ہوگئی اور ٹانگیں بھی کانپنے لگیں۔

وہ جاگ رہی تھی۔ سوئی نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھی اور دیوار کے ساتھ پشت ٹیک کر بیٹھ گئی۔ وہ مجھے حیرانی کی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے پوچھ رہی ہو کہ ڈاکٹر صاحب یہ کون سا وقت مریضوں کا علاج کرنے کا ہے؟

مجھے کوئی اور بات نہ سوجھ پائی تو میں نے لرزاں لب و لہجے میں کہا۔ "موہنی! تم ابھی سوئی نہیں۔"

وہ خمار آلود آواز میں جواباً بولی۔ "بتایا تو تھا آپ کو کہ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ جسم میں زہر سلگ رہا ہے۔ نیند کیسے آئے؟"

میں اس کے قریب گیا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دور ہوگئی۔ میں نے کہا۔ "موہنی! مجھ سے دور مت بھاگو۔"

وہ بولی۔ "آپ اس وقت کیسے آگئے؟ آپ نے تو صبح آنا تھا؟"

"تمہاری یاد تڑپا رہی تھی۔ نیند نہیں آرہی تھی۔" غیر ارادی طور پر حقیقت میرے منہ سے پھسل گئی۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ نیم والیوں اور موٹی موٹی آنکھوں میں حیرت موجزن تھی۔

اسے خاموش پاکر میں نے ہمت جمع کی، کہا۔ "موہنی! مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

وہ [illegible] اور [illegible] ہوگئی۔ اپنے گھٹنوں پر چہرہ رکھ کر مجھے دیکھنے لگی۔ "میرے [illegible] زہر پھیلا ہوا ہے ڈاکٹر صاحب! آپ کیسی باتیں کررہے [illegible] میں کبھی کسی مرد کے قریب نہیں جاسکتی۔ میں جس چیز پر [illegible] تھوکتی ہوں وہ پانی بن کر بہہ جاتی ہے۔ میں جس کو زور سے چھو [illegible] کے جسم پر نیلے رنگ کے چھالے بن جاتے ہیں، ڈاکٹر صاحب! میں کتنی مرتبہ آپ کو بتا چکی ہوں کہ میرے جسم میں سانپوں کا زہر بھرا ہوا ہے۔"

میں اس کے قریب ہوکر بولا۔ "موہنی! مجھے مت روکو۔ اپنے قریب آنے دو، ورنہ میں مر جاؤں گا۔ تمہارا علاج کرنے سے پہلے مرجاؤں گا۔"

وہ خوف زدہ سی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جھپٹ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے جھٹکے سے اپنے قریب کرنا چاہا مگر اس سے پہلے اس نے زوردار جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور بھاگ کر ٹیبل کی دوسری طرف چلی گئی۔ میرے ہاتھوں میں اس کے کومل ہاتھ کا لمس باقی رہ گیا۔

میز کی دوسری طرف کھڑی موہنی روہانسی ہوگئی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر ملتجیانہ انداز میں بھرائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ کو بھگوان کا واسطہ دیتی ہوں۔ اپنی جان کے دشمن مت بنیں۔ میرے قریب آنے کی غلطی مت کریں۔ آپ کیوں نہیں سمجھ رہے کہ میں زہریلی ہوں۔"

جب جذبات غالب آتے ہیں تو کچھ نظر نہیں آتا مگر جلد ہی میرے جذبات کو بریک لگ گئی۔ موہنی نے دیواروں کا جائزہ لیا۔ گھڑیال کے ساتھ بلب کے قریب ایک چھپکلی موجود تھی۔ موہنی جلدی سے میز پر چڑھی اور پھر اس نے چھپکلی پر تھوک دیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے عجب منظر دیکھا۔ اس کے تھوکتے ہی وہ چھپکلی گاڑھا سیال بن کر دیوار پر بہہ گئی۔ میں دم بخود سا موہنی کی صورت دیکھنے لگا۔ جذبات کا



نشہ چشم زدن میں ہرن ہوگیا تھا۔

وہ میز سے نیچے اتر آئی۔ "دیکھ لیا ڈاکٹر صاحب! آپ بھی اسی طرح بہہ جائیں گے۔"

میں نے سانس کو زور سے پھیپھڑوں میں کھینچا۔ کافی دیر تک میں ہکا بکا دیوار پر دیکھتا رہا، جہاں کچھ دیر پہلے ایک چھپکلی محوِ حرکت تھی۔ اب محض نیم سیاہ چھ انچ لمبی لکیر رہ گئی تھی۔

میں نے موہنی کی طرف دیکھا، جو اپنے بالوں کو سمیٹتی ہوئی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے لکنت زدہ آواز میں کہا۔ "م...... موہنی! تم سو جاؤ۔ میں کل آؤں گا۔"

میں تیزی سے باہر آگیا۔

آمنہ اسی طرح سو رہی تھی۔ اسے خبر تک نہیں ہوئی تھی کہ میں اسپتال سے ہوکر آچکا تھا۔ میں دیر تک اس کے پہلو میں لیٹا خالی الذہنی کی کیفیت میں چھت کو گھورتا رہا، پھر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح پانچ بجے آمنہ کے اٹھانے پر میری آنکھ کھلی۔ میں نے آنکھیں پٹ پٹا کر اسے دیکھا جو پھٹی پھٹی نگاہوں سے میرے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ "کیا ہوا آمنہ؟ اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہو؟"

وہ خوف زدہ آواز میں ہکلاتے ہوئے بولی۔ "ساحر! ی...... یہ آپ کے چہرے پر چھالے؟"

"کیا؟" میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ "کون سے چھالے؟"

وہ دہشت زدہ آواز میں بولی۔ "آپ آئینے میں دیکھیں۔"

میں [illegible] آئینے کے روبرو آیا تو اپنا چہرہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ میرے چہرے پر نیلے رنگ کے چھالے بنے ہوئے تھے جن میں [illegible] بھری ہوئی تھی۔ میں دہشت زدہ سا ہوکر آئینے میں اپنے [illegible] دیکھ رہا تھا۔ ایک چھالا آنکھ کے نیچے رخسار پر ابھرا ہوا [illegible] ٹھوڑی کے بائیں ہاتھ جب کہ تیسرا بائیں کنپٹی پر۔ تکلیف [illegible] رہی تھی مگر میں اندر تک دہل گیا تھا۔ موہنی نے کہا تھا کہ [illegible] اسے زور سے چھو لیتا ہے، اس کے جسم پر چھالے بن جاتے ہیں۔ رات کو میں نے موہنی کو زور ہی سے پکڑا تھا۔ موہنی کو یاد کر کے میں اور بھی لرز گیا تھا۔ کیا میرے جسم میں زہر پھیل گیا تھا؟ میں بے دم سا ہوکر بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ دل ڈوبتا محسوس ہورہا تھا۔

آمنہ کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ پھٹی پھٹی آواز میں گویا ہوئی۔ "یہ کیا ہے ساحر؟"

میں تو خود پریشان اور خوف زدہ سا بیٹھا تھا۔ اسے کیا جواب دیتا؟ اسے کیسے تسلی دیتا؟ وہ منہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی تو میں گھبرا گیا۔ میں نے کہا۔ "مت روؤ آمنہ! بچے یہاں آجائیں گے۔"

وہ آواز دبا کر آنسو بہانے لگی۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "یہ کوئی خاص بات نہیں آمنہ! ایسا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی مریض کے جراثیم ڈاکٹر کو لگ جاتے ہیں۔ ایسے ہی جراثیم کے نتیجے میں یہ چھالے بن گئے ہیں مگر اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہوجاؤں گا۔"

وہ بدستور رو رہی تھی۔ اسے تسلی دینے کے لیے میں نے جھوٹ کو طول دیا۔ "لندن میں ہمارے پروفیسر صاحب کے ساتھ بھی ایک دفعہ یہی مسئلہ ہوا تھا۔ دو تین روز میں یہ خود بخود مٹ جائیں گے۔"

اس جھوٹ کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ چپ ہوگئی۔ میں نے کہا۔ "اب تم جاکر بچیوں کو اٹھاؤ تاکہ وہ نماز پڑھ لیں۔"

آمنہ چلی گئی تو میں نے وضو کرنے کی بجائے کمرے کو اندر سے لاک کیا پھر اپنی شرٹ اتار دی۔ آئینے میں اپنے بالائی جسم کو دیکھ کر میرا دل ڈوب گیا۔ میرے بازوؤں اور سینے پر کئی چھالے موجود ہیں۔ میرے اندر خوف جڑیں پکڑ چکا تھا۔ یہ یقیناً زہر کے چھالے تھے۔ خوف ہی کی وجہ سے میں نے اپنا زیریں جسم نہیں دیکھا۔ یہ نیلے ابھرے ہوئے پیپ بھرے چھالے بالکل بھی تکلیف نہیں پہنچا رہے تھے۔ اس لیے میں تعین نہیں کرسکتا تھا کہ میرے جسم پر کہاں کہاں موجود تھے؟ آمنہ کو تو میں نے کسی حد تک مطمئن کردیا تھا مگر خوف کی وجہ سے میری اپنی حالت غیر تھی۔

میں کافی دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔ پھر شرٹ پہن لی۔ آمنہ باقی جسم پر بھی چھالے دیکھ لیتی تو اس کی حالت مزید خراب ہوجاتی۔ وہ کمرے میں آئی تو تشویش زدہ انداز میں بولی۔ "آپ کے باقی جسم پر بھی چھالے ہوں گے؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی، پھر اپنی سیدھی سادی بیوی کو جھوٹ کا سہارا لے کر تسلی دی۔ "نہیں یہ چھالے صرف چہرے پر بنتے ہیں۔ تم ڈرو نہیں۔ ڈاکٹروں کے ساتھ اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ یہ چھالے خطرناک نہیں ہیں۔"

پھر میں نے اپنی گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ "کاشفہ اور

سلیمہ کہاں ہیں؟"

"وہ ناشتا کر رہی ہیں۔" آمنہ نے بتایا۔ وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے بیٹھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ وہ بزدل سی لڑکی تھی۔ "ابھی میں انہیں اسکول چھوڑنے جاؤں گی۔" پھر وہ لمحاتی توقف کے بعد بولی۔ "جانے سے پہلے وہ تم سے پیار لینے کی عادی ہیں۔"

"ہاں! مگر تم انہیں کہنا کہ آج بابا سو رہے ہیں۔" میں نے بات بنائی۔

"آج تک کبھی ایسا ہوا ہے کہ وہ تم سے ملے بغیر اسکول گئی ہوں؟" آمنہ نے کہا۔ "تم سو بھی رہے ہو گے تو وہ تمہارا منہ چوم کر اسکول جائیں گی۔ میں انہیں کہوں گی کہ بابا غسل خانے میں ہیں۔"

"ہاں...... یہ ٹھیک رہے گا۔" میں نے کہا۔

وہ اسکول چلی گئیں۔ آمنہ انہیں چھوڑ کر آئی تو میں نے کہا۔ "آمنہ! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ دو تین روز تک گھر سے کہیں اور شفٹ ہو جاؤں۔"

وہ بولی۔ "کیا مطلب؟"

"میں گھر میں رہوں گا تو میری بچیاں میرا چھالوں والا چہرہ دیکھ کر خوفزدہ ہو جائیں گی۔ مجبوراً مجھے گھر سے باہر رہنا ہوگا۔"

بات آمنہ کی عقل میں آ گئی۔ وہ مان گئی۔ پھر بولی۔ "مگر آپ رہیں گے کہاں؟"

میں نے بتایا۔ "اسپتال میں سو جایا کروں گا۔ دن کو جب بچیاں اسکول میں ہوں گی تو میں گھر کا چکر لگا لیا کروں گا۔"

آمنہ کا فیصلہ فوراً ہی بدل گیا۔ "نہیں تم گھر میں ہی رہو گے۔ جب بچیاں سو جایا کریں گی تب تم گھر آ جایا کرنا۔ تم جانتے ہو کہ مجھے تمہارے بغیر نیند نہیں آتی۔"

میں نے اس کی بات مان لی۔

☆......☆

وہ مجھے دیکھ کر روہانسی ہو گئی تھی۔ "میں نے آپ سے کہا بھی تھا ڈاکٹر صاحب کہ مجھے مت ہاتھ لگائیں۔ اب نتیجہ دیکھ لیا۔ اب یہ چھالے آسانی سے آپ کی جان نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ میرا بازار سے لایا ہوا ناشتا قالین پر بیٹھی کھا رہی تھی۔ میں اپنی کرسی پر پشت سے ٹیک لگائے محویت کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ "تم بھول رہی ہو شاید۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ سر جھکا کر ناشتا کرنے لگی۔ نہ جانے کیوں اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا مشکل ہو جاتا تھا۔ میں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اس کا جسم سانپوں کے زہر سے بھرا ہوا تھا مگر خدا نے اسے شہکار بنایا تھا۔ میری نگاہیں اس کے تراشیدہ بدن پر بھٹکتے بھٹکتے تھک گئی تھیں لیکن اس کے وجود سے کوئی خامی، کوئی نقص کھوج نہیں پائی تھیں۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ پونچھتی ہوئی اٹھ بیٹھی [illegible] میرے سامنے آ کر اس کرسی پر بیٹھ گئی جہاں میرے مریض بیٹھا کرتے تھے۔ نگاہیں چرا کر بولی۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھتے ہیں؟"

پہلی بار اس کے منہ سے ایسی بات نکلی تھی۔ میں سٹپٹا گیا۔ کوئی معقول جواب نہ بن پایا تو [illegible] "بس یونہی...... تم خوب صورت ہی اتنی ہو کہ میں نگاہیں ہٹا نہیں پاتا۔"

وہ بولی۔ "اب آپ میرا علاج شروع کریں۔"

آہ! میں کیسے اس کا علاج کرتا، میں کیسے اس کی نس نس کو زہر سے پاک کرتا، میں کیسے اس کی رگ رگ سے جان لیوا زہر نچوڑتا؟ بے بسی اور شرمندگی نے مجھ پر یلغار کر دی۔ میں اس کا علاج نہیں کر سکتا تھا تو پھر کیوں اسے امید دلا رہا تھا؟ آخر میں جب اسے کہوں گا کہ میں تمہارا علاج کرنے سے قاصر ہوں تو کیا اس کا دل ٹوٹ نہیں جائے گا؟ میں عجب لاچاری کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ اگر میں ابھی اس کا علاج کرنے سے معذرت کر لیتا اور دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیتا کہ اس کا علاج دنیا کا کوئی ڈاکٹر نہیں کر سکتا تو کیا اس کا دل نہیں ٹوٹتا؟ اور میں ہر قیمت پر اس کا دل ٹوٹنے سے بچانا چاہتا تھا، اس کے شہکار ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتا تھا۔

میں نے ملازم لڑکے کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ نہ آئے۔ پھر میں نے ایک ورق پر لکھا۔ "آج کلینک بند رہے گا۔" اور اسے کلینک کے دروازے پر لگا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

مونی بے تاب ہو رہی تھی۔ میں اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا اور اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔ وہ بدنصیب اپنی رگ رگ میں رچے بسے زہر کی شدت سے بے حال ہو رہی تھی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں مسلسل رت جگوں سے متورم تھیں۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا علاج شروع کریں اب۔"

"نہیں مونی! پہلے میں اپنا علاج کروں گا۔" میں نے اندرونی ابال پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد تمہارا۔"

اس کی آنکھوں میں مایوسی کی لہریں نمودار ہوئیں مگر مان گئی۔ "ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔"

میں نے ضروری سامان اٹھا کر میز پر رکھا اور پھر جھک کر اپنے چہرے کے ایک چھالے کو چیرا لگایا۔ نیلے چھالے کا بے رنگ پانی میز پر رکھے مخصوص برتن میں قطرہ قطرہ گرنے لگا۔ چیرا لگانے میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی جیسے میری جلد سن ہو چکی ہو۔ چہرے پر موجود باقی دو چھالوں کے ساتھ بھی میں نے یہی سلوک کیا۔

مونی بڑے انہماک سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ جب میں نے شرٹ اتار کر اپنی کرسی پر رکھ دی تو وہ میرا بالائی دھڑ ننگا دیکھ کر نظریں پھیر کر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنے بازوؤں اور سینے پر موجود آٹھ چھالوں کو چیرا لگا کر صاف کرنے کے بعد مونی کو مخاطب کیا۔ "مونی! میں پینٹ اتارنے لگا ہوں اب ادھر مت دیکھنا۔"

پہلے وہ نظریں پھیرے بیٹھی تھی، یہ سن کر رخ دوسری طرف موڑ لی۔ میں نے پینٹ اتاری تو مسرت آمیز حیرت ہوئی کیونکہ زیریں دھڑ پر صرف دو چھالے موجود تھے۔ ایک دائیں ٹانگ کے گھٹنے سے کچھ اوپر جب کہ دوسرا بائیں ٹانگ کی پنڈلی پر موجود تھا۔ انہیں صاف کرنے کے بعد میں نے پینٹ پہن لی اور پھر مونی کے خیال سے شرٹ بھی پہن لی۔ "مونی! آ جاؤ۔"

وہ اٹھ کر دوبارہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "ڈاکٹر صاحب! میری وجہ سے آپ کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔"

میں مسکرا کر کہا۔ "نہیں، تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ میری اپنی غلطی تھی۔"

"اب کب میرا علاج شروع کریں گے؟"

میرے دل پر یہ سن کر [illegible] دماغ میں الفاظ ابھرے۔ "مونی میں تمہیں کیسے بتاؤں [illegible] علاج ہو؟ آہ!" میں نے سر جھکا لیا اور آہستہ سے بولا۔ "نہیں مونی! ابھی میں خود تو ٹھیک ہو جاؤں۔"

وہ مایوسانہ انداز میں سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ کافی دیر تک ہم دونوں چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ میں چار بجے تک مونی کے پاس بیٹھا رہا۔ ہلکی پھلکی گپ شپ چلتی رہی۔ اس کی تان یہیں پر ٹوٹتی تھی۔ "ڈاکٹر صاحب! میرا علاج کب شروع کریں گے؟"

ساڑھے چار بجے آمنہ کی کال موصول ہوئی۔ میں مونی کے رخ سے نگاہیں ہٹا کر بے دلی کے ساتھ آمنہ سے بات کرنے لگا۔

"آپ آئے نہیں؟"

"اپنا علاج کر رہا ہوں۔"

"ہوں!" اس نے ہنکاری خارج کی۔ "کوئی فرق پڑا؟"

"ہاں! چھالے صاف کر دیے ہیں۔ زخم بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"جب بچیاں سو جائیں گی تو میں آپ کو فون کر کے بتا دوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

رابطہ منقطع ہو گیا۔

مونی دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تجسس تاڑ کر بتایا۔ "آمنہ کی کال تھی۔ میری بیوی ہے۔"

"کیا کہہ رہی تھیں وہ؟" مونی دلچسپی لے رہی تھی۔

"چھالوں کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔"

"چھالوں کی وجہ کیا بتائی تھی آپ نے؟" مونی پوچھ رہی تھی۔

"کہہ دیا تھا کہ کسی مریض کے چھوت سے چھالے بن گئے ہیں۔"

"آپ کے بچے بھی ہیں؟" مونی نے سوال کیا۔

"ہاں! دو پیاری پیاری بیٹیاں ہیں۔" پھر کچھ توقف کے بعد اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "لیکن اب تم بھی مجھے جان سے زیادہ عزیز ہو گئی ہو۔"

اس نے سر جھکا لیا۔ "ایسی باتیں نہ کیا کریں ڈاکٹر صاحب!"

"کیوں؟" میں نے شانے اچکائے۔ "یہ حقیقت ہے۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب!" اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ "میرے جسم میں زہر پھیلا ہوا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ میں تمہارا علاج کروں گا۔"

اس بات پر پھر بول اٹھی۔ "کب کریں گے علاج جب میں مر جاؤں گی؟"

میرا دل مٹھی میں آ گیا۔ "ایسی بات کبھی مت کرنا۔

میں تمہیں کبھی مرنے نہیں دوں گا۔"

"تو پھر آپ میرا علاج تو کرتے نہیں ہیں۔" وہ بولی۔ "باتیں ہی کرتے رہتے ہیں آپ۔"

میں نے اٹھ کر پانی کا گلاس بھر کر اسے تھمایا۔ پھر نیند کی ایک گولی اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔ "لو تمہارا علاج شروع ہوا۔ یہ گولی کھا لو۔"

وہ خوش ہو گئی۔ اس نے گولی پانی کے ساتھ نگل لی تو میں نے کہا۔ "اب تم جاؤ، قالین پر سو جاؤ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

وہ پھیکے سے انداز میں بولی۔ "مگر مجھے نیند نہیں آتی ڈاکٹر صاحب!"

میں نے کہا۔ "اب آجائے گی۔"

وہ جا کر لیٹ گئی۔ اس نے منہ دیوار کی طرف کر لیا تھا۔ یوں اس کی پشت میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ میں بے مصرف اس کی پشت کو گھورتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔ میرا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ وہ سکھ کی نیند سو رہی تھی۔ اتنے دنوں کے بعد سوئی تھی اور میری وجہ سے سوئی تھی۔

میرا جی چاہا کہ اس کے پاس جاؤں اور اس سے چمٹ کر سو جاؤں مگر پھر اپنے بہکتے جذبات کو لگام دینی پڑی۔ جذباتی حرکت کا نتیجہ بھگت رہا تھا۔ اب ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

کتنے ہی ہت جگوں کے بعد وہ سوئی تھی۔ دیر تک سوتی رہی۔ یہاں تک کہ نو بجے آمنہ کی کال آ گئی اور اس نے مجھے بتایا کہ بچیاں سو چکی ہیں، سو میں فوراً گھر چلا آؤں۔ میں اس کو جگانا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا پہلے میں نے اپنے چہرے کو کپڑے سے چھپایا، پھر بازار کی طرف پیدل ہی نکل پڑا۔ موہنی کے لیے کچھ فروٹ اور کھانے پینے کی چند دوسری چیزیں خرید کر لایا اور انہیں میز پر رکھ دیں تاکہ موہنی جب بیدار ہو تو کھا پی کر اپنی بھوک مٹا لے۔ اس کے بعد اسے سوتا چھوڑ کر میں دروازہ باہر سے بند کر کے گھر چلا گیا۔

آمنہ جو ہمیشہ بڑی محبت سے میرے سینے سے لگ کر محبت کا اظہار کرتی تھی، فاصلے سے ملی۔ ہم کمرے میں چلے گئے۔ پھر میں نے کہا۔ "میں اپنی شہزادیوں کو دیکھ لوں۔"

ہم دونوں دوسرے کمرے میں گئے۔ میٹھی نیند سو رہی تھیں۔ میں انہیں پیار نہیں کر سکتا تھا مگر انہیں یوں آسودہ نیند سوتے دیکھ کر روح سرشار ہو گئی تھی۔

آمنہ نے کھانا لگا دیا۔ ہم دونوں نے مل کر کھایا۔ کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں، پھر ہم نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

☆......☆

صبح بچیوں کے اٹھنے سے پہلے ہی میں اسپتال کے لیے نکل گیا حالانکہ اسپتال صبح نو بجے کھلتا تھا۔ دروازے کے باہر بدستور کل والا اشتہار چسپاں تھا۔ یعنی آج بھی کوئی مریض نہیں آنے والا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا مگر یہ دیکھ کر متعجب رہ گیا کہ موہنی ایک کونے میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ اس کے بال بکھرے تھے اور حلیہ کسی نشئی کی طرح ہو رہا تھا۔ رات کو میں نے جو کھانے کا سامان میز پر رکھا تھا وہ جوں کا توں پڑا تھا۔ یعنی موہنی نے نہیں کھایا تھا۔ وہ تیزی سے میری طرف بڑھی۔ "دروازہ کھولو، مجھے جانا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کہاں جانا ہے؟"

"باپو کے پاس...... جلدی کھولو، میں مر رہی ہوں۔"

وہ لمبی لمبی سانسیں کھینچ رہی تھی۔ اس کی حالت بالکل کسی نشئی کی طرح ہو رہی تھی جو نشہ نہ ملنے پر بے کل ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا۔ "چلو میں تمہیں گاڑی میں لے چلتا ہوں۔"

وہ روہانسی ہو کر بار بار اپنے جسم کو خارش کر رہی تھی۔ میں بھاگ کر اپنی کار لے آیا۔ وہ جھٹ سے میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی اور میں اس کی ہدایت کے مطابق گاڑی کو تیز رفتاری سے دوڑانے لگا۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی اور بے چینی سے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ میں وقفے وقفے سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ آہ! خدا نے کیسی حسین صورت سے نوازا تھا اسے مگر ایک دائمی روگ بھی اس کی جان کو لگا دیا تھا۔ میں اس خوب صورت چہرے کو موت کے منہ میں جاتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ہم ایک گاؤں میں پہنچے۔ کوئی ڈیڑھ سو کچے پکے گھر تھے۔ چھ سات سو نفوس کی آبادی ہو گی۔ اس پسماندہ حال گاؤں سے پانچ کلومیٹر پر شمالی سمت میں ایک بہت گھنا اور طویل جنگل پھیلا ہوا تھا۔ موہنی کے مطابق اس کا باپ یہیں آج کل ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ جنگل شہر سے تیس کلومیٹر دور تھا۔ یعنی بدنصیب موہنی اپنی بیماری کے علاج کے لیے تیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے شہر پہنچی تھی۔

مسئلہ یہ تھا کہ گاؤں سے جنگل کی طرف کوئی سواری نہیں جا سکتی تھی۔ راستہ غیر ہموار تھا۔ یہ پانچ کلومیٹر پیدل کی مسافت تھی۔ میں نے گاڑی کسی نہ کسی طرح ایک کلومیٹر تک اونچے نیچے راستے پر جنگل کی طرف بڑھائی۔ اب چار کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ آگے گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔ موہنی کی حالت رفتہ رفتہ ناگفتہ بہ ہوتی جا رہی تھی اور میری پریشانی فزوں تر ہو رہی تھی۔ میں اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ ہم دونوں بھاگنے کے سے انداز میں جنگل کی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے۔ موہنی کی رنگت جو شفاف پانی کی طرح پاکیزہ تھی، متغیر ہو چکی تھی۔ وہ ہل چلی زمین کی پگڈنڈی پر گر پڑی۔ زور زور سے ہانپنے لگی۔ میری سانس بھی پھول چکی تھی مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اپنی نظروں کے سامنے موہنی کو تڑپ تڑپ کر موت کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ "موہنی! میں تمہیں اٹھا لوں؟"

وہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ انکار میں سر ہلانے لگی۔ "نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب! میں زہریلی ہوں۔ مجھے ہاتھ مت لگانا، ورنہ میں تو مر رہی ہوں آپ بھی نہیں بچ سکیں گے۔"

"جو بھی ہو مجھے کوئی پروا نہیں۔" میں نے حتمی فیصلہ کیا اور اسے داہنے کندھے پر ڈال لیا۔ تیز قدموں سے جنگل کی طرف چل پڑا۔

جنگل میں پہنچا اور ایک کٹیا کے سامنے موہنی کو گھاس پر لٹا دیا۔ میری سانسیں بری طرح پھول رہی تھیں۔ حواس بحال ہوئے تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ موہنی کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور وہ غنودگی کے عالم میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے کٹیا کی طرف رخ کر کے بلند آواز میں پکارا۔ "کوئی ہے؟ کوئی ہے؟"

تبھی کچھ فاصلے پر ایک بوڑھا آدمی جس کے سر اور داڑھی کے بال بے ترتیب تھے، گھاس پر لیٹا ہوا نظر آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"موہنی کے باپ تم ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!" وہ بدستور مجھے گھور رہا تھا۔

"جلدی چلو موہنی بے ہوش ہو گئی ہے" میں نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بتایا تو وہ میری جانب چل پڑا۔

ہم موہنی کے قریب پہنچے تو بوڑھا اس کی مخدوش حالت کو نظر انداز کر کے ذرا غصیلے لہجے میں بولا۔ "تجھے کہا تھا نا شہر میں تیرا علاج نہیں ہے مگر تو ضد کر کے چلی گئی۔ اب اپنی حالت دیکھ رہی ہے؟"

وہ رو رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ "باپو! میرا قصور کیا تھا؟ تو نے مجھے زہر پر کیوں لگایا؟ کوئی باپ اپنی اولاد کے ساتھ دشمنی کرتا ہے بھلا؟"

اس کے باپ نے اپنے سامان میں سے ایک شیشی نکالی اور پھر موہنی کے قریب آ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ "چل منہ کھول۔"

موہنی نے منہ کھول دیا۔ اس کے باپ نے چند قطرے اس کے منہ میں ٹپکا دیے۔ ان قطروں نے جیسے اسے نئی زندگی بخش دی تھی۔ وہ ایکدم ہشاش بشاش نظر آنے لگی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اس شیشی میں کیا ہے؟" میں نے تشکیک انداز میں پوچھا۔

"زہر ہے...... بڑی زہریلی ناگن کا ہے۔ اس کو تم پر چھڑک دوں تو تمہاری ہڈیاں بھی پگھل جائیں گی۔" اس نے اپنے پیلے دانت نکالتے ہوئے بڑے فخر سے بتایا۔ "تم کون ہو جو میری بیٹی کو یہاں لے کر آئے ہو؟ یہ تو مجھ سے روٹھ کر شہر گئی تھی۔"

"یہ ڈاکٹر صاحب ہیں ابا! میرا علاج کریں گے۔" موہنی نے میری طرف اشارہ کر کے بتایا۔ "شہر کے بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔"

موہنی کا باپ بھدے انداز میں ہنس پڑا۔ "تجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔ خواہ مخواہ تو نے علاج کی ضد ڈال رکھی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم نے موہنی کو زہر کی عادت کیوں ڈالی ہے؟"

"بیٹی ہے میری، تو کون ہوتا ہے میری بیٹی کی وکالت کرنے والا؟"

مجھے اس کے نفع نقصان کی فکر ہے۔ اب جا یہاں سے۔"

موہنی بول پڑی۔ "باپو! ایسا نہ بولو ڈاکٹر صاحب کو۔ یہ بہت اچھے ہیں۔ میرا علاج کریں گے۔"

اس کے باپ نے غصے سے کہا۔ "ایک دوں گا دائیں ہاتھ کی۔ کیا تجھے میری بات سمجھ میں نہیں آتی؟ تیرا کوئی علاج نہیں ہے اگر ہوتا تو یہ ڈاکٹر تجھے یہاں میرے پاس لانے کی بجائے وہیں رہ کر تیرا علاج نہ کر لیتا؟"

موہنی نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے

امید و بیم کے محلات زمین بوس ہوتے نظر آئے۔ ''نہیں موہنی! یہ غلط کہہ رہا ہے۔ میں تجھے ضرور ٹھیک کروں گا۔ میں ولایت کے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے بات کروں گا۔ تم ضرور ٹھیک ہو جاؤ گی مجھ پر بھروسا کرو۔''

موہنی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ سپیرا غضب ناک ہو کر مجھے گھورنے لگا۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے کہا۔ ''تم جانتے ہو، تم نے یہ بہت بڑا جرم کیا ہے؟ اگر میں ابھی شہر میں جا کر پولیس کو بتا دوں تو وہ تمہیں گرفتار کر کے لے جائے گی اور تم بقیہ عمر جیل میں سڑتے ہوئے گزارو گے۔

وہ تیزی سے ایک ڈبے کی طرف بڑھا اور اس میں سے ایک باریک سا چمکیلا سانپ نکال کر لہرانے لگا۔ ''میں تجھے شہر جانے ہی کب دوں گا؟ اسے دیکھو، یہ نایاب سانپ ہے۔ اس نے تمہیں ڈس لیا تو تم دوسری سانس نہیں لے سکو گے۔''

موہنی اٹھ کر اپنے باپ کی طرف بڑھی اور اس کے ہاتھ سے کوبرے کو لے کر اپنے ہاتھ پر ڈسوانے کے بعد اسے دوبارہ ڈبے میں بند کر کے میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔ ''باپو! اگر ڈاکٹر صاحب کو کچھ ہو گیا تو پھر تم بھی زندہ نہیں بچو گے۔''

اس کا باپ چنگھاڑا۔ ''یعنی اب تو اپنے باپ کی دشمن ہو گئی ہے؟''

''نہیں باپو! اب میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا علاج کرنا ہے۔ اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ اپنے ہاتھ کی اس جگہ کو مسل رہی تھی جہاں ابھی کوبرے نے کاٹا تھا۔ بولی۔ ''تم نے بھی تو مجھے بیٹی نہیں سمجھا۔ میری رگوں میں زہر بھر دیا۔ اتنا زہر کہ مجھے نیند نہیں آتی، میری ہڈیاں پگھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، جسم پھٹنے لگتا ہے۔ کتنی بار تجھے یہ سب بتا چکی ہوں لیکن تجھے میری پروا ہو گی تو تو کچھ کرے گا نا۔'' وہ اشکبار ہو گئی۔ گھٹنوں میں سر چھپا کر ہچکیاں لیتی رہی۔

اس کا باپ بھی پگھل گیا۔ ''مت رو موہنی! اس میں تیرا ہی فائدہ ہے۔ یہ تکلیفیں آہستہ آہستہ تیری عادت بن جائیں گی پھر نہ تو تجھے کوئی سانپ نقصان پہنچا سکے گا اور نہ ہی کوئی انسان تیرے قریب آنے کی جرأت کرے گا۔''

موہنی بدستور روتی رہی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر کہا۔ ''باپو! دیکھ ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر چھالے بن رہے ہیں۔''

اس کا باپ سکون سے بولا۔ ''تجھے اٹھا کر لایا ہے، چھالے تو بننے ہی تھے۔ چل تو منہ پھیر لے۔ میں ٹھیک کر دیتا ہوں اسے۔''

موہنی نے ہماری طرف پیٹھ کر لی۔ اس کے باپ نے کہا۔ ''چل کپڑے اتار یہ چھالے منٹوں میں غائب کر دوں گا تیرے۔''

میں نے بلا چوں چرا کیے پینٹ شرٹ اتار کر اس درخت کی ٹہنی پر رکھ دی جس کے تنے کے پاس میں بیٹھا تھا۔ میرے سینے پر جا بجا نیلے چھالے بن چکے تھے۔ موہنی کے باپ نے میرے سینے جسم پر سفید رنگت کا پاؤڈر چھڑک دیا۔ حیران کن طور پر تین منٹ کے اندر اندر چھالے جسم سے یوں غائب ہو گئے جیسے بنے ہی نہیں تھے۔ یہ ایک ان پڑھ سپیرے کی ڈاکٹری تھی اور خاصی حیران کن تھی۔

میں نے کپڑے پہن لیے۔ موہنی پھر سے میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ گپ شپ چلتی رہی۔ یونہی دن ڈھل گیا اور شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو میں نے اجازت چاہی۔ ''میں اب چلتا ہوں۔''

''میرا علاج نہیں کریں گے ڈاکٹر صاحب؟'' موہنی نے میرے قدم جکڑ لیے۔

''اگر تم میرے ساتھ چلو گی تو پھر زہر کی طلب میں تمہاری حالت خراب ہو جائے گی۔'' میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''ابھی تم یہیں رہو۔ دو چار دنوں میں، میں دوسرے بڑے ڈاکٹروں سے رابطہ کر کے تمہارے علاج کا مناسب طریقہ ڈھونڈتا ہوں۔ تم دو تین دنوں بعد میرے اسپتال میں آ جانا۔''

وہ منہ بنا کر بولی۔ ''مجھے آپ تک پہنچنے کے لیے بہت دھکے کھانے پڑیں گے۔'' پھر وہ اپنے باپ کی طرف مڑی۔ ''ابا! ایک شیشی دے دے نا، میں علاج کے بعد تیرے پاس واپس آ جاؤں گی۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ زہر یقیناً بہت قیمتی ہو گا پھر ہار مان کر بولا۔ ''ٹھیک ہے لے جا، کروا لے اپنا علاج۔ ہر وقت مجھے اپنا دشمن جو سمجھتی رہتی ہے۔ میں تجھے نہیں روکوں گا مگر میں اب زیادہ سے زیادہ دس دن اس جنگل میں رکوں گا۔ مجھے زیادہ انتظار مت کروانا۔''

وہ خوش ہو گئی۔ ''ٹھیک ہے ابا!''

اس کے باپ نے اسے زہر والی شیشی دے دی۔ وہ خوش نظر آنے لگی، پھر وہ میرے ساتھ واپس چل پڑی۔ ابھی ہم کچے راستے پر گاؤں کی طرف جا رہے تھے کہ اس نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! جب میں ٹھیک ہو جاؤں گی باپو کے پاس آ جاؤں گی تو بھی آپ کو نہیں بھولوں گی۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جو میرے بائیں طرف چل رہی تھی۔ ہماری نظریں ملیں تو اس نے سر جھکا لیا۔ میں نے دل میں کہا۔ ''میں تو تمہیں ایک پل کے لیے بھی جدا نہیں ہونے دوں گا۔ تم یاد کی بات کرتی ہو۔''

میں خاموش تھا۔ اس خاموشی کو وہ پاٹ رہی تھی۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ کے پاس تو ہزاروں مریض آتے ہیں۔ آپ مجھے بھول جائیں گے ناں؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''نہیں..... میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا۔''

وہ کھل اٹھی۔

☆.....☆

میں گھر میں گیا تو آمنہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ''ارے! آپ کے زخم تو بالکل ٹھیک ہو گئے۔''

اب میں اسے کیسے بتاتا کہ میں کہاں سے آ رہا تھا اور زخم کیسے فی الفور ٹھیک ہوئے تھے؟ اس لیے جواب میں فقط مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اپنی بیٹیوں کو پیار کیے تین روز ہو چکے تھے سو پہلی فرصت میں ان کے پاس گیا۔ دونوں بیٹھی ہوم ورک کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

جب میں اور آمنہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں آئے تو میں نے زیادہ گرمجوشی نہیں دکھائی بلکہ بیڈ پر دراز ہو کر لمبی سانس لینے لگا۔ حواس پر موہنی چھائی ہوئی تھی۔ وہ جیسی بھی تھی جو کچھ بھی تھی میری زندگی میں داخل ہو چکی تھی۔

''آپ کچھ الجھے الجھے سے نظر آ رہے ہیں۔'' آمنہ نے گلہ کیا۔

''نہیں، آج کل مریض بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ میں تھک جاتا ہوں۔'' میں نے سفید جھوٹ کا سہارا لیا۔ وہ میرے قریب ہو کر میرا سر دبانے لگی۔ بلاشبہ آمنہ ان عورتوں میں سے تھی جو اپنے شوہر کے لیے باعثِ راحت ہوتی ہیں مگر مجھے موہنی کے خیالات بھلے لگنے لگے تھے۔ اس کا تصور اچھا لگنے لگا تھا۔

رات کو آمنہ سو گئی تو میں اٹھ کر لان میں آ گیا۔ مجھے موہنی کی فکر لاحق تھی مگر اس کا مرض بھی ناقابلِ علاج معلوم ہو رہا تھا۔ میری الجھن بڑھ رہی تھی۔ کوئی راستہ سوجھ نہیں رہا تھا۔ میں نے تار کے ذریعے لندن میں اپنے ایک استاد سے رابطہ کرنے کی ٹھان لی۔ وہ تجربے کار تھے اچھے مشورے دیتے۔ میں لان میں ٹہل رہا تھا۔ ایسے ہی وقت مجھے اپنے عقب میں مانوس قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ اپنے بالوں کو سمیٹتی آمنہ آ رہی تھی۔ اس کا خمار آلود چہرہ خوب صورت لگ رہا تھا۔

''یہاں اس وقت آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''نیند نہیں آ رہی تھی۔ یہاں چہل قدمی کے لیے آ گیا۔'' میں نے سپاٹ انداز میں بتایا۔

''چلیں..... اندر چلیں، سردی بڑھ رہی ہے۔ ٹھنڈ لگ جائے گی آپ کو۔''

''مجھے نیند نہیں آ رہی۔ تم جا کر سو جاؤ۔ میں ابھی اور ٹہلنا چاہتا ہوں۔''

بہت حساس لڑکی تھی۔ میرے قریب آئی۔ میرے ہاتھ تھام کر بولی۔ ''ساحر! اتنا تو میں جانتی ہوں کہ آپ کسی الجھن کا شکار ہیں۔ آپ مجھے نہیں بتانا چاہتے مت بتائیں، شاید آپ تنہائی چاہتے ہیں۔ آپ کہیں تو میں بچیوں کو لے کر امی ابو کی طرف چلی جاتی ہوں۔ جب آپ کو ہماری ضرورت محسوس ہو بلا لیجیے گا۔''

''ایسا کیوں سوچا تم نے؟''

وہ دھیمے انداز میں بولی۔ ''کیوں کہ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔''

غربت کے باعث علی خان (جمال ابڑو کے والد) جونا گڑھ کالج میں پڑھنے کے لیے گئے تھے۔ ان دنوں وہاں نواب مہابت خان کی حکومت تھی اور تعلیم مفت تھی۔ وہاں بھی علی خان یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ انٹر میں اوّل نمبر، بی اے میں اوّل نمبر۔ اس طرح ایم اے تک اوّل نمبر آتے رہے۔ انہوں نے یہ ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا کہ اس سے پہلے کسی نے بھی یہ کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ اس طرح علی خان وہ پہلے شخص تھے جس نے ایسی حیرت انگیز کامیابی سرانجام دی۔ وہ پہلے سندھی مسلمان تھے جنہوں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔

اقتباس: پاکستانی ادب کے معمار۔ از منظور علی ویسریو

مرسلہ: نعمان علی۔ کراچی

میں نے کہا۔ "ایسا کچھ نہیں ہے تم اپنا دل صاف رکھو۔"

میں اس کو دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ وفا شعار، محبت کرنے والی بیوی کو پریشان کرنا برا لگ رہا تھا۔ سو میں اس کو لے کر بیڈ روم میں آگیا۔ وہ ہمیشہ میرے بازو پر سر رکھ کر سوتی تھی۔ میرے دائیں ہاتھ کے ڈولے پر اپنا چہرہ رکھ کر وہ جلد ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ ایک بار پھر ہماری تنہائی پر مونی نے شب خون مارا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر آمنہ کی جگہ مونی میرے پہلو سے چپک کر سو رہی ہوتی تو؟ طبیعت بے چینی سے بھر گئی۔ جی چاہا کہ آمنہ کو جھٹک کر اپنے وجود سے دور دھکیل دوں مگر ایسا کر نہ سکا۔ اس نے اپنی زندگی کے سات سال ہی نہیں بلکہ کاشفہ اور سلیمہ کی صورت میں دو انمول تحفے بھی میرے دامن میں ڈالے تھے۔ میں اسے کیونکر پرے دھکیل سکتا تھا؟

باقی رات سوچوں میں کٹ گئی۔ آمنہ اور مونی کے تقابل میں ہمیشہ مونی فاتح ٹھہری۔ آمنہ کو پسپا ہونا پڑا۔ میں جانتا تھا مونی سراب ہے پھر بھی اس کی جانب کھنچا جا رہا تھا۔

مونی نے کہا تھا وہ مجھے کبھی بھلا نہیں پائے گی مگر..... مگر آہ! اس نے کہا تھا کہ اگر میں نے اس کو ٹھیک کردیا، وہ اپنے باپ کے پاس واپس جنگلوں میں لوٹ گئی تو بھی یاد رکھے گی! اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں ٹھیک ہو کر صرف تمہارے لیے تمہارے پاس رہوں گی۔

اور پھر میرے دل میں دھواں سا بھر گیا۔ کیا میں کبھی مونی کو ٹھیک کر پاؤں گا؟ یہ سوال دل میں ہلچل مچا رہا تھا۔ مونی زہریلی تھی، اس کے روم روم میں زہر رچا بسا تھا۔ وہ جس ذی روح پر تھوک دیتی تھی، وہ پانی بن کر بہہ جاتا تھا اور..... جو کوئی اس کے طلسماتی وجود کی قربت کی لطیف لذتیں سمیٹنے کی کوشش کرتا وہ یقیناً اس کے زہریلے وجود میں تخلیق کا کوئی بیج بوئے بغیر ہی زندگی ہار جاتا۔

میری آنکھوں کے گوشوں کی فصلیں توڑنے والے آنسو اب رخساروں کے میدان میں محوِ سفر تھے۔ میرے نتھنوں سے نکلنے والی گرم سانسیں ایک حسرت کے لہو میں ڈوب کر آرہی تھیں۔ میرے سینے کی اوپر نیچے ہوتی حرکتیں کسی گہرے دکھ کا شاخسانہ تھیں۔ میرے ہونٹوں کی لرزش کے پیچھے کرب کی ایک داستان تھی۔

میں نے گردن موڑ کر اپنے بازو پر رکھے آمنہ کے چہرے کو دیکھا۔ بڑے سکھ کی نیند سوئی تھی۔ یوں جیسے دنیا کی کوئی فکر نہ رہی ہو۔ نعمت ہے یہ نیند بھی، نہ آئے تو علیحدہ بات ہے۔ آجائے تو بے غم کردیتی ہے۔ دنیا کی بے کنار الجھنوں کو بندے سے دور بھگاتی ہے مگر مجھے نہ تو نیند آئی تھی اور نہ الجھنوں نے میرا پیچھا چھوڑا تھا۔ مجھے مونی کی زندگی کی فکر سونے نہیں دے رہی تھی۔

☆......☆

دوسرے روز میں گھر سے آٹھ بجے اسپتال کے لیے نکلا۔ راستے میں گاڑی روک کر مونی کے ناشتے کے لیے کچھ چیزیں خریدیں پھر اسپتال آگیا۔ آج چونکہ اسپتال کھلا تھا لہٰذا کچھ ہی دیر میں مریضوں کا تانتا بندھ گیا۔ میری پہلی مریضہ مونی تھی۔ میں نے اسے ناشتا دیا اور نیند کی گولی بھی! وہ اسپتال کے اس پورشن میں چلی گئی جہاں میں کبھی کبھار فرصت میں آرام کیا کرتا تھا۔ مونی کو بھی وہیں آرام دہ چھوٹے سائز کے بیڈ پر سوتی رہی تھی۔

دو بجے تک میں مسلسل مریضوں کو چیک اپ کرتا رہا۔ کچھ فراغت نصیب ہوئی تو مونی کے پاس چلا گیا۔ وہ یہاں پرسکون ماحول میں آرام محسوس کررہی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ مسکرانے لگی۔

"تم مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو۔" میں نے بے لاگ تعریف کردی۔

وہ بدستور مسکراتی رہی۔ کچھ نہیں بولی۔

میں نے پوچھا۔ "اب کیسا محسوس کررہی ہو؟"

"ٹھیک۔" وہ مختصراً بولی۔

"کیا تمہیں پتا ہے کہ تم بہت خوب صورت ہو؟"

وہ گلنار ہوگئی۔ رگوں میں زہر بھرا تھا تو کیا ہوا، تھی تو گوشت پوست کی لڑکی! جذبات تو اس کے سینے میں بھی پنپتے تھے۔

"تم نے جواب نہیں دیا؟" اسے خاموش پا کر میں نے پوچھا۔

"آپ کہہ رہے ہیں تو مان لیتی ہوں۔"

میں نے قدم بڑھائے تھے کہ پیچھے سے مونی کی آواز آئی۔ "ڈاکٹر صاحب!"

میں نے گردن موڑ کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ "ڈاکٹر صاحب! یہ تو بتاتے جائیں کہ میں کب تک ٹھیک ہوجاؤں گی؟"

میں نے ایک اور طویل سانس اندر کھینچی پھر چند ہلکی ہلکی سانسیں لینے کے بعد کہا۔ "اللہ نے چاہا تو تم بہت جلد ٹھیک ہوجاؤ گی۔"

یہ وہ جواب تھا جو ہر ڈاکٹر تقریباً اپنے ہر مریض کو دیتا ہے۔ میں باہر جانے کا ارادہ ترک کرکے اپنے کمرے میں آگیا۔ چند لمحوں تک اپنی کرسی کی عقبی دیوار پر ٹنگے گھڑیال کو ویران آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ ذہن میں خیالوں کے جھکڑ چل رہے تھے پھر میں اپنی آرام کرسی پر ڈھے گیا۔ کرسی جھولنے لگی۔ میرے اردگرد لاتعداد سوالات بھی جھول رہے تھے۔ میں مونی کا علاج نہیں کرسکتا تھا، پھر اسے اپنے پاس کیوں رکھا ہوا تھا؟ میں اس کی رگوں میں موجود زہر کو اس کے خون سے الگ نہیں کرسکتا تھا، پھر اسے کیوں امید دکھا رہا تھا؟ میں اسے موت کے منہ میں جانے سے نہیں روک سکتا تھا، پھر اسے زندگی کی لطافتوں کی طرف کیوں بلا رہا تھا؟ جب کہ اسے ہاتھ لگانے میں بھی خطرہ تھا، گویا وہ میرے کسی کام کی نہ تھی پھر بھی اسے کیوں چاہ رہا تھا؟ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟

میں نے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ آئندہ مونی سے پیشہ ورانہ انداز میں پیش آنے کی کوشش کروں گا۔ اسے یہ کہہ کر مایوس نہیں کروں گا کہ میں اس کا علاج نہیں کرسکتا بلکہ جب تک ممکن ہو اسے زندگی میں مصروف رکھوں گا۔ وہ اپنے زہریلے وجود کے ساتھ زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتی تھی، یہ بات مجھے پتا تھی مگر زندگی میں موت کو کیوں منایا جائے؟

میں سوچوں میں گم آنکھیں بند کیے آرام کرسی پر آگے پیچھے جھول رہا تھا جب اس نے گلا کھنکار کر مجھے اپنی آمد سے مطلع کیا۔ سامنے میز کی دوسری طرف بیٹھ گئی۔ میں نے آنکھیں کھول کر اس کے حسنِ تازہ کو دیکھا پھر استفسار کیا۔ "خیریت؟ تم آرام چھوڑ کر یہاں آگئیں؟"

"وہاں نیند آ [illegible]" وہ بولی۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔ پہلے تم کہتی تھیں کہ تمہیں نیند نہیں آتی۔ اب نیند کو چھوڑ کر یہاں آ [illegible]"

"وہ تو ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! [illegible] مسئلہ ہوگیا ہے۔" وہ بولی۔

"بات مکمل کرکے بتاؤ۔"

"وہ جو دوا میں بابو سے لے کر آئی تھی، اسے میں نے ایک ہی وقت میں پی لیا ہے۔ اصل میں نیند کے بعد مجھے شدید طلب ہوتی ہے۔ جب میں سو کر اٹھی تو بہت طلب ہو رہی تھی۔ مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے شیشی خالی کردی۔" وہ سر جھکائے بتا رہی تھی۔ "اب دوبارہ نیند آرہی ہے تو میں اٹھ کر آپ کے پاس آگئی۔ ورنہ بات بگڑ جاتی۔"

"اوہ!" میں نے تشویش کا اظہار کیا۔ "اب کیا ہوگا؟"

"اب کیا ہوسکتا ہے ڈاکٹر صاحب؟" وہ شانے اچکا کر بولی۔ "یا تو میں سوؤں گی نہیں یا پھر دوبارہ بابو کے پاس جانا پڑے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں فوراً تمہارے باپ کے پاس چلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ بہت اچھے ہو [illegible]" [illegible] سے بولی۔ "آپ میری خاطر اتنے [illegible] ہو رہے ہیں [illegible] میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گی ڈاکٹر صاحب [illegible]"

میں نے جواب میں کچھ [illegible] کوئی بات بن پائی [illegible] خاموش رہی [illegible]

[illegible] ہم جنگل میں پہنچے تو اس کے باپ [illegible] کوئی خاص مشکل نہیں ہوئی [illegible] میں بولا۔ "ہاں تو ہوگیا علاج؟"

مونی نے مختصراً آنے کا مقصد بتایا تو وہ بولا۔ "اب تو شہر جانے کا خیال دل سے نکال دے اور اس ڈاکٹر کو جانے دے۔"

"بابو! ابھی تو میرا علاج شروع ہوا ہے۔" وہ بولی۔ "کیا تجھے اپنی بیٹی سے محبت نہیں؟ کیا تو نہیں چاہتا کہ میں ٹھیک ہوجاؤں؟"

کافی بحث و تمحیص کے بعد وہ مان گیا اور اس نے زہر

شمارہ جنوری 2019ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش.....آپ کا انتخاب

☆اول: حفاظتی اقدام.....راحت وفا راجپوت (لاہور)

☆دوم: بدلہ.....ڈاکٹر ساجدہ (ملتان)

☆سوم: نشانِ عبرت.....کوثر اسلام (صوابی)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے

ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

کی دوسری شیشی اسے دے دی مگر ساتھ تنبیہہ بھی کی۔ ”اب اسے دھیان سے استعمال کرنا۔ ایک ہی بار خالی کر کے نئی شیشی کی اُمید لے کر میرے پاس نہ آنا۔ اس سے تو آٹھ دس دن آرام سے نکال سکتی ہے۔“

موہنی نے کہا۔ ”ابھی طلب ہو رہی ہے۔“

اس نے کہا۔ ”پانچ سے زیادہ قطرے نہیں پیے گی تو سمجھ گئی؟ یہ بہت زہریلے ناگ کا زہر ہے۔ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔“

موہنی نے شیشی کا ڈھکن کھولا۔ میں بہ نظر تحیر دیکھتا رہا۔ اس نے چند قطرے حلق میں انڈیلے پھر زبان ہلانے لگی۔ پھر ایکدم سے پوری شیشی اپنے منہ میں انڈیل دی۔ اس کا باپ اس کی طرف دوڑا، پھر غصے سے بولا۔ ”موہنی! یہ کیا ہے؟ تجھے روکا تھا نا میں نے؟“

وہ شرمندہ نظر آنے لگی۔ ”ابا! بہت پیاس لگی تھی۔ سکون نہیں مل رہا تھا۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”اب میں تجھے اور شیشی نہیں دوں گا۔ جانا ہے تو اس ڈاکٹر کے ساتھ چلی جا، یا پھر یہیں رہ جا۔“

وہ بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میری سفارش پر اس کا باپ مان جانے والا تھا۔

میں نے کہا۔ ”موہنی! اب تو تم میرے ساتھ نہیں جا سکتیں۔“

وہ اپنے باپ کی منت ساجت کرنے لگی۔ ”تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ زیادہ نہیں پیوں گی۔“

وہ کسی قیمت پر مان نہیں رہا تھا۔

اچانک کچھ دیر بعد موہنی گھاس پر لیٹ گئی۔ اس کے باپ نے توجہ نہیں دی بلکہ اپنے مخصوص لکڑی کے ڈبوں میں اپنے سانپوں کے ساتھ مشغول رہا مگر میں ڈر سا گیا تھا۔ اس کے قریب چلا گیا۔ ”موہنی! تم ٹھیک ہو نا؟“

اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا، پتلیاں چڑھی ہوئی تھیں، پھر آنکھیں موند لیں۔ میں نے چیخ کر اس کے باپ کو بلایا۔ ”دیکھو......موہنی کو کچھ ہو رہا ہے۔“

اس نے میری طرف دیکھا، پھر موہنی کی طرف متوجہ ہوا، موہنی کو لیٹی ہوئی دیکھ کر اس کی طرف بڑھا۔ اس کے سر کے پاس بیٹھ کر بولا۔ ”موہنی! تجھے کیا ہو رہا ہے؟“

موہنی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں بے بسی سے اس کی متغیر رنگت دیکھ رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ”اس بے وقوف نے زہر ضرورت سے زیادہ پی لیا ہے۔“

میں نے گھبرا کر کہا۔ ”اب کیا ہوگا؟“

میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”موہنی! تم ٹھیک ہو نا؟“

اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا، پھر اس کے ہونٹوں پر معدوم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اٹک اٹک کر بولی۔ ”ڈاکٹر صاحب! میں زندہ نہیں رہوں گی آپ نے میرا علاج نہیں کیا......!“

میں چیخا۔ ”موہنی! تم آنکھیں کھولو۔ میں تمہارا علاج ضرور کروں گا۔“

وہ کہہ رہی تھی۔ ”اب میرے سینے میں دل نہیں رہا ڈاکٹر صاحب، لگتا ہے پکمل [illegible] کا حصہ بن گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب! میرا وجود اندر سے [illegible] ہے۔“

میری آنکھوں سے آنسوؤں کی [illegible]۔ ”مجھے چھوڑ کر مت جاؤ موہنی!“ میرے لہجے میں فریاد تھی۔ ”مجھے تم سے محبت ہے۔“

اس نے ایک بار پھر زور لگا کر آنکھیں کھولیں۔ مجھے نظر بھر کے دیکھا۔ اس کے شفاف چہرے پر کرب نظر آ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر مر رہی تھی۔ میں اس کے مزید قریب ہو گیا۔ ”موہنی! میں تمہارا علاج کروں گا۔ مجھ پر بھروسا کرو۔“

اس کے ہونٹ کالے ہو گئے تھے اور سکڑتے جا رہے تھے۔ وہ خود بھی سکڑ کر گٹھڑی بنتی جا رہی تھی۔

اس نے آخری بار نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا، بولی۔ ”ڈاکٹر صاحب! اس دنیا میں ہم نہیں مل سکے۔ میری دعا ہے کہ اگر میں اگلی دنیا میں زہریلی نہ ہوئی تو آپ کو ملوں۔“

میں نے تڑپ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ آہستہ آہستہ بند ہوتی چلی گئیں۔ میں نے دیوانگی میں اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ چیخ کر کہا۔ ”موہنی! مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔“

پھر میں نے اسے ہلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا کہ اس کے باپ نے مجھے دھکا دے کر دور دھکیل دیا۔ ”کم بخت! مرنا چاہتا ہے۔“ اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب ہوش آیا تو میں لباس کی قید سے آزاد ننگ

دھڑ تنگ گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ پورے جسم پر سفید پاؤڈر چھڑکا گیا تھا اور حلق میں کسی عجیب ذائقے والی دوا کا پتا چل رہا تھا۔

کچھ فاصلے پر موہنی کا باپ اپنے سامان کی گٹھڑی کے پاس سوگوارانہ انداز میں سر کو تھامے بیٹھا تھا۔ ہوش میں آتے ہی میں حلق کے بل چیخا۔ ''موہنی کہاں ہے؟''

اس نے ایک طرف اشارہ کیا تو میں سامنے کا دلدوز منظر دیکھ کر چیخ پڑا۔ ''نہیں موہنی!'' وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''موہنی نے بہت زیادہ زہر پی لیا تھا اور وہ زہر بھی بہت زہریلے سانپ کا تھا۔''

کچھ فاصلے پر موہنی کا لباس اور ہڈیوں کا پنجر دیکھ کر میں دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ آہ! وہ پانی بن کر بہہ گئی تھی۔ کافی دیر تک سسک سسک کر روتا رہا۔ اس کا باپ بتا رہا تھا۔

''مجھے پہلے ہی یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب نہیں بچے گی۔ اس نے زہر کی پوری شیشی نگل لی تھی۔ تم نے اس کو ہاتھ لگا کر بہت بڑی بے وقوفی کی اگر میں تمہارے منہ میں تریاق نہ ڈالتا اور تمہارے وجود پر پاؤڈر نہ چھڑکتا تو اب تمہارا ابھی ہڈیوں کا ڈھانچا ہی رہ جانا تھا۔''

میں نے لپک کر اس کا گریبان پکڑ لیا، چیخ کر کہا۔ ''اسے تم نے مارا ہے۔ وہ تمہاری وجہ سے مری ہے۔''

میری توقع کے برعکس اس نے غصہ نہیں کیا۔ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''بیٹھ جاؤ، تمہیں قصہ سناتا ہوں۔''

''تمہاری بیٹی مر گئی ہے۔ تم قصے کہانیوں کی بات کر رہے ہو؟''

''سنو گے تو سمجھو گے۔''

میں ہانپتے کانپتے بیٹھ گیا۔ میرا وجود مسلسل لرز رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

وہ بولا۔ ''آج سے بیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں اور راجن جنگل جنگل گھومتے تھے۔ ہم دونوں سپیرے تھے مگر راجن میری زندگی میں خوشیوں کا پیغام بن کر آئی تھی۔ سانپوں کے بارے میں وہ مجھ سے زیادہ علم رکھتی تھی کیونکہ وہ ایک نامی گرامی جوگی کی بیٹی تھی۔ ایک دفعہ ہم دونوں ایک جنگل میں موجود تھے کہ کچھ سیر سپاٹے پر آنے والوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ راجن بہت خوب صورت تھی۔ وہ لوگ جو سیر سپاٹے پر آئے تھے، بہت غلط لوگ تھے۔ وہ ہمارے قریب آئے۔ انہوں نے مجھے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا اور راجن پر بھوکے کتوں کی طرح پل پڑے۔ انہوں نے اس بات کا بھی خیال نہیں کیا کہ راجن ان دنوں ماں بننے والی تھی۔ وہ تعداد میں پانچ تھے، پانچوں نے باری باری اس کی عزت لوٹی اور پھر فرار ہو گئے۔''

وہ کچھ متوقف ہوا۔ میں آنکھیں پھاڑے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ پھر وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ ''وہ تو منہ کالا کر کے چلے گئے مگر ہم میاں بیوی جیتے جی مر گئے۔ راجن نے دو مہینے بعد موہنی کو جنم دیا۔ ہمیں کوئی خاص خوشی نہ ہوئی۔ اس کے دل کو روگ لگ گیا تھا۔ چپ چپ رہتی تھی۔ ایک دفعہ میں کچھ دور [illegible] گیا بین بجاتے ہوئے۔ واپس آیا تو وہ ٹھنڈی ہو چکی [illegible]۔ اس کے وجود پر میرا ہی ایک سانپ موجود تھا۔ مجھے یقین [illegible] وہ سانپ اس نے خود اپنے اوپر چھوڑا تھا کیوں کہ وہ جینا نہیں چاہتی تھی۔''

وہ آنسو پونچھنے کے لیے [illegible] بولا۔ ''وہ تو چلی گئی مگر میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ میں [illegible] کوشش شروع کی۔ جب یہ پانچ سال کی ہوئی تو میں [illegible] اس کے جسم میں تھوڑا سا زہر اتارا۔ پھر یہ عادی ہو [illegible]۔ اب کچھ سالوں سے زیادہ زہر کی ضد کرنے لگی تھی۔ [illegible] مجھے پچھتاوا ہوتا تھا کہ میں نے اس کو کیوں زہریلی بنایا [illegible] پھر میں سوچتا تھا کہ ٹھیک ہی کیا ہے۔ وہ بھی اپنی ماں کی طرح خوب صورت تھی۔ کوئی اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کرتا تو مزہ بھی چکھتا، تڑپ تڑپ کر مر جاتا۔''

بات سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ کیوں اپنی بیٹی کے جسم میں زہر اتارتا رہا تھا۔ رات پر پھیلانے لگی تھی۔ میرا دل گھبرا گیا۔ میں چپ چاپ اٹھا اور جنگل سے نکل کر گاؤں کی طرف چل پڑا جہاں میری کار کھڑی تھی۔ میں جلد از جلد اپنی خوب صورت بیوی آمنہ کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ اپنی شہزادیوں کاشفہ اور سلیمہ کو اپنے سینے سے لگا کر موہنی کو بھول جانا چاہتا تھا۔

بل کھاتی پگڈنڈی پر سر جھکا کر نم آنکھوں کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے موہنی بھی میرے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''ڈاکٹر صاحب! میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ کیا آپ بھی مجھے نہیں بھلائیں گے؟''

میں نے گھبرا کر اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ پھر میں نے رک کر پیچھے جنگل کی طرف دیکھا۔ آہ! اب شاید وہ وہاں بھی نہیں تھی۔